حرف و حکایت

سرباز جہانی

حرف و حکایت

ناشر: چودھری عبدالحمید، ایم۔ اے،
مطبع:۔ اردو پریس، میکلوڈ روڈ • لاہور

قیمت:۔ ۱۵ روپے،

حرف و حکایت

(انتخاب)

سندباد جہازی

مکتبۂ کارواں، ایبک روڈ۔ انار کلی۔ لاہور

سر آغاز

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی تنہا ذات میں بیک وقت بہت سی خوبیاں تا بحدِ کمال جمع ہو گئی تھیں۔ مرحوم ان کمیاب شخصیتوں میں سے تھے جو ایک فرد سے بڑھ کر ایک ادارے، ایک وضع کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ کسی قوم کی تہذیبی روایات کی علامت، ان کا رس اور دھڑکن بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے عصر پر بڑے پائیدار نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ گرد و پیش کی تخلیق ہی نہیں، اُس کے خالق بھی ہوتے ہیں۔

مولانا حسرت کی پوری زندگی تحصیلِ علم کی ایک امٹ پیاس اور ابلاغِ علم کی ایک مسلسل تگ و تاز کی رُوداد ہے۔ ۱۹۲۵ء میں خود زندگی و شگفتگی نے جو بہار آفریں قلم "عصرِ جدید" کلکتہ کے نوجوان "کوچہ گرد" کو سونپا تھا، اس کو جون ۱۹۵۵ء میں آخرِ کار موت ہی "حرف و حکایت" کے "سندباد جہازی" سے چھین سکی۔ اس مدت میں انھوں نے ادب و صحافت کو بہت کچھ دیا ہے۔ زندگی اور حالات مہلت دیتے تو وہ اس سے کہیں زیادہ وقیع علمی اثاثہ چھوڑ جاتے۔ انکی جینئس کے بعض نیم آشکار رنگوں کے اُبھرنے، نکھرنے اور پھیلنے کا وقت اب آ رہا تھا کہ موتیوں، پھولوں اور چراغوں سے جھلکتی ہوئی یہ قوسِ قزح اچانک ڈوب گئی — اندھیروں کو فتح کرنے والی کرن مر گئی!

کتنے خوابوں کے دامن تہی رہ گئے
کتنے پھولوں کو ئے کر چمن سو گیا

مولانا حسرت ایک کارکن صحافی تھے۔ پانی پینے کے لئے ان کو ہر روز ایک نیا کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ حد یہ ہے کہ جس روز لاہور کے مغموم و دل ریش اہلِ قلم و اربابِ علم حسرت کی میت کو میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر رہے تھے، اُس روز بھی حسرت کا لکھا ہُوا تازہ مزاحیہ کالم اخبار میں موجود تھا۔ اے کاش! زبان و بیان کے فضلا ایسی موت کی عظمت کے لئے بھی کوئی نام تجویز کر سکیں۔

خالص علمی تصانیف کے کئی اداریے اور خاکے ان کے ذہن میں موجود تھے جو لوگ حسرت صاحب کو قریب سے جانتے ہیں، اُن کو معلوم ہے کہ آخری ایام میں اُن کا ایک ایک سانس ان خاکوں کی تزئین میں صرف ہو رہا تھا۔ لیکن اُن کی زندگی (اور شاید اس دور کے ادب کا بھی) سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اس کام کو شروع تک نہ کر سکے جس کی تکمیل ہی ان کی زندگی تھی۔ ادب کو اُن سے جو کچھ مل سکا ہے، اُس کا بہت بڑا حصّہ صحافت کے واسطے سے ملا ہے۔ مگر چونکہ وہ صحافت بھی ادب ہی کی سطح پر کرتے تھے، اس لئے یہ ذخیرہ بھی اتنا کافی، اتنا رنگا رنگ اور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے تہذیبی و لسانی ورثے کی عزیز ترین متاع سمجھا جائے گا۔ ان کا "کارنامۂ حیات" وہ شہرۂ آفاق فکاہی کالم ہے جو وہ زندگی بھر مختلف اوقات میں، مختلف قلمی ناموں کے تحت، مختلف اخبارات میں لکھتے رہے ہیں۔ "حرف و حکایت" اس کالم کی آخری صورت اور "سندباد جہازی" اس کے مصنّف کا آخری قلمی نام تھا۔ اس عظیم سرمایہ کو محفوظ کرنا اُردو زبان کے خادموں کا فرض ہے —— ان اوراق میں یہی کوشش کی گئی ہے!

قارئین یہاں مجھ سے کسی انتقادی محاکمے کی توقع نہ رکھیں۔ میں اس منصب کا اہل نہیں

ہوں۔ ادب میں حسرت کا مقام متعین کرنے کے لئے علم و نظر کی جس وسعت اور مذاقِ سلیم کی جس شیرینی اور لچک کی ضرورت ہے، وہ مجھے میسّر نہیں ہے۔ جذباتی اعتبار سے بھی میں اپنے آپ کو ابھی اس کام کے لائق نہیں پاتا کہ ابھی تو "مرشد" کے تذکرے کا ایک ایک لفظ آنسوؤں کی نمی میں گھل کر قلم تک آتا ہے۔ اس وقت کوئی انتقادی تبصرہ لکھنا قبل از وقت بھی ہے اس مجموعہ کی حیثیت "حرف و حکایت" کی چند جھلکیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ کام اگر جاری رہ سکا، تو نہ معلوم کتنے مجلدات میں جاکر ختم ہو۔ ایک عمر کا کام ایک مدت ہی میں جاکر سمیٹا جا سکے گا۔ حسرت کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا اُسی وقت ممکن ہو سکے گا۔ ابھی تو قرب کے باعث ہم ان کے قامت کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔

مولانا حسرت سے مجھے بیس بائیس برس تک نیازمندانہ تقرب کی سعادت حاصل رہی ہے۔ چودھری عبدالحمید صاحب (مکتبۂ کارواں) نے جب مجھے "حرف و حکایت" کی تدوین و ترتیب کی دعوت دی تو میں نے اس عظیم و مشکل پیشکش کو صرف اس اعتماد پر قبول کر لیا کہ "مرشد" کی صحبتوں کی بخشی ہوئی روشنی، اس کام میں میری رہنمائی کرے گی۔ اس سے زیادہ مجھے اور کوئی دعویٰ نہیں۔ ایسا شخص، ایک مزدور کی طرح کام ہی کر سکتا ہے، لمبے چوڑے تبصرے نہیں لکھ سکتا —— البتہ تدوین و ترتیب سے متعلق کچھ صراحت ضروری ہے!

یہ مجموعہ ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۵۵ء تک کے کالموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ دراصل اس مجموعہ کو اس مدت کے تمام کالموں کا انتخاب کہنا بھی درست نہیں۔ ۴۷ء اور ۵۵ء کے بہت ہی کم تراشے دستیاب ہو سکے ہیں۔ پھر جو تراشے مجھے ملے ہیں، وہ لفافوں میں کچھ اس طرح ٹھونس ٹھانس کر رکھے گئے تھے کہ گویا کالم پر کالم سوار تھا اور اُن کی خستگی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کے بجائے ان پرچیوں کو گھڑی ساز کے چمٹے سے پکڑنے کی ضرورت

تھی۔ بہرحال میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا، کالموں کو چھانٹ کر ان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتّب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم یہ اندیشہ موجود ہے کہ میری تمامتر احتیاط و سعی کے باوجود بعض مقامات پر یہ صورت نظر آئے کہ "سر" ایک کالم کا ہے اور "دھڑ" دوسرے کا۔ یہ اطمینان بہرحال میں نے کر لیا ہے کہ ربط ضبط نہ ہونے پائے۔

جہاں تک اس انتخاب کا تعلّق ہے، میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا اِنتخاب ہے اور یہ ایک ایسا نازک، ذاتی سا معاملہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس پر آخری مہرِ ثبت نہیں کر سکتا۔ مولانا کی زندگی میں اس موضوع پر بارہا میری اُن سے گفتگو رہی ہے وہ پچیس تیس برس کی اس طویل مدت کو مختلف ذیلی ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کے سیاسی، ذہنی، معاشی خدوخال پر الگ الگ تفصیلی مقدّمے لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خود اپنے کالموں کو مرتّب کرتے تو "مقدمات" کا حجم "انتخابات" کے حجم سے کہیں زیادہ ہوتا۔ یہ کام وہی کر سکتے تھے۔ موجودہ حالات میں بہترین صورت تو یہ تھی کہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۵۵ء تک ان کالموں کو سلسلہ وار مرتّب کیا جاتا۔ لیکن اگر یہ نہیں ہو سکا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جو سرمایہ فوری طور پر محفوظ کیا جا سکتا ہے، اُس کو بھی تلف ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

انتخاب و ترتیب کے کام میں میجر مسعود احمد اور کرنل جاوید خٹک نے کہ حسرت صاحب کے "نیازمندانِ ملایا" میں سے ہیں، میرا ہاتھ بٹایا ہے اور "تراشوں" کے "پیچ و خم" سلجھانے میں اگر غلام علی بلبل کاشمیری میری امداد نہ کرتے تو کچھ عجب نہیں کہ میں اِن "پیچ و خم" میں کھو کر رہ جاتا — میں اِن سب دوستوں کا شکر گزار ہوں۔

۹۴ یونیک روڈ، راولپنڈی
جولائی ۱۹۵۶ء

ضمیر جعفری

مقدمہ

موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے آغاز میں ادبِ اردو یا نثرِ اردو میں ایک نئی ذیلی شاخ کا آغاز ہوا جس کو "روزناموں کا مستقل مزاحی کالم" کہتے ہیں۔ ذیلی شاخ اس لیے کہ رہا ہوں کہ ادب کی شاخوں میں سے ایک صحافت ہے اور جس نئی شاخ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ صحافت کی شاخ ہے۔ لہٰذا اسے ادبِ اردو کی ذیلی شاخ کہے بغیر چارہ نہیں۔

روزنامے میں مستقل مزاحی کالم کا آغاز کچھ ایسے انداز سے ہوا کہ چند ہی ہفتے کے اندر زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا اثر محسوس ہونے لگا۔ اس کالم کے موضوعات اتنے ہی کثیر اور وسیع تھے، جتنی کثرت و وسعت کی سرمایہ دار حیاتِ انسانی ہے۔ سیاست، ادب، معاشرت، اخلاق، دین، اقتصاد غرض کوئی شعبہ باقی نہ رہا جس کو مزاحی کالم نے اپنی مؤثر لیکن خوشگوار تنقید کے تیروں کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ کبھی حکومت کی پالیسیوں کی چھاڑ کی جا رہی ہے، کہیں فرقہ وار جھگڑوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی غلط اندیشیوں کا خاکہ اڑایا جا رہا ہے، آج معاشرت کی خرابیوں پر طنز کی توپیں دنادن گولے برسا رہی ہیں تو کل کسی بنے ہوئے پیر اور رنگے سیار کے دامنِ ریا کو چاک چاک کر کے اوہام پرست عوام کی آنکھیں کھولی جا رہی ہیں۔ کبھی دین کے نام نہاد علم برداروں کے گنبدِ دستار کو چھلنی کیا جا رہا ہے اور کبھی برخود غلط اور جاہل شاعروں اور ادیبوں کو رگڑے دیے جا رہے ہیں۔ غرض اردو اخباروں کے پڑھنے والوں پر اس کالم سے ایک دہشت سی طاری رہتی تھی۔ لیکن یاد رہے

کہ یہ دہشت "خطرے" کی دہشت نہ تھی بلکہ اس کو ایک سنسنی کہنا چاہیے جس کا انتظار ہر پڑھنے والے کو رہتا تھا اور اس کالم میں جن افراد و جماعات کے خلاف زور آزمائیاں کی جاتی تھیں، وہ خود بھی اس کے بے کینہ اور مخلصانہ کچوکوں سے لطف اٹھاتے تھے، کیونکہ اس کا مقصد توہین نہ تھا بلکہ ہلکی سی تضحیک، اور خندہ آوری مقصود تھی جس میں اس کے شکار بھی نہایت شاطرانہ سپرٹ سے شریک ہو جاتے تھے۔

اس زمانے میں زمیندار کے "افکار و حوادث" کا طوطی بولتا تھا اور روزناموں بلکہ بعض ہفتہ واروں میں بھی اس کی نقل و تقلید کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن کہیں بھی بات نہ بنتی تھی اور جن لوگوں کو "افکار و حوادث" کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار اسی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ انہی دنوں کلکتہ سے ایک روزنامہ "نئی دنیا" کے نام سے جاری ہوا جس میں ایک صاحب نے "کولمبس" کا نام اختیار کر کے مزاحی کالم لکھنا شروع کیا۔ یہ کالم ابھی چند ہی ہفتے نکلا تھا کہ جا بجا اس کا چرچا ہونے لگا۔ کلکتہ سے لاہور بہت دور تھا اور کلکتے کے اخباروں کے پڑھنے والے پنجاب میں مفقود تھے لیکن اخباروں کے دفتروں میں تبادلہ کے طور پر "نئی دنیا" موصول ہو رہا تھا۔ "کولمبس" کا کالم ہم لوگوں کو بے حد پسند آیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ "کولمبس" کوئی کہنہ مشق، شگفتہ مزاج اور زبان دان انشا پرداز ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب چراغ حسن حسرت کاشمیری ہیں جو بعض اتفاقات کے باعث سالہا سال سے کلکتہ میں مقیم ہیں۔ ایک آدھ ادبی رسالہ جاری کر کے بند کر چکے ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد، نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی اور آقائے موید الاسلام مدیر "حبل المتین" کی صحبت کے فیض یافتہ ہیں۔

۱۹۲۷ء کے اوائل میں جب "انقلاب" جاری ہوا تو "زمیندار" کو نئے عملے کی ضرورت پڑی۔ مولانا ظفر علی خاں کہیں اپنے سیاسی دوروں کے سلسلے میں کلکتہ گئے تو اس دُور افتادۂ وطن چراغ حسن حسرت کو کسی نہ کسی طرح ساتھ لے آئے اور "زمیندار" کے عملۂ ادارت میں شامل کر لیا۔ حسرت کا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر "زمیندار" کی فضا موافق نہ آئی تو واپس کلکتہ چلے جائیں گے لیکن لاہور نے ایسے پاؤں پکڑے کہ پھر یہیں کے ہو رہے۔ زمیندار

بندے ماترم، احسان، شہباز، انصاف اور خدا جانے کس کس اخبار میں اپنے حسنِ انشا کے جوہر دکھاتے رہے۔ جنگِ دوم کے سلسلے میں فوج کے محکمہ رابطۂ عمومی سے وابستہ ہو کر ملایا چلے گئے۔ واپس آ کر "امروز" کی ادارت سنبھالی اور "حرف و حکایت" کے کالم کو باغ و بہار بنایا۔ زندگی کے آخری ایام میں "نوائے وقت" کا یہی کالم لکھتے رہے۔ غرض ادب کی اس نئی ذیلی شاخ یعنی روزناموں کے مزاحی کالم لکھنے میں بہت نام پیدا کیا۔

حسرت کی ان تحریروں کی خصوصیات متعدد ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش سادہ، سلیس اور دلنشیں ہے۔ یوں تو وہ زبانِ اردو کے ایک ایک لفظ اور محاورے کے مزاج داں ہیں لیکن آپ جانتے ہیں، مزاح کے لیے تو بطورِ خاص زبان کی ہندی کی چندی نکال کر لکھنا پڑتا ہے، ورنہ مزاح بالکل بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اس صنف میں حسرت کے کمالاتِ ادب و ظرافت خوب اجاگر ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ صنفِ ادب زیادہ تر وقتی و ہنگامی حیثیت رکھتی ہے اور جو چیز روزانہ صحافت سے متعلق ہوگی، وہ لازماً ہنگامی ہوگی، جس کی رونق چند روز کے بعد ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود اس کالم کے بعض حصے اپنے بدیع انداز اور پاکیزگیٔ زبان کے اعتبار سے یقیناً ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا بصورتِ کتاب محفوظ ہو جانا بے حد ضروری ہے۔ ہمارے بعض پبلشروں کی یہ کوشش قابلِ داد ہے کہ وہ تحریراتِ حسرت کے خلاصے شائع کرنے میں ہمت سے کام لے رہے ہیں۔

روزناموں کے مزاحی کالموں میں حسرت نے جتنا کچھ لکھا ہے۔ اس کی مقدار بلاشبہ ہزاروں صفحات تک پہنچتی ہے۔ ان سب کو پڑھنا اور اسلوبِ حسرت کی بعض خصوصیتوں کو مثالیں دے کر واضح کرنا بے حد مشکل ہے۔ خصوصاً جس حالت میں ان کی تحریرات کتابی صورت میں مدوّن نہ ہوئی ہوں۔ لیکن میں اس مقالہ میں بعض مثالیں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان کی چستی و درستی کے علاوہ ایک خصوصیت حسرت کی یہ ہے کہ اس کی تحریر ہتک اور ناگواری اور تیزی سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ لفظی ہیر پھیر اور تلازم و مناسبات کے اعتبار سے حسرت اپنی بہت کم مثالیں رکھتے ہیں۔ ان کے کالم میں ادبی محاسن اور

لسانی خوبیوں کے علاوہ معلوماتِ علمی وتاریخی بھی جابجا پائی جاتی ہیں۔ جو ان کی وسعتِ مطالعہ اور حُسنِ مذاق کا ثبوت دیتی ہیں۔

لیکن میرے نزدیک حسرتؔ کے کالم کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں تلازم ومناسبات کا خیال اس حد تک رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا لفظ لفظ پر پھڑک اُٹھتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں پتنگ کا ذکر آگیا ہے تو اس کے متعلقات کے تابڑ توڑ تذکرہ سے یوں معلوم ہوتا ہے گویا حسرتؔ عمر بھر پتنگ بازی ہی کے کوچے کی خاک چھانتے رہے ہیں اور اگر کسی سلسلے میں طب و عطاری کا مذکور آگیا تو احساس ہوتا ہے کہ حسرتؔ کی ساری عمر کسی دواخانے میں بسر ہوئی ہے مثلاً ذرا پتنگ بازی کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"پچھلے سال خبر آئی تھی کہ پاکستان کے وزیرِ خزانہ مسٹر غلام محمد کراچی میں پتنگ اڑاتے دیکھے گئے۔ ہمیں اُمید ہو چلی تھی کہ پاکستان میں پتنگ بازی کا فن ضرور ترقی کرے گا۔ لیکن نہ جانے کیا پیچ پڑا کہ مسٹر غلام محمدؐ نے پھر کبھی پتنگ کو ہاتھ نہ لگایا اور کراچی والے "دے ڈھیل" اور "وہ کاٹا" کی صدائیں سننے کو ترس گئے۔

سُنا ہے ایک جمعدار کنکوے باز کے کنکوے کی ڈور کٹ گئی یا کٹنے کو ہے۔ کنکوا کٹ گیا یا کٹ جانے کو ہے۔ لگے سے ڈور کاٹ کر کنکوا اور کنکوے کے ساتھ ڈور لوٹ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ خاص طور پر جب لگا "ڈان" یا بقول شخصے "ڈانگ" کا ہو۔ بہر حال اب کنکوے بازی کا فن لندن ہی میں ترقی کرے تو کرے۔ ہمارے ہاں سے یہ فن اُٹھ گیا۔ اس کے قاعدے اور آداب بھی مٹ

گئے۔ کہاں ملڈورے پیچ لڑانا اور کنکوے کو سیروں ڈور پلاتے چلے جانا اور کہاں لگّے سے کنکوا لوٹنا۔ سچ پوچھیے تو استاد جمّن کے ساتھ کنکوے بازی کا فن بھی ختم ہو گیا اور ہمارے پاس لے دے کے صرف ایک "ڈانگ" کا لگّا رہ گیا۔ اب اس سے کنکوے لُٹتے دیکھیے اور مرحوم جمّن کے ملڈورے پیچوں کو یاد کیجیے۔

اب ذرا طب کا ذکر سُنیے۔ شیخ کرامت علی مرحوم پنجاب کے وزیر تعلیم و صحت تھے۔ ان کے متعلق حسرتؔ لکھتے ہیں :-

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، شیخ صاحب بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ البتہ طب سے انھیں بجز اس کے اور کوئی تعلق نہیں کہ وہ اپنی نرم گفتاری اور خوش اخلاقی کے باعث کبھی کبھی ریشہ خطمی باضافۂ لعاب بہیدانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن طب سے اس قسم کا تعلق سردار شوکت حیات کو بھی ہے جو اپنے اکل کھرے پن کی وجہ سے چرائتہ اور شاہترہ کا خیساندہ بلکہ بالکل جوشاندہ معلوم ہوتے ہیں۔

بہر حال ہماری دعا ہے کہ طب قدیم کے زر کامل عیار کے لیے جو کشتہ ہو چکا ہے، شیخ کرامت علی کی صدارت ماءالحیات ثابت ہو۔ بحمد اللہ کہ شیخ صاحب کو اطبائے کرام سے نہ کوئی سیاسی اختلاف ہے نہ طبی۔ اور طبی اختلاف ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ شیخ صاحب اخلاط اربعہ کے قائل ہیں۔ بلکہ خود مغربی پنجاب کے جسم میں ایک خلط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا اطبّا کا کام ہے کہ وہ صفرا ہیں یا سودا۔ کم از کم

خون تو ہرگز نہیں۔

انہی دنوں کا ذکر ہے، جناب علاّمہ علاؤالدین صدّیقی جو یونیورسٹی میں اسلامیات کے ہیڈ اور صوبے میں فلموں کے سنسر ہیں، کسی فلم کو سندِ پسندیدگی دے بیٹھے۔ اس پر حسرت کی رگِ مزاح پھڑکی اور انہوں نے لکھا:

آپ کو یاد ہوگا، کوئی دو ڈھائی مہینے ہوئے، سول اینڈ ملٹری گزٹ میں "سندری" نام ایک فلم کا اشتہار چھپا۔ جس میں پنجاب مسلم لیگ کے سابق جنرل سکرٹری اور خان ممدوٹ کے اکھاڑے کے مشہور پہلوان علاّمہ علاؤالدین صدّیقی کی سند بھی موجود تھی۔ ہم نے تو یہ اشتہار پڑھتے ہی کہ دیا تھا کہ لیجیے، فلم نے علم کا بانا سر کر دیا اور علاّمہ علاؤالدین فلاّمہ علاؤالدین بن کر رہ گئے۔ لیکن اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ آسان سی بات نہ آئی کہ جب علم میں فلم کا پیوند لگے تو علاّمہ مظلوم ہو کر فلاّمہ بن جاتا ہے ؎

فلم ازیں بسیار کرداست و کند
لیڈراں را خوار کرداست و کند

کبھی کبھی حسرت کے مزاحی کالم میں نثر کے ساتھ ساتھ گیت بھی نظر آجایا کرتے تھے۔ لکھتے لکھتے طبع رواں زور پہ جو آئی تو "اتحاد پارٹی" کی شان میں چند ٹپے لکھ دیے، جو مدت تک لوگوں کی زبانوں پر رواں رہے۔

تیرے گورے گورے گال اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال اتحاد پارٹی
تیرا یار نریندر ناتھ اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ اتحاد پارٹی وغیرہ

جب میاں ممتاز دولتانہ اور میاں عبدالباری یکے بعد دیگرے صوبہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے تو حسرت نے بہت مزے کا کالم لکھا جس میں یہ گیت بھی شامل تھا:

چنا جور گرم

میرا چنا ہے سب سے نیارا | جس کو کھائے عالم سارا
منشی، متصدی، پٹواری | جُمّا، فتّا، عبدالباری

چنا جور گرم

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا | اس کو کھائے قسمت والا
اس کے گاہک طرّے والے | یعنی ہپ ہپ ہُرّے والے
سارے مہاجر اور انصاری | چیمہ، لڈّن، عبدالباری

چنا جور گرم

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حسرت کے مزاحی کالم کے اقتباسات نہیں دیے جا سکتے، اس لیے کہ ان کی مقدار بے اندازہ ہے اور ان میں اچھے ٹکڑے اتنے زیادہ ہیں کہ قوتِ انتخاب مجروح ہے۔ ان سے لطف اندوز ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُن کو پڑھیے اور اُن کے شانِ نزول کا تصور سامنے رکھ کر پڑھیے۔

عبدالمجید سالک

لاہور
۲۰ رجون ۱۹۵۶ء

سنة ١٩٤٧

۷ مارچ

ایک زمانے میں جب کشمیر بھر میں شیخ عبداللہ کی دینداری کی شہرت تھی کشمیری عورتیں اکثر یہ گیت گایا کرتی تھیں :

محمد عبداللہ شین کھورت پر ونئے   دینچ رز پیٹھ نو ننئے دراو

(یعنی شیخ محمد عبداللہ جو برف سے زیادہ سپید ہیں دین کی رسّی پر ننگے پاؤں ہی چل پڑے)

آپ سوچتے ہوں گے کہ دین کا راستہ کہتے تو ٹھیک تھا، دین کی رسّی کیسی لیکن اصل میں دین کو رسّی سے اس لئے تشبیہہ دی گئی ہے کہ جس طرح رسّی پہ چلنا بڑا مشکل کام ہے اسی طرح دین کے راستے میں قدم رکھنا بھی بہت مشکل ہے۔

خدا جانے کشمیری عورتیں اب بھی یہ گیت گاتی ہیں یا نہیں۔ بہر حال ہمارے خیال میں انہیں آجکل

یہ گیت ضرور گانا چاہئے۔ کیونکہ شیخ صاحب پچھلے دنوں "دین کی رسی" پر چلتے چلتے سری نگر سے دلی اور دلی سے نیو یارک جا پہنچے تھے اور اب وزیرِ اعظم بن کے گھر واپس آ رہے ہیں اگرچہ وہ ہوائی جہاز پر گئے اور ہوائی جہاز پر آئے۔ لیکن کشمیر کے لوگوں کو یہی کہنا چاہئے کہ انہوں نے یہ سفر "دین کی رسی" ہی پر طے کیا ہے۔

راقم الحروف شیخ صاحب کا پُرانا نیاز مند ہے۔ یعنی پہلی مرتبہ جب ان سے ملاقات ہوئی، وہ ابھی پوری طرح "شیرِ کشمیر" بھی بننے نہیں پائے تھے۔ ان دنوں ان پر مذہب کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں اور مسلمانوں کی مصیبتوں کا ذکر ان کی زبان پر ہوتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ یہ نشہ کم ہوتا گیا اور اب تو وہ بالکل اللہ کے فضل سے وزیرِ اعظم ہیں۔ "دین کی رسی" پر نہ چلیں تو کوئی ان کا کیا کر لے گا؟

شیخ صاحب نے جیل سے رہا ہونے کے بعد کہا تھا کہ پہلے ذمہ دار حکومت مل جائے پھر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے یا ہندوستان میں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے ذمہ دار حکومت ملنے سے پہلے ہی ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ نہ کرتے تو "ذمہ دار حکومت" کیسے ملتی؟

لیکن کشمیر کی یہ ذمہ دار حکومت عجیب ہے کہ شیخ محمد عبداللہ وزیرِ اعظم ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک دیوان کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ یعنی یہ "ذمہ دار حکومت" تو ہے۔ لیکن ذرا "دیوانی قسم" کی ذمہ دار حکومت ہے۔ دیوان کی گنجائش غالباً اسی لئے رکھی گئی ہے کہ لالہ مہر چند مہاجن برابر چپکے رہیں اور مہاجن کو اس لئے رکھا گیا ہے کہ "لیکھا جو کھا" برابر رہے۔ لیکن مہر چند مہاجن اور شیخ محمد عبداللہ کی میزان پٹتی نظر نہیں آتی۔

کشمیر کے سلسلے میں حکومتِ ہند کا "وہائٹ پیپر" جسے "اعمال نامہ" کہنا زیادہ موزوں

ہوگا، بڑی دلچسپ چیز ہے۔ کہنے کو تو یہ "وہائٹ پیپر" ہے لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے خاندان کے تذکرے کی وجہ سے ذرا کالا ہو گیا ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان کی حکومت کو اس بات کا احساس نہیں ہوا۔

کیا اچھا ہوتا کہ حکومت ہند اس "وہایٹ پیپر" میں یہ بھی بتا دیتی کہ ڈوگروں کے عہد میں کشمیر کے اندر کتنی مرتبہ قحط کی آفت آئی۔ سیلاب اور آتشزدگی سے کتنی جانیں ضائع ہوئیں اور کتنی بار کشمیریوں کو ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ "وہایٹ پیپر" کو کالا ہی کرنا تھا تو پوری طرح کالا کر دیا ہوتا۔ اب تو اس وہایٹ پیپر کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہند سرکار" نے باورچی خانے میں سپیدی کرانے کی کوشش کی ہے۔

۱۳ر جولائی

لاہور کے ایک شیر فروش پر جو دودھ میں پانی ملا کے بیچا کرتا تھا، چار سو روپے جرمانہ ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیر فروش اناڑی تھا ورنہ دودھ میں پانی ملا کے بیچنے کے بجائے پانی میں دودھ ملا کے بیچتا۔ کوئی مہاجر ہو گا جسے کسی ہندو حلوائی کی دکان الاٹ ہو گئی اور اس نے دودھ میں پانی ملا ملا کے بیچنا شروع کر دیا۔ لالہ گھاسی رام حلوائی کے نسخے پر عمل کرتا یعنی پانی میں دودھ ملا کے بیچتا تو یہ فضیحتہ کاہے کو ہوتا۔

دراصل الاٹمنٹ کی بے قاعدگیوں کی وجہ سے اس قسم کے تماشے اکثر نظر آتے ہیں جس بزاز کو بنیئے کی دکان الاٹ ہو گئی ہے وہ بیچارہ ہلدی کی گرہ کو گز سے ناپ کے بیچے یا جو بنیا بزاز بن بیٹھا ہے وہ کپڑے کو تول کے فروخت کرے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ جس پیشے میں عمر گزری ہے وہ اتنی آسانی سے تو نہیں چھوٹ سکتا۔

پچھلے دنوں پولیس کے ایک کنسٹیبل اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک سب انسپکٹر نے ایک طالب علم کو پیٹ ڈالا تھا۔ اس پر لوگ بہت برافروختہ ہوئے اور خان ممدوٹ کے ہاں وفد لے کے پہنچے۔ لیکن اس ساری دوا دوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضروب کے ہتھکڑی لگ گئی۔ چنانچہ وہ ان دنوں ہسپتال میں پڑا ہے اور پولیس کے فرشتگانِ عذاب اس کے سر پر مسلط ہیں۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے اعلان کیا ہے کہ ۱۶ جولائی کو اس واقعہ کے سلسلے میں یومِ احتجاج منایا جائے گا۔ خدا جانے ان لوگوں کو کس نے مشورہ دیا ہے کہ لوگوں کے پھٹے میں ٹانگ اڑائیں اور خواہی نخواہی پولیس والوں کے منہ آئیں۔ اخباروں نے اتنے دن پولیس کے خلاف مضامین لکھ کے اس کا کیا بگاڑ لیا جو آپ بگاڑ لیں گے؟

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن والے تو خان ممدوٹ کے مقرّبین میں ہیں۔ ہم نہ خان میں نہ خان کے اونٹوں میں۔ تاہم اتنا بتائے دیتے ہیں کہ آپ یومِ احتجاج چھوڑ، ماہِ احتجاج بلکہ سالِ احتجاج منایئے کوئی اثر نہیں ہوگا۔ پولیس جو چاہے گی کرے گی۔ آخر صوبے کا انتظام پولیس کو کرنا ہے یا آپ کو اور ہم کو۔ وزارت پولیس والوں کی بات مانے گی یا ایسے لوگوں کی جو کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان —— ایک الکشن گزر چکا اور دوسرے میں ابھی خاصی مدت پڑی ہے۔

ایم۔ ایل۔ اے اکڑ رہا ہے کیونکہ وزارت کی عمارت اس کے ووٹ کے سہارے کھڑی ہے۔ پولیس والا اکڑ رہا ہے کیونکہ صوبے کے انتظام کا انحصار اسی پر ہے۔ تانگے والا اکڑ رہا ہے کیونکہ کئی کنسٹیبلوں سے اس کی جان پہچان ہے۔ بائیں ہاتھ چلنا اس کے لئے ضروری نہیں۔ وہ دہنے ہاتھ چلے گا۔ سڑک کے بیچوں بیچ گھوڑا سرپٹ

دوڑائے گا۔ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر لیجئے۔ دودھ دہی والے کی بھینس پھیلتی ہوئی سڑک کے وسط تک پہنچ گئی ہیں تو آپ اعتراض کرنے والے کون۔ وہ چاہے تو ساری سڑک روک کے کسی کو ادھر سے گزرنے ہی نہ دے۔ آپ کو معلوم نہیں اس کا ماموں ——— خیر اس قصے کو بھی جانے دیجئے۔ کہیں ہم اور آپ سیفٹی ایکٹ کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔

سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر ڈاکٹر ضیاء الاسلام صاحب کو چار دن کی چاندنی پر اتنا غرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اور آپ کہاں اور پولیس کہاں؟ پولیس لوگوں کو پیٹتی ہے تو یہ اس کے فرائض میں داخل ہے۔ اور اب تو احتساب کا کام بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ اسے معلوم ہے کون کون لوگ روزہ رکھتے ہیں، کون کون نہیں رکھتے؟ پانچویں کالم والے کون کون ہیں؟ کمیونسٹوں اور کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھنے والوں کی فہرست میں کن کن کو شامل کرنا چاہیئے۔ ڈر ہے کہ کسی ایسی ویسی فہرست میں آپ کا نام بھی درج نہ کر دیا جائے۔

نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ پولیس والوں کی اصطلاحیں ہیں جو بہت عام ہو چکی ہیں معمولی بدمعاشوں کا نام نمبر ۹ میں درج ہوتا ہے۔ جو لوگ زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں ان کے نام نمبر ۱۰ کے رجسٹر میں درج کئے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اب پولیس کو چاہیئے رجسٹر نمبر ۵ کو پانچویں کالم کے لئے وقف کر دے۔ یعنی جو لوگ پولیس کی حرکات کے خلاف احتجاج کریں انہیں "پانچواں کالم" کہہ کے فوراً رجسٹر نمبر ۵ میں ان کے نام درج کر لئے جائیں۔ اس رجسٹر میں مغربی پنجاب کی نصف آبادی کے نام تو درج ہو سکتے ہیں۔

۲۶ر جولائی

آج کل لوگوں کے سامنے جو اہم مسائل ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ

مغربی پنجاب میں "پلراج" ہے یا "ملراج" یعنی پولیس کا راج ہے یا ایم۔ایل۔اے حضرات کا۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن والے کہتے ہیں کہ پولیس راج ہے کیونکہ پچھلے دنوں پولیس والوں نے ایک طالب علم کو پیٹ ڈالا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایم۔ایل۔اے راج ہے کیونکہ ایک ایم۔ایل۔اے کے ہاتھوں ایک سرکاری عہدے دار کی کندی ہو چکی ہے اور ایک سرکاری عہدہ دار پر کیا موقوف ہے، ع

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار

مثل مشہور ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پولیس کے ہاتھ میں تو ہمیشہ ڈنڈا رہا ہے، ایم۔ایل۔اے حضرات کے ہاتھ میں صرف ووٹ تھا لیکن اس زمانے میں ووٹ بھی ڈنڈا بن گیا ہے۔ یعنی یہ دونوں ڈنڈے والے ہیں اور حکومت صرف بھینس بن کے رہ گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے ڈنڈے کے زور سے اسے جدھر چاہے ہنکالے جائے چاہے کانجی ہاؤس پہنچا دے۔ ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟

ہم اور آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ بین بجاتے رہیں یعنی کبھی یہ کہہ دیں کہ اے صاحب عوام کے حقوق کا بھی کچھ خیال کیجئے۔ دیکھئے فلاں الاٹمنٹ ناجائز ہے، فلاں شخص نے مقامی مہاجر بن کے اتنی دکانوں اور مکانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہم بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں اور بھینس موسیقی کا ذوق نہیں رکھتی ہے۔ وہ ذرا کان کھڑے کرتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بھیرویں اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ اب کان کھڑے کر کے داد دے رہی ہے۔ حالانکہ کان کھڑے کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ مکھیاں اسے تنگ کر کے الاٹمنٹ میں اپنا حصہ مانگ رہی ہیں۔

ہمارا دل گردہ دیکھئے کہ ہم بین بجاتے بجاتے اکتائے نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ بین وہیں پٹک کے سیدھے اپنے گھر چلے آئے ہوں، بلکہ یہ سوچ کے بین بجائے جا رہے ہیں کہ

کیا عجب ہے کہ ہماری محنت پروان چڑھے یعنی بھینس بین سنتے سنتے کن رس ہو جائے۔

اصل میں تو یہ بحث ہی فضول ہے کہ مغربی پنجاب میں کس کا راج ہے۔ پولیس کا یا ایم۔ ایل۔ اے حضرات کا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ راج کسی کا بھی ہو کم از کم ہمارا آپ کا راج نہیں۔ عوام کے لئے تو یہی کافی ہے کہ دیکھتے جائیں اور یہ شعر پڑھ کے چپ ہو رہیں ؎

محفل ان کی ساقی ان کا آنکھیں میری باقی ان کا

۹ر دسمبر

مولانا عبدالمجید سالک کی سلور جوبلی کے تذکرہ میں ہمارے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ لاہور میں بہت سے کوچوان ایسے نکل آئیں گے جو پچیس سال سے تانگہ چلا رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس موقع پر تخصیص کے ساتھ کوچوانوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ دوسرے پیشوں میں بھی ایسے لوگ ہوئے ہیں جو تیس تیس چالیس چالیس سال سے لشٹم پشٹم اپنا کام کئے جا رہے ہیں لیکن کسی کو ان کی سلور جوبلی منانے کا خیال نہیں آیا۔ دور کیوں جائیے، ادب اور شاعری ہی کو لیجئے۔ بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو تیس پینتیس برس سے استخواں بندی کر رہے ہیں لیکن نہ کبھی ان کے قلم سے کوئی بامزہ شعر نکلا۔ نہ کوئی ایسا مضمون لکھنے کی توفیق ہوئی جسے کوئی نمایاں حیثیت حاصل ہوتی۔ بھلا انہیں سالک سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ؎

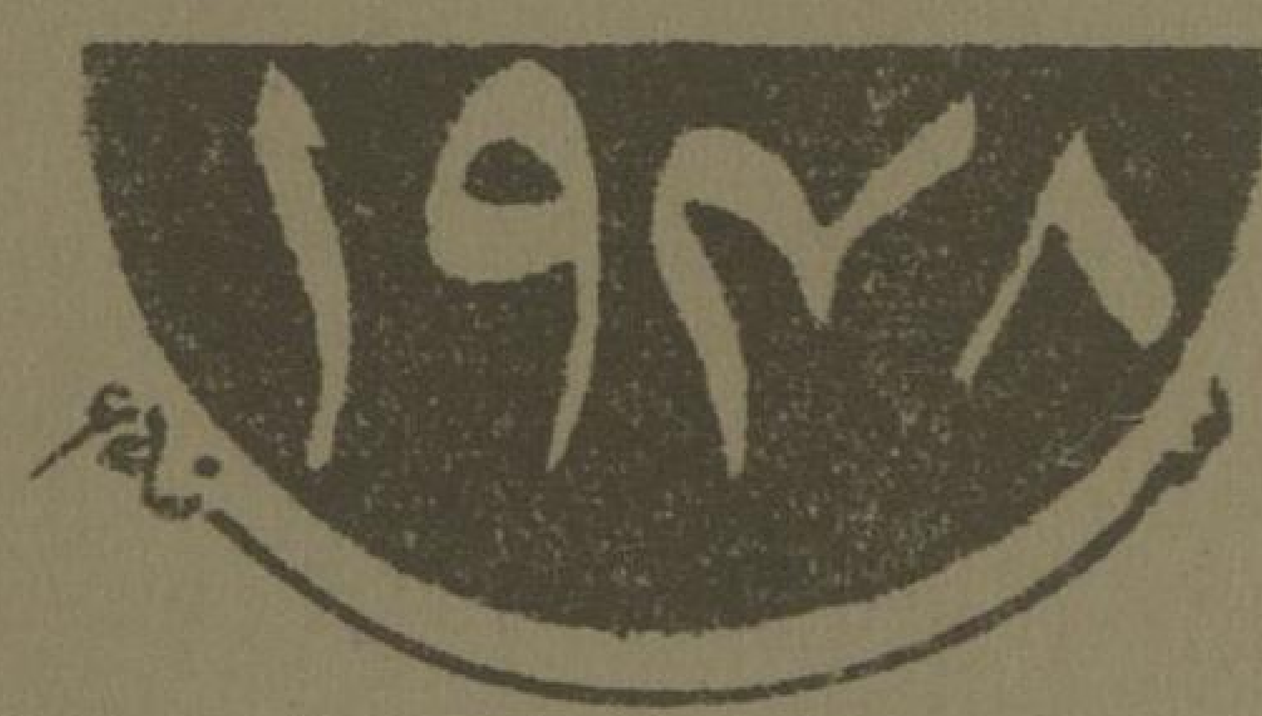
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

ہمارے معاصر کو سالک صاحب کی سلور جوبلی کا ذکر سن کے خیال آیا ہو گا کہ سالک بچارا کہیں کا خان ممدوٹ بھی تو نہیں بلکہ مزا اخبار نویس ہے۔ اس کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے

تو استاد گاماں جسے تانگہ چلاتے چھتیس برس ہو چکے ہیں، اس عزت سے کیوں محروم رہ جائے؛ لیکن ہمارے معاصر کو غالباً معلوم نہیں کہ سالک صاحب کی سلور جوبلی تانگہ یونین کی جانب سے نہیں بلکہ ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی جانب سے منائی جا رہی ہے۔ تانگہ یونین والے اگر استاد گاماں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھوڑے کی سلور جوبلی بھی منانا چاہیں تو ہم اعتراض کرنے والے کون؟ اسی طرح استاد گاماں، خلیفہ نتھو وران کے حامیوں کو اخبار نویسوں پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہمیں کیا معلوم کہ خلیفہ نتھو کی سلور جوبلی آج تک کیوں نہیں منائی گئی اور استاد گاماں اس سعادت سے کیوں محروم رہ گیا ؎

ہماری ہم سے پوچھو کوہ کن کی کوہ کن جانے

باقی رہا یہ خیال کہ سالک صاحب نہ کہیں کے شاہ و شہریار، نہ جاگیردار، نہ وزیر اعظم۔ پھر ان کی سلور جوبلی منانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو یہ بھی بے معنی سی بات ہے۔ بادشاہوں اور نوابوں کی جوبلیاں تو ہر حالت میں منائی جاتی ہیں۔ چاہے بادشاہ سلامت یا نواب صاحب قبلہ ساری عمر بھاڑ ہی جھونکتے رہے ہوں۔ لیکن شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں وغیرہ میں انہی لوگوں کو اس قسم کی عزت کا مستحق سمجھا جاتا ہے جو کوئی نمایاں حیثیت رکھتے ہوں۔ ورنہ ایسے شاعر اور اخبار نویس بہت ہیں جنہوں نے ساری عمر شاعری اور اخبار نویسی کی لیکن نہ شعر کہنا آیا نہ اخبار نویسی کا سلیقہ نصیب ہوا یعنی گوسالۂ ما پیر شد و گاؤ نہ شد۔ سلور جوبلی اتنی سستی ہو جائے تو ہم اور آپ سارا کام کاج چھوڑ کے بیٹھ جائیں اور شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کی سلور جوبلیاں ہی مناتے رہیں۔


١٩٤٨

۸ر جنوری

ملک راحت علی صاحب (پشاور) لکھتے ہیں :

"عمر خیام کی ایک رباعی ہے جس کے قوافی کچھ عجیب سے ہیں ؎

ہر چند ز دستِ دہر غم کش باشی
وز جور و جفائے چرخ ناخوش باشی

زنہار ز دستِ ناکساں آبِ زلال
برلب مچکاں اگر در آتش باشی!

پہلے مصرع میں غم کش کا کَ مفتوح ہے۔ تو کیا ہم اس کی رعایت سے ناخوش کے حرف خَ اور آتش کے حرف تَ کو بھی جو دراصل مضموم اور مکسور ہیں، مفتوح ہی پڑھیں گے؟ اگر واقعی قافیوں میں اس حد تک تصرف جائز ہے تو اس کے جواز میں کوئی سند عنایت فرمائیے۔"

اس کے جواز میں عرض ہے کہ شعراء نے آتش کی تؔ کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح باندھا ہے اور خوؔش اور خوؔد کو تو اکثر ایرانی خَش اور خَد پڑھتے ہیں اور اشعار میں بھی اسی طرح باندھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک زاد
کہ رحمت بر آں تربت پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

دوسرا شعر فردوسی کا ہے جس میں کشؔ اور خوؔش کو ہم قافیہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن خود سعدی کے ہاں اس قسم کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ؎

زناں شوخ و فرماں دہ و سرکش اند
ولیکن بہ بیدم کہ در برخوش اند

پچھلے دنوں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ بعض شعراء عیؔن کو حرفِ علّت سمجھ کے گرا دیتے ہیں اور اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر اور حکیم تاثیر کے علاوہ دو تین اور بزرگوں کے کلام سے بھی مثالیں پیش کی تھیں۔ ڈاکٹر تاثیر کے جس مصرع میں یہ غلطی نظر آتی ہے وہ انہوں نے ارتجالاً ارشاد فرمایا تھا۔ اس لئے انہیں ایک حد تک معذور سمجھنا چاہیئے۔ حکیم تاثیر صاحب نے سوچا کہ ایلوپیتھی میں عیؔن کا سقوط جائز ہے تو اسے طبِ یونانی میں کیوں نہ رواج دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ہوالشافی، کہہ کے نسخہ لکھا اور ڈاکٹر تاثیر کی پیروی میں عیؔن کو ساقط الوزن قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ سارا معاملہ غلط فہمی پر مبنی تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر تاثیر ڈاکٹر ضرور ہیں۔ لیکن ایلوپیتھی یا ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر نہیں۔

ملک راحت علی خان نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے راقم الحروف کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ "سقوطِ عین کی غلطی آپ سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ ماہنامہ 'نئی صدی' دہلی کے تازہ پرچہ میں آپ کا یہ شعر درج ہے جس میں یہی غلطی موجود ہے ؎

ایک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا دل نہ دیا ہوتا یا غم نہ دیا ہوتا

شعر تو واقعی راقم الحروف کا ہے۔ لیکن غلطی میری نہیں۔ جن صاحب نے یہ شعر نقل کیا ہے ان کی ہے۔ یا اگر وہ غلطی کا بار اٹھانا نہ چاہیں تو یہ غلطی بھی رسالہ کے کاتب کے سر تھوپ دیجئے۔ بہرحال راقم نے پہلے مصرع میں "اک" لکھا تھا۔ ان بزرگوں نے اسے "ایک" بنا کے عین کو وزن سے ساقط کر دیا۔

راحت علی خان نے ایک اور سوال کیا ہے:

"ازراہِ کرم یہ بھی بتا دیجئے کہ تاریخ گوئی کے فن کی رُو سے نون غُنّہ کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اسے اڑا دیا جاتا ہے یا اس کے اعداد بھی نون کے اعداد کے برابر شمار کئے جاتے ہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ نون چاہے کسی قسم کا ہو اس کے عدد پچاس ہی ہوں گے لیکن ملک فیروز خان نون اس سے مستثنٰے ہیں۔ ان کے عدد گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۸ ہیں۔ کسی کا بیان ہے کہ بارہ یا چودہ ہیں اور ہم نے تو بعض ثقہ راویوں کی زبانی یہ بھی سُنا ہے کہ ان کے اصل عدد تو چالیس ہیں لیکن اس میں دولتانہ کے نون کے اعداد بھی شامل ہیں۔ بہرحال یہ بات ۲۶ جنوری کو معلوم ہو گی کہ نون کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ممکن ہے دولتانہ صاحب "اعلانِ نون" پر زور دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نون کو ساقط الوزن قرار دیا جائے۔

---

۱۰ جنوری

معلوم ہوا ہے کہ حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ کے عرس کے موقع پر پنجابی کا ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔ عرسوں پر پہلے طوائفوں کے مجرے ہوتے تھے، قوالی ہوتی تھی۔ قوالی تو اب بھی

ہوتی ہے لیکن مجرا غائب ہوگیا اور اس کی جگہ مشاعرہ نے لے لی۔ اُردو زبان کے شعراء کو اس واقعہ سے بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا نے چاہا تو اگلے سال ان کی باری بھی ضرور آئے گی۔

اور یہ بات کچھ اولیائے کرام کے عرسوں ہی پر موقوف نہیں مشاعرہ کچھ اس طرح ہماری زندگی کا جزو بنتا چلا جاتا ہے کہ کوئی تقریب ہو مشاعرہ کے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ کوئی جلسہ ہو یا میلہ، غمی کی تقریب ہو یا شادی کی مشاعرہ بغل میں جزدان دبائے مفاعیلن فعولن کا پشتارہ اٹھائے موجود ہے۔

سرسکندر حیات خان مرحوم کے دورِ وزارت میں تو کبھی کبھی ایک غیر طرحی سا مشاعرہ ہو جایا کرتا تھا اور مشاعرہ نہیں ہوتا تھا تو بیت بازی ضرور ہوتی تھی جو مشاعرہ ہی کی ایک صورت ہے لیکن اس دور میں یہ رسم بھی ختم ہوگئی۔ اب نہ لیگ میں مشاعرہ ہوتا ہے نہ اسمبلی میں حتیٰ کہ گالیاں بھی نثر میں دی جاتی ہیں۔ مشاعرے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اسمبلی، لیگ بلکہ دستور ساز اسمبلی میں بھی مشاعرے کو رواج دیا جائے۔

شاعر تو دراصل اس وقت گھبراتا ہے جب زمین سنگلاخ ہو۔ یعنی قافیے کم ہوں یا ردیف اور قافیہ میں تعلق پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ یہاں تو خدا کے فضل سے قافیہ تنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممدوٹ ذرا اس قسم کا لفظ ہے جسے سُن کے خیال ہوتا ہے کہ کہیں قافیہ جواب نہ دے جائے۔ لیکن ذرا غور کیجیے تو کئی بولتے ہوئے قافیے ذہن میں آجاتے ہیں جن سے ممدوٹ کی مشہورِ زمانہ خاموشی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ مثلاً چوٹ، کوٹ، ووٹ، پھوٹ، لوٹ، فوٹ، سکوٹ، کھلوٹ، لنگوٹ وغیرہ۔ اور دولتانہ تو قافیوں کا خزانہ ہے" دولتانہ ہوا اور روانہ ہوا" کی زمین میں غزل کہیئے یا نظم۔ ایسے ایسے قافیے ذہن میں آئیں گے کہ بس کیا کہئے یہی حال دوسرے بزرگوں کا ہے۔

ہم نے زندگی میں بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔ مشاعروں میں شریک ہوئے۔ سیاسی اور غیر سیاسی پہلوانوں کے دنگل بھی دیکھے۔ اب یہ آرزو ہے کہ جیتے جی لیگ، اسمبلی بلکہ دستور ساز اسمبلی کو منظوم بھی دیکھ لیں۔ یعنی قرار داد نظم میں ہو، تائید نظم میں، تقریریں نظم میں۔ اگر کوئی چوٹ کرنے کو جی چاہے تو اسے بھی نظم کر لیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ شاعری اور اس کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی ترقی ہوگی بلکہ سیاسیات میں جو بے تکا پن آ چلا ہے وہ بھی نہیں رہے گا۔ اگر لیگ کے اجلاس میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تو کرسی کا جواب کرسی سے نہ دیا جاتا بلکہ لوگ کرسی کا قافیہ تلاش کرتے رہ جاتے اور پُرسی یا کس مپرسی کے سوا کوئی قافیہ نہ سوجھتا۔

۱۳ر فروری

سُنا ہے پھولکیاں یونین میں ان دنوں پگڑی اور گاندھی ٹوپی میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ پہلے معرکہ میں پگڑی ہی کو فتح ہوئی ہے اور بچاری نازک اندام گاندھی ٹوپی ریاستی پگڑی کے پیچ میں پھنس کے رہ گئی ہے۔ اب پنڈت نہرو اسے اس مصیبت سے نکالیں تو نکالیں ورنہ اس کا حال بے حال نظر آتا ہے۔

پھولکیاں یونین مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کی یونین ہے اور مہاراجہ پٹیالہ اس کے راج پر مکھ ہیں جن کے متعلق میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎

کھلا نشے میں جو پگڑی کا اس کی پیچ اے میر
سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

پچھلے دنوں مہاراجہ نے حکم دیا کہ وکلاء عدالتوں میں پگڑیاں باندھ کے آئیں۔ بعض کانگریسی وکیلوں نے سوچا کہ گاندھی ٹوپی یقیناً اس حکم سے مستثنیٰ ہوگی۔ چنانچہ گاندھی ٹوپی پہن کے عدالت میں جا پہنچے۔ اہلمد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ ریڈر مسکرایا، اہلِ مقدمہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ آخر جج نے للکارا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ ٹوپی اتار کے پگڑی باندھو اور وکیلوں کی صورت

بنا کے عدالت میں آؤ۔ وہ تو شکر ہے کہ اسی پر بات ٹل گئی ورنہ کہیں عدالت کا پیادہ گردنی دے کے نکال دیتا تو کیا عزت رہ جاتی؟

کانگریسی وکلاء کہتے ہیں کہ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم گاندھی ٹوپی پہنتے ہیں تو ہم پر یہ قدغن کیوں؟ پھر یہ ڈر بھی ہے کہ ٹوپی اتار کے پگڑی کو سر چڑھایا تو کہیں مت ہی نہ ماری جائے۔ سارے قانونی دلائل پگڑی کے پیچوں میں ہی اُلجھ کے نہ رہ جائیں۔ اُدھر ریاستی حکّام یہ کہہ رہے ہیں کہ پٹیالہ پھولکیاں یونین میں شامل ہو گیا اور پھولکیاں یونین ہندوستان میں شامل ہو گئی تو فرق کیا پڑا۔ پٹیالہ آخر پٹیالہ ہے۔ دلّی نہیں کہ سر پہ ٹوپی رکھی اور جہاں جا ہا چلے گئے۔ وکالت کرنا ہے تو ململ خریدو، رنگریز سے رنگواؤ، پھر پگڑی باندھنا سیکھو۔ صورت پر ٹخ ٹخ وکالت کا نور نہ برسنے لگے تو ہمارا ذمہ۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے زمانے میں ٹوپی کا تو رواج ہی نہیں تھا۔ سب لوگ پگڑیاں ہی باندھتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرکاری عہدہ داروں کے لئے ڈاڑھی رکھنا بھی ضروری تھا۔ جس کی ڈاڑھی جتنی لمبی ہوتی تھی وہ اتنا ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ گویا ڈاڑھیوں کو ناپ کے عزت تقسیم کی جاتی تھی۔ کوئی عجب نہیں کہ آگے چل کے وکالت کے امتحان میں پگڑی کے ساتھ ساتھ ڈاڑھی بھی "لازمی مضمون" قرار پائے۔ یعنی مشرقی پنجاب کی یونیورسٹی میں ایل۔ایل۔بی کا امتحان ہو تو ممتحن اپنے سامنے طالب علم سے پگڑی بندھوا کے دیکھے۔ ڈاڑھیوں کا طول ناپا جائے اور اس سلسلے میں اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ داڑھی کہیں مصنوعی تو نہیں۔ پہلے زمانے میں علم کے طول کا اندازہ شملہ کے طول سے لگایا جاتا تھا اسی لئے اگلے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ "شملہ بمقدارِ علم" اب مشرقی پنجاب میں علم کا اندازہ "گنبدِ دستار" کے حجم اور ڈاڑھی کے طول سے لگایا جائے گا اور اہلِ مقدمہ وکیل کی تلاش میں نکلیں گے۔ گز ہاتھ میں لئے ڈاڑھیوں کا طول ناپتے پھریں گے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ مختلف ریاستوں میں پگڑیوں کی بندش کا انداز جداگانہ ہے۔ راجپوتانے کی ریاستوں میں پگڑیوں کی بندش الگ ہے، پٹیالہ میں الگ۔ ڈوگروں کا انداز اور، کشمیری پنڈتوں کا اور۔ راجپوتوں کو لہریا رنگ پسند ہے، ڈوگروں کو کیسری مرغوب۔ مہاراجہ پٹیالہ سے کوئی بعید نہیں کہ پگڑی کے طول، بندش اور رنگ کے متعلق بھی خاص خاص قاعدے مقرر کر دیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پنڈت نہرو گاندھی ٹوپی پر پگڑی کی فضیلت تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن تا بہ کے؟ وہ سکھوں سے دب جانے کے عادی ہیں۔ اس لئے اگر اب کے بھی سر جھکا دیں، بلکہ خود گاندھی ٹوپی اتار کے پگڑی باندھنا شروع کر دیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ اگر یہ ہو گیا تو دلی بھر میں ٹوپیوں کی جگہ پگڑیاں ہی پگڑیاں نظر آئیں گی اور امیر خسرو کا یہ شعر ہر زبان سے سنائی دے گا ؂

اے دہلی والے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

---

۵ مارچ

تین دن ہوئے لاہور کے تانگے والوں نے ہڑتال کر دی تھی اور ہڑتال بھی ایسی مکمل کہ شہر بھر میں مشکل ہی سے کوئی تانگہ نظر آتا تھا۔ جن لوگوں کو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور موٹر کاروں کا سہارا ہے انہیں کیا پروا۔ لیکن جو لوگ ساری عمر تانگوں پر لدے رہے ہیں ان کی جان آفت میں آ گئی۔ یعنی تانگوں کے بجائے ٹانگوں کا سہارا رہ گیا۔

ہمارے ملک میں مکمل ہڑتال شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ لیکن تانگہ یونین بڑی تیز نکلی جہاں کوئی تانگے والا تانگہ چلاتا نظر آیا۔ یار لوگوں نے گھیر کے اس کا منہ کالا کر دیا۔ پرانا قاعدہ تو

یہ ہے کہ منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹا سوار کر دیا جائے۔ لیکن ان لوگوں نے گدھے کا کام تانگے سے لیا۔ یعنی منہ کالا کر کے تانگے پر سوار کر دیا اور وہ بھی اُلٹا نہیں بلکہ سیدھا۔

لاہور میں اب کے ہولی کی دھوم دھام تو کیا نظر آئے گی۔ البتہ تانگے والوں کی ستم ظریفی نے ہولی کے تیوہار سے چند دن پہلے ہولی سے ملتی جلتی ایک تفریح کا سامان مہیا کر دیا۔ ہولی اور ہولانہ سہی "ہلتہ" ہی سہی۔ آخر ہلتہ بھی تو اسی خاندان سے ہے۔ تانگے والوں کے اس تیوہار اور ہولی کے موسمی تیوہار میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ہولی کا کاروبار عبیر و گلال سے چمکتا ہے۔ یہاں توے کی سیاہی اور دیئے کا کاجل کافی ہے اور تارکول اگر ہاتھ آ جائے تو سبحان اللہ! ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔

بات میں بات نکلتی ہے۔ شیدی فولاد خان جو شاہی زمانے میں دلّی کے کوتوال تھے رنگت کے بہت کالے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی شخص کسی جرم میں پکڑا آیا۔ کوتوال صاحب نے فرمایا "اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹا سوار کرو اور سارے شہر میں پھراؤ"۔ مجرم بولا —

"صاحب! اور جو سزا چاہے دے دیجئے، یہ سزا نہ دیجئے"۔

کوتوال صاحب نے پوچھا "یہ کیوں؟"

جواب ملا "لوگ سمجھیں گے کہ کوتوال صاحب گدھے پر سوار ہو کے شہر کی سیر کر رہے ہیں"۔

گفتگو تانگے والوں سے چلی تھی اور کوتوال کا ذکر یونہی بیچ میں آ گیا۔ حالانکہ جب سے تانگہ اور تانگے والے ایجاد ہوئے ہیں پولیس والوں سے ان کی لاگ ڈانٹ چلی آتی ہے۔ چنانچہ تانگے والوں کی۔ اس ہڑتال کا رُخ بھی اصل میں پولیس ہی کی طرف تھا۔ لیکن آپ کو غالباً یہ بات معلوم نہیں کہ تانگے والے اور پولیس کے اس جھگڑے میں سب سے زیادہ گھوڑا مظلوم ہے۔

پولیس والا تانگے والے پر غصہ نکالتا ہے۔ تانگے والے کا بس نہیں چلتا تو وہ گھوڑے پر برس پڑتا ہے۔ لاہور کے تانگے والے گھوڑے کو جیسی گالیاں دیتے ہیں وہ تو آپ نے اکثر سُنی ہوں گی لیکن بے چارا گھوڑا کس پر غصہ نکالے۔ بہت ہُوا تو موقع دیکھ کے اَڑ گئے، زمین پر زور زور سے ٹاپیں مارنا شروع کر دیں، دولتیاں جھاڑیں۔ تاہم تانگے والا بہت جلد اسے ڈھب پر لے آتا ہے۔ آخر صاحب دانے گھاس کا معاملہ ہے۔ گھوڑا تانگے والے سے ہمیشہ کے لئے بگاڑ لے تو کھائے کیا۔

تانگے والا تنخواہ دار ملازم ہے تو اور بات ہے۔ لیکن اگر تانگہ اس کا اپنا ہے تو وہ غلے کی گرانی کا ذکر نہیں کرتا۔ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا دُکھڑا نہیں روتا۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ صاحب دانہ مہنگا ہے، گھاس مہنگی ہے۔ جتنے روپے کماتا ہوں ان میں سے آدھے تو گھوڑے کے دانے گھاس پر اُٹھ جاتے ہیں۔ کل ایک تانگے والے نے حسبِ عادت یہ قصّہ چھیڑا تو میں نے کہا "تم ہمیشہ گھوڑے کے دانے گھاس کا ذکر کرتے ہو، اپنے دانے گھاس کا نام تک نہیں لیتے۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا "جی ہاں ٹھیک ہے لیکن صرف میرے اور میرے گھوڑے کے دانے گھاس پر کیا موقوف ہے۔ سب کو اپنے اپنے دانے گھاس کی فکر ہے۔"

دانہ گھاس کے سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔

مرحوم شیخ چلّی سے کسی نے کہا "آپ اپنے گھوڑے کو کچھ کھانے کو نہیں دیتے؟"

شیخ صاحب نے فرمایا "میں نے دو سیر جَو اور گھاس کا ڈیڑھ گٹھا اس کا روزینہ مقرر کر رکھا ہے۔"

"تو پھر اتنا لاغر کیوں ہے؟"

"بات یہ ہے کہ اس کا مہینہ بھر کا دانہ گھاس میرے ذمے نکلتا ہے۔"

---

۱۰ مارچ

تیموری خاندان کے فرمانرواؤں میں شاہ رُخ مرزا بڑا علم دوست اور خوش ذوق فرمانروا ہو گذرا ہے۔ بعض اربابِ تذکرہ نے لکھا ہے کہ مرزا کے دربار میں دو امیر تھے۔ ایک کا نام ابوالفتح تھا اور دوسرے کا نصراللہ۔ ابوالفتح منصب میں نصراللہ سے زیادہ تھا۔ اس لئے شاہی دربار میں اس کی نشست پہلی صف میں تھی اور نصراللہ کی دوسری صف میں۔ ایک دن امیر نصراللہ کو شوخی سُوجھی تو وہ اپنی نشست چھوڑ کے ابوالفتح کی جگہ پر جا بیٹھا۔

اس جسارت پر تمام اہلِ دربار کو حیرت ہوئی اور معاملہ بادشاہ تک پہنچا۔ شاہ رخ مرزا نے امیر نصراللہ کو اپنے سامنے بلا کے پوچھا "تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

جواب ملا "مجھے امیر ابوالفتح پر تقدّم حاصل ہے۔ کیونکہ قرآن میں آیا ہے "اذا جاء نصراللہ والفتح" یہاں نصراللہ پہلے ہے اور فتح بعد میں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی دلیلِ استحقاق کیا ہوگی؟ الفضل للمتقدم "۔ یہ نکتہ بادشاہ کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ امیر نصراللہ کا منصب بڑھا دیا گیا۔

لائل پور سے خبر آئی ہے کہ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر کا انتخاب اس طرح ہُوا کہ میاں نوراللہ ایک وزیر کا سفارشی خط لے کے ڈپٹی کمشنر لائل پور کے پاس پہنچے اور صاحب بہادر نے فوراً ایک ہدایت نامہ جاری کر دیا کہ بورڈ کے تمام سرکاری ارکان میاں صاحب کے حق میں رائے دیں۔ چنانچہ میاں نوراللہ سرکاری ارکان کی رائے کے برتے پر لائل پور ڈسٹرکٹ بورڈ کے غیر سرکاری صدر مقرر ہو گئے۔

ہمارے خیال میں میاں نوراللہ نے ناحق اتنی تگ و دو کی۔ وہ امیر نصراللہ کی طرح قرآن سے اپنا استحقاق ثابت کر سکتے تھے۔ یعنی کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں آیا ہے:

یریدون ان لطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہٗ ولو کرہ الکفرون۔

آپ لوگ مجھے صدر بنانا نہیں چاہتے تو آپ کی کوششوں سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے خدا صدر بنا چکا ہے۔

بہر حال جن وزیر صاحب نے صدارت کے لئے میاں نوراللہ کی سفارش کی ہے، انہیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے اگر کوئی شخص سفارشی خط لکھنے پر اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجئے کہ صاحب میاں نوراللہ کی صدارت تو قرآن سے ثابت ہے۔ میں ان کی سفارش نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟

میاں نوراللہ کی صدارت کے حق میں یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ نور اور لائل پور ہم قافیہ ہیں۔ اگرچہ یہ نری شاعرانہ دلیل ہے لیکن ہمارے ملک میں جہاں مذہبی اور سیاسی جلسوں سے زیادہ مشاعرے ہوتے ہیں اگر صرف قافیہ کے زور سے میاں نوراللہ کو ڈسٹرکٹ بورڈ کا صدر بنا دیا جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ آخر ایرانی شاعر بھی کہہ گیا ہے کہ ؎

بلبل اگر بقافیۂ گل شود بس است

بہر حال یہ دوسرا "صدری نکتہ" ہے جسے وزیر صاحب، ڈپٹی کمشنر بہادر اور میاں نوراللہ تینوں کو پلّے باندھ لینا چاہیئے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جنہیں صدارت کا شوق نہیں جنون ہے۔ سیاسی جلسہ ہے تو آپ اس کی صدارت کر رہے ہیں، مشاعرہ ہے تو یہاں بھی صدارت کی کرسی پر آپ ہی دھرے ہوئے ہیں ان لوگوں کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انہیں "ذات الصدر" ہو گیا ہے۔ یوں تو ذات الصدر مرض ہے، لیکن اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا پیشہ ہی صدارت نہیں بلکہ ان کی ذات بھی صدر ہے۔ میاں نوراللہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر تو ہو گئے لیکن وہ اگر اس گروہ میں شامل ہونا چاہیں تو ایک آدھ مشاعرے کی صدارت بھی کر ڈالیں۔

---

۱۲ / مارچ

اخباری ٹکسال کے جو سکّے پچھلے برسوں کے اندر ڈھلے ہیں ان میں "خضر لنگ" بھی ہے۔

اس لفظ سے عام طور پر وہ لوگ مراد لئے جاتے ہیں جو سر خضر حیات خان ٹوانہ کے متوسلین کے زمرے میں رہ چکے ہیں اور کچھ عرصے سے تو "خضر لنگ" اچھی خاصی فحش گالی سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں فحش کا پہلو بھی موجود ہے۔

اب خدا جانے جن صاحب نے یہ گالی ایجاد کی ہے انہوں نے اس بات پر غور کر لیا تھا کہ اس لفظ سے کیا کیا معنی نکل سکتے ہیں یا انہوں نے صرف کوئز لنگ کے وزن پر ایک لفظ گھڑ لیا اور یہ نہ سوچا کہ "کوئزلنگ" میں "لنگ" لاحقہ نہیں بلکہ کوئزلنگ تو اسم علم ہے۔ لنگ انگریزی زبان کا ایک لاحقہ بھی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ انہیں اس موقع پر التباس ہوا ہو۔

پچھلے سال سنگاپور میں ایک دعوت کے موقع پر راقم الحروف نے ایک فوجی افسر کو دیکھا جس کی ناک سر خضر حیات خان کی ناک سے بہت ملتی تھی۔ لیکن اہلِ محفل میں سے کوئی انہیں نہیں جانتا تھا۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا "یہ کپتان صاحب کون ہیں؟"

میں نے عرض کیا "میں انہیں جانتا تو نہیں۔ لیکن بڑے "خضرناک" آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

سیاسی گالیوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ ٹوڈی انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے پہلی مرتبہ اُردو میں اسے رائج کیا اور اب اس کا شمار اُردو زبان کے لفظوں میں ہوتا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے ہاں اس لفظ سے ایسے تصورات وابستہ ہیں جو انگریزی میں موجود نہیں۔ "انقلاب" میں مدتوں ان مسلمانوں کو جنہوں نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تھی "نہروانی" لکھا جاتا رہا۔ لیکن یہ لفظ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ یعنی نہرو رپورٹ کے خلاف جو ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ ختم ہوا تو یہ لفظ بھی مٹ گیا۔

پٹھانوں کے اکثر قبیلوں کے ناموں کے ساتھ "زئی" ضرور ہوتا ہے مثلاً یوسف زئی، بارک زئی وغیرہ۔ بعض اخباروں نے "نہروانی" پر "ہندو زئی" کا اضافہ کیا اور اکثر بڑے بڑے لیڈروں کو "ہندو زئی نہروانی" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن نہروانی کی طرح "ہندو زئی" بھی نہ چلا اور جن لوگوں نے یہ اصطلاحیں وضع کی تھیں خود انہوں ہی نے انہیں ترک کر دیا۔

ایک زمانے میں "وہابی" بھی اچھی خاصی گالی تھی۔ صوبہ سرحد کے ایک مولوی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک ہندو دوکاندار گھسیٹا مل سے ناراض ہو گئے تو کہہ دیا کہ گھسیٹا مل "وہابی" ہے اس لئے کوئی شخص اس سے لین دین نہ رکھے گھسیٹا مل کو معلوم ہوا تو مولوی صاحب کے قدموں پر آگرا۔ اب کے جو مولوی صاحب نے وعظ کیا تو اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ گھسیٹا مل نے "وہابیت" سے توبہ کر لی ہے۔

وہابیوں کے معاملہ میں یہ اندازہ تو پرانی بات ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک یہ حال رہا ہے کہ جس شخص کو لوگوں کی نظروں سے گرانا مقصود ہوا اسے قادیانی یا میرزائی کہہ دیا۔ اب وہ بچارا تردید کرتا پھرتا ہے، اخباروں میں مضمون چھپواتا ہے لیکن لوگوں کو یقین نہیں آتا اور الیکشن کے زمانے میں تو لوگ ایسے شوشے چھوڑتے رہتے تھے۔ چنانچہ مغربی پنجاب کے سربرآوردہ مسلمانوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جن پر قادیانی ہونے کا الزام نہ لگ چکا ہو۔

یہ حربے تو پرانے ہو گئے۔ یار لوگوں کو اب کوئی نئی سیاسی گالی تصنیف کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ گالی جامع و مانع ہونے کے علاوہ ایسی مؤثر ہو کہ جس شخص کو یہ گالی دی جائے پھر وہ لوگوں کی نظروں میں اعتبار حاصل نہ

کر سکے۔

---

۱۵ مارچ

ایک محفل میں پنجاب اسمبلی کے مہاجر ممبروں کا ذکر آیا تو ایک صاحب کہنے لگے "ہمارے وزیر اعظم بھی تو مہاجر ہیں"۔ میں نے عرض کیا "مہاجر بھی معمولی نہیں بلکہ "صاحب الہجرتین"۔ ان کے بزرگ مغربی پنجاب سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب چلے گئے تھے۔ یہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے مغربی پنجاب آ گئے ؎

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوے نفروشم

ممدوٹ خاندان کا اصل وطن قصور ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس خاندان کے ایک بزرگ نواب قطب الدین حاکمِ قصور سے قصور کا شہر اور اس کے آس پاس کا علاقہ چھین لیا اور اس کے عوض ستلج پار ایک چھوٹی سی جاگیر دے دی۔ گویا قصور سے بھی اس خاندان کو سکھوں ہی نے نکالا تھا اور ممدوٹ کو بھی انہی کی ہنگامہ آرائی کے باعث نکلنا پڑا۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است

پروفیسر محمد حسن اعظمی نے کچھ عرصے سے یہ تحریک شروع کر رکھی ہے کہ پاکستان کی زبان عربی ہونی چاہیے۔ بات تو بہت اچھی ہے لیکن پاکستان کے لوگوں کو عربی سکھانے کے لئے کئی سو برس کی ضرورت ہے۔ ہمارا آپ کا کیا ذکر ہے، اچھے اچھے مولویوں کو بھی عربی نہیں آتی۔ ان لوگوں کی عربی دانی کا بھرم اس لئے قائم ہے کہ ہم لوگ عربی نہیں جانتے۔

جن لوگوں کو عربی نہ آتی ہو ان پر اپنی عربی دانی کا رعب بٹھانا کیا مشکل ہے۔ پنجاب کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بنگالی ہندو تھے۔ انہوں نے ایک دن دو مسلمان طالب علموں سے پوچھا "کیا تم لوگوں کو عربی بچپن ہی میں سکھا دی جاتی ہے؟" لڑکوں نے جواب دیا "جی ہاں!" ہیڈ ماسٹر صاحب کہنے لگے "تو اچھا ذرا عربی میں باتیں کر کے دکھاؤ۔" ایک لڑکا بولا "الحمد للہ رب العالمین"۔ دوسرے نے کہا "الرحمٰن الرحیم" اور اس طرح دونوں نے سورۂ فاتحہ ختم کر دی۔

آج سے بیس پچیس سال پہلے یہ حال تھا کہ مسجدوں کے پیش امام بھی اچھی خاصی عربی جانتے تھے البتہ لکھنا نہیں آتا تھا۔ راقم الحروف نے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ تعویذ تو لکھ لیتے ہیں لیکن خط لکھنا پڑے تو جان آفت میں آجاتی ہے۔ پنجاب کے ایک مشہور عالم اور لیڈر کا تو آج بھی یہ حال ہے کہ خط خود نہیں لکھتے بلکہ دوسروں سے لکھواتے ہیں۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہے تو پرانا لیکن موقع سے مناسبت رکھتا ہے۔ ایک گاؤں کے طبیب نے کسی جاٹ کو نسخہ لکھ کر دیا جس کے اجزاء یہ تھے:۔ شربت بنفشہ، الائچی دانہ، گلاب۔ جاٹ کو طبیب سے زیادہ گاؤں کی مسجد کے پیش امام پر اعتبار تھا۔ چنانچہ وہ یہ نسخہ پڑھوانے کے لئے ان کے پاس لے گیا۔ مولوی صاحب نے نسخے کب پڑھے تھے کہنے لگے۔ اگر یہ عربی شریف ہے تو نسخہ یوں ہے:۔ ھوالشافی ۔ شَرِبْتُ بِنَفْسِہٖ اِلَّا یَجِیْ وَاِنَّہٗ کِلَاب۔

جاٹ نے پوچھا "بس نسخہ اتنا ہی ہے؟" مولوی صاحب نے کہا "نہیں نسخے کے آخر میں مِنْ کُلِّ سِنْگِہٖ بھی لکھا ہے۔ اصل میں گاؤں کے طبیب نے جس کا نام منگل سنگھ تھا نسخے کے آخر میں اپنا نام لکھ دیا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بھی عربی بنا لیا۔

۱۹ر مارچ

ویر بھارت کی روایت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کی تو اس میں ایک رباعی کے یہ دو مصرعے بھی تھے ؂

مے خواہی تند و تیز و انگہ بسیار
ایں بادہ فروش ساقیٔ کوثر نیست

ہر چند کہ مولانا نے ان مصرعوں کا ترجمہ انگریزی میں کر کے ممبروں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن مدراسی اور بنگالی ممبر سمجھے تو یہ سمجھے کہ کسی تند و تیز قسم کی وسکی کا ذکر ہے جو جنت ہی میں ملتی ہے اور بافراط ملتی ہے۔

مولانا آزاد کا معاملہ تو یہ ہے کہ ؂

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تحریر ہو یا تقریر ایک آدھ شعر ضرور لاتے ہیں اور جب تک شعر نہ آئے انہیں خود بھی لطف نہیں آتا۔ چنانچہ آج بھی جب کہ پوری پارلیمنٹ میں ان کی زبان کی نکتہ طرازیوں کی داد دینے والا کوئی نہیں وہ اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں ؂

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

مولانا کی وضعداری مسلّم۔ لیکن وہ یہ انداز کب تک نبھائے جائیں گے؛ کہاں ہندوستان کی پارلیمنٹ اور کہاں "ساقیٔ کوثر" کا ذکر۔ رطل گراں اور پیرِ مغاں کی حکایت شحنہ و محتسب کی داستان۔ ان لوگوں کی تربیت مختلف قسم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کا اندازِ نگاہ اور ہے، اسلوبِ فکر اور۔ انگریزی میں ہزار سمجھانے کی کوشش کیجئے ان کی

سمجھ میں یہی آئے گا کہ یہ اسی شراب کا ذکر ہے جو یورپ سے آتی ہے اور رپلو مریا بھولارام کے ہاں ملتی ہے۔ یعنی ؎

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است

مشہور لطیفہ ہے کہ ایک صاحب بہادر اُردو سیکھ رہے تھے۔ ایک موقع پر ان کے سامنے میرؔ کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

صاحب بہادر نے فرمایا " ہم سمجھ گیا ہم ٹم میر سب کو جیل خانہ بھیجنا مانگٹا "۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے ہندوستان کی پارلیمنٹ کے اکثر ممبران صاحب بہادر سے بھی گئے گزرے نکلیں گے۔

پاکستان اگرچہ اس معاملے میں غنیمت ہے لیکن سچ پوچھئے تو اگر پاکستان کی پارلیمنٹ میں بھی فارسی کے اشعار پڑھے جائیں تو بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکیں گے اور تو اور اس معاملہ میں مغربی پنجاب کی اسمبلی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ فارسی پڑھتے ہیں وہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ممبر نہیں بنتے، بلکہ تیل بیچتے ہیں یا لڑکوں کو پڑھاتے ہیں یا پھر کلرکی کرتے ہیں اور ایک اچکن ایک کوٹ اور دو پتلونوں میں ساری عمر گذار دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ قانون ساز مجالس کے ممبر بنتے ہیں، سکتری اور وزارت کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں وہ فارسی نہیں پڑھتے، شعر نہیں سمجھتے اور ان میں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہیں پڑھتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ پڑھیں اور سمجھیں تو تقریریں کیونکر کر سکیں، سوالات کا جواب کیسے دے سکیں؟

دنیا میں بعض کاروبار ایسے بھی ہیں جنہیں خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لئے ان سے بے خبر ہونا ضروری ہے۔

ایک واقعہ یاد آگیا۔ کسی اونچے گھرانے کے نوجوان نے ملازمت کی درخواست دی جس میں لکھا تھا کہ میں فلاں جاگیردار کا بیٹا ہوں، فلاں نواب صاحب میرے ماموں ہیں اور فلاں جج صاحب میرے چچا ہوتے ہیں۔ میرے پردادا ضلع کے حاکم تھے اور ان کے دادا کو شاہی عہد میں پنج ہزاری منصب حاصل تھا۔ جس افسر کے پاس یہ درخواست پیش کی گئی تھی اس نے یہ کہہ کے درخواست واپس کر دی کہ ہمیں نسل کشی کے لئے نہیں بلکہ کلرکی کے لئے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ سُنا ہے کہ یہ صاحبزادے کچھ عرصے کے بعد اپنے صوبے کی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔

۱۲ر مارچ

سرگودھا میں شیخ کرامت علی صاحب وزیر تعلیم کی صدارت میں پنجاب طبّی کانفرنس کا دسواں سالانہ اجلاس ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس موقع پر ایک طبّی مشاعرہ بھی ہو گا جس کے لئے مصرع طرح یہ قرار پایا ہے ع

گلشنِ حکمت میں اب کے پھر بہار آنے کو ہے

مصرع اگرچہ مدقوق سا معلوم ہوتا ہے تاہم طبّی ضرور ہے۔ لیکن اس مصرع پر طبّی قسم کی غزل تو جبھی لکھی جا سکتی ہے کہ قافیے بھی طبّی ہوں یعنی بخار، انار، کوکنار، انجبار، خیار وغیرہ۔ اس طرح ہر غزل اچھا خاصا نسخہ بن جائے گی اور مشاعرے کی ساری غزلوں کو جمع کر لیا جائے تو کیا عجب کہ ایک "قرابادین کانفرنسی" مرتب ہو جائے۔

پنجاب کے اطبائے کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ طب کی بقا کے لئے آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو طبّی مشاعروں کے چکّر میں نہ پڑیئے۔ کیونکہ طب اور شاعری کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اب کے آپ کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے طبّی مشاعرہ کرا رہے ہیں۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کیا عجب ہے کہ اگلے سال طبّی قوالی کا انتظام کرنا پڑے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی دیکھا دیکھی ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک مشاعرے بھی ہونے لگیں۔ ہماری سُنیئے تو طب اور شاعری کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیجئے۔ اس اتحاد سے طب کو کوئی فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے شاعری کو ضرور لقوہ، فالج یا اس قسم کا کوئی اور مرض ہو جائے گا۔

۲۲ر مارچ

کسی بزرگ کے عرس کے موقع پر ایک طوائف گا رہی تھی اور ایک مولوی صاحب بھی شریکِ محفل تھے۔ یکایک طوائف نے بھاؤ بتانا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب اب تک تو خاموش تھے لیکن اب ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ چیں بجبیں ہو کے فرمایا:

"یہ حرکت خلافِ شرع ہے۔" گویا اس سے پہلے جو کچھ ہو رہا تھا وہ شرع کے عین مطابق تھا۔

مولانا عبدالستّار نیازی کو اس بات پر اصرار ہے کہ بے پردگی کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور مسلمان عورتیں باہر نکلیں تو ہاتھوں اور چہرے کے سوا ان کے جسم کا کوئی حصّہ نظر نہ آئے۔ کیونکہ بے پردگی خلافِ شرع ہے۔ نیازی صاحب سے عرض ہے کہ صرف بے پردگی ہی پر اتنا زور کیوں دیا جائے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کب شرع کے مطابق ہے؟

مشرقِ اقصٰی یا مشرقِ بعید اور مشرقِ اولیٰ یا مشرقِ قریب کی اصطلاحیں یورپ سے آئی ہیں اور اب ہمارے ہاں بڑی بے تکلفی سے استعمال کی جاتی ہیں۔ حالانکہ جس علاقے کو یورپ والے مشرقِ قریب کہتے ہیں وہ ہمارے ملک سے مغرب کی جانب ہے اور جسے انہوں نے مشرقِ بعید کا نام دے رکھا ہے وہ ہم سے مشرق کی جانب تو ضرور ہے لیکن اتنا ہی دور ہے جتنا مشرقِ قریب۔

راقم الحروف کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید کی اصطلاحیں بالکل اڑا دی جائیں۔ انہیں رکھئے لیکن ان کا محلِ استعمال بدل دیجئے۔ مثلاً اگر مشرقی بنگال اور مشرقی پنجاب کو مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید یا آل انڈیا ریڈیو کی زبان میں دُور پورب اور پاس پورب کہا جائے تو کیا کہئے گا؟

عام قاعدے کے لحاظ سے مشرقی پنجاب کو مشرقِ قریب اور مشرقی بنگال کو مشرقِ بعید کہنا چاہیئے۔ لیکن اگر دلوں کے قرب و بعد کا خیال رکھا جائے تو مشرقی پنجاب ہمارے لئے مشرقِ بعید یا دُور پورب ہے اور مشرقی بنگال پاس پورب۔ مشرقی پنجاب کی سرحد واہگہ سے شروع ہو جاتی ہے گویا ہمارے اور اس کے درمیان صرف تیرہ چودہ میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن دلوں کے تفاوت اور دُوری کا یہ حال ہے کہ یہ فاصلہ ہزاروں میلوں کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے اور مشرقی بنگال تیرہ چودہ سو میل دور ہونے کے باوجود بہت قریب نظر آتا ہے۔ اس لئے مشرقی پنجاب کو دُور پورب کہنا چاہیئے اور مشرقی بنگال کو مشرقِ قریب۔

ہم نے کل کے "حرف و حکایت" میں پنجاب طبّی کانفرنس کے طبّی مشاعرہ کا ذکر کیا تھا جس کے لئے یہ مصرع طرح قرار پایا ہے ع

گلشنِ حکمت میں اب کے پھر بہار آنے کو ہے

لاہور کے ایک حکیم صاحب جو عمیظ لاہوری کہلانا پسند کرتے ہیں، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"قافیوں میں بخار، انار، کوکنار، انجبار وغیرہ تو آپ نے لکھ دیئے لیکن بیمار نہیں لکھا جو اکثر طبیبوں کا قافیہ تنگ کر دیتا ہے۔"

طبیب کے لئے اس سے بڑا مژدہ کیا ہوگا کہ "بیمار آنے کو ہے" لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس وزن میں 'بیمار' نہیں آتا۔ ادویہ کے اوزان اور اشعار کے اوزان میں بڑا فرق ہے۔ ، ماشہ گاؤزبان کے ساتھ ، ماشہ بنفشہ کے بجائے اگر ۹ ماشہ بنفشہ لکھ دیجئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بہار کے قافیہ کے ساتھ بیمار لے آیئے تو پوری غزل مفلوج ہو گئی۔ اسی لئے تو میں نے عرض کیا تھا کہ طب اور شاعری کے اتحاد سے طب کو فائدہ ہو نہ ہو، شاعری کو لقوہ یا فالج ضرور ہو جائے گا۔

بہرحال بیمار کو بہار کا ہم قافیہ بنانے پر اصرار نہ کیجئے۔ کیونکہ طب کے لئے "بخار آنے کو ہے" بھی اچھا خاصہ مژدہ ہے۔ البتہ یہ بات یقینی نہیں کہ بخار آ گیا تو مریض طبیب کی جانب ہی رجوع کرے گا یا کونین کی تلاش میں کسی ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

طبّی مشاعرہ کے مصرع طرح سے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ شیخ کرامت علی صاحب شاعر ہیں اور "بہار" تخلص کرتے ہیں۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ ؎

گلشنِ حکمت میں اب پھر بہار آنے کو ہے

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شیخ صاحب طبّی کانفرنس کی صدارت کے لئے عنقریب سرگودھا جا رہے ہیں۔

"گلشنِ حکمت" کی سیر تو وہ پہلے بھی کر چکے ہوں گے لیکن پہلے ان کی حیثیت اور تھی۔ اب اور ہے۔ یعنی اب وہ وزیرِ صحت یعنی "گلشنِ حکمت کی بہار" ہیں۔

۲۶ر مارچ

مغربی پنجاب کی اسمبلی میں دو تین دن سے عجیب رنگا رنگی نظر آ رہی ہے۔ کبھی تو یہ عالم ہے کہ ہلکی ہلکی چوٹیں چل رہی ہیں، لطیفے کہے جا رہے ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں، بیچ بیچ میں شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میاں بشیر احمد، شیخ صادق حسن اور مولانا عبدالستار نیازی مشہور شعراء کے کلام سے محفل کو گرماتے ہیں۔ مولوی احمد جان سے ضبط نہیں ہو سکتا تو علامہ اقبال کا ایک اُردو شعر حافظ شیراز کے نام سے پڑھ کے خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میاں نور اللہ شعر تو نہیں پڑھتے البتہ اُردو میں پنجابی کا پیوند اس خوبی سے لگاتے ہیں کہ اچھے اچھے سخن سنج ان کے سامنے گر دہر کے رہ جاتے ہیں۔

یکایک یہ سماں بدلتا ہے۔ گفتگو میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور اس محفل پر جو ابھی ابھی نری مجلسِ مشاعرہ تھی پہلوانوں کے دنگل بلکہ کبھی کبھی تو معرکۂ جنگ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دونوں طرف کے پہلوان میدان میں اُترے ہیں، داؤ پیچ ہو رہے ہیں، فن کے سارے کمالات صرف کئے جا رہے ہیں، باہم آتشیں قسم کی گالیوں کی گولیاں چل رہی ہیں۔ دشنام کے تیروں سے سینے چھد رہے ہیں، غلغلۂ عام بلند ہے جس میں کبھی کبھی سپیکر کی آواز اس طرح گونج اٹھتی ہے کہ زبانیں چلتے چلتے رُک جاتی ہیں۔ غرض ہماری اسمبلی بھی عجب چیز ہے۔ یعنی کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل، کبھی مشاعرہ، کبھی پہلوانوں کا دنگل اور کبھی میدانِ جنگ۔

اگرچہ اسمبلی میں کوئی حزبِ مخالف موجود نہیں۔ مغربی پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہے اور تقریباً تمام ممبر مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ پھر بھی وزارت سے کوئی شخص خوش معلوم نہیں ہوتا۔ آخر یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ پاؤں ہی آپ کے خلاف گواہی دینے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ قیامت آ گئی۔

ہندوستان کی حکومت نے دیوان چمن لال کو سفیر مقرر کر کے ترکی بھیجا ہے۔ دیوان چمن لال اس سے پہلے ترکی نہیں گئے۔ ترکی زبان نہیں جانتے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے ترکی کے سیاسی معاملات سے بھی انہیں چنداں واقفیت نہیں۔ تاہم ان میں ایک خوبی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ ترکی میں آسانی سے کھپ جائیں گے یعنی ان کا نام ایسا ہے جو ترکوں کو اجنبی معلوم نہیں ہوگا۔

دراصل دیوان صاحب کے نام کے تینوں اجزا یعنی دیوان، چمن اور لال ترکی زبان میں موجود ہیں۔ البتہ چمن کے سوا باقی دو لفظ ایسے ہیں جن کے معنی ترکی میں وہ نہیں جو ہمارے ہاں مراد لئے جاتے ہیں۔ "دیوان" دفتر کو کہتے ہیں اور "لال" گونگے کو۔ اس لئے ترک دیوان صاحب کا نام سن سن کے تعجب تو کریں گے البتہ انہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ حکومت ہند نے اچھا کیا کہ "مسٹر ونکا پٹیا ٹلیم" کی قسم کے کسی صاحب کو سفیر مقرر کر کے ترکی نہیں بھیج دیا۔

آج کل ایران، مصر وغیرہ کے لوگ اکثر ہندوستانی لیڈروں سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں ورنہ ایک زمانے میں تو یہ حال تھا کہ ہندوستانی لیڈروں کے نام کچھ اس طرح مفرّس اور معرّب کر لئے جاتے تھے کہ ان کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ مثلاً اکثر اخبار لال کو لآلی لکھتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو جواہر لآلی نہرو لکھا جاتا تھا۔ "شفقِ سرخ" میں جو ایران کے سب سے بڑے اخبارات میں سمجھا جاتا تھا، سردار منگل سنگھ کی گرفتاری کی خبر چھپی تو مترجم نے منگل سنگھ کو "منقل سنگ" بنا کے اس میں معنی پیدا کر دیئے اور عربی کا ایک اخبار تو اس سے بھی بازی لے گیا۔ یعنی اس نے آل انڈیا "شدھی کانفرنس" کو "جمعیۃ شہود یین" بنا دیا۔ حالانکہ شدھی کو نہ وحدتِ شہود سے کوئی تعلق ہے اور نہ وحدتِ وجود سے۔

۲۷ر مارچ

مولانا ظفر علی خان خود تو ہمیشہ نماز کے پابند رہے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں انہیں اس بات کا بڑا خیال تھا کہ لاہور کے تمام مسلمان ان کی طرح نماز کے پابند ہو جائیں۔ ان دنوں وہ صبح سویرے اپنے کنبے کے لوگوں، نوکروں چاکروں کو نماز کے لئے جگاتے تھے۔ پھر محلے والوں کو جگانا شروع کر دیتے تھے۔ اس کام سے فراغت پاتے تھے تو سیر کو نکل جاتے تھے اور کبھی کبھی تو سیر کا وقت بھی لوگوں کو جگانے اور نماز پڑھوانے میں صرف ہو جاتا تھا۔

ان دنوں کسی نے مولانا کے ایک پرانے خدمت گار سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے کہ مولانا ان دنوں صبح کی نماز پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟" یہ سن کے اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا "صاحب میں یہ باتیں کیا جانوں۔ لیکن اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ مولوی صاحب وہابی ہو گئے ہیں۔"

شکر ہے کہ مولانا کو وہابی ہونے کے شبہ میں گرفتار نہیں کیا گیا ورنہ جن دنوں ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث انگریزی حکومت کے زیرِ عتاب تھی بعض لوگوں کو مذہب سے شغف رکھنے یا اٹنگا پاجامہ پہننے کی بنا پر "وہابیت" کے شبہ میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ سلیم شاہ سوری کے پورے دورِ حکومت اور اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور میں یہ کیفیت تھی کہ علماء میں سے جو لوگ امر بالمعروف پر زور دیتے تھے انہیں "مہدوی" سمجھ کے فوراً گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ مہدوی فرقے کے لوگ جو سیّد محمد جون پوری کے پیرو ہیں دینی معاملات میں سخت "متشدد" تھے۔

آج اگر کوئی شخص کہے کہ الارض للّٰہ یعنی زمین خدا کی ہے، جاگیرداری کا نظام

قطعاً غیر اسلامی ہے۔ اسلام انسانوں کی اونچ نیچ کا قائل نہیں۔ یہ خواجہ و بندہ کا امتیاز کیسا؟ ادنیٰ و اعلیٰ کے اس فرق کے کیا معنی؟ پھر یہ خواجگی و بندگی موروثی کیوں بن گئی ہیں؟ ہر انسان کو بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں موقعے کیوں حاصل نہیں؟ تو ہر طرف سے آوازیں بلند ہوتی ہیں "اس کی باتیں نہ سُنو یہ کمیونسٹ ہے۔"

یہی نہیں بلکہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لوگ جنہیں وزارت اور سکتّری کے عہدے نصیب ہیں خاص و عام محفلوں میں، نجی کی صحبتوں میں، اسمبلی کے جلسوں میں منہ میں کف بھر کے چلاّ چلاّ کے کہتے ہیں" دیکھیں آپ نے اس کمیونسٹ کی حرکتیں؛ یہ انسانوں کی مساوات کا قائل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی اونچ نیچ، بندگی اور خواجگی کا امتیاز مٹ جائے۔ یعنی مسلمان تباہ ہو جائیں۔ لیکن یقین رکھئے کہ جب تک مجھ ایسے خادمِ اسلام زندہ ہیں اسے اپنے ارادوں میں کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ آپ دیکھتے کیا ہیں۔ ذرا اِدھر رُخ کر کے زندہ باد کا ایک نعرہ تو لگائیے۔"

جاگیرداری کے نظام کو جو قرونِ مظلمہ کی یادگار ہے، صحیح قرار دینا عین اسلام ہے اور اسلامی مساوات کا ذکر کرنا، خلافتِ راشدہ کے مبارک عہد کی یاد دلانا، طبقاتی امتیاز، رشوت ستانی، سرمایہ داری کی مخالفت کرنا کفر و زندقہ ہے، الحاد ہے، کمیونزم ہے۔ اُردو کے مشہور شاعر اکبر مرحوم سے بھی لوگوں کو یہی شکایت تھی۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مولانا محمد علی مرحوم نے کراچی کے مشہور مقدمۂ بغاوت میں کیا خوب فرمایا تھا

کہ اگر بغاوت یہی ہے تو سارا قرآن بغاوت کی تلقین سے بھرا پڑا ہے اسے ضبط کیوں نہیں کرتے؟ آج بھی قریب قریب یہی معاملہ ہے۔ اگر مساوات پر زور دینا کمیونزم ہے تو قرآن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر اسلامی جمہوریت کا نام لینے والے کمیونسٹ ہیں تو مسلمان کون ہے؟ شرمائیے نہیں صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم —— اور ہر وہ شخص جو ہماری مخالفت کرتا ہے، کافر ہے، زندیق ہے، ملحد ہے، کمیونسٹ ہے"۔

---

۲۸ / مارچ

اسمبلی میں میجر مبارک علی نے کہا:۔

"کل سردار شوکت حیات نے جو انداز اختیار کیا وہ بے حد افسوسناک ہے۔ ایک وزیر کو اس قسم کی عامیانہ روش زیب نہیں دیتی۔ شاید انہوں نے اسمبلی کو چنگڑ محلہ سمجھ رکھا ہے"۔

اس موقع پر سپیکر نے ٹوکا اور میجر مبارک علی کو چنگڑ محلہ کا لفظ واپس لینا پڑا۔

چنگڑ محلہ کے لوگوں کو شکایت ہے کہ اسمبلی میں ہمارے محلہ کا نام اس طرح کیوں لیا گیا اور پھر سپیکر صاحب نے یہ کیوں فرمایا کہ "چنگڑ محلہ" کا لفظ واپس لے لیا جائے۔ چنگڑ محلہ اتنا گیا گزرا تو نہیں کہ اسے اسمبلی سے تشبیہہ دی جائے۔ آپ بڑے لوگ ہیں۔ آپ کی باتیں بھی بڑی ہیں۔ لیکن ہمارے محلے کا نام تو یوں نہ لیجئے۔ یہاں کوئی وزیر نہیں رہتا۔ کوئی سکتر نہیں رہتا۔ اسمبلی کا کوئی ممبر نہیں رہتا۔ یہ غریب لوگوں کی بستی ہے لیکن ہم نے مہاجرین کے کسی دکان، مکان یا کارخانے پر قبضہ نہیں کیا۔ ہم غریب لوگ ہیں صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کی باتیں بھی بڑی ہیں۔

ایک دلی والے نے جو چنگڑ محلہ میں رہتا ہے اور انار کلی میں کباب بیچتا ہے، راقم الحروف سے کہا۔" اسمبلی میں چنگڑ محلہ بدنام ہے اور چنگڑ محلہ میں اسمبلی بدنام ہے کل ہمارے محلے کے دو آدمیوں میں تکرار ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے جب یہ کہا کہ یہ چنگڑ محلہ ہے بھائیو، اسمبلی نہیں، تو دونوں چپ ہو گئے اور میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ بھئی ہم میں نہ تو کوئی سردار شوکت حیات ہے، نہ خان محمد وٹ، نہ میاں ممتاز دولتانہ پھر ہم جلی کٹی کیوں کہیں؟ آپس میں کیوں لڑیں؟ ان میں سے ایک ذرا زیادہ اکل کھرا ہے۔ میں نے اس سے بھی کہہ دیا کہ میاں میری باتیں سُن کے تمہارے ماتھے پر بل کیوں پڑ گئے؟ نہ تم شوکت حیات ہو نہ میں افتخار الدین ہوں اور یہ اسمبلی بھی تو نہیں کہ سپیکر صاحب مجھے بات کرنے سے روک دیں۔ یہ چنگڑ محلہ ہے میاں چنگڑ محلہ۔

---

۲۹ مارچ

مولانا سالک نے لکھا ہے کہ اسمبلی میں اکثر ممبر لطیفے سُناتے ہیں، شعر پڑھتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور بیچارے سپیکر کو جس کا کام یہ ہے کہ کوئی ممبر اسمبلی کے آداب کو ملحوظ نہ رکھے تو اسے ٹوک دے، بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اصل میں جو لوگ اسمبلی میں شعر پڑھتے ہیں اور لطیفے سُناتے ہیں انہیں اسمبلی کے باہر کہیں شعر پڑھنے اور لطیفے سُنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر زیادہ نہ سہی تو سال بھر میں پانچ چھ مرتبہ ایک "پارلیمانی مشاعرے" کا انتظام ہو جایا کرے تو اسمبلی یوں مشاعرہ بن کر نہ رہ جایا کرے۔

ہماری آپ کی طرح بچارے اسمبلی کے ممبروں کو بھی شعر سُنانے کا شوق ہے۔ لیکن کوئی موقع نہیں ملتا۔ اُردو کانفرنس والوں نے عورتوں کے مشاعرے کا انتظام تو کر دیا لیکن اتنی توفیق انہیں بھی نہ ہوئی کہ اسمبلی کے ممبروں کے لئے بھی ایک مشاعرے کا انتظام کر دیتے۔ ریڈیو پر بھی ہر مہینے مشاعرہ ہوتا ہے لیکن اس میں بھی ان لوگوں کو بلایا نہیں جاتا۔ اس سے تو ہمارے طبیب ہی اچھے رہے جنہوں نے سرگودھا کانفرنس کے ساتھ ساتھ طبی مشاعرہ بھی کر ڈالا۔

سالکؔ صاحب کا خیال ہے کہ اسمبلی کے ممبر عام جلسوں میں تقریریں کرتے رہے ہیں اس لئے اسمبلی میں پہنچے تو وہاں بھی اسی ڈھب کی تقریریں شروع کر دیں۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ ان بیچاروں کو اسمبلی کے باہر کہیں لڑنے جھگڑنے تقریریں کرنے، پھبتیاں کہنے اور شعر پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے اسمبلی میں ہنگامہ آرائی کر کے جی کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

اسمبلی کے بعض ممبروں کا تو یہ حال ہے کہ گھر سے دس پندرہ شعر اور دو چار لطیفے یاد کر کے آتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے انہیں چسپاں کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ کبھی شعر چسپاں ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی لطیفہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے اور کبھی نہیں بیٹھتا۔ اگر مہینے دوسرے مہینے ان کے لئے بیت بازی اور لطیفہ گوئی کی ایک محفل کا انتظام کر دیا جائے تو اسمبلی کی بحثوں کا رنگ ہی بدل جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر لاہور میں کوئی ایسی انجمن قائم ہو جائے جس کا کام صرف جلسے کرانا ہو تو اسے بہت کامیابی ہو گی بلکہ یہ کام ذرا سلیقے سے کیا جائے تو عجب نہیں کہ اسمبلی کے اکثر ممبر کچھ دے بھی نکلیں۔

معاشری بے انصافی، عدم مساوات اور لوٹ کھسوٹ کی حمایت میں بعض لوگ بڑے زور کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کا ارشاد ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ امیر بھی اسی نے بنائے اور غریب بھی۔ ہم خدا کے کاموں میں دخل دینے والے کون؟ جی ہاں! دینے والے کے ڈھنگ نیارے ہیں جن لوگوں نے لاکھوں کا مال لوٹ کے گھر بھر لئے، فیکٹریوں پر قبضہ کیا، دوکانوں اور مکانوں کے مالک بن بیٹھے، جتنا سیمنٹ سکے خود سمیٹا، باقی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو دلوا دیا، ان کو بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ ہمارا اور کسی کا کیا منہ ہے کہ اعتراض کریں؟

لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کے مر جائیں تو مرنے دیجئے مشیّتِ الٰہی یہی تھی کہ یہ لوگ فاقے کر کر کے مر جائیں اور امراء اور اہلِ دول عیش کرتے رہیں میرا مولا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے اور نہ دینا چاہے تو کسی کا کیا زور ہے؟ ہم اور آپ ان باتوں میں کیوں دخل دیں؟ اور مفت میں کیوں گنہگار بنیں؟

۲ر اپریل

سالک صاحب نے افکار و حوادث میں لکھا ہے کہ شیخ کرامت علی صاحب وزیرِ تعلیم نے پچھلے دنوں پبلشرز یونائیٹڈ کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے جو تقریر کی اس میں کئی غلطیاں تھیں۔ مثلاً شیخ صاحب نے "رفقائے کار" کی جگہ "رفقایانِ کار" "اس کے علاوہ" کی جگہ "ماسوا اس کے" اور "مجبوریاں" کی جگہ "مجبورئیں" فرمایا اور "معتدبہ" کو "معتد باہ" ہی کہتے رہے۔

سالک صاحب کو اعتراض کرتے وقت اول تو اس بات کا خیال نہ آیا کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ پھر وہ یہ بھی بھول گئے کہ آخر آنریبل وزیرِ تعلیم اس

صوبے میں ادب و زبان کی سب سے بڑی سند ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہوگا، سوچ سمجھ ہی کے کہا ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وزیرِ تعلیم جیسا بلند مرتبہ شخص اہلِ علم کے ایک مجمع میں تقریر کرے اور غلطیاں کرتا چلا جائے۔

ہماری رائے میں "رفقائے کار" اور "رفقایانِ کار" دونوں صحیح ہیں علامہ ابی قیبوس دلالی نے اخبار الفصحا میں حکیم منطق کاشی کا یہ مصرع نقل کیا ہے:

ع آں زماں بودند رفقایاں کجا

اس کے علاوہ اٹل نے جو میر جعفر زٹل کے بڑے دوست تھے اپنی ایک غزل میں کہا ہے ؎

آؤ دوست سوئے رفقایاں چلیں
لے کے بہرِ نذر نقدِ جاں چلیں

یہ دونوں کتابیں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں اور اردو کانفرنس میں نادر کتابوں کی نمائش ہوئی تھی۔ اس میں سالک صاحب کی نظر سے بھی گذری ہوں گی۔

"اس کے علاوہ" کی جگہ "ماسوا اس کے" بھی درست ہے اور درست ہی نہیں بلکہ فصیح ہے اور "مجبوریئیں" تو خاص فصحائے اردو کی زبان ہے۔ مثلاً ایک مشہور شاعر کہتا ہے:

ع عشق کی مجبوریئیں ناچاریئیں

باقی رہا "معتندباہ" تو اس لفظ کے بارے میں سالک صاحب کو التباس ہوا ہے۔ "معتد بہ" سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ ایک طبی اصطلاح ہے۔ آنریبل وزیرِ تعلیم نرے وزیرِ تعلیم ہی نہیں بلکہ وزیرِ صحت بھی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی تقریروں میں

نہایت بے تکلفی سے طبّی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں اور ہماری رائے میں یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔

سالک صاحب کے یہ تمام اعتراضات صحیح بھی ہوں تو کون سی آفت آگئی۔ شیخ کرامت علی صاحب پنجاب میں اُردو زبان کی سب سے بڑی سند ہیں۔ اگر وہ کہہ دیں کہ:

ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تو فرمائیے آپ اور ہم ان کا کیا کر لیں گے؟

یوں تو اُردو زبان کے اکثر مشہور شعرا نے بھی کہا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی صحیح زبان ہے۔ لیکن ہمارے وزیرِ تعلیم کو اپنی بات منوانے کے جو ذریعے میسّر ہیں وہ ان لوگوں کو بھی میسّر نہیں تھے۔ مثلاً شیخ کرامت علی صاحب اگر ایک سرکلر جاری کر دیں کہ آئندہ "معتدبہ" کی جگہ "معتدباہ" ہی لکھا اور بولا جائے۔ "مجبوری" کی جمع "مجبورئیں" ہے اور "ناچاری" کی "ناچارئیں" اسی طرح "رفیق" کی جمع "رفقا" یا "رفیقاں" نہیں "رفقایاں" ہے۔ علما کی علمایاں، شعرا کی شعرایاں، تو کسی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ ان کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔

اگر شیخ صاحب نے اس قسم کا سرکلر جاری کر دیا تو دیکھ لیجئے گا کہ جمع کے پرانے قاعدوں میں فوراً ترمیم کر دی جائے گی۔ گرامر کی کتابوں میں لکھ دیا جائے گا کہ مجبوری کی جمع مجبورئیں ہے اور رفیق، شاعر اور عالم کی رفقایاں، شعرایاں اور علمایاں۔ اطبّا کی جگہ اطبایاں کہنا چاہئے اور حکما کی جگہ حکمایاں۔ نصابِ تعلیم کی جس کتاب میں حکما، اطبّا، رفقا اور مجبوریاں، ناچاریاں نظر آجائے گا اسے سررشتۂ تعلیم نامنظور کر دے گا۔ لوگ تکالیفیں اور تکالیفاں بولا اور لکھا کریں گے اور اس پر فخر کریں گے کہ ہماری زبان ٹکسالی ہے۔

ابھی سالک صاحب کوئی دن جاتا ہے کہ خود علماء علمایاں اور شعراء شعرایاں کہلانے پر فخر کریں گے۔ آپ کی زبان یا قلم سے تکالیف یا مجبوریاں نکل جائے گا تو لوگ کہیں گے کہ صاحب تکالیف اور مجبوریاں کے کیا معنی۔ تکالیفاں اور مجبورئیں کہئے۔ غرض آئندہ زمانے کی اُردو ئے معلّیٰ کچھ اس قسم کی ہوگی:۔

"حضراتاں شعرایاں کراماں آپاں نے جو اپنی مجبورئیں اور تکالیفاں بیاناں کی ہیں ان کا مجھ کو بڑا احساساں ہے۔

بہرحالاں آپاں کو معلوماں ہو کہ حکومتاں ان باتاں کا تدارکاں کر رہی ہے"

---

۳ راپریل

کل کے "حرف و حکایت" میں "وزارتی اُردو" کا ذکر آیا تھا۔ اس پر ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جنوبی ہند میں خط کو خطوطاں کہتے ہیں اس لئے اگر آنریبل شیخ کرامت علی نے رفقایانِ کرام کہہ دیا تو کیا ہو گیا ؎

ایں گناہیست کہ در ملکِ دکن نیز کنند

اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ "وزارتی اُردو" "اداراتی اُردو" کا چربہ ہو۔ آخر "وزرایانِ کرام" کی زبان اور ہماری آپ کی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور رہنا چاہئے۔

"وزارتی اُردو" کی خوبیوں سے کس کافر کو انکار ہے۔ اس زبان کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ نون غنّہ کی کثرت نے اسے "غنغنی لبلی" بنا دیا ہے۔ "وزارتی زبان کیا ہے" نون غنّہ کی عجوبہ کاری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نون صاحب وزارت میں شامل نہیں۔

پچھلے دنوں اُردو کانفرنس کے زیرِاہتمام جو مشاعرہ ہوا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اکثر مشہور شاعر ایک ایک دو دو شعر پڑھ کے بیٹھ گئے اور بعض شعراء کو تو ایک آدھ شعر

پڑھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ یعنی ع

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

خواجہ دل محمد صاحب کی ہمت کو آفرین ہے کہ اگرچہ لوگوں نے بہت شور مچایا، سیٹیاں بجائیں، بار بار کہا کہ ہم آپ کے اشعار نہیں سُنتے، لیکن انھوں نے بھی اپنا کلام سُنا کے ہی چھوڑا اور یہ ثابت کر دیا کہ "زمیں جنبد نہ جنبد دل محمد"۔

اس موقع پر ایس۔ پی۔ ایس۔ کے ہال کا ایک مشاعرہ یاد آ گیا جو اٹھارہ انیس برس ہوئے خواجہ دل محمد صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ یوں تو مشاعرہ شروع ہی سے بڑا ہنگامہ خیز تھا لیکن جب پنڈت راج نرائن ارمانؔ نے کلام سُنانا شروع کیا تو حد ہو گئی۔

ان کی غزل کی ردیف "آنکھیں" تھی اور قافیہ طرح دار، بیمار۔ چونکہ ارمانؔ صاحب کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں اس لئے کچھ عرصے میں یہ کیفیت نظر آئی کہ ارمانؔ صاحب تو کہہ رہے ہیں "بیمار آنکھیں" اور لوگ "بیمار مونچھیں" کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ خواجہ دل محمد صاحب نے بہتیرا لوگوں کو سمجھایا۔ لیکن اس ہنگامے میں ان کی کون سُنتا تھا۔ "بیمار مونچھیں" اور "طرحدار مونچھیں" کے نعرے برابر لگتے رہے۔

پچھلے دنوں ہندوستان کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ مجلسِ احرار بالکل "بے کار" جماعت بن کے رہ گئی ہے۔ لیکن اس اخبار کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ مجلسِ احرار کے صدر شیخ حسام الدین کا تعلق موٹر یونین سے ہے۔ ان کے پاس "کار" پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اور اب تو شیخ صاحب نے بس سروس بھی جاری کر رکھی ہے اور ان کے پاس کئی "بسیں" ہیں۔ اس لئے مجلسِ احرار نہ "بے بس" رہی نہ "بے کار"۔ یعنی اللہ نے کاریں بھی دے رکھی ہیں اور بسیں بھی۔

شیخ کرامت علی صاحب وزیرِ تعلیم نے پچھلے دنوں اخبار نویسوں کی کانفرنس میں فرمایا تھا کہ ہم نے مولانا عبدالمجید سالکؔ کو اُردو کمیٹی میں شامل نہیں کیا۔ کیونکہ ان سے ہمارا سیاسی اختلاف ہے۔ بیگم سلمیٰ تصدّق حسین نے اسمبلی میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُردو کمیٹی میں بعض ایسے لوگوں کو لیا گیا ہے جنہیں اُردو زبان اور ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔

ان لوگوں کو اُردو زبان سے واسطہ ہو نہ ہو شیخ کرامت علی صاحب کے "ہم زبان" تو ہیں۔ اُردو ادب سے سروکار نہیں رکھتے تو کیا ہوا؟ مغربی پنجاب کے وزیروں کا تو ادب کرتے ہیں۔ سالکؔ کی طرح حکومت پر نکتہ چینی کرنے تو نہیں بیٹھ جاتے۔

ہمارے خیال میں شیخ کرامت علی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مغربی پنجاب کی وزارت کی پالیسی کی وضاحت کر دی اور لگی لپٹی نہ رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے نزدیک سب سے بڑا زبان دان اور ادیب وہی ہے جو ہر بات میں ہماری حمایت کرتا ہے۔ سالکؔ بڑا لائق شخص سہی لیکن ہم اسے زبان دان، ادیب یا شاعر نہیں سمجھتے —— اور ہم جو کچھ سمجھتے ہیں، درست سمجھتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ شیخ صاحب وزیرِ تعلیم یعنی اس صوبے میں علم و فضل اور زبان و ادب کی سب سے بڑی سند ہیں۔ وہ جسے انشا پرداز اور زباندان قرار دے دیں اس کی زباندانی اور انشاپردازی مسلّم۔ ورنہ پینتیس برس زبان و ادب کی خدمت کرنے، اخباروں اور رسالوں میں قلم گھسانے اور پنجاب کا سب سے بڑا زبان دان کہلانے سے کیا ہوتا ہے۔ شیخ صاحب نے دو لفظ کہہ دیئے اور سالکؔ کا سارا علم و فضل چھین لیا اور ابھی تو انہوں نے بڑا کرم کیا۔ اگر وہ اپنے خانساماں یا ڈرائیور کو ادب اور زبان دانی کی سند دے کر اُردو کمیٹی کا ممبر بنا دیتے تو کوئی ان کا کیا کر لیتا۔

---

۴ راپریل

ہمارے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ اُردو کانفرنس کے اہتمام سے جو مشاعرہ ہوا اس میں کلام سنانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ "گردے" کے متعلق تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ اس تخلص کے کسی شاعر سے ہماری شناسائی نہیں۔ البتہ "دل" کا کام ضرور تھا اسی لئے تو خواجہ دل محمد صاحب دلؔ نے لوگوں کی ہنگامہ آرائی کے باوجود اپنا کلام سُنا ہی کے دم لیا۔

اُردو کانفرنس کے عجائبات مشاعرہ ہی تک محدود نہیں، اس کے علاوہ بھی جو کچھ ہوا وہ ہر لحاظ سے عجیب تھا۔ مثلاً کانفرنس میں اُردو کے خدّام بہت کم تھے۔ زیادہ تعداد خواتین کی تھی یا خواتین کے نمائندوں کی۔ گویا یہ مجلس کانفرنس نہیں بلکہ اچھی خاصی خانفرنس تھی اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردو کمیٹی کو بھی جو یونیورسٹی کے رشتے سے "خانفرنس" کی بیٹی ہوتی ہے "اردو خمیٹی" کہنا چاہئے۔

عوام کہتے ہیں کہ جاگیرداری کا نظام مٹا دیا جائے۔ پرانی جاگیرداریاں تو نہ جانے کب ختم ہوں۔ یہاں نئی جاگیرداریاں قائم ہو رہی ہیں۔ اُردو کانفرنس میں یہ تماشا سب نے دیکھا کہ جو لوگ اُردو کو عمر بھر خوگیر کی بھرتی سمجھتے رہے ہیں، اسے اپنی جاگیر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو دیکھ لیجئے گا کہ اُردو پر چند "جاگیردار" قسم کے لوگ مسلط ہیں اور جن لوگوں نے زبان اور ادب کی خدمت میں عمریں بسر کر دی ہیں وہ "کمیں" بن کے رہ گئے ہیں۔

"بابائے اُردو" مولانا عبدالحق اپنی "تلخ نوائی" کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن ان کے خطبۂ صدارت کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دھن تو "دیس"

کی چھیڑی تھی لیکن کہیں کہیں ان کا "دیس" بھی "درباری" بن کے رہ گیا ہے۔ آخر وہ بھی کیا کرتے! "وقت کی راگنی" یہی ہے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک تو کچھ عرصے سے ملّت کے لئے "امرت دھارا" بلکہ "آبِ حیات" بنے ہوئے ہیں ؎

یکے دواست بدار الشفائے میکدہ ہا

بہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہند

دانت کا درد ہو یا پیٹ کا۔ آنکھیں دکھتی ہوں یا بار بار چھینکیں آتی ہوں، نزلہ ہو یا زکام، صداع ہو یا خناق۔ ذات الصدر ہو یا ذات الجنب، ڈاکٹر عمر حیات ملک کو استعمال کیجئے، اللہ شفا دے گا۔

کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج کے پرنسپل بھی تھے، یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی اور دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی۔ کالج کی پرنسپلی سے تو انہیں بادلِ ناخواستہ الگ ہونا پڑا۔ لیکن باقی دونوں اعزاز اب بھی ان کے قبضے میں ہیں اور جب کبھی مرکزی یا صوبائی وزارت کی توسیع کا سوال سامنے آتا ہے تو عام طور پر انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اُردو کانفرنس والوں کو "ذات الصدر" ہو گیا تھا۔ یعنی انہیں مجلسِ استقبالیہ کے لئے صدر کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اس "آبِ حیات" سے کام لیا اور "حیاتِ تازہ" پائی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اُردو کانفرنس میں جو لوگ پیش پیش نظر آتے تھے انہیں اُردو سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اُردو کانفرنس والوں کے پاس اس کا ترشا ترشایا جواب موجود ہے کہ انہیں اُردو سے تعلق نہیں تو نہ سہی، ہم سے تو تعلق ہے اور ہم سے تعلق ہے تو اُردو سے بھی تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس منطق کے سامنے ہمارے آپ کے دلائل بے کار ہیں۔

۷ر اپریل

سکھوں نے پنجابی میں جو عجیب و غریب ترجمے کئے ہیں، ان میں سے اکثر آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے۔ معاصر "جنگ" کراچی کی روایت ہے کہ الٰہ آباد میں ان دنوں ہندی زبان میں بھی اس قسم کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں الٰہ آباد کے ایک رسالے میں جوش ملیح آبادی کی ایک نظم "اُبال نون پوری" کے نام سے چھپی تھی۔ آپ حیران ہوں گے کہ "اُبال نون پوری" صاحب کون ہیں لیکن اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ "نون پوری" اصل میں "ملیح آبادی" ہیں جنہوں نے "جوش ملیح آبادی" کا چولا اتار کے "اُبال نون پوری" کا لباس پہن لیا ہے۔

جوش کا ترجمہ "اُبال" صحیح ہے لیکن "ملیح" کا ترجمہ "نون" نہیں۔ ہاں "ملیح" کی جگہ "ملح" ہوتا تو اور بات تھی۔ ترجمہ غلط ہی سہی بہرحال ترجمہ تو ہے۔ ہم لوگ اگر سرحد اسمبلی کے ممبر لالہ کوڑو رام کے نام کا ترجمہ خالص اُردو میں کرنا چاہیں تو انہیں مسٹر "زہر دانی" کہیں گے۔ ہمارے پاس لے دے کے لالہ کوڑو رام ہی رہ گئے ہیں جن کے نام کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی بآسانی کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ملک لال خان یاد آ گئے۔ مدت ہوئی ایک صاحب نے اعراب لگا کے ان کے نام کو عربی بنا دیا تھا۔ ان دنوں ملک صاحب کے نام کے ساتھ فخرِ قوم ضرور لکھا جاتا تھا۔ عربی میں اس نام نے یہ صورت اختیار کر لی۔ فَخَرَ قَومِہِم مَلَکَ لَعَلَ خَان اور ترجمہ یہ ہوا۔ پس قوم ذلیل ہو گئی۔ شاید کہ ملک نے خیانت کی۔

ملک لال خان کے تذکرے میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ جن دنوں مسجد شہید گنج کی

بازیابی کی تحریک شروع ہوئی، مولانا ظفر علی خان صاحب قبلہ نے نیلی پوش جماعت قائم کی اور ملک صاحب بھی کانگریس کو چھوڑ کے اس جماعت میں شامل ہو گئے تو شور مچا کہ ملک لال خان کو اب اپنا نام نیلی خان رکھ لینا چاہیئے۔ ملک صاحب غصے میں بہت لال پیلے ہوتے رہے لیکن یار لوگ کب پروا کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں نیلی خان کہنا شروع کر دیا۔

عرب سرائے کو خان کہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک عرب سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہاں قیام ہے؟ کہنے لگے آج ہی کراچی سے آیا ہوں۔ سید محمد الکتنی تو ان دنوں یہاں نہیں ورنہ میں انہی کے ہاں ٹھہرا کرتا ہوں۔ اب کے ارادہ ہے کسی سرائے میں قیام کروں۔ کہو یہ خان ممدوٹ کیسی سرائے ہے؟ میں نے حیران ہو کے کہا: "خان ممدوٹ تو ہمارے وزیرِ اعظم ہیں۔" کہنے لگے "ہمیں بناتے ہو۔ میں نے اس سرائے کا اشتہار اکثر اخباروں میں پڑھا ہے۔"

۱۲ر اپریل

پچھلے دنوں انگریزی زبان کے کئی الفاظ ہمارے سامنے آئے ہیں جن کا ترجمہ کرنے میں پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اخبار نویسوں کو خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔ انہی میں ایک لفظ "ریفیوجی" ہے۔ پاکستان کے اخباروں نے پہلے اس کا ترجمہ "پناہ گزین" کیا۔ پھر بعض اخباروں نے "پناہ گیر" لکھنا شروع کیا جو "پناہ گزین" سے بہتر ہے۔ لیکن اب پناہ گیروں کو مہاجرین لکھا جا رہا ہے جو پناہ گزین اور پناہ گیر دونوں سے بہتر ہے۔

ہندوستان کے اخباروں نے ریفیوجی کا ترجمہ "شرنارتھی" کیا جو "پناہ گیر" کا ہم معنی ہے

اس پر ہندوؤں اور سکھوں نے شور مچایا کہ ہم کسی کی پناہ لینے نہیں آئے۔ ہمیں "شرنارتھی" نہ کہیئے۔ اخبار نویسوں نے سنسکرت کی پرانی کتابوں کو چھان مارا لیکن انہیں مہاجرین سے ملتا جلتا کوئی لفظ نہ ملا۔

اور سنسکرت کی پرانی کتابوں میں مہاجرین سے ملتا جلتا لفظ کیسے ملتا۔ پرانے زمانے میں ہندوستان کے لوگوں نے کبھی ہجرت نہیں کی۔ البتہ لوگوں کو "بن باس" ضرور ملتا رہا ہے لیکن ہندوستان کسی جنگل کا نام تو نہیں، اس لئے جو لوگ پاکستان سے اٹھ کے ہندوستان چلے گئے ہیں انہیں "بن باسی" کیونکر کہا جا سکتا تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ان لوگوں کو "پیڑت" یعنی درد رسیدہ کہنا چاہیئے۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں آج اسی لفظ کا چلن ہے۔ اخباروں میں روز مضمون چھپ رہے ہیں کہ "پیڑتوں" کی حالت خراب ہے۔ ان کا کوئی انتظام ہونا چاہیئے۔

ریفیوجی کا ترجمہ کرنے میں تو پاکستان ہندوستان سے بازی لے گیا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمیں "ری ہیبی لی ٹیشن" کا کوئی اچھا ترجمہ نہیں سوجھ سکا۔ "بحالی" اچھا خاصا لفظ تھا لیکن یار لوگوں نے اسے بھی "بحالیات" بنا لیا ہے۔ چنانچہ آج کل محکمۂ بحالیات اور وزیر بحالیات کو اور کہیں نہ سہی، کم از کم اردو زبان میں خاصی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان کے بعض اخباروں نے "ری ہیبی لی ٹیشن" کا ترجمہ "پھر بساؤ" کیا ہے چنانچہ "الجمعیۃ" جیسے اخبار میں 'پھر بساؤ محکمہ' اور 'پھر بساؤ کمیٹی' جیسے الفاظ نظر آ رہے ہیں حالانکہ الجمعیۃ علماء کا اخبار ہے اور حضرات علماء چاہتے تو عربی سے کوئی ایسی اصطلاح تلاش کر لاتے کہ ہندوستان تو ہندوستان پاکستان کے لوگ بھی اسے سمجھ نہ سکتے۔

ہمارے خیال میں "پھر بساؤ" اچھی خاصی اصطلاح ہے۔ پاکستان کو بھی "بحالیات" کی جگہ اسے ہی اختیار کر لینا چاہئے۔ "ریفیوجی" کا ترجمہ کرتے وقت یہی قاعدہ ملحوظ رکھا جاتا تو بڑی آسانی سے "چھوڑ آؤ" کی اصطلاح گھڑی جا سکتی تھی۔ محکمۂ "مہاجرین و بحالیات" تو محض تکلف ہے۔ اسے بھی "چھوڑ آؤ اور پھر بساؤ" محکمہ کہنا چاہئے۔

ترجمے کے اس قاعدے کو سامنے رکھا جائے تو وضع اصطلاحات کا جھگڑا ہی طے ہو جاتا ہے۔ مثلاً وزیرِ زراعت کو "ہل چلاؤ وزیر" کہنا چاہئے۔ وزیرِ خزانہ کو "روپیہ بچاؤ" ہوم منسٹر کو "گھر گھراؤ" اور وزیرِ خارجہ کو "باہر جاؤ"۔ شیخ کرامت علی صاحب وزیرِ صحت بھی ہیں اور وزیرِ تعلیم بھی اس لئے انہیں "لڑکے پڑھاؤ، نبض دکھاؤ وزیر" کہنا چاہئے۔

۱۴ر اپریل

ایک صاحب نے جو مدت تک کسی دیہاتی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں، شیخ کرامت علی صاحب کی ایک تقریر کے اقتباسات بھیجے ہیں۔ یہ تقریر جو شیخ صاحب کا بہت بڑا کارنامۂ خطابت سمجھی جاتی ہے انہوں نے ۱۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو پنجاب اسمبلی میں کی تھی۔ ان دنوں ملک خضر حیات خان وزیرِ اعظم تھے اور میاں عبدالحئی وزیرِ تعلیم۔ شیخ کرامت علی صاحب جو ان دنوں مسلم لیگ پارٹی میں سندھورہ میں سعدان سمجھے جاتے تھے، تقریر کرنے کھڑے ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بس ع

جنگل کا شیر گونج رہا ہے کچھار میں

شیخ صاحب کی عام تقریروں کی طرح اس تقریر کا رُخ بھی محکمۂ تعلیم اور میاں عبدالحئی مرحوم کی طرف تھا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے فرمایا:

"ہم کہتے ہیں اچھے استاد رکھو، انہیں اچھی تنخواہ دو، انہیں ٹریننگ دلاؤ۔

ہر سال پولیس کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر استادوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، رفاہِ عام پر زیادہ روپیہ خرچ ہو، لوگوں میں تعلیم پھیلے اور اخلاق سُدھریں۔ وزیر جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ بولنا ان کا پیشہ ہے۔ انہوں نے اپنے صوبے کی معاشی اور اخلاقی زندگی تباہ کر دی ہے۔"

زمانہ یہ ورق اُلٹ چکا۔ خضر حیات خان سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے۔ میاں عبدالحی نے وفات پائی۔ آج خان ممدوٹ وزیرِ اعظم ہیں اور شیخ کرامت علی صاحب نے بھی وکالت کو چھوڑ کے وزارت کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن نہ مدرّسوں کی حالت سُدھری، نہ کسی کو تعلیم پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کا خیال آیا۔ ہاں پولیس کے اخراجات میں ضرور اضافہ ہوا ہے۔

آگے چل کر شیخ صاحب نے فرمایا:

"اپاہج اور بے کار انسان انسپکٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک انسپکٹر ایسے ہیں کہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کاغذ پر رکھنا پڑتا ہے۔ ان کی بینائی قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ میں میاں عبدالحی سے پوچھتا ہوں، کیا یہ معاملہ ان کے نوٹس میں آیا؟"

تین سال کے عرصے میں محکمۂ تعلیم کے کئی افسروں کی بینائی خراب ہو چکی ہے۔ ہم شیخ کرامت علی صاحب سے پوچھتے ہیں، "کیا یہ معاملہ ان کے نوٹس میں آیا؟"

اس تقریر کا یہ حصّہ ٹیپ کے بند کی حیثیت رکھتا تھا:

"دیہاتی مدارس کے استادوں کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے ایک استاد سے پوچھا: ماسٹر جی! آپ کی تنخواہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا "مرغی کم دس روپے۔" میں نے کہا کیا مرغی کوئی سکّہ ہے؟" انہوں نے

جواب دیا "دس روپے اصل تنخواہ ہے۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہر مہینے آتا ہے، اسے مرغی کھلانی پڑتی ہے۔"

اگر بیچارے دیہاتی مدرس کی تنخواہ پہلے "مرغی کم دس روپے" تھی تو اب بھی یہی ہے کیونکہ نہ دیہاتی مدرسوں کی نیاز مندی میں فرق آیا ہے نہ انسپکٹروں کی قوتِ ہضم میں کوئی فتور واقع ہوا ہے۔ کھلانے والے اب بھی مرغیاں کھلاتے ہیں اور کھانے والے اب بھی کھاتے ہیں۔ بایں ہمہ ہم نیاز مندوں کو یہی سمجھنا چاہیئے کہ شیخ کرامت علی صاحب نے جب سے قلمدانِ وزارت سنبھالا ہے، نہ کوئی مرغی کھاتا ہے، نہ کوئی ظالم ہے نہ کوئی مظلوم، نہ رشوت دینے والے باقی رہے نہ لینے والے۔

پرسوں اسمبلی کے اجلاس میں بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے مولانا عبدالستار نیازی کو علامہ نیازی کہہ دیا۔ اس پر شیخ کرامت علی صاحب وزیرِ تعلیم نے فرمایا:

"بیگم صاحبہ نے مولانا نیازی کو بیک جنبشِ قلم علامہ بنا دیا۔ میں انہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ انہیں علامہ فہامہ بنا کے اتنا نہ بڑھائیں کہ وہ گلے کا ہار بن جائیں۔"

بیگم صاحبہ کی غلط بخشی تو افسوسناک ہے۔ انہیں علامہ کا خطاب ہی دینا تھا تو وزیرِ تعلیم سے زیادہ اس کا مستحق کون تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وزیرِ تعلیم کو تحریر و تقریر اور جنبشِ زبان و جنبشِ قلم کا فرق معلوم نہیں۔

۱۵ر اپریل

بیس بائیس برس ہوئے لاہور کے کچھ نوجوان طلبہ جنہیں شعر و سخن کا خاصا ذوق تھا، کلکتہ گئے۔ ایک دن پھرتے پھراتے مسجد ناخدا کے پاس سے گزرے تو ان

میں سے ایک نے کہا مرزا داغ کلکتہ آئے تو اسی نواح میں ٹھہرے تھے۔ دوسرا بولا نہیں کہیں لوئر چت پور روڈ پر ان کا قیام تھا۔ چنانچہ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں ؎

سامنے ناخدا کی مسجد تھی
ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مکان میں وہ ٹھہرے تھے وہ مسجد کے بالمقابل تھا۔

تیسرا نوجوان جو اپنے ساتھیوں سے زیادہ باخبر تھا۔ کہنے لگا میں نے سُنا ہے کہ لوئر چت پور روڈ پر مسجد ناخدا کے سامنے جو گلی ہے اس کے سرے پر مرزا داغ کی قیام گاہ تھی۔ یہ پتہ کافی تھا۔ چنانچہ سب کے سب اس کوچے میں گھس گئے۔ اتفاق سے مالک مکان گھر پر موجود تھا۔ ایک نوجوان نے اس سے پوچھا "کیوں صاحب مرزا داغ اسی مکان میں رہتے تھے؟"

"داغ کون؟"

"آپ مرزا داغ کو نہیں جانتے۔ اُردو کے مشہور شاعر تھے۔"

"حضرات آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس مکان میں کوئی شاعر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میں کرایہ ہمیشہ پیشگی وصول کرتا ہوں۔"

ہمارے ایک معاصر نے بعض شعراء کے نام گنوا کے لکھا ہے کہ ان کو اُردو کانفرنس میں کسی نے پوچھا تک نہیں۔ لیکن دنیا میں بچارے شاعر کی جو عزت ہے وہ اُوپر کے واقعے سے ظاہر ہے۔ کلکتہ کا ایک سوداگر تو بیچارے شاعر پر مہینے بھر کے کرایہ کا بھی اعتبار نہیں کرتا اور آپ چاہتے ہیں کہ اُردو کانفرنس والے اس پر اعتبار کر کے اپنے کسی اجلاس کی صدارت اس کے حوالے کر دیتے۔ ہوش کی دوا کیجئے حضرت۔ حلوا خوردن را روئے باید!

---

۱۷ اپریل

علّامہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی بہت بڑا عالم۔ ہندوستان کے پرانے اہلِ علم میں یا تو ابوالفضل اس لقب سے مشہور رہا ہے یا پھر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور سعداللہ خان چنیوٹی کے ناموں کے ساتھ علّامہ لکھا جاتا رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کو لوگوں نے علّامہ کہا اور بے شبہ وہ اپنے علم و فضل کے باعث اس لقب کے مستحق تھے۔

لیکن پچھلے چند برسوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو نیم ملّا یا استخواں بند شاعر اٹھتا ہے اپنے نام کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے علّامہ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں بعض تو موسمی علّامہ ہیں۔ یعنی آج انہیں علّامہ کہا جا رہا ہے۔ کل وہ بچارے مولانا یا نرے مولوی رہ گئے۔ لیکن بعض لوگوں نے تو علّامہ کا لقب اپنے ناموں کے ساتھ لئی سے نہیں بلکہ سریش سے چپکا رکھا ہے۔ یہ لوگ علّامہ کہلانے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور اس سے کم درجے کی کسی چیز یعنی مسٹر، مولوی یا مولانا پر رضامند نہیں ہوتے۔

یہ لوگ گھر کے اندر ہوں یا باہر۔ خلوت میں ہوں یا جلوت میں۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ہنستے روتے علّامہ ہیں۔ ان کے دفتر کے دروازے پر جو بورڈ لٹک رہا ہے، اس پر بھی جلی حروف میں علّامہ لکھا ہوا ہے۔ مکان کے دروازے کے ساتھ جو بوسیدہ سا لیٹر بکس آنے جانے والوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے اس کے ایک کونے پر بھی علّامہ کا لفظ صاف نظر آ رہا ہے۔ آپ انہیں "حضرت مولانا" کہہ کے دیکھ لیجئے۔ فوراً بگڑ جائیں گے لیکن "ابے او علّامہ" کہہ دیجئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ان نیم ملاؤں، شاعروں اور ناکام لیڈروں کو اس بات پر بڑا اصرار ہے کہ ان کے ناموں کے ساتھ علامہ ضرور لکھا جائے نہیں تو علم و فضل اور ادب و شعر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کہتے ہیں کہ اس قسم کے ایک بزرگوار نے اپنے ایک کلرک کو صرف اس لئے موقوف کر دیا تھا کہ اس نے ان کے نام کے ساتھ علامہ نہیں لکھا تھا اُدھر تانگہ والوں سے تو کئی مرتبہ ان کی ہاتھا پائی ہو چکی ہے۔ کیونکہ تانگے والے جو ان کے مقام سے بے خبر ہیں ہمیشہ انہیں بابو جی یا مولوی صاحب کہتے ہیں۔

ان دنوں لاہور میں اتنے علامہ حضرات موجود ہیں کہ اگر تانگہ یونین کے وزن پر وہ "علامہ یونین" بنا لیں تو تانگہ والوں کو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔ کیونکہ ان کی نفری تانگہ والوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ ہمارے خیال میں پہلے تو "علامہ تنظیم" ہونی چاہیئے۔ پھر یونین بنے اور ساتھ ہی یہ مطالبہ پیش کر دیا جائے کہ مغربی پنجاب کی اسمبلی اور لاہور کارپوریشن میں علامہ برادری کے لئے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔

دراصل لفظ "علامہ" میں صوتی اعتبار سے جو طنطنہ اور ہنگامہ ہے وہ نہ مسٹر میں ہے نہ مولانا میں۔ اس لئے جس شخص کو ہنگامہ آرائی کا کوئی اور طریقہ نظر نہیں آتا وہ اپنے نام کے ساتھ علامہ لکھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر سیاسیات یا شاعری کے پھٹے میں ٹانگ اڑا کے سمجھ لیتا ہے کہ بس میدان مار لیا۔ راقم الحروف کے ایک عزیز دوست نے جو فلم کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دیکھی "فلامہ" کہلانا شروع کر دیا ہے۔ اور ذرا حالات درست ہو لینے دیجئے یہ "فلامہ" اکثر علاموں سے زیادہ فائدے میں رہیں گے۔

علامہ تو عربی کا لفظ ہے۔ لیکن اُردو کے محاورے میں "علامہ" کے ایک اور معنی

بھی ہیں۔ یعنی یہ لفظ "قطّامہ" اور "حرّافہ" کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ جو لوگ علم کی دولت نہیں رکھتے اور محض اپنی چرب زبانی اور لسّانی کے باعث علاّمہ کہلاتے ہیں انہیں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کہیں لوگ انہیں انہی معنوں میں "علاّمہ" نہ سمجھ لیں؟

۱۸ر اپریل

پچھلے دنوں ہمیں ایک مدرّس نے آنریبل شیخ کرامت علی صاحب وزیر تعلیم کی ایک پرانی تقریر کے چند اقتباسات بھیجے تھے جنہیں ہم نے حرف و حکایت میں نقل کر دیا تھا۔ سُنا ہے کہ شیخ صاحب ہماری اس جسارت پر بے حد جھلاّئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کل مسلم ہائی سکول کے جلسۂ تقسیمِ انعامات میں انہوں نے جو تقریر کی اس میں سکول سے زیادہ "امروز" کا ذکر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مسلم ہائی سکول کے طلبہ کو انعام اور کارپردازوں کو داد ملی اور ہمارے حصّے میں گالیاں آئیں۔

شیخ صاحب نے فرمایا:

"یہ اقتباسات کسی مدرّس نے نہیں بھیجے۔ کوئی مدرّس یہ اقتباسات نہیں بھیج سکتا۔ اصل میں یہ ایڈیٹر کے اپنے دماغ کی اختراع ہے"

گویا ہمارے وزیر تعلیم کے نزدیک بچارے مدرّسوں میں اتنی اہلیت بھی نہیں کہ اخبار پڑھ کے اس کا مطلب سمجھ لیں یا کسی اخبار کا فائل محفوظ رکھیں اور اس کے بعض حصّے نقل کر لیں۔ اور وہ بچارے یہ مرحلے طے بھی کر لیں تو انہیں یہ معلوم نہیں کہ لفافے پر مکتوب الیہ کا پتہ کیسے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے مدرّسوں کی تنخواہ وہی ہونا چاہئے جو میاں عبدالحی مرحوم کے عہدِ وزارت میں تھی۔ یعنی "مرغی کم دس روپے" ـــــ غالباً لسان الغیب نے یہ شعر شیخ کرامت علی صاحب ہی کے حق میں کہا ہے ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرّس شد

اس کے بعد شیخ صاحب نے فرمایا:

"اس اخبار (امروز) نے میری تقریر کے جو حوالے دیئے ہیں وہ غلط نہیں درست ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ان دنوں پنجاب اسمبلی میں محکمۂ تعلیم پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں پنجاب وہ کچھ نہ تھا جو آج ہے۔ اُس وقت اس حکومت میں انگریزی حکومت کا ہاتھ تھا۔ اُس وقت حکومت پر نکتہ چینی کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔"

(کذا فی الاصل)

شیخ صاحب نے صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ ان دنوں میاں عبدالحی وزیرِ تعلیم تھے اور اب وزارتِ تعلیم کا قلمدان میرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے عیب و ہنر کا نقشہ بدل چکا ہے۔ زہر تریاق بن گیا ہے اور گناہ نے ثواب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہی مضمون سیدھے سادے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ میاں عبدالحی کی وزارت میں اسسٹنٹ انسپکٹر پر مرغی حرام تھی۔ لیکن اب حلال ہے۔ اور یہ تو مرغی ہے خاص موقع اور مقام پر یار لوگ کوّے کو بھی حلال کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سُنا ہوگا کہ ع

آغا تقی کے باغ میں کوّا حلال ہے

اس موقع پر جو لوگ موجود تھے ان کا بیان ہے کہ شیخ صاحب کی تقریر کے اکثر حصّے کسی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ ایک تو جس اُردو میں وہ تقریر کرتے ہیں وہ انہوں نے خاص طور پر آرڈر دے کے زبان کی کسی نئی ٹکسال میں ڈھلوائی ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ وہ کچھ اس طرح بے موقع استعمال کرتے ہیں کہ سارا مطلب خبط

ہو جاتا ہے۔ مثلاً انہوں نے لفظ "مقام" اس طرح بار بار جا و بے جا استعمال کیا کہ سُننے والوں کو "زکام" ہو گیا اور "ماحول" کی تکرار کی تو لوگ "لاحول" پڑھنے پر مجبور ہو گئے

شیخ صاحب کی تقریر کے آخری حصّے کا مطلب غالباً یہ تھا کہ میاں عبدالحی کے زمانے میں پنجاب بڑا خوش حال تھا اور انگریز موجود تھے لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ مدرسوں کی بہبودی کی خاطر کچھ کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے خیال میں شیخ صاحب کو ان فرسودہ ولیلوں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے جرأت سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ بھائیو! جو تقریریں محض الکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہیں ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ تقریر کرنے والے کو سچ مچ عوام سے ہمدردی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں نے اگر میری پُرانی تقریروں سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں مدرسوں کا ہمدرد ہوں تو آپ نے سخت غلطی کی اور "امروز" نے بھی میری تقریر پر اعتراض کر کے جھک ماری۔

اگر وہ اس قسم کی تقریر کرتے تو لوگ ان کی صاف گوئی کی داد دیتے اور مدرسوں کے مطالبوں سے انہیں ہمیشہ کے لئے نجات ہو جاتی۔

---

۱۹ اپریل

سیّد عبدالقادر صاحب جو ہمارے صوبہ کے مشہور اہلِ علم میں سے ہیں اور مدتوں اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، ان دنوں "نجومی" بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں جب یہ افواہ اُڑی تھی کہ لاہور میں زلزلہ آنے والا ہے تو سیّد صاحب نے اعلان کیا تھا کہ لاہور میں زلزلہ ہرگز نہیں آئے گا۔ ان کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی چنانچہ لاہور زلزلہ سے محفوظ رہا۔

حال میں سیّد عبدالقادر صاحب نے "پاکستان کا زائچہ یعنی جنم پتری" کے نام سے ایک

مضمون لکھا ہے جو "نوائے وقت" میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں جوتشی جی نے لگن اور مہورت بچار کے بتایا ہے کہ پاکستان کی نیوبڑی شبھ گھڑی میں پڑی ہے۔ کیونکہ ۱۵ اگست کو جب رات کے بارہ بجے تو سورج اور چندرماں دونوں تُلا یعنی بُرج میزان میں تھے۔ شبھ گھڑی۔ شبھ لگن۔ سندر مہورت۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان سرکار کا بل اور ساہس بڑھے۔ بَیری پاؤں پڑیں۔ نرناری دونوں کا کلیان ہو۔ ساری پرجا سُکھی رہے۔ پر اتنا ضرور ہے کہ اگیان گیان سے بڑھ جائے گا۔ ودّوانوں کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ مُورکھ لوگ بڑا ادھیکار پائیں گے، دیوان اور منتری کہلائیں گے۔ لیکن لگن کا مالک شُکّر ہے۔ اس لئے جان پڑتا ہے کہ بالک کے ساتھ نریا کا ادھیکار بھی بڑھے۔ ناری کا مان بڑھے۔ نر کی ہین ہو۔ استری جاتی اپنے روپ انوپ سے من رجھائے، دل لبھائے، اس کی سندرتا کی ٹھلک سے راج دربار میں اُجالا ہو۔ راج نیتی کے کام کاج میں اسی کا بول بالا ہو۔ پر اس سمے مجھے وشنواؤں کا دھن بچتا دکھائی نہیں دیتا۔ راجہ راج ہرے۔ نواب کی نوابی جائے۔ جاگیر چھنے۔ سینچر پاؤں پڑے۔ زردر کے دھکے کھائے۔ بھوکا کنگال ہو جائے۔

جوتشی جی یعنی سید عبدالقادر نے یہ باتیں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ جنم پتری میں نے سائیں کرم الٰہی کے مشورے سے تیار کی ہے۔ کوئی جوتشی اس میں مین میکھ نکالے تو ہم پھر ان باتوں پر سوچ بچار کرنے کو تیار ہیں۔

"نوائے وقت" کے ایڈیٹر صاحب کو اس جنم پتری سے پورا پورا اتفاق ہے۔ اسی لئے انہوں نے یہ مضمون من و عن چھاپ دیا اور یہ کہیں نہیں لکھا کہ ایڈیٹر کا جوتشی کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

سید عبدالقادر صاحب مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:

"غالباً قائداعظم نے پاکستان کے جنم کا وقت مقرر کرتے وقت کسی منجم یا

جوتشی سے مشورہ نہیں لیا۔ لیکن وہ کسی جوتشی سے مشورہ بھی کر لیتے تو اس مبارک موقع کے لئے اس سے بہتر وقت مقرر نہیں کر سکتے تھے۔"

لیکن سید صاحب کو یاد نہیں رہا کہ پاکستان کی "ولادت" کا وقت قائدِ اعظم نے نہیں بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مقرر کیا تھا۔ شکر ہے کہ انہوں نے کسی جوتشی سے مشورہ نہیں کیا ورنہ پاکستان کے قیام کے لئے ایسی ساعتِ سعید ہرگز مقرر نہ کی جاتی۔ یہ تو محض اتفاق کی بات ہے۔

بہرحال اب پاکستان کو محض "اتفاقات" کے بھروسے پر نہیں بیٹھ رہنا چاہیے، بلکہ فوراً نجوم کا محکمہ قائم کر کے اس کا سارا انتظام سید عبدالقادر کے حوالے کر دینا چاہیے۔ پرانے زمانے کی سلطنتوں میں منجم کا عہدہ بڑی اہمیت رکھتا تھا اور حکومت کوئی کام جوتشی سے مشورے کئے بغیر نہیں کرتی تھی۔ آج سے دس بیس برس پہلے تک ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں جوتشی موجود تھے اور والیانِ ریاست ان کے مشورے سے بڑے بڑے اہم فیصلے کرتے تھے۔ پاکستان میں جہاں اکثر پرانے علوم زندہ کئے جا رہے ہیں۔ نجوم کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ مغربی پنجاب میں پبلک ریلیشنز یعنی "رابطۂ عامہ" کا محکمہ تو موجود ہے لیکن کسی کو شمس و قمر، عطارد و مشتری وغیرہ سے ربط قائم کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ حالانکہ جب تک کوئی لگن اور مہورت بچارنے والا نہ ہو پبلک ریلیشنز کے محکمہ کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ سید نور احمد صاحب[1] کو کیا معلوم کہ کون سا پریس نوٹ کس وقت جاری کرنا چاہیے۔ کس اعلان کے لئے کون سی گھڑی مناسب ہے۔ یہ کام کرنا ہے تو ٹھکانے سے کیجئے۔ یعنی مہورت پوچھئے۔ فال نکلوائیے۔ اکبر بادشاہ مہورت پوچھے بغیر درشن کے جھروکے میں آ کے بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ ہمارے وزراء اسمبلی میں بیٹھا نیز

---

[1] ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز۔ پنجاب

پلیش کرتے ہیں اور یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ شمس میزان میں ہے یا سنبلہ میں، حالانکہ میزان اور میزانیہ اور سنبلہ اور سنبلی میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا یہ چپ رہنے کا موقع ہے یا بولنے کا۔

اور ہمارے خیال میں نجوم کے ساتھ ساتھ رمل، جفر اور سامدرک یعنی علم الید کو بھی زندہ کرنا چاہیئے۔ اتفاق سے خواجہ دل محمد جیسے حسابی بھی ہمارے ہاں موجود ہیں جو رمل اور جفر دونوں میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ سید عبدالقادر اور خواجہ صاحب دونوں ایک محکمہ میں جمع ہو جائیں تو اس اجتماع کو "قران السعدین" سمجھیئے اور خدا کا شکر ادا کیجیئے۔ سید صاحب نجوم کے زور سے پاکستان کی آئندہ ہزار سالہ تاریخ لکھ ڈالیں گے، اور خواجہ صاحب رمل "لڑا کے" پانچ سو برس کا بجٹ مرتب کر لیں گے۔

۲۱ر اپریل

آپ نے یہ شعر کئی بار سُنا ہوگا ؎

چہ خوش گفتہ است سعدی در زلیخا

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

"یوسف زلیخا" سعدی کی نہیں بلکہ جامی کی تصنیف ہے اور سعدی سے جو مصرع منسوب کیا گیا ہے وہ حافظ کا ہے۔ اسی لئے اس شعر کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جب کسی کی بوالعجبی کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو یہ شعر نقل کر دیا جاتا ہے۔

لیکن مغربی پنجاب کے ایک بہت بڑے لیڈر جو دو تین دن ہوئے یوم اقبال کے سلسلے میں ایک مشاعرے کی صدارت فرما چکے ہیں، اس مقام سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔ گذشتہ انتخابات میں انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے

فرمایا:
"شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں غالبؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"

شعر مومنؔ کا ہے، تخلص غالبؔ کا اور اسے منسوب کیا گیا ہے شیخ سعدی سے۔

یہ آغا شورشؔ کاشمیری ایڈیٹر "آزاد" کی روایت ہے جو خود اس جلسے میں موجود تھے۔
اتوار کو ترقی پسند مصنفین کے اہتمام سے یومِ اقبال کے سلسلے میں جو جلسہ ہوا اس میں شورشؔ صاحب نے ایک خاصے بڑے مجمع کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا اور ان بزرگوار کا نام بھی بتا دیا۔ لیکن ہم ان کا نام نہیں لکھتے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی ہم سے ناراض ہیں۔ آپ خود ہی بُوجھ لیجئے۔ بہر حال اس واقعہ سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

یومِ اقبال کے سلسلے میں ایک صاحب نے ہمارے نام ایک خط لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ لوگ ہر سال بڑی دھوم دھام سے یومِ اقبالؔ تو منا لیتے ہیں۔ لیکن کسی کو حکیم الامت کی کوئی موزوں یادگار قائم کرنے کا خیال نہیں آتا۔"

علامہ اقبالؔ کی یادگار میں ایک روزنامہ اخبار لو مدت سے نکل رہا ہے۔ اس کے علاوہ "اقبال گھی سٹور" بھی قائم ہو چکا ہے۔ آپ کو مرحوم کی یادگار قائم کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو نان کباب اور چائے کی ایک دکان کھول کر اس کا نام "اقبال ہوٹل" رکھ لیجئے۔

آگے چل کر یہ صاحب لکھتے ہیں :

"افسوس تو یہ ہے کہ ابھی تک علامہ اقبال کا مقبرہ تعمیر نہیں ہو سکا تعجب ہے کہ حکومت بھی اس معاملے کی طرف توجہ نہیں کرتی"

آپ نے سُنا نہیں ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجوئے
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

اور یہ "مردمِ عارف" کون ہیں؟ ہمارے وزراء اور کون؛ ہماری سُنئے تو اقبال کا نام لے لے کے حکومت پر نکتہ چینی نہ کیجئے۔ بلکہ اگر آپ کے نام خوش قسمتی سے کوئی دکان الاٹ ہو گئی ہے تو اقبال ہوٹل، اقبال ریستوران یا اس قسم کا چھوٹا موٹا کاروبار کھول کے بیٹھ جائیے۔ رسمِ افتتاح کے لئے ہم کسی وزیر کو پکڑ لائیں گے اور ایک آدھ تقریر بھی کرا دیں گے۔

ایک صاحب کہنے لگے :

"بھئی یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال اپنے کلام میں پنجابی کے الفاظ بڑی بے تکلفی سے لے آتے ہیں تو اس میں بہت حد تک اصلیت ہے۔ مثلاً اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

اب آپ ہی انصاف کیجئے "کدوں کے" خالص پنجابی ہے جس کا اُردو ترجمہ "کبھی کے" ہے ——"

یومِ اقبال کے جلسوں کے سلسلے میں جو اشتہار چھپے ہیں ان میں ان صاحب کا نام کہیں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے سہواً ان کا نام نظر انداز ہو گیا ہے ورنہ وہ ایسے تو نہیں کہ اس موقع پر پیچھے رہ جائیں۔ کسی جلسے کی صدارت نہ فرمائی تو مشاعرے کی

صدارت کریں گے۔ لاہور میں نہ سہی، سیالکوٹ میں سہی۔ سیالکوٹ میں نہ سہی، جہلم یا ڈیرہ اسمٰعیل خان میں سہی ؏

گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

۲۲ر اپریل

سُنا ہے کراچی میں "یومِ اقبال" پر قوالی کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں فوراً اس بدعت کی روک تھام کرنی چاہیئے ورنہ آج یومِ اقبال پر قوالی ہو رہی ہے، اگلے سال طوائف کے مجرے کا انتظام ہوگا اور یومِ اقبال اچھا خاصا عرس بن کر رہ جائے گا۔

ہمارے خیال میں تو اس موقع پر بزمِ مشاعرہ برپا کرنا بھی بڑی انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ کیونکہ علامہ مرحوم مشاعروں کے قائل نہیں تھے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف نے ان سے پوچھا۔ آپ مشاعروں میں کیوں نہیں جاتے ؟ کہنے لگے مشاعروں نے شاعری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ جس شعر پر داد ملتی ہے شاعر اسی انداز کے شعر کہنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح شاعری مذاقِ عام کی تابع ہو کے رہ جاتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے ان دنوں لاہور کی سڑکوں کے نئے نام رکھنے کے سوال پر غور کیا جا رہا ہے۔ کسی نے بعض اربابِ اختیار سے کہا: میرے خیال میں تو مال روڈ کا نام اقبال روڈ ہونا چاہیئے۔ جواب ملا: مال روڈ سے اقبال کا کیا تعلق ؟ ہمارا ارادہ تو یہ ہے کہ میو روڈ کا نام اقبال روڈ رکھ دیا جائے۔

اور بات ٹھیک بھی ہے۔ علامہ اقبال لاہور آئے تو پہلے کچھ دنوں بازار حکیماں میں رہے۔ پھر انار کلی اور میکلوڈ روڈ میں زندگی کا کچھ عرصہ گزارا۔ عمر کے آخری زمانے میں میو روڈ پر کوٹھی بنوائی اور وہیں انتقال فرمایا۔ وہ مال روڈ سے گذرے ضرور ہوں گے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ علامہ اقبال جس سڑک سے گزر جائیں اس کا نام اقبال روڈ رکھ دیا جائے۔

اور یہ اندازِ استدلال اختیار کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یومِ اقبال بھی میو روڈ یا میکلوڈ روڈ پر منانا چاہئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ علامہ اقبال نے عمر کا بہترین حصہ تو میکلوڈ روڈ پر گذارا اور یومِ اقبال حبیبیہ ہال میں منایا جا رہا ہے اور لاہور سے تو خیر علامہ مرحوم کو تعلق بھی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کراچی میں قوالی کیوں ہو؟ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں جلوس کیوں نکلے؟

بات یہ ہے کہ مال و منال والے لوگ مال روڈ کو اپنے باپ دادا کا مال سمجھتے ہیں۔ مال کے ان مالکوں کو یہ کب گوارا ہے کہ اسے اقبال سے منسوب کیا جائے۔ ان لوگوں کا بس چلے تو حکم دے دیں کہ جسے ٹھیک چال سے چلنا نہیں آتا اسے مال کو پامال کرنے کی اجازت نہیں۔

آپ نے ایک فرق ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ پہلے یومِ اقبال منایا جاتا تھا تو اقبال کے کلام کے متعلق مقالے پڑھے جایا کرتے تھے جن میں زیادہ تر اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ اقبال کا کلام قرآن کی شرح و تفسیر ہے۔ اسلام جس معاشی مساوات کا حامی ہے، اقبال نے بھی اسی کی حمایت کی ہے لیکن اب کے مقالے کم ہیں، اور شور و غل زیادہ۔ یومِ اقبال کے جلسوں کی صدارت کے لئے زیادہ تر ایسے لوگوں کو چنا گیا ہے جن کے نام تو ضرور پُر شکوہ ہیں لیکن وہ اقبال کے کلام کو نہیں سمجھتے۔

گویا یومِ اقبال چند پُرشکوہ ناموں، چلتے فقروں، مشاعرہ اور قوالی کی محفلوں میں گھر کے رہ گیا ہے۔

جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مال روڈ کا نام اقبال روڈ رکھ دیا جائے تو ہمارے اربابِ اختیار کہتے ہیں کہ مال روڈ سے علامہ اقبال کا کیا تعلق؟ وہ تو میو روڈ پر رہتے تھے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ اقبال معاشی مساوات کے حامی تھے تو ارشاد ہوتا ہے کہ وہ شاعر تھے اور شاعر لوگ ہر قسم کی باتیں کہا کرتے ہیں۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یومِ اقبال کے جلسے کی صدارت فرمائیے تو کہتے ہیں: "ہم کس لائق ہیں۔ علامہ اقبال پاکستان کے بانی تھے اور ہم پاکستان کے خادم ہیں۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو یوں ہی سہی۔ لائیے یہ ہار بھی ہمارے ہی گلے میں ڈال دیجئے۔ قوم کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور یوں بھی حضرت علامہ مرحوم سے ہمیں جتنی عقیدت ہے اور کس کو ہوگی؟"

۲۴ر اپریل

اکثر لوگوں کو شکایت ہے کہ دکانیں اور مکان الاٹ کرنے کے سلسلے میں بڑی بڑی بے قاعدگیاں ہوئی ہیں اور کہیں کہیں تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دکان ایک ہے اور اس کی "الاٹمنٹ" کا پروانہ تین آدمیوں کے پاس موجود ہے۔

مرکزی مجلسِ اقبال کو شکایت ہے کہ "یومِ اقبال" پر تو ہمارا حق شفعہ تھا مگر نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو کیسے الاٹ کر دیا؟ لیکن ہمارے خیال میں یہ الاٹمنٹ پکی ہو چکی۔ اس لئے مجلسِ اقبال کے کارپردازوں کو صبر سے کام لینا چاہئے۔ تِلکَ الایّام نداولہا بین النّاس۔

یقین رکھئے کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور کچھ کرے نہ کرے "یوم اقبال" ضرور منایا کرے گی۔ ہاں یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگلے سال یوم اقبال کسی اور کو الاٹ نہ ہو جائے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک دکان آج ایک کے پاس ہے۔ کل دوسرے کے پاس اور دو دن کے بعد دیکھتے ہیں تو کوئی اور اس پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ سچ ہے

ع کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

سُنا ہے "یوم اقبال" کے منتظمین سے کسی شخص نے پوچھا: سیّد نذیر نیازی تو علامہ اقبال کی خدمت میں برسوں رہے ہیں۔ آپ نے ان سے کوئی مقالہ پڑھوانے کا کچھ انتظام نہیں کیا؟ جواب ملا: مقالے درخواست پر "الاٹ" ہوتے ہیں۔ انہوں نے درخواست نہیں دی اس لئے کوئی مقالہ "الاٹ" نہیں ہو سکا۔

اس سے پہلے جو زمانہ گذر چکا ہے وہ انگریزی گورنمنٹ اور لاٹ صاحب بہادر کا زمانہ تھا۔ لیکن اب "الاٹ منٹ" یا عام لوگوں کی زبانوں میں یوں کہئے کہ "الاٹ صاحب" کا زمانہ ہے۔ لاٹ صاحب گئے "الاٹ صاحب" آ گئے۔ آج کل دکانیں الاٹ ہوتی ہیں، مکان الاٹ ہوتے ہیں، زمینیں الاٹ ہوتی ہیں، فیکٹریاں الاٹ ہوتی ہیں، نیک نامی الاٹ ہوتی ہے، علم الاٹ ہوتا ہے، عقل الاٹ ہوتی ہے۔ قطب صاحب کی لاٹ دلّی میں ہے۔ نہ معلوم اس پر کیا گزری لیکن لاہور میں ہوتی تو وہ بھی کسی کو یوں چپ چاپ الاٹ ہو جاتی کہ آپ کو یا ہمیں کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔

بدھ کو یونیورسٹی ہال میں سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام جو جلسہ ہوا اس میں بڑی دھوم دھام تھی۔ یعنی صرف ڈائس پر دو سفیر، دو وزیر، تین علامے، کئی مولانا اور مولوی تشریف فرما تھے۔ لطف یہ ہے کہ اس موقع پر سب سے اچھی تقریر

صدرِ مجلس یعنی برما کے سفیر صاحب نے کی اور وزیر اور علاّمے، مولوی اور مولانا منہ تکتے رہ گئے۔

برما کے سفیر صاحب نہ اُردو جانتے ہیں نہ فارسی۔ لیکن انہوں نے علاّمہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کے بارے میں جو کچھ کہا وہ اکثر مقرروں کی لمبی لمبی تقریروں سے زیادہ وزنی تھا۔

"علاّمہ" اسد نے تقریر کرتے وقت اگرچہ ایک آیت اور ایک حدیث بھی پڑھی۔ تین چار مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ بھی کہا لیکن اقبال کا ایک شعر بھی نہ پڑھ سکے کیونکہ برمی سفیر کی طرح انہیں نہ اُردو آتی ہے نہ فارسی۔ بعض دوسرے اصحاب نے اگرچہ بڑا زورِ بیان دکھایا۔ لیکن انہیں بھی اپنے دلائل کی تائید میں اقبال کا کوئی شعر نہ سُوجھا۔ البتہ برمی سفیر نے فارسی سے ناواقف ہونے کے باوجود اقبال کا ایک قطعہ اس روانی سے اور اتنا برمحل پڑھا کہ سب حیران رہ گئے ؎

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از شام
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

۲۵ر اپریل

ہمارے ایک معاصر نے پچھلے دنوں لکھا تھا کہ حکومت پر تخریبی نکتہ چینی کی بجائے صرف تعمیری نکتہ چینی کی جائے۔ اگر کسی شخص کی تحریر یا تقریر میں تخریب کا رنگ نظر آئے حکومت کو فوراً اس کا ٹینٹوا دبا لینا چاہیئے۔ معاصر "انقلاب" نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ آپ نے تعمیری اور تخریبی نکتہ چینی کا ذکر کیا ہے تو اب لگے ہاتھوں اس کی حدود بھی بتا دیجئے۔ تاکہ جب ہمارا اشہبِ قلم تعمیر کے دائرے سے نکل کے تخریب کے میدان میں قدم رکھنا چاہے، ہم باگیں کھینچ کے اسے روک لیا کریں۔

ہمارے خیال میں تعمیری نکتہ چینی کی ایک بہت اچھی مثال وہ قرارداد ہے جو یونیورسٹی ہال کے جلسے میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے پیش کی گئی۔ اس قرارداد کا مضمون یہ تھا کہ حکومت کو اقبال اکیڈیمی قائم کرنے کے علاوہ علامہ اقبال کے مرقد کی تعمیر کے لئے ایک گراں قدر رقم بھی منظور کرنی چاہیئے۔ لطف یہ ہے کہ جن صاحب نے یہ قرارداد پیش کی انہوں نے یہ بھی کہا کہ حضرات! یہ تخریبی نہیں بلکہ صرف تعمیری نکتہ چینی ہے۔

اگر کوئی اخبار لکھے کہ موجودہ وزارت کو توڑ دینا چاہیئے تو یہ تخریبی نکتہ چینی ہے ایسے اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر بلکہ سارے عملے کو توپ دم کر دینا چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی اخبار یہ لکھ دے کہ وزیروں کی تعداد بڑھا کے ۱۴ کی بجائے ۱۴ یا ۴۲ کر دی جائے اور چودھری محمد حسن کو ضرور وزارت میں لیا جائے۔ کیونکہ وہ بچارے "مہاجرین" ہیں، تو یہ تعمیری نکتہ چینی ہے۔

اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ابھی تک ۲۸ لاکھ مہاجرین کو آباد کرنے کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ بہت سی زمین پر مقامی مہاجرین نے قبضہ کر رکھا ہے اور بڑے بڑے افسر اپنے عزیزوں اور دوستوں میں زمینیں، دکانیں اور فیکٹریاں تقسیم کر رہے ہیں، تو یہ تخریبی نکتہ چینی ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کہتے ہیں وہ پانچویں کالم کے آدمی ہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ مہاجرین کی آبادکاری کا کام بڑا مشکل تھا، حکومت کو بڑی سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن بحمداللہ کہ مہاجرین میں سے اکثر و بیشتر کو آباد کرنے کا بندوبست ہو گیا ہے اور جو تھوڑے سے مہاجر رہ گئے ہیں انہیں بھی بہت جلد آباد کر دیا جائے گا تو یہ تعمیری نکتہ چینی ہوئی۔

بعض اخبارات آئے دن اس قسم کی باتیں بھی لکھتے رہتے ہیں کہ آنریبل وزیر تعلیم کو

اُردو نہیں آتی۔ ان کا تلفظ غلط ہوتا ہے۔ وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی بے معنی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بھی تخریبی نکتہ چینی ہے۔ اس خیال کو "تعمیری انداز" میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ آنریبل شیخ کرامت علی کو مشق سے مشکل تقریر لکھ کے دے دیجئے۔ ایک دو مرتبہ ریہرسل کرنے کے بعد وہ بڑے سے بڑے مجمع میں اسے اس روانی سے پڑھ ڈالیں گے جیسے ان کی ساری عمر اس قسم کی تقریریں پڑھتے ہی گزری ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ خود شاعر نہیں لیکن تقریر میں کہیں شعر آجائے تو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ البتہ ان سے کہیں کہیں تلفظ کی غلطی ضرور ہو جاتی ہے۔ مثلاً یونیورسٹی ہال میں انہوں نے جو تقریر پڑھ کے سُنائی اس میں مُزمِن کو مزمّن کہہ گئے۔ لیکن خدا نے چاہا تو مشق اور ریہرسل سے یہ نقص بھی دور ہو جائے گا۔

شعرا میں خواجہ حافظ اکثر اوقات تخریبی نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار سراسر تخریبی ہیں ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

غالب کا بھی یہی حال ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

اور اقبال کا تو سارا کلام تخریبی نکتہ چینی سے بھرا پڑا ہے۔ البتہ استاد ذوق کی نکتہ چینی کا انداز ہمیشہ تعمیری رہا ہے۔ ان کا یہ شعر تو آپ نے ضرور سُنا ہوگا ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

یہاں فیض سے فیض احمد فیض مراد نہیں۔

غرض یہ ہے تعمیری تنقید جس کے دائرے میں ہر اخبار کو رہنا چاہیئے ع
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے کبھی تعمیری نکتہ چینی کے دائرے سے قدم باہر نہیں نکالا۔ جہاں ذرا قلم بے مہار ہوا ہم نے اسے فوراً یہ کہہ کے روک دیا ؎

اشتر صراحی گردنا دانم چہ خواہی کردنا
گردن درازی مے کنی پنبہ بخواہی خوردنا

۲۶ر اپریل

بعض حضرات ہم سے خطوں میں ایسے ایسے سوال کرتے ہیں جن کا جواب دینا اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے ہمارے نام ایک لمبا چوڑا خط لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سرکار دربار میں اُردو کا چلن کب ہوگا؟ اور انگریزی کو کب دیس نکالا ملے گا؟

اگر سید عبدالقادر صاحب قبلہ جنہوں نے پچھلے دنوں مملکتِ پاکستان کا زائچہ اخباروں میں چھپوایا تھا، ہمت کر کے اُردو کا زائچہ بھی بنا ڈالیں تو ہمیں اس قسم کے بہت سے سوالوں سے ہمیشہ کے لئے نجات ہو جائے۔ بہر حال اس فن میں جو تھوڑی سی شُدبُد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی نہ تو انگریزی کو دیس نکالا ملے گا اور نہ اُردو سرکار دربار میں جگہ پائے گی۔

بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر بڑے بڑے لوگوں کا یہ حال ہے کہ انگریزی

کے بغیر ان کا دو قدم چلنا محال ہے۔ یہ بزرگوار انگریزی بولتے، انگریزی لکھتے، انگریزی پہنتے اور انگریزی اوڑھتے ہیں۔ یعنی ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے۔ ان لوگوں کو غصہ انگریزی میں آتا ہے، وہ گالیاں انگریزی میں دیتے ہیں۔ بلکہ محبت بھی انگریزی ہی میں کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ میر یا داغ کا کلام پڑھا اور رو دھو لئے۔ اس لئے یہ توقع بے سُود ہے کہ اُردو چند برس کے اندر انگریزی کی جگہ لے لے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر اُردو کی پُر زور حمایت کرتے ہیں اور اپنی تقریروں میں بار بار کہتے ہیں کہ پاکستان کی زبان اُردو ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اُردو کو وہی حیثیت دے دینا چاہتے ہیں جو انگریزی کو حاصل ہے۔ آخر لیڈر لوگ اپنی تقریروں میں بار بار اسلام کا نام بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ——

طبیب کہتے ہیں کہ ہمیں ڈاکٹروں کا درجہ دیا جائے۔ اُردو کے مدرّسوں کا مطالبہ ہے کہ انگریزی کے ٹیچروں جتنی تنخواہ ملنی چاہئے۔ گویا ان دنوں ہمارے ہاں عام رجحان یہ ہے کہ ہر دیسی چیز کو بدیسی پر فوقیت دی جائے۔ خمیرہ بنفشہ پیپس کی ٹکیا کو خاطر میں نہیں لاتا۔ گئو دنتی کا کشتہ اسپرین پر زہر کھا رہا ہے۔ گلوُ کو کونین کی برابری کا دعویٰ ہے اور نقوعِ شاہترہ توجوش کے عالم میں پنسلین سے آگے بڑھا جا رہا ہے۔

اور یہی نہیں اُردو کے قاعدے کو کنگنہ پرائمر کی برابری کا دعویٰ ہے اور لغاتِ کشوری اپنے آپ کو ویبسٹر ڈکشنری کا ہم پلّہ سمجھتی ہے یعنی ہر شخص جو اُردو پڑھتا لکھتا ہے یا بولتا ہے اس کی خواہش یہ ہے کہ مجھے انگریزی پڑھنے لکھنے اور بولنے والوں سے بہتر سمجھا جائے۔

دراصل یہ لوگ "اُردو اُردو اور وطن وطن" کا شور سن کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سچ مچ اس سرزمین میں ہر طرف اُردو ہی اُردو نظر آئے گی اور انگریزی کو کوئی

پوچھے گا نہیں۔ یعنی رانی باندی بن جائے گی اور باندی رانی کی جگہ لے لے گی۔ حالانکہ کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ یعنی تحقیق کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جو لوگ اُردو اُردو کے نعرے لگا رہے ہیں ان میں سے اکثر گندم نما جَو فروش یا یوں کہنا چاہئے کہ "اُردو نما انگریزی فروش" ہیں۔

۳۰ر اپریل

پچھلے دنوں جناب خطیب الحسنی نے جو پاکستان میں مصر کے نمائندے ہیں، اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ عربی کو تمام اسلامی ممالک کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے عربی عالمِ اسلام کی مشترکہ زبان بنے نہ بنے پھر بھی ہر مسلمان کو تھوڑی بہت عربی ضرور سیکھ لینی چاہئے۔

ہم نے تو دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو قرآن کی چند سورتیں یاد ہیں انہیں عربوں سے گفتگو کرنے میں کچھ ایسی دقت پیش نہیں آتی۔ مولانا شوکت علی مرحوم کچھ زیادہ عربی نہیں جانتے تھے لیکن کسی عرب سے گفتگو کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو قرآن کی آیتوں سے کام نکال لیتے تھے۔ جہاں حافظہ ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں اشاروں کنایوں سے یعنی کبھی ہاتھ ہلا کے، کبھی ماتھے پر بل ڈال کے یا گھونسہ تان کے مخاطب پر مطلب واضح کر دیتے تھے۔

مولوی شفیع داؤدی مرحوم صرف نام کے مولوی تھے۔ یعنی عربی نہیں جانتے تھے گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انہیں ولایت جانا پڑا۔ جہاں وہ علّامہ اقبال کے ساتھ رہے اور انہی کے ساتھ واپس آئے۔ جہاز عدن کے قریب پہنچا تو مولوی صاحب عرشہ پر کھڑے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً وہ ان کے ہاتھ سے

چھوٹ کے سمندر میں جا پڑی۔ عدن میں غوطہ خوروں کی کثرت ہے۔ سمندر میں کوئی چیز پھینک دیجئے۔ یہ لوگ غوطہ مار کے نکال لائیں گے۔ مولوی صاحب نے چلّا کے کہا۔ "یا شیخ ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیبَ فِیہِ"۔ ایک عرب غوطہ خور ان کا مطلب سمجھ گیا اور کتاب نکال لایا۔

ہمارے ایک اخبار نویس دوست کو بھی مصر کے سفر کے دوران میں اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ انہیں قاہرہ کے ایک بالا خانہ پر جانا تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زینہ کس طرف ہے۔ آخر انہوں نے بھی قرآن کا سہارا لیا۔ یعنی پکار کے کہا۔ "اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیم" یہ سن کے ایک شخص بالا خانے سے اُترا اور انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔

فارسی میں گفتگو کرنا تو اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ جس شخص نے کریما یا نامِ حق کی قسم کی کوئی چھوٹی موٹی کتاب پڑھ لی ہے وہ بڑی آسانی سے اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہے اور بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ فارسی بولنے کے لئے کریما یا نامِ حق پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اُردو کے فقروں میں موقع بموقع "است" اور "بود" لگاتے جائیے۔ لوگ آپ کو فارسی کا بہت بڑا عالم سمجھ لیں گے اور اگر آپ ایرانی لب و لہجہ کی بھی نقل کر لیں تو سبحان اللہ! پھر تو آپ "علّامہ" ہیں۔

پچھلے دنوں ایرانی اخبار نویسوں کے اعزاز میں لاہور کے اخبار نویسوں کی طرف سے ایک دعوت دی گئی تھی۔ سُنا گیا ہے کہ اس محفل میں بھی بعض حضرات اسی قسم کی فارسی بولتے رہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بچارے ایرانی اخبار نویس ان لوگوں کی فارسی سمجھے یا نہیں لیکن انہیں سر ہلاتے تو سب نے دیکھا ہے اور ہماری روایت ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ "بلے بلے" اور "خیلے خوش وقت شدیم" بھی کہا اور سچ پوچھئے تو وہ بچارے سر نہ ہلاتے تو اور کیا کرتے؟

۳؍ مئی

سُنا ہے کراچی میں مسٹر غلام محمد وزیرِ خزانہ پتنگ اُڑا رہے تھے۔ اس طرف سے مسٹر غضنفر علی خان کا گذر ہوا۔ وہ بھی شریک ہو گئے۔ اس کشادہ دلی کی داد دیجئے کہ کنکوا مسٹر غلام محمد کا، ڈور بھی انہی کی اور مسٹر غضنفر علی خان مفت میں شریک ہیں۔

یوں تو اس فن میں ہمارے صوبے کے وزیرِ خزانہ بھی کسی سے پیچھے نہیں لیکن مرکزی حکومت کے وزیرِ خزانہ دوسرے وزراء کے ساتھ مل کے صرف کنکوا اڑاتے ہیں، اور میاں محمد ممتاز دولتانہ لم ڈورے پیچ لڑاتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو ایک معرکے میں ان کے حامیوں نے "وہ کاٹا" کا بھی شور مچا دیا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سراسر فریبِ نظر تھا۔

پتنگ بازی کے تذکرہ میں خیال آیا کہ آج کل جہاں بہت سے پُرانے علوم وفنون زندہ کئے جا رہے ہیں، اِس پُرانے فن کے احیا کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ تکل، پتنگ، کنکوا، گڈی وغیرہ کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس فن کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں جس میں پتنگ بازی کے اصول اور قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ سرسید احمد خان کے ماموں نواب زین العابدین خان نے بھی پتنگ بنانے کے اصولوں کے متعلق ایک رسالہ لکھا تھا جو اب ناپید ہے۔

ہمارے ہاں عموماً آغازِ بہار میں پتنگ بازی شروع ہوتی ہے اور بسنت پنچمی کے تیوہار پر تو اس کا خاصا زور رہتا ہے۔ لیکن یہ تفریح زیادہ تر لڑکوں تک محدود ہے۔ ایک زمانہ میں بڑے بڑے رؤسا کو پتنگ بازی کا شوق تھا۔ بڑے بڑے کنکوے بنائے جاتے تھے جو سیروں ڈور پیتے چلے جاتے تھے۔ پتنگ بازوں کی ٹولیاں

مقابلہ کے شوق میں دلّی سے لکھنؤ جاتی تھیں اور لکھنؤ سے دلّی آتی تھیں۔ دلّی میں میر حسینی بڑے استاد سمجھے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں میرزا دلاور بیگ کا بڑا شہرہ تھا اور انصاف کی بات یہ ہے کہ میرزا کا ہاتھ بہت منجھا ہوا تھا۔ معمولی تکل کو کنکوّے سے لڑاتے تھے اور اکثر میدان انہی کے ہاتھ رہتا تھا۔

مرحوم نواب شبّن کی تربت کو خدا عنبریں کرے۔ ان کی توجہ سے بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی وغیرہ کئی فن زندہ تھے۔ جب سے انہوں نے انتقال فرمایا ہے لکھنؤ میں ان فنون کا کوئی سرپرست نہیں رہا۔ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہی خاندان کے ایک رئیس وضعداری نباہے چلے جاتے تھے سو وہ بھی پچھلے سال کربلائے معلّیٰ تشریف لے گئے۔ اگر پاکستان کے امرا اور اہلِ دول، اِن فنونِ شریفہ کی طرف توجہ فرمائیں تو کیا عجب کہ سُوکھے دھانوں پانی پڑ جائے اور اگلے زمانے کے رؤسا کی یہ یادگاریں مٹنے سے بچ جائیں۔ بٹیر بازی اور مرغ بازی کے پنپنے کا تو امکان نہیں، پتنگ بازی ہی نئے سرے سے رواج پائے تو غنیمت ہے۔

---

۶ مئی

سُنا ہے راولپنڈی میں سلطان ٹیپو شہید کی یاد میں یومِ سلطان شہید منایا جا رہا ہے جس کے سلسلے میں ایک مشاعرہ کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

جن لوگوں کو سلطان ٹیپو کے حالات کا علم ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلطان شہید کو مشاعروں اور اس قسم کی دوسری لغویات سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ ایک سیدھے سادے سپاہی تھے۔ ساری عمر آزادی کی خاطر لڑتے گزار دی۔

اور اس حالت میں شہادت پائی کہ تلوار کے قبضے پر ہاتھ تھا اور جسم زخموں سے فگار ہو رہا تھا۔

اگر مشاعرہ اس قسم کا ہو جس میں سلطان شہید کے کارناموں کے متعلق نظمیں پڑھی جائیں یا کم از کم ایسی نظمیں ہوں جو لوگوں کے دلوں میں سچا اسلامی ولولہ پیدا کریں تو اور بات ہے لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ مشاعرہ چاہے یوم اقبال کے موقع پر ہو یا یوم سلطان شہید کے موقع پر اس میں یا تو غزلیں پڑھی جاتی ہیں یا ادنیٰ قسم کی نظمیں جن میں جنسی مسائل کی طرف تیز تیز اشارے ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ عرسوں کے موقع پر طوائفوں کے مجرے ہوتے تھے۔ بیاہ، شادی، ختنہ، عقیقہ وغیرہ تقریبوں پر طوائف کا مجرا بہت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جو لوگ زیادہ تکلّف کرتے تھے وہ بھانڈوں کا ایک طائفہ بھی منگوا لیتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم بڑے متشرع بزرگوار تھے لیکن اپنے بیٹے سیّد عشرت حسین کا بیاہ رچایا تو مجرے کا انتظام بھی کیا۔ جلال لکھنوی کی برات عظیم آباد گئی تو لکھنؤ کے بھانڈوں کا ایک طائفہ بھی ساتھ تھا۔۔۔ آج کل بزرگوں کے عرسوں پر مشاعروں کا بندوبست کیا جاتا ہے اور کہیں کہیں شادی بیاہ کے موقع پر بھی شاعروں کو بلانے کا رواج ہو چلا ہے۔ یہی لیل و نہار رہے تو دیکھ لیجئے گا کہ اس قسم کی تقریبوں پر صرف مشاعرے ہوا کریں گے۔

بات یہ ہے کہ مجرے سے مشاعرہ سستا پڑتا ہے۔ کیونکہ بعض شاعر تو اپنی جیب سے روپے خرچ کر کے مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ جن میں اتنی ہمت نہیں انہیں تھرڈ نہ سہی، انٹر کلاس کا کرایہ دے دیجئے اور چلتے وقت رخصتانہ کے طور پر پانچ روپے تھما دیجئے تو جب بلائیے گا دوڑے دوڑے آئیں گے۔ طوائف

ایک بھی ہو گی تو نگلنے چوگنے دام اٹھیں گے۔ پھر طوائف کا مجرا ان دنوں ذرا معیوب سمجھا جاتا ہے اور مشاعرے کا یہ حال ہے کہ شعر بھی سُنئے۔ شاعر کو جی بھر کے ذلیل بھی کیجئے پھر بھی آپ بہت بڑے خادمِ ادب ہیں اور کسی وزیر یا دوسرے سرکاری افسر کو مشاعرے کا صدر بنا دیجئے تو سرکار سے مفت میں تعلق بھی قائم ہو گیا۔ کیا عجب کہ کبھی کام ہی آئے۔

۷، رمیٔ

کئی برس ہوئے میکناب صاحب نے جو بلدیۂ لاہور کے ناظم تھے، لاہور کو بہشت بنانے کی ایک سکیم بنائی تھی۔ لیکن وہ پانی ملتان بہ گیا۔ یعنی میکناب صاحب ولایت چلے گئے اور انہوں نے جو سکیم بنائی تھی اسے یار لوگوں نے 'دفتر بے معنی' سمجھ کے غرقِ مئے ناب کر دیا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میونسپلٹی جوان ہو کے کارپوریشن بنی۔ لاہور کو بہشت بنانے کے لئے نئی تجویزیں اور سکیمیں سامنے آئیں اور ان پر طرح طرح کے حاشیے چڑھائے گئے۔ ایک بزرگوار نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ خداوندِ جل و علا کے فضل و کرم سے بلدۂ لاہور، روضۂ رضواں کی ہمسری کرے گا۔ اس کی سڑکیں رشکِ جادۂ کہکشاں ہوں گی اور اس کے درخت طوبیٰ سے برابری کا دعویٰ کریں گے۔ ایک پنڈت جی سر ہلا کے بولے "یوں کہئے کہ اندر کا سورگ ہو گا، اندر کا سورگ۔ جس میں کلپ برکش ہے۔ کام دھینو گائے ہے۔ ایراوت ہاتھی ہے۔ جہاں گندھرب بین پر تانیں اُڑاتے ہیں اور اپسرائیں پرے باندھ کے ناچتی ہیں۔" لیکن فسادات نے یہ خواب بھی پریشان کر دیا۔

جب امن وامان ہوا تو یار لوگوں کو پھر خیال آیا کہ لاہور کو بہشت بنانے کی کوئی ترکیب کرنی چاہئے۔ پرانی سکیمیں جو رجسٹروں اور فائلوں کے بوجھ تلے دبی پڑی تھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالی گئیں اور انہیں سامنے رکھ کے لاہور کو بہشت بنانے کی ایک نئی سکیم تیار کی گئی۔ سنا ہے کہ اس سکیم پر کوئی پچیس لاکھ روپیہ خرچ آئے گا۔ بس اب صرف نو من تیل کی ضرورت ہے۔ تیل اکٹھا ہوتے ہی "سورگ سکیم" کی "رادھا" ناچنا شروع کر دے گی۔ اور لاہور کی ایسی کایا پلٹ ہو گی کہ جو دیکھے گا عش عش کر اٹھے گا۔

اس سکیم پر جب عمل ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو لاہور کی یہ حالت ہے کہ بازاروں میں ملبہ کے ڈھیر لگے ہیں۔ سڑکوں کے کنارے کہیں کہیں کوڑے کرکٹ کے انبار کہیں اینٹوں کے تودے، سڑکوں میں جگہ جگہ گڑھے سیکڑوں بلکہ ہزاروں من کنکریٹ ہاتھ آئے تو کہیں ان کا چہرہ رفو ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں سڑکوں کے کنارے گڑھے ہیں جن میں پانی بھرا ہوا ہے اور پانی میں مچھر پرورش پاتے ہیں۔ ان میں بعض مچھروں کے خاندان بہت پرانے ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب ان مچھروں سے جا ملتا ہے جو سکندر کے حملے کے زمانے میں غور غشت سے یہاں آ بسے تھے۔ میونسپلٹی کے "آبائے شہر" مچھروں کے معاملے میں بہت فیاض تھے اور انہیں دکھ دینے کو جیو ہتیا سمجھتے تھے۔ اب بھی ان لوگوں کی "پشہ پروری" کا وہی حال ہے اور مکھیاں —— لیکن اس قصے کو جانے دیجئے۔

استاد ذوق مرحوم نے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ہی کے قصیدے نہیں لکھے، مچھروں کی شان میں بھی ایک ایسا شعر کہہ گئے ہیں جس پر ہزاروں قصیدے قربان ہیں۔ یعنی ؎

پشے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی !
جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

یہ شعر انہوں نے صرف دلی کے مچھروں کی شان میں نہیں کہا بلکہ اس میں مچھروں کی پوری قوم کی تعریف کر گئے ہیں اور ایک لحاظ سے تو یہ شعر لاہور کارپوریشن اور کارپوریشن کے ممبروں

کی مدح میں ہے۔ کیونکہ مچھر ان کے "خانہ زاد" بلکہ "شہرزاد" ہیں۔ گویا ذوق نے مچھروں ہی کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کے خداوندانِ نعمت یعنی "آبائے شہر" کی مدح کا حق بھی ادا کر گئے جو نرے آبائے شہر ہی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے "آبائے پشّہ" بھی ہیں۔

رات کو جب مچھروں سے ہنگامۂ کارزار گرم ہوتا ہے، وہ "پیں پیں" کے نعرے لگاتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور میں ایک ہاتھ کو سپر بنا کے دوسرے ہاتھ سے تیغِ دو دم کا کام لیتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کیا یہ شدّاد کی جنت ہے یا میکناب کی جنت یا وہ جنت جس کا وعدہ ہم سے کارپوریشن نے کر رکھا ہے ع

یہ جنّت ہے تو ہائے دنیائے فانی

---

۹ رمئی

سفارتوں اور وزارتوں کے سلسلے میں جو رنگا رنگ خبریں مشہور ہو رہی ہیں وہ صحیح ثابت ہوں یا غلط، پیرزادہ عبدالستار کے وزیر اعظم سندھ بننے کے متعلق جو خبر مشہور ہوئی تھی وہ غلط نکلی۔ یعنی پیر الٰہی بخش سندھ کے وزیر اعظم بن گئے اور پیرزادہ عبدالستار بدستور سابق پاکستان کی زرعی پیداوار کا حساب سنبھالے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے پیر الٰہی بخش نام ہی کے پیر نہیں بلکہ بہت بڑے عامل بھی ہیں۔ خبر نہیں وہ سفلی عمل کے قائل ہیں یا علوی کے بہر حال انہوں نے جس صفائی سے وزارت عظمیٰ کے قلمدان پر قبضہ کیا ہے اسے دیکھ کے اکثر لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہو گئے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر پیر الٰہی بخش وزارت کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کا شغل رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ پیر صاحب تو وزیر اعظم ہیں، اکثر مغل بادشاہ بھی پیری مریدی کرتے تھے اور جو لوگ ان کے مرید ہوتے تھے، چیلے کہلاتے تھے۔ چنانچہ ان چیلوں کے نام پر

دلّی کا ایک کوچہ اب تک کوچہ چیلاں کہلاتا ہے اور دین الٰہی، اکبر شاہی بھی تو اصل میں ایک قسم کی پیری مریدی ہی تھی۔

راقم الحروف نے کشمیر کے بعض سرکاری افسروں کو دیکھا ہے جو افسری کے ساتھ پیری مریدی بھی کرتے تھے۔ ان میں ایک صاحب سرکاری ملازمت سے تو سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن پیری مریدی کا وہی انداز ہے۔ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے ہیں تو ایک آدمی گھوڑے کے آگے آگے دوڑتا جاتا ہے۔ جس گاؤں میں ڈیرا ڈال دیا میلہ سا لگ گیا۔ پیر صاحب چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گئے بستے سے پیپر ماشی کا ایک پرانا قلمدان نکالا اور تعویذ لکھنے شروع کر دئے۔

یہ پیر صاحب ہمیشہ الف خافی روشنائی سے اور واسطی قلم کے ساتھ تعویذ لکھتے ہیں اور سنا گیا ہے کہ ان کا تعویذ بہت کم خالی جاتا ہے۔ انہیں حاضرات میں بھی بڑا دخل ہے۔ کئی دفعہ انہوں نے تعویذ لکھ کے "شاہِ جنّات" کو بلایا اور اسے ایسا رگیدا کہ بچارے کو آخر ہار ماننی پڑی۔ لیکن ایسے تعویذ ہمیشہ مرغ کے خون سے لکھے جاتے ہیں۔

پیر الٰہی بخش کو کوئی ٹھکانہ آتا ہو تو بعض دوسرے وزراء کو بھی بتائیں جنہیں وزارتوں اور سفارتوں کی اتھل پتھل نے بالکل بے ٹھکانے کر رکھا ہے۔ مسٹر چندری گر نے تو خیر وزارت چھوڑ کے سفارت اختیار کر لی اور اب "ہُدہُد" بن کے شہر "سبا" کو جا رہے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اور بھی ہیں جن کا ابھی تک کوئی ٹھیک ٹھکانہ نہیں۔

بعض اخباروں نے یہ تحریک شروع کر رکھی ہے کہ جو لوگ ۱۵ اگست سے پہلے مسلم لیگ کے حامی نہیں تھے ان کو پاکستان کا دشمن سمجھا جائے اور ان سے دشمنوں کا سا سلوک کیا جائے۔ لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ جو لوگ ۱۵ اگست سے پہلے مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہونے اور پاکستان کی حمایت کے لمبے چوڑے دعوے کرنے کے باوجود

کبھی پاکستان یا مسلم لیگ کے حامی نہیں ہوئے اُن سے کیا سلوک کیا جائے؟

مولانا قطب الدین شیرازی ایک مشہور ظریف بزرگ ہو گزرے ہیں جن کے متعلق کئی لطیفے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں ایک یہودی تاجر نے جو ان کا ہمسایہ تھا ان سے کہا: مولانا آپ ہمارا مذہب کیوں قبول نہیں کر لیتے؟ مولانا نے جواب دیا۔ ان دنوں میرا ہاتھ ذرا تنگ ہے چالیس دن کا سامانِ خورد و نوش میرے ہاں بھجوا دو۔ یہ مدت ختم ہونے پر تمہارا دین قبول کر لوں گا۔ یہودی نے یہ بات مان لی اور چالیس دن کا آذوقہ ان کے ہاں بھجوا دیا۔

چالیس دن ختم ہوئے تو یہودی تاجر بہت سے یہودیوں کو ساتھ لے کے مولانا قطب الدین شیرازی کے ہاں پہنچا اور کہنے لگا اب وعدہ پورا کیجئے۔ مولانا نے جواب دیا، میں چالیس سال سے مسلمانوں کا دیا کھاتا ہوں اور آج تک مسلمان نہیں ہوا۔ اگر تم نے سمجھ لیا کہ میں چالیس دن تمہارا دیا کھا کے یہودی ہو جاؤں گا تو سخت غلطی کی۔

ہمارے ہاں بیسیوں ایسے اللہ کے بندے موجود ہیں جو برسوں مسلم لیگ میں رہنے اور رات دن پاکستان پاکستان پکارنے کے باوجود نہ کبھی مسلم لیگ کے حامی تھے نہ پاکستان سے انہیں کوئی واسطہ ہے۔ البتہ پاکستان اور اسلام کا نام لے لے کے انہوں نے اپنے گھر ضرور بھر لئے ہیں۔

ہمارے نزدیک جو لوگ ۱۵ اگست سے پہلے پاکستان کے حامی نہیں تھے ان کے معاملے میں یہ منتقمانہ انداز اختیار کرنا اچھا نہیں۔ جو لوگ پاکستان میں آباد ہیں سب پاکستانی ہیں اور کوئی شخص، چاہے آج سے سال بھر پہلے اس کے خیالات کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں یہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا کہ اس کی ذات سے اس کے وطن کو کوئی نقصان پہنچے۔ باقی رہا سبقت بالایمان کا معاملہ تو اس کا کیا جواب کہ حضرت خالد بن ولید جنہیں سیف اللہ کا خطاب

ملا، ایمان لانے میں دوسرے لوگوں سے بہت پیچھے تھے۔ یعنی کہیں صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن لشکر کی سرداری کا معاملہ سامنے آیا تو انہیں ایسے لوگوں پر ترجیح دی گئی جو سابقون الاولون میں سے تھے۔

---

۱۰ رمئی

سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے "لقمان را پرسیدند ادب از کہ آموختی؟ گفت از بے ادباں" پچھلے دنوں ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کے سرورق پر ہماری نظریں جم کے رہ گئیں۔ کتاب کا نام ہے۔ "بیوقوفوں سے عقل سیکھو" اور مصنف کا نام ملک فیروز خاں نون کتاب کے نام سے نظر پھسل کے مصنف کے نام پر پہنچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

لقمان نے یہ تو کہہ دیا کہ میں نے ادب بے ادبوں سے سیکھا ہے لیکن اپنے "ادب آموزوں" کے نام نہیں بتائے۔ اس کتاب میں یہ خامی نہیں بلکہ "عقل سکھانے والے" کا نام بھی بتا دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے نہ تو یہ کتاب پڑھی، نہ کبھی ملک فیروز خاں نون ہی سے ملے۔ اور اس طرح عقل سیکھنے کا ایک بہت اچھا موقع کھو دیا۔

اکبر الہ آبادی کے کلام کی شہرت ہوئی تو ایک مولوی صاحب نے اخباروں میں چھپوا دیا کہ میں اکبر کا استاد ہوں اور انہیں اس زمانہ سے جانتا ہوں جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے اکبر سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا۔ مدت ہوئی ایک مولوی صاحب مجھے "علم" سکھاتے تھے اور میں انہیں عقل سکھاتا تھا۔ نہ مجھے علم آیا نہ انہیں عقل۔ یعنی ہم دونوں کو اپنی کوششوں میں سخت ناکامی ہوئی۔

علم اور عقل ایسی چیزیں نہیں جن کا مول تول نہ کیا جا سکے۔ لوگوں نے عقل اور علم دونوں کا وزن بھی معلوم کر لیا ہے۔ بلکہ علم اور عقل کا تناسب بھی بتا دیا ہے۔ مثلاً فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم اور عقل دونوں ایسی چیزیں ہیں جو تُل کے بکتی ہیں اور منوں کے حساب سے تُل کے بکتی ہیں۔

اور یہ جو ہم لوگ کہتے ہیں کہ "عقل بڑی کہ بھینس" تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقل بھینس سے بڑی ہے۔ عقل کا وزن معلوم ہو گیا۔ جسامت کی تعیین ہو گئی تو باقی کیا رہا؟ "تعلقاتِ عامہ" کا محکمہ "نیک نامی" کے مول تول میں مصروف ہے۔ اگر اس کے بجائے "عقل و علم" کی ایک آدھ کھیپ منگوا لی جاتی اور وزراء میں ایک من علم اور دس من عقل کے حساب سے تقسیم کر دی جاتی تو ہماری بہت سی مشکلیں حل ہو جاتیں۔ "نیک نامی" اچھی چیز ہے لیکن وزراء کو ان دنوں نیک نامی سے زیادہ عقل و علم کی ضرورت ہے۔

کسی گاؤں سے ایک شخص بستر بند خریدنے لاہور آیا۔ اتفاق سے دکان دار شاعر تھا اور مولانا سیماب اکبر آبادی سے مدتوں اصلاح لیتا رہا تھا۔ اس نے دو چار بستر بند دکھا کے کہا:

"چودھری صاحب ملاحظہ فرمائیے۔ اس بستر بند میں کتنی شعریت ہے؟"

چودھری صاحب نے فرمایا: "ہمیں شعریت نہیں مجبوطی چاہئے"۔

تعلقاتِ عامہ کا محکمہ یوں ہی "شعریت" کے پھیر میں پڑا ہے۔ حالانکہ وزارت کو نہ "شعریت" کی ضرورت ہے نہ نیک نامی کی بلکہ اسے صرف "مجبوطی" چاہئے۔

---

۱۲ مئی

پنجاب میں ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ "قصور پٹھاناں دا" یعنی قصور پٹھانوں کا۔ غلطی کرے کوئی اور پٹھان بچارے مفت میں قصوروار۔ کرے داڑھی والا اور

پکڑا جائے مونچھوں والا۔ یہ ضرب المثل اس لئے مشہور ہوئی کہ کسی زمانے میں قصور پر پٹھانوں کی حکومت تھی۔

پٹھانوں کا یہ خاندان قصور سے اٹھ کے ممدوٹ چلا گیا۔ پھر ممدوٹ کو چھوڑ کے لاہور آ گیا۔ لیکن اب بھی یہ فقرہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کل کلاں لوگ یہ نہ کہنا شروع کر دیں کہ "خان ممدوٹ" کو لاہور سے قصور چلے جانا چاہئے تاکہ یہ ضرب المثل درست ثابت ہو جائے کہ "قصور پٹھانوں کا"۔

ضرب الامثال کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو ہر جاٹ کے سر پہ کھاٹ نظر آئے گی۔ حالانکہ جاٹوں کے ہاتھ میں عام طور پر حقہ ہوتا ہے۔ اور تیلی کے سر پر کولھو رکھ دیا جائے گا۔ جاٹ سے لوگ پوچھیں گے کہ کیوں چودھری تمہارے سر پر کھاٹ کیوں ہے؟ اور وہ جواب دے گا۔ "اس لئے کہ ضرب المثل صحیح ثابت ہو اور اس کے ساتھ مقفٰے شاعری اور اردو زبان کی بھی تو خدمت کر رہا ہوں"۔ تیلی سے اس قسم کا سوال کریں گے تو وہ کہے گا۔ صاحب میں نے تو سر پر اس لئے کولھو اٹھا رکھا ہے کہ ضرب المثل بھی درست ثابت ہو جائے اور بے قافیہ شاعری کے لئے وجہ جواز بھی نکل آئے۔

لاحول ولاقوۃ ؎ کجا بودم مرکب کجا تاختم۔ گفتگو قصور سے شروع ہوئی تھی اور جاٹ اور تیلی یونہی بیچ میں آ گئے، حالانکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کا تذکرہ اس سلسلے میں ضروری ہے مثلاً مولوی غلام محی الدین قصوری جن کا قصور پر خان ممدوٹ سے زیادہ حق ہے۔ لیکن یہ ذکر چھڑا تو ملتان کے "گرد و گرما و گورستان" کی طرح قصور کی جوتی اور میتھی کا ذکر بھی کرنا پڑے گا ——— اس لئے فی الحال اس قصّے کو جانے دیجئے۔

جو نسبت مولوی غلام محی الدین صاحب کو قصور سے ہے وہی "ایمان" والے مولوی

عبدالمجید صاحب قریشی کو پٹی سے ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ان کا نام پٹی کے ساتھ اس طرح آتا تھا کہ وہ اچھے خاصے "مرہم عیسیٰ" معلوم ہوتے تھے اگرچہ پچھلے دنوں جو بجوگ پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب "پٹی" مشرقی پنجاب میں ہے اور "مرہم" مغربی پنجاب میں۔ لیکن قریشی صاحب اب بھی جو کام کرتے ہیں اس میں پٹی کی رعایت ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً سنا ہے کہ عرصے سے وہ بیماروں کی تیمارداری کر رہے ہیں اور راتوں کو ان کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے ہیں۔

ضرب الامثال اور شہروں کے سلسلے میں ایک اور بات یاد آگئی۔ پنجاب کی تقسیم میں زیرہ مشرقی پنجاب کے حصے میں آیا۔ حالانکہ اگر ضرب المثل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو زیرہ کو اونٹ ہی کے منہ میں رہنا چاہیئے۔ مشرقی پنجاب میں گائے یا بیل تو ہو سکتا ہے اونٹ نہیں ہو سکتا، یہ سعادت ہمارے ہی حصہ میں آئی ہے۔ اس لئے یا تو زیرہ ہمیں دلوائیے ورنہ "اونٹ کے منہ میں زیرہ" کہنا چھوڑ دیجئے۔

۱۳ر مئی

میں پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھا بعض احباب کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک خاتون میرے پاس آ بیٹھیں اور کہنے لگیں:۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔ اچھا ہوا یہیں ملاقات ہو گئی۔ اصل میں مجھ پر بعض ایسے حادثے گزرے ہیں جنہوں نے میرے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ چونکہ عام ڈاکٹر اس قسم کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آپ سے مشورہ کر لوں۔"

میں نے کہا "لیکن میں ——"

انہوں نے مجھے بات کرنے کی مہلت نہ دی۔ کہنے لگیں "میں ترتیب وار وہ تمام واقعات بیان کئے دیتی ہوں جنہوں نے میرے اعصاب پر ناگوار اثر ڈالا ہے۔ پہلے آپ سوال کرتے

جائیے گا اور میں ان کا جواب دیتی جاؤں گی۔"

یہ کہہ کے انہوں نے تفصیل سے اپنے سوانح حیات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے بیچ میں ایک دو مرتبہ پھر بولنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کے روک دیا کہ پہلے سارے واقعات ذہن نشین کر لیجئے۔ پھر جو سوال جی چاہے کیجئے گا۔

جب انہوں نے اسکول کے زمانے کا ذکر ختم کر کے کالج کے زمانے کا ذکر چھیڑا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے چلّا کے کہا:

"لیکن یہ باتیں آپ مجھے کیوں سُنا رہی ہیں؟"

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب ——"

"میں ڈاکٹر نہیں۔"

"میں نے تو سُنا تھا کہ آپ تجزیۂ نفسی کے بہت بڑے ماہر ہیں اور لاشعور کی بڑی بڑی گتھیاں دم بھر میں سُلجھا کے رکھ دیتے ہیں۔"

"توبہ کیجئے۔ تجزیۂ نفسی سے میرا کیا واسطہ؟"

"تو کیا آپ ڈاکٹر لطیف نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو آپ کون ہیں؟"

"میں ایک معمولی اخبار نویس ہوں۔"

"اچھا تو آپ سندباد جہازی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا ریڈیو اسٹیشن پر آپ سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ معاف کیجئے گا۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔ اور پھر میں نے آپ کے سامنے ——"

مجھ پر ڈاکٹر لطیف کا دھوکا تو صرف دو تین آدمیوں کو ہوا ہے جن میں یہ خاتون بھی تھیں لیکن ایسے لوگ بکثرت ہیں جو مجھے مولوی صلاح الدین ایڈیٹر "ادبی دنیا" سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے ایک بزرگوار سے کافی ہاؤس میں اکثر ملاقات ہوا کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں مولوی صاحب آپ نے

بڑا غضب کیا کہ "ادبی دنیا" بند کر دیا۔ لیکن آپ بھی مجبور تھے۔ آخر کیا کرتے۔ لیکن میری سُنئے تو جس طرح بن پڑے پھر رسالہ جاری کیجئے۔ سب سے بڑی دشواری تو یہی ہے نا کہ کاغذ نہیں ملتا۔ سو اس کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ آخر لاہور سے دوسرے اخبار اور رسالے بھی تو نکل رہے ہیں۔ انہیں کاغذ کیسے مل جاتا ہے؟

میں انہیں ٹالنے کے لئے کہتا ہوں "دیکھئے ذرا حالات درست ہو لیں تو اس طرف توجہ کروں گا۔" اور وہ میرے مضامین کا تذکرہ لے بیٹھتے ہیں۔

"خوب لکھتے ہیں صاحب آپ! اور خاص طور پر تنقیدی مضامین لکھنے تو آپ پر ختم ہیں۔ وہ جو آپ نے اس افسانہ نگار کے افسانوں کے مجموعے پر تنقید لکھی تھی۔ بھلا سا نام ہے اس کا ——— اس وقت یاد نہیں آتا۔ نہیں معلوم کم بخت حافظہ کو کیا ہو گیا؟"

میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ ان سے صاف کہہ دوں "دیکھئے صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام صلاح الدین نہیں" لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ سوچتا ہوں بچارا خفیف ہوگا۔ آخر اس سے تھوڑی دیر صلاح الدین بن کے "ادبی دنیا" کے متعلق باتیں کر لینے میں ہرج بھی کیا ہے؟ اور سچ پوچھئے تو ان بزرگوار کے سامنے بیٹھ کے مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوا ہے کہ میں سندباد جہازی نہیں، مولوی صلاح الدین ہوں۔

ایک دو صاحب ایسے بھی ہیں جو مجھے مصطفیٰ ناٹک وکیل امرت سر سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو مجھے کیپٹن کفایت علی سمجھ لیا تھا لیکن زیادہ تر لوگ مجھے مولوی صلاح الدین ہی کے نام سے جانتے ہیں اور اسی نام سے کئی لوگوں کے ساتھ میرا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں علامہ "اسد" نے لورینگز میں مولوی صلاح الدین ہی کی حیثیت سے میرا تعارف اپنے چند دوستوں سے کرایا تھا۔ غالباً یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ مجھے جتنے لوگ میرے اصلی نام سے جانتے ہیں ان سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنے ہی لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مجھے ہمیشہ مولوی صلاح الدین ہی سمجھا ہے۔ میں نے اب تردید کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آخر کوئی کہاں تک

تردید کرنا پھرے اور اس کے علاوہ مولوی صلاح الدین بنے رہنے میں ہرج بھی کیا ہے؟

---

۱۴ / مئی

پنجاب کی وزارت کا معاملہ کچھ ایسا الجھا ہے کہ سلجھنے ہی میں نہیں آتا۔ ایک دفعہ تین وزیر کراچی گئے اور واپس آتے ہی ایک بیان دھر گھسیٹا کہ ہم "ٹیم ہیں ٹیم"۔ اب پھر طلبی اور پیشی کا قصہ شروع ہوا ہے اور پوری ٹیم کو کراچی جانا پڑا ہے۔ پچھلی دفعہ شیخ کرامت علی صاحب اس قضیئے میں شامل نہیں تھے۔ اب کے انہیں بھی بلوایا گیا ہے۔ دیکھیں اس ٹیم میں سے کون کون آؤٹ ہوتا ہے۔

بعض اخباروں میں خبر چھپی ہے کہ شیخ کرامت علی کراچی روانہ ہوئے تو ایسی گھبراہٹ میں تھے کہ ریلوے کا ٹکٹ بھی نہ خریدا۔ ملتان میں پڑتال ہوئی تو انہیں کرایہ بھرنا پڑا۔ یہ واقعہ اگر صحیح بھی ہے تو اخباروں کو اسے اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ آخر پچھلے دنوں انگلستان کے مشہور اہلِ علم پروفیسر جوڈ بھی تو بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑے گئے تھے۔ شیخ صاحب کو اس معاملے میں پروفیسر جوڈ سے توارد ہو گیا تو کیا ہوا۔ اکثر اہلِ علم کے فکر و عمل میں بعض اوقات حیرت انگیز قسم کی یکسانی پائی جاتی ہے۔

اور پھر موقع اور محل کی نزاکت پر تو غور کیجیئے۔ شیخ صاحب اطمینان سے لاہور میں بیٹھے تھے اچانک کراچی سے طلبی کا پروانہ آ گیا۔ اس عالم میں ٹکٹ خریدنے کا ہوش کسے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروفیسر جوڈ سے "مضمون" لڑ گیا۔

ہمیں پروفیسر جوڈ سے شیخ صاحب کے اس "توارد" پر تو افسوس نہیں ہوا۔ البتہ اگر کراچی میں ان سے کہہ دیا گیا کہ آپ وزارت کی ریل گاڑی میں بھی تو "بے ٹکٹ" ہی سفر کر رہے ہیں تو اس پر ضرور افسوس ہوگا۔ کیونکہ "حرف و حکایت" میں جو تھوڑی سی شگفتگی نظر آ جاتی ہے دراصل وہ انہی کا فیضان ہے۔

اصل میں وزارت بڑی جھگڑے کی چیز ہے۔ اول تو رات دن یہ فکر کہ کس کو چھوڑیں اور کس کا ساتھ دیں۔ پھر اعتراض کرنے والے دم نہیں لینے دیتے۔ ہمارے خیال میں تو وزارت سے سفارت ہزار درجے اچھی۔ نہ ساتھیوں سے بک جھک۔ نہ اعتراضات کی فکر۔ پھر لطف یہ ہے کہ جتنا چاہو خرچ کرو۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کیونکہ سفارتخانوں پر جو رقم خرچ ہوتی ہے اس کی جانچ پڑتال نہیں کی جاتی۔

راجہ غضنفر علی خان کو ہمارا مشورہ ہے کہ ایران کی سفارت ہاتھ آتی ہے تو ضرور قبول کر لیجئے۔ ایران میں نہ نشتر ہیں۔ نہ لیاقت علی خان نہ ممدوٹ۔ نہ دولتانہ۔ اطمینان سے گل و گلزار کے مزے لوٹیے۔ شعر کہئے، غزل سرائی کیجئے، آخر وزارت میں کیا پڑا ہے اور وزارت بھی مہاجرین کی، جس میں ساری دنیا کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔

لاہور میں پنجابی شاعری کو ترقی دینے کے لئے ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کے صدر فقیر محمد فقیر ہیں اور سکرٹری میر محمد دین تیر۔ صدر اور سکتر کے ناموں میں جس طرح قافیہ کا التزام کیا گیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجمن واقعی شاعروں کی انجمن ہے اور ضرور ترقی کرے گی۔ ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

۱۶ر مئی

آپ نے یہ تماشا دیکھا کہ مغربی پنجاب کے وزراء کراچی جاتے ہیں تو وہاں سے "رطیم" بن کے آتے ہیں اور یہاں کچھ دن رہتے ہیں تو پھر "دو نیم" ہو جاتے ہیں۔ گویا یا تو کراچی کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی ہے جس کے اثر سے ٹوٹے ہوئے دل خود بخود جڑ جاتے ہیں۔ یا وہاں دلوں کو جوڑنے کا کوئی کارخانہ موجود ہے ؎

دلِ شکستہ دراں کوچہ مے کنند درست   چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

دراصل آب و ہوا کو توڑ جوڑ میں بڑا دخل ہے۔ مثلاً لنکا شائر کی آب و ہوا میں سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ سوت کا تار آسانی سے جڑ جاتا ہے۔ کراچی کو دلوں کا لنکا شائر کہنا چاہئے۔ کیونکہ وہاں ٹوٹے ہوئے دل آن کی آن میں جوڑ دیے جاتے ہیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وزرائے کرام کراچی سے دل جڑوا کے لاہور پہنچے اور دو دن میں پھر وہی حال ہے۔ کراچی کے کاریگروں کی خدمت میں عرض ہے کہ دل جوڑنا ہے تو کوئی ایسا مسالہ لگائیے جو لاہور کی گرم و خشک آب و ہوا میں بھی ٹھہر سکے۔ ورنہ اسی "توڑ جوڑ" میں عمریں گزر جائیں گی۔

ہم نے وزارتوں کے جھگڑے اور وزیروں کے اختلافات پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن ایسا اختلاف نہیں دیکھا جس کا دورہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پڑتا ہے۔ وزیروں کا اختلاف نہ ہوا دردِ گردہ یا قولنج ہو گیا اور لطف یہ ہے کہ اس اختلاف کا ذکر اس انداز میں کیا جاتا ہے گویا یہ کوئی بہت بڑی قومی خدمت ہے۔

قوم کے سامنے اس وقت بڑے بڑے مسائل ہیں لیکن ہمارے وزراء کو ان کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزراء صرف "اختلاف" کے لئے بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔ مہدی حسن مرحوم جو اردو کے مشہور انشا پرداز تھے، اپنے نام کے ساتھ "افادی الاقتصادی" لکھا کرتے تھے۔ ہمارے وزراء کو اپنے ناموں کے ساتھ "اختلافی الاقتصادی" لکھنا چاہئے اور زیادہ بہتر تو یہ ہوگا کہ خان ممدوٹ اور شیخ کرامت علی اپنے ناموں کے ساتھ "اختلافی الاجتہادی" لکھیں اور میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات "اختلافی الاقتصادی" کہلائیں۔

یہ اختلاف اصولی ہے تو ازراہِ کرم مسلمانوں کو بتایا جائے کہ کون سے اصول ہیں جن پر

یہ جھگڑا آ پڑا ہے اور واقعی ہے تو اسے کسی طرح جلد نپٹا دیجیے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ لوگ جھگڑتے رہیں اور دنیا سارا کام کاج چھوڑ کے آپ کے اختلافات کا تماشا دیکھتی رہے۔

ٹیلیفون کی وجہ سے آئے دن جو لطیفے ہوتے رہتے ہیں انہیں ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ ہم نے "انقلاب" کے دفتر میں ٹیلیفون کیا اور "انقلاب" کے بجائے بورسٹل جیل میں جا پہنچے اور کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ جا ہے جس دفعہ انقلاب کے دفتر میں ٹیلیفون کیجیے بورسٹل جیل ہی نکلے گا۔ اور اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہوتے کہ انقلاب کا دفتر بورسٹل جیل بن گیا ہے یا "انقلاب" نے بورسٹل جیل میں ڈیرے ڈال دئے ہیں۔ یہ ٹیلیفون کے عجائبات ہیں۔

جس طرح ہم ٹیلیفون کے راستے بعض خاص مقامات پر جا نکلتے ہیں اس طرح بعض دوسرے حضرات بھی اسی راستے "امروز" کے دفتر میں آ پہنچتے ہیں۔ مثلاً آج صبح ایک صاحب نے ٹیلیفون کیا۔ ہم نے ریسیور اٹھا کے کہا "امروز" — لیکن وہ کچھ ایسے اضطراب میں تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ کہنے لگے "صاحب! گھی کے دو کنستر ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ فرمائیے کہاں پہنچاؤں؟"

ہم نے کہا "گھی کے دو کنستر اور ہمارے لئے، آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ اخبار "امروز" کا دفتر ہے۔"

آواز آئی "کیا کہا۔ اخبار "امروز" کا دفتر ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ" اور یہ کہہ کے انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

گھی کا کنستر اور اخبار "امروز" کچھ ایسی انمل اور بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے جس کے تصور ہی سے ہنسی آتی ہے۔

---

۱۷ مئی

لاہور کو جنت بنانے کے لئے کارپوریشن جو کوششیں کر رہی ہے ان کے سلسلے میں لاہور کی سڑکوں کا معاملہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ شہر کی بہت سی سڑکیں ایسی ہیں جن کے نام غیر اسلامی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بالکل فرنگیانہ ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایبٹ روڈ، ایمپرس روڈ، ڈیوس روڈ، ہال روڈ، میو روڈ اور مال روڈ وغیرہ جنّت کی سڑکوں کے نام نہیں ہو سکتے۔ ہاں اللہ ان سڑکوں کو ہدایت دے اور وہ مشرف بہ اسلام ہو جائیں تو اور بات ہے۔

کارپوریشن والوں نے لاہور کو جنّت بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے تو اسے سب سے پہلے لاہور کی سڑکوں کو مسلمان بنانے کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ پچھلے دنوں لارنس گارڈن اور روز گارڈن نے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کے باغِ جناح اور گلستانِ فاطمہ کے اسلامی نام اختیار کر لئے لیکن منٹگمری ہال بدستور منٹگمری ہال ہے اور منٹگمری روڈ ابھی تک منٹگمری روڈ ہی کہلاتی ہے۔ حالانکہ اس موقع پر ان دونوں کو بھی اسلام کی تبلیغ کرنا ضروری تھا۔

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ لاہور میں بعض مرتد سڑکیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً جن دنوں خواجہ دل محمد میونسپلٹی میں تھے ان کی کوششوں سے بیڈن روڈ نے اسلام قبول کر کے دل محمد روڈ کا نام اختیار کر لیا تھا لیکن جب میونسپلٹی سے خواجہ صاحب کا کوئی واسطہ نہ رہا تو یہ سڑک پھر مرتد ہو گئی اور بیڈن روڈ یا بیدین روڈ کہلانے لگی۔ یہ فیصلہ کرنا علما کا کام ہے کہ اس سڑک کو کوئی سزا دی جائے۔ یا اسے پھر مسلمان کر لیا جائے۔

ایک اور بحث طلب بات یہ بھی ہے کہ سڑکوں کے نام تبدیل کرتے وقت "روڈ" کے لفظ کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یا اس کی بجائے "شارع" یا "جادہ" کا استعمال بہتر ہے

ہمیں تو دل محمد روڈ سے، شارع دل محمد یا جادۂ دل محمد اچھا معلوم ہوتا ہے۔ نہیں معلوم اس معاملہ میں کارپوریشن کے ممبروں اور علمائے کرام کی کیا رائے ہے؟ لیکن یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو بعض کوٹھیوں اور بنگلوں کے نام بھی بدلنے پڑیں گے مثلاً وزیرِ اعظم صاحب کی کوٹھی کا نام "محمد وٹ ولا" ہے جو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اسے بدل کے "ولائے محمد وٹ" کر دیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ کیونکہ اس کوٹھی میں جتنے لوگ ہیں سب محمد وٹ اور خان محمد وٹ کے "مولائی" ہیں۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض سڑکوں کے ناموں کو تھوڑی سی قطع و برید کے ساتھ اسلامی بنایا جا سکتا ہے اور ایک آدھ سڑک تو ایسی ہے جس کے نام میں کسی قطع و برید کی بھی ضرورت نہیں۔ مثلاً ہمارے نزدیک میو روڈ کے نام میں کوئی تبدیلی کرنے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ اس سڑک پر میو قوم کے لوگوں کو آباد کر دیا جائے۔ اس طرح یہ سڑک مسلمان بھی ہو جائے گی اور اس کا نام بدلنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔

میو روڈ پر میو قوم کے لوگوں کو آباد کرنے میں ایک خطرہ ضرور ہے۔ بہت ممکن ہے آگے چل کر میو حضرات یہ کہنا شروع کر دیں کہ میو ہسپتال میں صرف میو قوم کے مریض داخل ہو سکتے ہیں یا میو سکول آف آرٹس پر میو ائیوں کا قبضہ ہونا چاہئے۔ ہم نے مسئلہ کے تمام پہلو پیش کر دیئے ہیں کارپوریشن کو ان سب پر غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔

بہرحال کارپوریشن کو اس معاملے میں عجلت سے کام لینا چاہئے۔ بہتر یہ ہوگا کہ مولوی غلام مرشد ایک دن اللہ کا نام لے کے لاہور کی سڑکوں کو تبلیغِ اسلام کرنے نکلیں۔ خدا نے چاہا تو ساری سڑکیں ایک ایک کر کے ان کے "دستِ حق پرست" پر بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کے "کفِ پا" پر مسلمان ہو جائیں گی۔ سڑکیں اور کوٹھیاں مسلمان ہو جائیں تو پھر سڑکوں

پر چلنے والوں اور کوٹھیوں کے مکینوں کو مسلمان کرنے کی باری آئے گی۔ جبھی تو کہا گیا ہے کہ؎

چو دورِ خسروی آغاز کردند مسلماں را مسلماں باز کردند

---

۱۸ رمئی

سنا ہے میرٹھ کے ڈسٹرکٹ جیل کے قیدیوں نے اچھی خاصی "ذمہ دار حکومت" قائم کر رکھی ہے۔ یعنی اسمبلی بھی ہے، وزیر بھی، سکتر بھی جو اپنے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ قیدیوں کی تعداد بارہ سو ہے۔ ان میں ۷۲ اسمبلی کے ممبر ہیں جو ووٹوں کے ذریعے منتخب کئے گئے ہیں۔ وزیر پانچ ہیں جو اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہیں۔

لا اینڈ آرڈر کا محکمہ میرٹھ جیل کے خان ممدوٹ یعنی وزیر اعظم نے اپنے پاس رکھا ہے۔ باقی چار صیغے یعنی خوراک، لباس، لیبر اور حفظانِ صحت اپنے چار ساتھیوں کے حوالے کر دئے ہیں۔ ان میں دولتانہ یعنی وزیرِ خزانہ کوئی نہیں۔ شیخ کرامت علی یعنی وزیرِ تعلیم کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس لئے کام بڑی خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے اور روزانہ میں کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔

دراصل میرٹھ جیل کی مجلس وزارت اور اسمبلی کے ارکان کو ایک دوسرے کی کمزوریاں اچھی طرح معلوم ہیں۔ یعنی وہ جانتے ہیں کہ اسمبلی کا کون ممبر کس جرم میں ماخوذ ہو کے جیل پہنچا ہے۔ اس لئے حکومت کا کاروبار چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس کے علاوہ نہ الاٹمنٹ کا جھگڑا ہے۔ نہ شرنارتھیوں کا قضیہ۔ نہ کوئی تارا سنگھ ہے جو ہر روز ایک آدھ تقریر جھاڑ دیا کرے۔ نہ کوئی گولیکر جو راشٹریہ سیوک سنگھ کا جھگڑا کھڑا کر دے۔ اس لئے نہ تو لالہ بھیم سین سچر اور نہ پنڈت جواہر لال نہرو کو میرٹھ جیل کی کامل "ذمہ دار حکومت" سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ خان ممدوٹ یا پنڈت گوپی چند بھارگو کو میرٹھ جیل کی وزارت کے

کارنامے سن سن کے شرمانا چاہیئے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی عمر وزارت کی ہوس میں کٹی ہے۔لیکن وزارت یا تو ہاتھ ہی نہیں آئی یا ہاتھ آئی بھی تو "دولتِ مستعجل" ثابت ہوئی۔ انہیں میرٹھ جیل کی اسمبلی اور وزارت کا ذکر اخباروں میں پڑھ پڑھ کے شاید خیال آتا ہو کہ کسی طرح جیل پہنچیں۔ اسمبلی توڑ کے نیا انتخاب کرائیں اور وزارت پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں اور کوئی عجب نہیں کہ ضلع میرٹھ کے بعض لوگوں نے جیل پہنچنے کی کوشش بھی شروع کر دی ہو۔

لیکن میرٹھ یو۔پی میں ہے اور یو۔پی ہندوستان میں۔ اس لئے مغربی پنجاب کے "شیدائیانِ وزارت" حصولِ وزارت کے اس حیرت انگیز موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔یوں تو جیل مغربی پنجاب میں بھی ہیں مگر ان میں اس قسم کی "ذمہ دار حکومت" قائم نہیں ہوئی۔نہ اس کا کوئی امکان ہی ہے۔بہر حال اگر لاہور کے سنٹرل جیل کو بھی "ہوم رول" مل جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جرائم حیرت انگیز طور پر ترقی کریں گے۔

۱۹ر مئی

امریکہ کے اخبار میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل مسٹر راج گوپال اچاریہ کے متعلق ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان "رنبادہ مدراس" ہے۔عنوان سن کے کچھ اور نہ سمجھ لیجئے گا۔ اس مضمون میں اچاریہ جی کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔

دراصل مختلف قوموں کے مذاق میں بڑا فرق ہے۔ہمارے ہاں گدھا اپنی بیوقوفی کی وجہ سے مشہور ہے۔لیکن دنیا کے اکثر ملکوں میں بچارا گدھا اتنا بدنام نہیں مثلاً عرب ممالک

ہیں گدھا بے وقوفی سے زیادہ اپنی مشقت پسندی کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کا آخری بادشاہ مروان صرف اپنی جفاکشی کے باعث مروان الحمار کہلاتا تھا۔

اُلّو ہمارے ہاں احمق ہونے کے علاوہ بہت منحوس بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دنیا کے کسی ملک میں اُلّو اتنا بدنام نہیں۔ سچ ہے کہ ہم بالکل ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ میں چوہا بڑا مکار اور کمینہ سمجھا جاتا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ لومڑی کو یورپ اور امریکہ کے لوگ بہت نیک سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح وہاں بھی شیر بہادری اور روباہ حیلہ گری میں مشہور رہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں حیلہ گری کو چنداں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اسی لئے تو امریکہ کے اس اخبار نے مسٹر راج گوپال کو "روباہِ مدراس" یعنی مدراس کی لومڑی" لکھ دیا۔

ہمارے ہاں لیڈروں کے ناموں کے ساتھ ہز ہرِملّت یا ضیغمِ ملّت لکھنے کا رواج عام ہے۔ ایک زمانے میں مولوی فضل حق شیرِ بنگال کہلایا کرتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ اب بھی شیرِ کشمیر کہلاتے ہیں اور سُنا ہے اب تو سرکاری کاغذات میں بھی ان کے نام کے ساتھ شیرِ کشمیر لکھا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کشمیر میں ریچھ بھی ہوتے ہیں، لومڑ، بِل اور چیتوں کی بھی کمی نہیں۔ لیکن شیر سرے سے نہیں ہوتا۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا۔ مولوی فضل حق جب پٹنہ پہنچے تو اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھے پنڈال میں جا پہنچے۔ اس وقت ان کا عجب حال تھا۔ سارا جسم گرد میں اٹا ہوا، چہرے پر مٹی کی تہ جمی ہوئی۔ کسی نے کہا "مولوی صاحب منہ ہاتھ تو دھو لیجئے۔"

ساتھ ہی آواز آئی "کہیں شیر بھی منہ دھویا کرتے ہیں؟"

یہ سن کے مولوی صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ منہ نہیں دھوئیں گے۔ چنانچہ اسی عالم میں تقریر شروع کر دی۔

ہمارے خیال میں "روباہِ مدراس" "شیرِ بنگال" "خرسِ کشمیر" "بیوزِ سرحد" "گرگِ سندھ" "گربۂ پنجاب" اچھے خاصے لقب ہیں جنہیں ضرور رواج دینا چاہئے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے بعض ایسے ایسے مطالب بآسانی ادا کئے جا سکتے ہیں جنہیں کسی دوسرے طریقے سے ادا کرنا ناممکن ہے۔ اس قسم کے القاب رائج ہو گئے تو ہماری سیاست اچھا خاصا چڑیا گھر بن کے رہ جائے گی۔

اخباروں میں ایک خبر چھپی ہے کہ ایک شخص کو جس کے منہ پر خاصی لمبی داڑھی ہے اور جس کا نام مولوی غلام محی الدین ہے، چوری کے جرم میں سزا دی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی مسجد میں نماز پڑھتے پڑھتے اس نے ایک اور نمازی کی جیب سے دو سو روپے نکال لئے لیکن مسجد سے نکلنے نہ پایا تھا کہ پکڑا گیا اور لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

مسجد میں چوری کوئی نئی بات نہیں۔ مسجدوں میں جوتیاں تو بہت پرانے زمانے سے چرائی جاتی ہیں۔ اسی لئے مرحوم ملا دوپیازہ نے "نعلین تحت العین" کا نسخہ ایجاد کیا تھا۔ جیب تراشی کا مرض بھی پرانا ہے۔ چنانچہ مولانا حالی کہتے ہیں ؎

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ملزم کو اخباروں میں "مولوی" کیوں لکھا گیا۔ جس شخص کے چہرے پر لمبی ڈاڑھی ہو وہ مولوی نہیں ہوتا۔ ع

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

---

۲۷ مئی

پچھلے دنوں مغربی پنجاب میں جو وزارتی دنگل ہوا ہے اسے دیکھ کے گیے نگے پہلوان، رستمِ ہند امام بخش، رستمِ زماں گاماں اور زبسکو کے دنگل یاد آ گئے۔ مقابلہ تو اصل میں دو نامی پہلوانوں کا تھا لیکن دونوں پہلوانوں کے پٹھوں کے علاوہ اور بھی کئی پُرانے کشتی گیر تماشا دیکھنے کے لئے جمع تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی ایک دنگل پر مغربی پنجاب کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہے۔

یوں تو خان ممدوٹ اور میاں محمد ممتاز دولتانہ دونوں برابر کے جوڑ معلوم ہوتے تھے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ دولتانہ صاحب نے بڑے بڑے داؤ یاد کر رکھے ہیں، اور مدا کھاڑ" تو ان کا ایسا رواں داؤ ہے کہ بڑے سے بڑے پہلوان پر بھی یہ داؤ چل جائے تو چاروں شانے چت نظر آئے۔ اس لئے شروع شروع میں سب کا خیال تھا کہ میدان میاں دولتانہ ہی کے ہاتھ رہے گا اور ایک دفعہ تو یار لوگوں نے شور بھی مچا دیا تھا کہ خان ممدوٹ کا کندھا زمین سے لگ گیا۔ لیکن وہ نرا نظر کا فریب تھا۔ اصل میں خان ممدوٹ کا لنگر بھاری ہے۔ اس لئے استاد دولتانہ کا داؤ نہ چل سکا۔ ورنہ یہ تو وہ پیچ ہے جس کا توڑ غلام پہلوان کو بھی یاد نہیں تھا۔

میاں دولتانہ کو بڑھاوے دینے والے بھی بہت تھے۔ نامی نامی پہلوان اکھاڑے کے گرد اگرد کھڑے واہ وا، سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہے ہوں تو مدِّ مقابل کا جی صرف شور سن کے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن خان ممدوٹ بڑے ہمت کے دھنی نکلے۔ نہ "اکھاڑ" کے ڈھب پہ آئے۔ نہ ان پہ "کلاجنگ" چل سکا اور پھر جو بغلی ڈوب کے نکلے ہیں تو لپک کے ہفتے کس لئے اور پلک جھپکتے میں میدان مار لیا۔

ہم نہ خان ممدوٹ کے طرفدار ہیں۔ نہ میاں ممتاز دولتانہ کے بلکہ صرف فن پہلوانی کے قائل ہیں۔ اس لیئے دونوں کی تعریف کریں گے۔ کیونکہ دونوں نے اس موقع پر اپنا اپنا کمال خوب دکھایا۔ ہار جیت کی اور بات ہے۔ ورنہ میاں ممتاز دولتانہ نے اس موقع پر جو پھرت دکھائی ہے اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج کل کے پہلوان مل کے کشتی لڑتے ہیں۔ اس لئے اگلے زمانے کی سی کشتیوں کا سا لطف نہیں آتا۔ لیکن یہ کشتی تو ایسی بے لاگ اور دو ٹوک ہوئی ہے کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ دونوں طرف کے پہلوان یہ ارادہ کیئے بیٹھے تھے کہ بس حریف کو نیچا دکھا کے ہی رہیں گے۔ اس لیئے دونوں نے خوب خوب کمال دکھائے اور دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔

یہ دنگل "بے ٹکٹ" تھا۔ یعنی لوگوں نے یہ تماشہ مفت دیکھا اور صرف اپنوں ہی نے نہیں بلکہ بیگانوں نے بھی مفت دیکھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اس دنگل کی ضرورت کیا تھی؟ ساری دنیا کو کس تقریب میں یہ تماشہ مفت دکھایا گیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ دنگل پر ٹکٹ لگتا اور اس طرح جو رقم ہاتھ آتی اسے قائدِ اعظم ریلیف فنڈ میں دے دیا جاتا۔

اس جوڑ توڑ، ایچ پیچ، اکھاڑ پچھاڑ، کشتم کشتا اور دھکا پیل کی صرف یہ وجہ سمجھ میں آئی ہے کہ دولتانہ صاحب، خان ممدوٹ سے رستمی کا گرز چھین لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ خان ممدوٹ بڑے کلے ٹھلے کے جوان اور نامی پہلوان سہی، اکھاڑ پچھاڑ کے تو مردِ میدان نہیں۔ ذرا کس بل دکھاؤں گا تو وہ چپ چاپ گرز میرے حوالے کر دیں گے۔ مگر وہ لندھور زمانہ مقابلہ پر آمادہ ہو گیا اور حریف کو چت کر کے اپنی استادی کی لاج رکھ لی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے وزراء کو چٹ لنگوٹ باندھ کے یوں اکھاڑوں میں اتنا اور پہلوانی کے کرتب دکھانا زیب دیتا ہے؟ قوم کے سامنے ہزاروں مسائل ہیں اور

وزراء کو باہمی زور آزمائیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اس طرف توجہ کر سکیں۔ جو لوگ دھوبی پاٹ اور کلا جنگ کے چکّر میں پڑ جائیں ان سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے؟

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ خان ممدوٹ اس معرکہ میں ہار جاتے تو شیخ کرامت علی جو ہمیشہ قائم بالغیر رہے ہیں اکھاڑے میں اُترے بغیر چاروں شانے چت نظر آتے۔ خان ممدوٹ کا اس معرکہ میں سُرخروئی حاصل کرنا بڑا واقعہ سہی۔ لیکن اس سے بھی بڑا واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ شیخ صاحب کو بھی صاف بچالے گئے۔

۲۸ر مئی

لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان میں ذات پات سرے سے نہیں۔ لیکن یہ خیال بہت حد تک غلط معلوم ہوتا ہے۔ ذات پات ہر جگہ ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ دور کیوں جائیے۔ لاہور کی سڑکوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ ان میں ذات پات کا جھگڑا موجود ہے یعنی بعض سڑکیں برہمن ہیں، بعض کھشتری، بعض ویش اور بعض شودر۔

مال روڈ کی ذات بہت اونچی ہے۔ یہاں موٹریں فرّاٹے بھرتی پھرتی ہیں۔ اونچے طبقے کے لوگ خرید و فروخت کرنے آتے ہیں۔ یہاں کے دکاندار بھی امیر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس شخص کو مال روڈ کی کوئی دکان الاٹ ہو گئی۔ اس کا مرتبہ خود بخود اونچا ہو گیا۔ جب وہ فخر سے سینہ تان کے کہتا ہے کہ میری دکان مال روڈ پر ہے۔ ملکہ کے بت سے ذرا آگے تو چھوٹے موٹے دکانداروں کی گردنیں فرطِ احترام سے جھک جاتی ہیں۔

مال روڈ کی ذات اونچی ہے۔ بہت اونچی۔ لاٹ صاحب کی کوٹھی یہیں ہے۔ ملکہ کا بت بھی یہیں۔ پھر ہائی کورٹ ہے۔ یونیورسٹی ہے۔ عجائب گھر ہے۔ لارنس باغ ہے۔ ہوٹل ہیں،

ریستوران ہیں۔ سینما ہیں۔ صاف ستھری دکانیں ہیں جن میں لاکھوں روپے کا مال قرینے سے رکھا ہوا ہے۔ ایک زمانے میں یہاں انگریز مردوں اور عورتوں کا ہجوم نظر آتا تھا جن کے گورے گورے قدموں تلے مال روڈ کا دل مارے خوشی کے اُچھلا پڑتا تھا۔ اب بھی یہاں کوئی اکّا دکّا انگریز نظر آ جاتا ہے اور نوابوں، خان بہادروں، جاگیرداروں، وزیروں، سکتّروں، ججوں، مجسٹریٹوں، اونچے اونچے افسروں، بڑے بڑے عہدے داروں کی موٹریں ہوا سے باتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں تو دیکھنے والے پکار اٹھتے ہیں کہ سچ مچ مال روڈ کی ذات اونچی ہے۔

مال روڈ سے اُتر کے ڈیوس روڈ، گاف روڈ، ریس کورس روڈ، لارنس روڈ وغیرہ ہیں۔ پھر ایبٹ روڈ، میکلوڈ روڈ، نکلسن روڈ وغیرہ جیسی دوغلی سڑکوں کی باری آتی ہے۔ اس کے بعد ویلش اور شودر سڑکیں ہیں۔ چیمبرلین روڈ، سرکلر روڈ، فلیمنگ روڈ، دل محمد روڈ اور اندرونِ شہر کی سڑکیں، گلیاں اور کوچے جن میں سے کسی کے نام کے ساتھ روڈ کا پُر رعب لفظ بھی نظر نہیں آتا۔ بے ڈول، بھدّی اور بدقوارہ سڑکیں جن کے چہروں پر چیچک کے بڑے بڑے داغ ہیں اور جو گرمیوں میں سینے پر سیکڑوں من گرد اور برسات میں کیچڑ کے انبار لئے چپ چاپ آسمان کو تکتی رہتی ہیں۔ یہاں مکھیاں بھنکتی ہیں، مچھر بھنبھناتے ہیں، کتے لوٹتے ہیں، گنڈیریوں اور کبابوں والے آوازیں لگاتے ہیں اور بھٹر بھونجے گاہکوں کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی "بڑا آدمی" جس نے عمر کا بڑا حصہ مال روڈ اور اس کے آس پاس کی سڑکوں پر گزارا ہے، اس طرف آنکلتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور ان بچاری "شودر" سڑکوں کو اس سے گالیاں سُننی پڑتی ہیں۔ لیکن "بڑے آدمی" صرف الکشن کی فصل میں جب ووٹوں کے کھیت لہلہاتے ہیں اس طرف آنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔

کارپوریشن کہتی ہے کہ ہم لاہور کی حالت بہتر بنانے پر پچیس لاکھ روپے خرچ کریں گے لیکن ان پچیس لاکھ روپوں سے مال روڈ کے حسن و رعنائی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا لارنس روڈ اور گاف روڈ وغیرہ پر کولتار کی ایک ایک اور تہ بچھ جائے گی۔ سرکلر روڈ کو جو لاہور کے گلی کوچوں

پر بلا گرداں ہو رہی ہے، کون پوچھتا ہے۔ ریلوے روڈ کی حالت سدھارنے کا خیال کیسے آسکتا ہے؟ یہ نیچ ذات کی سڑکیں ہیں۔ شودر سڑکیں۔ جن پر مجبور اور بے اختیار لوگ بستے ہیں۔

"کیوں میاں تانگہ خالی ہے؟"

"کہاں جایئے گا؟"

"یہی دہلی دروازے تک۔"

"اجی نام نہ لیجئے دلّی دروازے کا۔ میرے گھوڑے نے سن لیا تو ابھی دولتّیاں جھاڑنی شروع کردے گا۔ ذرا گھوڑے کو دیکھئے، تانگے کو دیکھئے، اس کے رنگ و روغن کو دیکھئے اور خود ہی انصاف کیجئے کہ یہ گھوڑا اس لائق ہے کہ دلّی دروازہ اور لنڈا بازار کی خاک چھانتا پھرے۔ صاحب یہ گھوڑا مال روڈ پر چلتا ہے۔ گاف روڈ پر چلتا ہے اور ایسی ہی کوئی مصیبت پڑی تو میکلوڈ روڈ یا نکلسن روڈ تک آگیا۔ یہ کوٹھیوں اور بنگلوں والوں کی سواری کا تانگہ ہے۔ یہ صاحب بہادر کی سواری کا گھوڑا ہے۔ دلّی دروازے کا نام نہ لیجئے۔ آپ کو تانگے کی ضرورت ہے تو ذرا اس موڑ تک چلے جایئے "چھٹ بھیّا" قسم کے بہت سے تانگے اور گھوڑے مل جائیں گے جو دلّی دروازہ چھوڑ کشمیری بازار تک چلے جاتے ہیں۔

گویا سڑکوں ہی میں نہیں گھوڑوں اور تانگوں میں بھی ذات پات موجود ہے۔ بعض گھوڑے اونچی ذات کے ہیں۔ بعض "چھٹ بھیا" قسم کے یعنی ویش اور شودر، جو دلّی دروازے اور لنڈا بازار بھی چلے جاتے ہیں اور جنہیں بھاٹی، شاہ عالمی اور کشمیری بازار تک جانے کے بعد بھی "پرائشچت" کی ضرورت نہیں پڑتی۔

---

۲۹ مئی

بعض حضرات کو اعتراض ہے کہ پاکستان ریڈیو پر پنجابی کے عشقیہ گیت گائے جاتے ہیں جن میں عموماً عورت کی طرف سے اظہارِ عشق ہوتا ہے۔ اس قسم کے گیت بیحد مخربِ اخلاق ہیں۔ اس لئے ریڈیو پر ان کے گانے کی ممانعت کر دینی چاہئے۔ بات ٹھیک بھی ہے۔ آخر پاکستان کو عشق و عاشقی سے کیا واسطہ؟ یہاں تو قال اللہ و قال الرسول کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ہمارے خیال میں صرف پنجابی گیتوں کے بارے میں اس قسم کی قدغن نہیں ہونی چاہئے۔ فارسی اور اُردو شعرا کا کلام بھی عاشقانہ مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے پڑھنے پڑھانے کے متعلق بھی اسی قسم کا کوئی حکم نافذ ہو جانا چاہئے۔

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جہانگیر کے سامنے ایک گویا امیر خسرو کی ایک مشہور غزل گا رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

تو شبانہ مے نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

تو جہانگیر کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ندیموں سے کہنے لگا۔ خسرو نے یہ کیا لکھ دیا ہے۔ بھلا کوئی شخص اپنی محبوبہ یا بیوی سے کہہ سکتا ہے کہ تو رات کس کے آغوش میں تھی کیونکہ تیری سُرخ سُرخ آنکھیں کیفیتِ شبانہ کی غمازی کر رہی ہیں۔ ایک منہ لگے مصاحب نے عرض کیا کہ امیر خسرو پر برج بھاشا اور سنسکرت شاعری کا بڑا اثر پڑا ہے اور برج بھاشا میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ گویا اس شعر میں بھی مرد مخاطب ہے اور عورت برج بھاشا کے شعراء کے عام انداز کے مطابق اس سے کہہ رہی ہے کہ "ساجن! کہاں گنوائی ساری رات۔" یہ جواب سن کے جہانگیر کو اطمینان ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ شعر امیر خسرو کا ہے جو خواجہ نظام الدین علیہ الرحمۃ کے خاص مریدوں میں تھے اور جن کا کلام عوام کے عقیدہ کے مطابق عارفانہ مضامین سے بھرا پڑا ہے۔

لیکن وہ زمانے لد گئے۔ جب اس قسم کی دلیلیں سن کے لوگ چپ ہو جایا کرتے تھے اظہارِ عشق ہر حالت میں معیوب ہے۔ چاہے وہ عورت کی جانب سے ہو چاہے مرد کی طرف سے۔ چاہے پنجابی میں ہو چاہے فارسی یا اردو میں ہمیں ہیر وارث شاہ کے سارے نسخے جمع کر کے انہیں راوی میں غرق کرنا ہے۔ سعدی، خسرو، حافظ، میر، سودا، غالب، داغ وغیرہ کے کلام سے نجات پانے کی کوئی تدبیر سوچنا ہے۔ کیونکہ ع

ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

پاکستان میں کسی شخص سے رو رعایت نہیں کی جا سکتی۔ چاہے وہ کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو؟

بعض علما نے بھی اس قسم کے اشعار لکھ کے بڑی گمراہی پھیلائی ہے۔ مولانا شبلی بڑے عالم تھے لیکن ان کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے شعر موجود ہیں ؎

من فدائے بتِ شوخے کہ بہنگامِ وصال
بمن آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

بچارا داغ عریاں اشعار لکھنے کی وجہ سے بہت بدنام ہے۔ لیکن آپ کو اس قسم کا شعر اس کے کلام میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ لطف یہ ہے کہ مولانا شبلی کا کلام دار المصنفین اعظم گڑھ نے چھپوایا ہے جو علماء کی ایک مقتدر جماعت ہے اور جس کے سرگروہ مولانا سید سلیمان ندوی کو پچھلے دنوں مولانا شبیر احمد عثمانی نے کراچی آنے اور اسلامی نظامِ حکومت کی ترتیب و تدوین کے کام میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ایک اخبار میں کسی صاحب نے لکھا ہے کہ پاکستان ریڈیو پر جو لوگ نعتیں پڑھتے ہیں ان میں سے اکثر کا چال چلن مشتبہ ہے۔ اس لئے ریڈیو والوں کو چاہئے کہ وہ نیک اور پاک لوگوں سے نعتیں پڑھوایا کریں۔ یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نیک اور پاک لوگ یا تو بڑے بڑے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں یا بڑی بڑی دکانیں اور کارخانے وغیرہ

چلا رہے ہیں۔ اس لئے انہیں اتنی فرصت کہاں کہ روز نعت سنانے کے لئے ریڈیو اسٹیشن پہنچ جایا کریں۔ ہاں یہ لوگ محض حصولِ ثواب کی نیت سے یہ نیک کام انجام دینے پر آمادہ ہو جائیں تو اور بات ہے۔ بہر حال پاکستان ریڈیو والوں کو سردار شوکت حیات خاں، شیخ کرامت علی، مولانا غلام مرشد، مولانا داؤد غزنوی وغیرہم سے اس سلسلے میں گفتگو کر کے دیکھ لینا چاہیئے۔

---

۳۰ رمئی

دو تین دن ہوئے "امروز" میں مولانا ظفر علی خاں کے متعلق جو مضمون چھپا تھا اس میں مولانا کے حقہ پینے کا بھی ذکر تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب سے مولانا کی صحت بگڑی ہے انہوں نے حقہ سے عدم تعاون کر رکھا ہے۔

"امروز" کے سٹاف رپورٹر صاحب سے جب اس غلطی کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب ملا کہ میں نے تو صرف اتنا لکھا تھا کہ مولانا کے کمرے میں ایک حقہ بھی موجود تھا سب ایڈیٹر صاحب نے مضمون کاتب کے حوالے کرتے وقت ایک فقرہ بڑھا دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب میں نے مولانا سے ملاقات کی تو وہ حقہ پی رہے تھے۔

اصل میں سٹاف رپورٹر صاحب اور سب ایڈیٹر صاحب بھی کیا کریں انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، مولانا ظفر علی خاں کے حقہ کی داستانیں سنتے چلے آتے ہیں آج سے چند برس پہلے وہ حقہ کے اتنے رسیا تھے کہ جب آل انڈیا حقہ کانفرنس کی صدارت کا سوال پیش ہوا تو اس کے لئے مولانا ہی کا نام تجویز کیا گیا تھا۔

راقم الحروف کی غزل کا ایک شعر ہے ؂

حقّہ پیتا ہے شعر کہتا ہے
اور عاشق ہیں کیا بُرائی ہے

یہ شعر بھی دراصل مولانا ظفر علی خاں ہی کے متعلق ہے۔ لیکن اب وہ نہ حقّہ پیتے ہیں، نہ شعر کہتے ہیں۔ سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں نہ سیاسیات سے واسطہ نہ شاعری اور اخبار نویسی سے سروکار ؂

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

مولانا ظفر علی خاں نظم ونثر دونوں میں اپنا خاص انداز رکھتے ہیں۔ ان کی نثر بڑی پُرشکوہ اور بے عیب ہوتی ہے اور اگرچہ بعض لوگوں نے ان کا تتبّع کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس میں کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکی۔ نظم میں ان کو جو قدرت حاصل ہے اس کی مثال پوری اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ افسوس کہ ان کی علالت نے لوگوں کو ان کی نظم ونثر سے جو اہلِ ذوق کے لئے بہت بڑی نعمت تھی محروم کر دیا۔

ایک زمانے میں جب ہمارے ہاں تھیٹر کثرت سے تھے عام طور پر یہ کیفیت نظر آتی تھی کہ ہیرو گا بھی رہا ہے اور رو بھی رہا ہے، سینے سے خون بہہ رہا ہے، سانس اکھڑ چلا ہے لیکن اس حالت میں بھی گانے سے باز نہیں آتا۔ ہیروئن اپنے عاشقِ جاں باز کی لاش پر آتی ہے تو وہ بھی گانا یا تقریر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ہم سمجھے تھے کہ اردو سے اس قسم کے ڈراموں کا نام ونشان مٹ چکا۔ لیکن ہمارا خیال غلط نکلا۔ کیونکہ حال میں خواجہ احمد عباس نے ایک ڈرامہ لکھا ہے جس میں پرانے زمانے کے ان ڈراموں کی اکثر خوبیاں موجود ہیں۔

مقبول احمد شیروانی کشمیر نیشنل کانفرنس کا ایک کارکن تھا جو کشمیر کی لڑائی کے آغاز میں جاں بحق ہو گیا۔ خواجہ احمد عباس نے "شہید شیروانی" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ شیروانی کے چودہ گولیاں لگتی ہیں لیکن وہ برابر مسکراتا ہے۔ بلکہ ہر گولی لگنے کے بعد اچھی خاصی تقریر کرتا ہے جسے سن کر لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ شیروانی سے اس موقع پر "یار چھا۔ گلزار چھا" یا اس قسم کا ایک آدھ گانا بھی گوایا جاتا۔ بہرحال اس میں خواجہ احمد عباس کا کوئی قصور نہیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ ڈرامہ کشمیر کے محکمۂ اطلاعات کی فرمائش پر لکھا۔ محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر صاحب نے جو کوریتھین یا نیو ایلفرڈ کے کوئی پرانے ایکٹر معلوم ہوتے ہیں، ان سے جو کچھ کہا انہوں نے لکھ دیا۔

۲ر جون

میاں بشیر احمد صاحب (ہمایوں) نے پرسوں ایک محفل میں کیا خوب کہا ہے

بدل کر وزیروں کا ہم بھیس شوکت
تماشائے اہلِ وطن دیکھتے ہیں

اصل شعر مرزا غالب کا ہے جسے میاں صاحب نے تھوڑی سی قطع و برید کے بعد سردار شوکت حیات خان کے نام "الاٹ" کرا لیا ہے۔ اگرچہ "الاٹمنٹ" بے قاعدہ ہے۔ لیکن اس بے قاعدگی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ شعر سردار شوکت حیات خاں کی زبان سے اتنا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار "واہ واہ" کہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ "واہ" سردار صاحب کا وطن مالوف ہے۔ وہ شعر "الاٹ" نہ کرائیں اس قسم کی کوئی اور حرکت کر بیٹھیں جب بھی آپ کو اور ہمیں "واہ" کہہ کے چپ ہو جانا چاہیئے۔

مرزا غالب اور سردار شوکت حیات کا مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بہروپئے ہیں۔ غالب فقیروں کا بھیس بدلتے تھے، یہ وزیروں کا روپ دھار لیتے تھے۔ وہ "اہلِ کرم" کا تماشا دیکھتے تھے، یہ اہلِ وطن یعنی فقیروں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب تماشا دیکھ کے شعر کہتے تھے "وزیر لوگ" بیان چھپواتے ہیں۔ آپ اور ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ وزیر تماشا ہیں اور ہم تماشائی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم تماشا ہیں اور وزیر تماشائی۔

ایک جاٹ میلہ دیکھنے گیا۔ وہاں کسی نے اس کا کمبل اڑا لیا۔ واپس آیا تو گاؤں والوں نے پوچھا۔ کیوں چودھری میلہ دیکھ آئے؟ جاٹ نے جھلّا کے کہا: کیسا میلہ؟ وہ تو یار لوگوں نے میرا کمبل اڑانے کے لئے ایک سوانگ رچا رکھا تھا۔ مغربی پنجاب کی وزارت کے جھگڑے دیکھ کے بھی یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کیسی وزارت اور کیسی حکومت؟ وہ تو یار لوگوں نے ہمارا کمبل اڑانے کے لئے سوانگ رچا رکھا تھا۔

سردار شوکت حیات خاں اور میاں محمد ممتاز دولتانہ کے اتحاد کو جسے ہمارے ایک دوست "دولتانہ شوکتانہ" یعنی دولت اور شوکت کا اتحاد کہتے ہیں، یونہی نہ سمجھئے۔ اس میں ابھی بڑے بڑے شاخسانے نکلیں گے۔ کوئی عجب نہیں کہ نون، ٹوانے، دولتانے یعنی مغربی پنجاب کے زمیندار اور جاگیردار سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور حصولِ اقتدار کے لئے پھر بڑے زور کی کشمکش شروع ہو جائے۔ لیکن یقین رکھئے جب تک نیا انتخاب نہیں ہوتا اور عوام کے صحیح نمائندے "موروثی ممبروں" اور "خاندانی وزیروں" کی جگہ نہیں لے لیتے یہ جھگڑے ختم نہیں ہوں گے اور ہم اور آپ یونہی تماشا بنے رہیں گے۔

حضرات وزرائے کرام یا بقول شیخ کرامت علی "وزرایانِ کرام" میں بیان بازی کا جو سلسلہ جاری ہے وہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ۔ خان ممدوٹ کو وزارت کی نالائقی اور نااہلی کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ اور

خان ممدوٹ کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا قصور ان دونوں حضرات کا ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ سچ کہہ رہے ہیں۔

شعرا کے کلام کی "الاٹ منٹ" کا قضیہ تو بیچ ہی میں رہ گیا۔ مرزا غالب کا انتقال ہو چکا ہے۔ پھر وہ دلّی کے رہنے والے تھے۔ نہ مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب آئے۔ نہ مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب گئے۔ پھر بھی میاں بشیر احمد صاحب نے سردار شوکت حیات خان کو مقامی مہاجر قرار دے کے غالب کا ایک شعر ان کے نام الاٹ کر دیا۔ ہمارے خیال میں جو ہندو شعراء مغربی پنجاب کو چھوڑ کے مشرقی پنجاب چلے گئے ہیں ان کا کلام ضرور مہاجر شعراء کو "الاٹ" ہو جانا چاہیئے۔ میاں بشیر احمد صاحب نے شاعری کی الاٹ منٹ کا کام اپنے ذمے لیا ہے تو انہیں اسے پورا کر کے ہی دم لینا چاہیئے۔

ہمارے خیال میں تلوک چند محروم کا کلام نور لدھیانوی کو الاٹ کر دیا جائے اور جگن ناتھ آزاد کا کلام اختر ہوشیارپوری کو، فکر تونسوی کی نظم و نثر ساحر لدھیانوی کے حوالے کر دی جائے اور راج بلدیو راج کی غزلیں نذر امروہوی کو الاٹ ہو جائیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ہندو شاعر اور ادیب ہیں جن کی نظم و نثر کی "الاٹ منٹ" کی طرف ابھی توجہ نہیں کی گئی۔

پاکستان سے ہندوستان جانے والے ادیبوں اور شاعروں کی نظم و نثر کی الاٹمنٹ" اس لئے بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے لئے اب اردو شاعری اور انشا پردازی بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ انہیں پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً ہندی یا پنجابی میں نظمیں اور افسانے لکھنے پڑیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ابھی تک وضعداری نباہے چلے جاتے ہیں۔ لیکن آخر کب تک؟ ایک نہ ایک دن انہیں مجبوراً اردو کو ترک کر کے ہندی

اور پنجابی کی طرف جھکنا پڑے گا۔

۶ر جون

مغربی پنجاب کے وزیر اعظم خان ممدوٹ نے ایک پریس کانفرنس میں فرمایا ہے کہ زمینوں، دکانوں اور کارخانوں کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں عنقریب ان کی اصلاح کی جائے گی۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ الاٹمنٹ میں جو بے قاعدگیاں ہوئی ہیں، وزیر اعظم صاحب کو اب ان کی اصلاح کا خیال کیوں آیا؟ پہلے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ کہیں خدانخواستہ اس ارشادِ عالی کا یہ مطلب تو نہیں کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات کی وزارت کے زمانے میں ان کے بہت سے متوسلین کو کارخانے، زمینیں اور دکانیں مل گئی تھیں۔ اب یہ زمینیں اور دکانیں وغیرہ ان سے چھین کے نئے وزیروں کے عزیزوں اور دوستوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔

ہم تو آج سے مہینہ بھر پہلے عرض کر چکے ہیں کہ الاٹمنٹ چاہے علم کی ہو یا عقل کی، نیک نامی کی ہو یا رسوائی کی، یومِ اقبال کی ہو یا اقبال گھی سٹور کی، وزارت کی ہو یا کارخانے کی، ہر حالت میں بے بنیاد ہے۔ اس لئے جو لوگ الاٹمنٹ کے پروانے کو شاخِ زعفران سمجھ کے مارے غرور کے زمین پر پاؤں نہیں رکھتے، انہیں چاہیئے کہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور یہ بات پلّے باندھ لیں کہ وزارت کی الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی الاٹمنٹ بدل جاتی ہے۔

صنعت و حرفت کا صیغہ پہلے میاں محمد ممتاز دولتانہ وزیرِ خزانہ کے پاس تھا۔ وہ گئے اور میاں نور اللہ وزیرِ خزانہ ہوئے تو صنعت و حرفت کا محکمہ شیخ کرامت علی کے حوالے کر دیا گیا

حالانکہ شیخ صاحب جس طرح تعلیم و تعلّم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسی طرح انہیں صنعت و حرفت سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے خیال میں اس سے تو بہتر تھا کہ یہ محکمہ میاں عبدالحمید دستی کے سپرد کر دیا جاتا۔ کیونکہ میاں نوراللہ "نوربافت" نہ سہی کم از کم میاں عبدالحمید "دستی" تو ہیں اور آپ جانتے ہیں صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک مشینی، دوسری دستی۔ پاکستان میں مشینیں کم ہیں اس لئے ہمارے ہاں لے دے کے صرف "دستی" قسم کی صنعتیں یعنی دستکاریاں باقی رہ گئی ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ صنعت و حرفت کے صیغے کی وزارت کے لئے دستی صاحب سے زیادہ کون شخص موزوں ہو گا؟

فارسی کا یہ پرانا شعر جو صنعتِ مقلوب میں ہے آپ نے سُنا ہو گا ؎

شکر بہ ترازوئے وزارت برکش
شو ہمرہِ بلبل بلبِ ہر مہ وش

سالک صاحب نے "انقلاب" میں یہ شعر نقل کر کے لکھا ہے:

"معلوم نہیں 'شکر بہ ترازوئے وزارت برکش' کے معنی کیا ہیں۔ آیا اس شاعر کے عہد میں بھی سول سپلائی کی وزارت موجود تھی اور شکر راشن سے ملا کرتی تھی؟"

بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں تعلقاتِ عامہ کا محکمہ نہیں تھا۔ اس لئے وزیر بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے تھے اور جو شخص ایک دفعہ کسی وزیر سے مل لیتا تھا ہمیشہ کے لئے اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اب شکر تولنے اور بانٹنے یعنی میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کا دل لبھانے کا کام تعلقاتِ عامہ کے سپرد ہے۔ بلکہ آج کل تو "سرکاری اشتہارات کی شیرینی" بھی وزارت کے ترازو میں تول کے بانٹی جاتی ہے۔ اسی لئے تو خان ممدوٹ نے یہ محکمہ اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے اور کسی دوسرے کو اس کی ہوا نہیں لگنے دیتے۔

۹ر جون

پانچ چھ مہینے ہوئے خبر آئی تھی کہ علامہ مشرقی خاکساروں کی ایک جماعت کے ساتھ

شہادت کے شوق میں سری نگر کے محاذ پر جہاد فرما رہے ہیں۔ پھر سُنا کہ مشرقی صاحب شہید تو نہیں ہوئے۔ البتہ ان کی انگلی یا ٹانگ پر کہیں زخم آ گیا ہے اور وہ لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد مشرقی صاحب ایسے غائب ہوئے کہ پھر ان کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

دو تین دن ہوئے خبر آئی کہ مشرقی صاحب انڈو پاکستان اسلام لیگ کا نسخہ لے کے پھر اس خیال سے میدان میں اُترے ہیں کہ آئینی طریقوں سے کام لے کے دلّی، آگرہ، علی گڑھ، لکھنؤ، بہار شریف وغیرہ مقامات پر جہاں اسلامی تمدّن کی یادگاریں موجود ہیں مسلمانوں کا قبضہ کرا دیا جائے۔

مشرقی صاحب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی تردید انہوں نے خود نہ کی ہو۔ پہلے وہ مدت تک ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھتے رہے۔ پھر ہندو مسلم اتحاد کی طرف جھکے اور لیڈروں کے نام احکام صادر کرنے شروع کر دئے کہ فوراً آپس میں اتحاد کر لو، ورنہ مابدولت ناراض ہو جائیں گے۔ ایک زمانے میں وہ "آئینی طریقوں" کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سول نافرمانی اور اس قسم کے دوسرے حربے اختیار کرنا بزدلوں کا شیوہ ہے۔ آج وہ خود فرما رہے ہیں کہ مسلمانوں کو آئینی طریقوں سے کام لے کے ہندوستان پر قبضہ کر لینا چاہئے۔

ایک پٹھان جو کابل سے ہینگ لے کے آیا تھا ایک گلی کے نکڑ کے پاس بیٹھا ہینگ بیچ رہا تھا۔ جو شخص اُدھر سے گزرتا آغا صاحب اس سے چلّا کے کہتے "اینگ لے لو" اگر کوئی شخص جواب دیتا کہ "مجھے ہینگ نہیں چاہئے" تو آغا صاحب جھلّا کے فرماتے "تو تم اینگ کیوں نہیں لیتا۔ ام تمہارا باپ کا نوکر ہے جو تمہارے واسطے اتنی دور سے اینگ لے کے آیا ہے"

مشرقی صاحب کی باتیں سُن کے ہمیں بے اختیار یہ پٹھان یاد آ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی لیڈری کی ہینگ اس تحکّم سے بیچتے ہیں گویا ہمارے باپ دادا پر احسان کر رہے ہیں۔

پچھلے انتخابات کے زمانے میں مشرقی صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر قائداعظم محمد علی جناح خاکسار جماعت کے ٹکٹ پر کھڑا ہونا چاہیں تو میں انہیں فوراً ٹکٹ دلوا دوں گا —— اب کے بھی انہوں نے فرمایا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح، مسٹر لیاقت علی خاں اور دوسرے بڑے بڑے لیڈر اس تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو انڈو پاکستان کے دروازے ان پر کھلے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ایسی فیاضی ہے کہ بیچارا حاتم طائی بھی اپنی قبر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا ہوگا۔

حضرت علاّمہ نے ہینگ بیچنے والے پٹھان کی طرح آخر میں دھمکی بھی دی ہے کہ اگر بڑے بڑے لیڈر اس تحریک میں نہ شامل ہوئے تو میں انڈو پاکستان لیگ کو توڑ ڈالوں گا۔ پھر دیکھیں گے مسلمان کیا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں قائداعظم، مسٹر لیاقت علی خان، خان ممدوٹ اور دوسرے تمام لیڈروں کو اس جماعت میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ اگر انہوں نے انڈو پاکستان اسلام لیگ کو توڑ ڈالا اور پہلے کی طرح غوطہ لگا گئے تو ہم اور آپ کیا کریں گے؟

---

۱۱ رجون

ہندوستان کے اخباروں نے لکھا ہے کہ پچھلے دنوں گونڈہ کے اسٹیشن پر بلرام پور اور بہرائچ کے مسافر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر صاحب ہانپتے ہوئے تشریف لائے اور کہنے لگے۔ بہرائچ اور بلرام پور دو الگ الگ گاڑیاں نہیں جا سکتیں۔ جس اسٹیشن کے مسافر زیادہ ہوں گے گاڑی اسی طرف جائے گی۔

مسافروں کی گنتی کی گئی تو بہرائچ کے مسافر زیادہ نکلے۔ اس لئے گاڑی پہلے بہرائچ بھیجی گئی۔

وہاں سے واپس آئی تو بلرام پور کے مسافروں کی باری آئی۔ معلوم نہیں اگر اتفاق سے بلرام پور اور بہرائچ کے مسافروں کی تعداد برابر ہوتی تو اسٹیشن ماسٹر صاحب کیا کرتے۔ غالباً انہیں اپنا "کاسٹنگ ووٹ" ڈال کے اس بات کا فیصلہ کرنا پڑتا کہ گاڑی کو پہلے بہرائچ جانا چاہئے یا بلرام پور۔

آج کل جمہوریت کا زمانہ ہے جس طرف ووٹوں کی اکثریت ہو گاڑی بھی اسی طرف اپنا رُخ کر لیتی ہے۔ بہرائچ والوں کے پاس ووٹ زیادہ ہوں تو گاڑی بہرائچ جائے گی اور بلرام پور کے حق میں زیادہ ووٹ پڑیں تو گاڑی بہرائچ کے بجائے بلرام پور کو اپنا کعبۂ مقصود سمجھ لے گی۔ لیکن ہمارے صوبے کے لوگوں کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ان لوگوں کی گھٹی میں جمہوریت پڑی ہے اس لئے ہندوستان والوں کو اپنی "جمہوریت پسندی" پر اترانا نہیں چاہئے۔

ایک دیہاتی کی ٹانگ میں درد تھا۔ کسی نے پوچھا "چودھری! تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ درد کہاں ہے؟ ٹخنے کے پاس یا گھٹنے سے ذرا نیچے؟" اس نے کہا "یہ میں کیا جانوں؟ اگر چار بھائی مل کے کہہ دیں کہ یہاں درد ہے تو سمجھ لو کہ درد ضرور وہیں ہے۔" ووٹوں کی اکثریت پر گاڑی کا رُخ بدل لینا تو معمولی چیز ہے۔ ہمارے ہاں کے دیہاتی اس بات کا فیصلہ بھی ووٹ سے کر لیتے ہیں کہ ٹانگ کے کس حصے میں درد ہے۔ گویا ووٹ "سمت نما" ہی نہیں۔ بلکہ ایکس رے کا کام بھی دیتا ہے۔

ایک لطیفہ اور سُن لیجئے۔ چودھری صاحب گانا سُنتے سُنتے اونگھنے لگے۔ گویّے نے جو جی جان سے گا رہا تھا، کہا "چودھری صاحب! میں نے دیس شروع کیا اور آپ کو نیند آگئی ذرا سُنئے تو سہی۔" چودھری صاحب نے جواب دیا "بھئی تم اطمینان سے گائے جاؤ۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔"

یہ کہا اور سو گئے۔

ہماری قوم کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے وزرائے کرام "الاٹ منٹ" راگ کا "سرگم" کر رہے ہیں اور ہم نے یہ کہہ کے آنکھیں بند کرلی ہیں کہ گائے جائیے ہمیں آپ پر اعتبار ہے حالانکہ "الاٹ منٹ" راگ ایسا مشکل ہے کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خان ایسے پرانے گویے بھی اس کا "سرگم" نہ کر سکے۔ لوگ نئے وزیروں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نئے گویوں پر اعتبار کر کے بیٹھ گئے تو یہ اس راگ کا ستیاناس کر کے رکھ دیں گے۔

آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے حکومت پر اعتراض کیا لوگوں نے کہہ دیا: یہ شخص پانچویں کالم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ پچھلے دنوں راقم الحروف سے ایک کرم فرما نے کہا کہ:

"پانچویں کالم سے تمہارا تعلق تو پوری طرح سے ثابت ہو چکا ہے۔"

میں نے پوچھا: "وہ کیونکر؟"

جواب ملا: "حرف و حکایت اخبار کا پانچواں کالم ہے اور تم حرف و حکایت لکھتے ہو۔ اس لئے اگر پولیس تمہیں یہ کہہ کے گرفتار کر لے کہ تم پانچویں کالم سے تعلق رکھتے ہو تو تم کیا جواب دو گے؟"

بات ٹھیک ہے۔ اس زمانے میں اخبار کے پانچویں کالم سے تعلق رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں اور پھر یہ کالم بھی تو حرف و حکایت کا کالم ہے جس نے اکثر بڑے بڑے لوگوں کو ناراض کر رکھا ہے۔

پانچویں کالم کے تذکرے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ بعض اخبار نویسوں کا قاعدہ ہے کہ اخبار کی فروخت کے لئے ہیجان انگیز خبریں جن میں اکثر بے بنیاد ہوتی ہیں چھاپتے چلے جاتے ہیں اور ایک زمانے میں تو ہندو اخباروں کی وجہ سے یہ مرض بڑی ترقی پر تھا۔ ایک مرتبہ اخباروں میں ان لوگوں کی بعض حرکتوں کا ذکر آیا تو ہمارے ایک رفیق مولانا انعام اللہ خاں ناصر حسن پوری نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

ایڈیٹر ہوں ضرورت ہے مجھے خونِ دو عالم کی کہ بنتی ہے اسی سُرخی سے سُرخی پانچ کالم کی

---

۱۷ جون

سنا ہے کہ واگہ میں جہاں مغربی اور مشرقی پنجاب کی سرحد ملتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے طلبہ کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مملکتوں میں دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ واگہ میں دونوں مملکتوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کا کام پہلے بھی ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے یہ کام صرف تاجر قسم کے لوگ کر رہے تھے یعنی چور بازاری کے ساتھ ساتھ آپس کے تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں بھی ہو رہی تھیں۔ اب الحمدللہ طلبہ نے بھی اسی نیک کام کی طرف توجہ کی ہے لیکن تاجروں کا انداز اور تھا۔ طلبہ کا انداز اور ہوگا۔ وہاں تعلقات کی بہتری کے ساتھ پیٹ کا دھندا بھی چلتا تھا۔ یہاں نری تعلقات کی بہتری ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو کچھ عرصے میں واگہ بڑی مرکزی حیثیت حاصل کر لے گا۔ یہاں دونوں مملکتوں کے ادیبوں کی کانفرنسیں ہوں گی۔ مجالسِ مشاعرہ منعقد کی جائیں گی۔ کبڈی اور کرکٹ کے میچ ہوں گے۔ بڑے بڑے کلاونت جمع ہو کے گلے بازی کیا کریں گے اور اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہوتے چلے جائیں گے لیکن جب تک پولیس کی مسلح گارد ساتھ نہ ہو ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے میں نہیں جا سکیں گے۔

پاکستان اور ہندوستان، مغربی اور مشرقی پنجاب میں رشوت خور افسروں کی کمی نہیں۔ کیا اچھا ہو کہ کبھی کبھار دونوں مملکتوں کے رشوت خور افسروں کی بھی ایک کانفرنس ہو جائے۔ ڈاکٹر ستیہ پال کہتے ہیں کہ مشرقی پنجاب میں رشوت خور افسر بہت زیادہ ہیں۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم اس معاملے میں مشرقی پنجاب سے پیچھے نہیں۔ خدا نے چاہا تو واگہ کی کانفرنس میں اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

اس کانفرنس کا انداز چہار درویش کی محفل سے جس کا حال میرامّن دہلوی نے لکھا ہے کچھ ملتا جلتا ہوگا۔ یعنی دونوں طرف کے رشوت خور افسر اپنے اپنے کارنامے بیان کریں گے۔ کسی ایسے شخص کو جس کی ساری عمر رشوت خوری میں گزری ہو کانفرنس کا صدر مقرر کیا جائے گا۔ اس کی مدد کے لئے دو اعلیٰ درجے کے رشوت خور جن میں ایک مغربی پنجاب کا نمائندہ ہوگا اور ایک مشرقی پنجاب کا، موجود ہوں گے اور یہ تینوں مل کے اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ رشوت خوری میں مشرقی پنجاب کے افسر آگے ہیں یا میدان مغربی پنجاب کے ہاتھ رہا ہے۔

۱۹ر جون

محکمۂ تعلقات عامہ کا ایک پریس نوٹ اخباروں میں چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے وزیروں کے ہاں مبارک باد دینے والوں کی لین ڈوری بندھی رہتی ہے۔ اس لئے ان بچاروں کو مبارک باد قبول کرنے کے مسئلے سے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اطمینان سے وزارت کے کام کاج کی طرف توجہ کر سکیں۔ اس پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ وزرا مبارکباد دینے والوں کے شکر گزار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان ملاقاتوں میں ان کا وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں کام کرنے دیا جائے۔

بات ٹھیک بھی ہے۔ وزرا اگر دن بھر مبارک باد ہی وصول کرتے رہیں تو کام کون کرے۔ لیکن جو لوگ دلی شوق اور عقیدت سے وزراء کے بنگلوں پر مبارک باد دینے حاضر ہوتے ہیں انہیں مایوس کرنا بھی درست نہیں۔ اس لئے ہمارے خیال میں حکومت کو "مبارک باد" کا ایک علیحدہ صیغہ قائم کر کے میجر مبارک علی شاہ کو اس کا انچارج بنا دینا چاہیئے۔ اس طرح مبارک باد دینے والوں کو مایوسی بھی نہیں ہوگی اور تمام وزراء کو بھی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ بلکہ میجر مبارک علی شاہ دوسرے وزراء کی مبارک باد وصول کر کے وصولی کی تاریخ لکھ دیا کریں گے۔

وزراء کو مبارک باد دینے والوں کی وجہ سے جو زحمت اٹھانی پڑی ہے اس کی ذمہ داری دراصل خود ان پر عائد ہوتی ہے۔ میاں نوراللہ نے سخت غلطی کی ہے کہ اپنی کوٹھی سے سنتری ہٹا دیا۔ اب جو شخص آتا ہے سیدھا کوٹھی میں گھس جاتا ہے اور "وزارت مبارک، وزارت مبارک" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے اور جب تک میاں صاحب کی زبان سے دس بیس مرتبہ "تھینک یو" نہیں سن لیتا ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ ہمارے خیال میں مبارک باد دینے والوں کا ہجوم سب سے زیادہ انہی کے ہاں رہتا ہوگا۔

انہوں نے ایک اور بات یہ کی کہ وزیر بنتے ہی اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کے جامع مسجد جا پہنچے اور وہاں ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی اور اب یہ تینوں حضرات جمعہ کے دن کسی نہ کسی مسجد میں اکٹھے نماز پڑھتے ہیں اور موقع مل جائے تو تقریر بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ملاقاتیوں کا حلقہ وسیع ہو گیا ہے اور یہ لوگ ہر روز نہ سہی دوسرے تیسرے ان کے ہاں ضرور مبارک باد دینے جا پہنچتے ہیں۔ مبارک باد تو ایسی چیز ہے جو ہزار بار دی جائے جب بھی ختم ہونے میں نہیں آتی

"آپ کیسے تشریف لائے؟"

"مبارک باد دینے حاضر ہو گیا۔"

"آپ پہلے بھی مبارک باد دینے آئے تھے۔"

"جی ہاں! آج پھر مبارک باد دینے چلا آیا۔"

میاں نوراللہ پہلے بھی نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے لیکن وہ پہلے نرے میاں نوراللہ تھے۔ اب وہ نوراللہ وزیر خزانہ ہیں اور لوگوں کو خدا جانے یہ کیوں غلط فہمی ہے کہ ان کی ہمیانی اشرفیوں اور نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اب وہ مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے ہیں تو اکیلے نہیں جاتے بلکہ دو وزیروں کو ساتھ لے کے جاتے ہیں اور تقریر بھی ضرور کرتے ہیں پہلے وہ نام کے نوراللہ تھے اب لوگوں کو ان کے چہرے پر وزارت کے نور کے ساتھ

الاٹمنٹ کا نور بھی نظر آتا ہے اور کیا عجب ہے آپ کچھ دنوں میں یہ بھی سُن لیں کہ بہت سے لوگ میجر مبارک علی شاہ کے مرید ہو گئے۔ چنانچہ ان کے ہاں ہر صبح تعویذ لینے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔

۲۱ر جون

ان دنوں ایک فرانسیسی اخبار نویس ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کر رہا ہے۔ اس کا پروگرام تو یہ تھا کہ دلی پہنچ کے لاہور اور لاہور سے کراچی جاؤں گا۔ لیکن دلی میں بعض لوگوں سے اپنے پروگرام کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا، لاہور اور کراچی کے درمیان ہوائی سروس تو ہے نہیں۔ اس لئے لاہور سے کراچی کیسے جائیے گا۔ بہتر ہے کہ دلی ہی سے کراچی کا قصد کیجئے۔ لیکن ٹکٹ ابھی سے خرید لیجئے۔ بعد میں کیا عجب ہے ہوائی جہاز میں گنجائش نکلے نہ نکلے۔ چنانچہ اس نے ان لوگوں کی رائے کے مطابق ٹکٹ خرید لیا۔ دلی سے لاہور پہنچا۔ لاہور سے پھر دلی گیا اور اب وہاں سے ہوائی جہاز پر کراچی جا رہا ہے۔

پچھلے دنوں یہ اخبار نویس امرتسر سے موٹر پر لاہور پہنچا تو اسے یہ معلوم کر کے بے حد حیرت ہوئی کہ لاہور سے کراچی روز ہوائی جہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن بچارا ٹکٹ خرید چکا تھا اس لئے اسے لاہور سے پھر دلی جانا پڑا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آئی کہ اس سے ایک غلط بات اس شدّ و مد کے ساتھ کیوں کہی گئی۔ ہمارے خیال میں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ معاملہ یہیں تک رہا اور یار لوگوں نے اس سے کچھ اور نہیں کہہ دیا۔ ورنہ اگر یہ لوگ کہہ دیتے کہ لاہور میں نہ موٹریں ہیں نہ سڑکیں، نہ ہوٹل ہیں نہ قہوہ خانے۔ اور نہ کوئی پرانی قابلِ دید عمارت ہی موجود ہے۔ لوگ ننگے رہتے ہیں اور مکانوں کے بجائے غاروں میں زندگی بسر کرتے ہیں تو کوئی ان کا کیا

کر لیتا؟

گیانی کرتار سنگھ پر جو مشرقی پنجاب کی نئی وزارت کے رکن ہیں، پچھلے دنوں ایک عجیب حادثہ گزرا۔ گیانی جی اپنے ایک دوست کے ساتھ شملہ کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے ہیں۔ جس دن گیانی جی کو حلفِ وفاداری اٹھانا اور اپنے عہدے کا چارج لینا تھا انہوں نے سوچا کہ آؤ آج اشنان ہی کرلیں۔

اُدھر ان کے دوست نے یہ سمجھ کے کہ گیانی جی گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے، مکان کو تالا لگایا اور چلا گیا۔ ادھر گیانی صاحب غسل خانہ سے نکلے تو مکان کو مقفل اور اپنے آپ کو محبوس پایا تو بس قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ بہتیرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شور مچایا لیکن کسی نے توجہ نہ کی۔ کسی اور موقع پر اس قسم کا سانحہ پیش آتا تو چنداں مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن اُدھر گورنمنٹ ہاؤس میں حلفِ وفاداری کی رسم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اِدھر اس برات کے دُلھا گیانی کرتار سنگھ دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ بس وہی کیفیت تھی کہ برات کی تیاری اور دُلھا غائب۔

آخر کافی مدت تک شور مچانے کے بعد اس مصیبت سے نجات ہوئی یعنی کچھ راہ گیروں نے انہیں تالا توڑ کے باہر نکالا اور گیانی جی اس وقت گورنمنٹ ہاؤس پہنچے جب لوگ ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

ہم گیانی کرتار سنگھ سے زیادہ واقف نہیں لیکن مشرقی پنجاب کے اخباروں کے ایڈیٹروں نے یہ واقعہ اس انداز میں بیان کیا ہے جیسے گیانی جی سرے سے نہانے کے قائل ہی نہیں اور اس واقعہ کے بعد تو انہیں ایسی نصیحت ہوئی ہے کہ شاید ہی پھر کبھی ایسی حرکت کریں۔

۲۳ر جون

چھاچھ کے ایک گلاس میں پانی کے دس گلاس ڈال دو بچے جب بھی چھاچھ ہی کہلائے گی۔ یہ اور بات ہے ذرا پتلی ہو جائے گی۔ ہماری وزارت میں پہلے چار وزیر تھے اب پانچ ہیں۔ سُنا ہے عنقریب دو وزیروں کا اضافہ ہونے کو ہے۔ لیکن وزارت ہر حال میں وزارت ہے۔ چار کی ہو یا پانچ کی۔ سات کی ہو یا دس کی۔ گویا ہماری وزارت ربڑ کی ہے جب چاہا کھینچ کے لمبی کر لی۔

چودھری محمد حسن "اول المہاجرین" ہیں یعنی سب سے پہلے ہجرت کی۔ لاہور پہنچتے ہی پہلے لیزان افسری اور پھر اسمبلی کی ممبری پر ہاتھ صاف کیا۔ اب سُنا ہے یار لوگ پھر انہیں وزیر بنانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ پچھلے دنوں کچھ اڑی مار لوگوں نے ان کے راستے میں بعض رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ لیکن وہ ایک ہی ٹھوکر میں اُڑ گئیں۔ وزارت چودھری صاحب کا انتظار کر رہی ہے، جب چاہیں آ کے چارج لے لیں۔

یہ تو چھوٹے وزیر ہوئے اچھوتے ہوئے نہیں، صرف چھوٹے۔ رسانویں وزیر نواب سر مہر شاہ ہیں جو حزب اللہ والے سید فضل شاہ سجادہ نشین جلال پور شریف کے چھوٹے بھائی اور بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ میجر مبارک علی شاہ جھنگ شریف کے پیر ہیں۔ نواب سر مہر شاہ جلال پور شریف کے پیرزادے ہیں۔ گویا ان کے وزارت میں شامل ہو جانے سے مغربی پنجاب کی وزارت "وزارت شریف" بن جائے گی اور بیچاری چند مہینے میں غفر لہا بھی ہو گئی تو ہر سال اس کا عرس شریف تو ضرور ہوا کرے گا۔

گویا وزارت چھاچھ یا ربڑ ہی نہیں عملِ تسخیر اور عملِ حُبّ اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ چھاچھ میں پانی ڈالئے تو پتلی ہو جاتی ہے۔ وزارت کی چھاچھ میں پانی ملایا جائے تو گاڑھی ہو جاتی ہے اور اس میں ایک مہاجر اور دو پیر شامل کر لئے جائیں تو دافع نظرِ بد بن جاتی ہے اور "شریعت گروپ"

سے محفوظ رکھتی ہے۔

خان ممدوٹ نے میجر مبارک علی شاہ اور نواب سر مہر شاہ ایسے خدا رسیدہ بزرگوں اور مستند پیروں کی مدد سے وزارت کے گرد اگرد حصار باندھ کے اپنے آپ کو آسمانی اور زمینی آفات و بلّیات سے بظاہر محفوظ تو کر لیا ہے۔ پھر بھی ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ قصہ زیادہ دیر تک چل سکے گا۔ بہر حال "وزارت شریف" نہیں تو نہ سہی "عرس شریف" تو کہیں نہیں گیا۔

۲۶ر جون

میاں نوراللہ نے اب کے جمعہ کو بادشاہی مسجد میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے فرمایا:

"میں نے صرف مغربی پنجاب اور پاکستان کی خدمت کرنے کے لئے وزارت کا عہدہ قبول کیا ہے"۔

لیکن میاں صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ پیٹ کی خاطر کس نے وزارت قبول کی ہے؟ میاں عبدالحمید دستی نے یا میجر مبارک علی شاہ نے، شیخ کرامت علی نے یا خان ممدوٹ نے؟ آخر ان بزرگوں نے بھی تو مغربی پنجاب اور پاکستان کی خدمت ہی کرنے کے لئے وزارت قبول کی ہے۔

وزارت ساجھے کی ہے اور ذمہ داری مشترک۔ لیکن ہر وزیر اسی کوشش میں مصروف ہے کہ نیک نامی صرف میرے حصے میں آئے۔ وہ صاف صاف یہ تو نہیں کہتا کہ سارا نور ظہور میرے ہی دم قدم سے ہے باقی وزرا صرف برائے وزن بیت ہیں۔ لیکن عام جلسوں، محفلوں اور نجی صحبتوں میں جو کچھ کہتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس برات کا دولہا میں ہوں۔ دوسرے وزیر محض براتی ہیں۔

ہمارے خیال میں وزارت کو چاہئے کہ نیک نامی کا راشن مقرر کر دے۔ ورنہ بعض وزرا خصوصاً میاں نوراللہ جس طرح دونوں ہاتھوں سے نیک نامی سمیٹ رہے ہیں اسے دیکھ کے تو

یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں وہ نیک نامی کے سارے ذخیرے ہی پر قبضہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اور دوسرے وزراء کو حافظ کی زبان میں یہ کہنا پڑے کہ ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند　　گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

نیک نامی کی راشن بندی میں یہ اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں یار لوگ اس جنس کی "بلیک مارکٹ" نہ شروع کر دیں اور میاں نور اللہ جنہیں تجارت کے گر خوب آتے ہیں بلیک مارکٹ سے کالاٹے نیک نامی خرید خرید کے گھر نہ بھر لیں۔ اراضی کا بے نامی کاروبار چل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نیک نامی کا بے نامی کاروبار نہ چلے۔ یعنی خان ممدوٹ اپنے راشننگ افسر اور ان کے اخبار "استقلال" پر بھروسہ کئے بیٹھے رہیں اور یہاں "بے نامی" اخباروں کے ذریعے نیک نامی کا سارا ذخیرہ لٹ جائے اور بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔

میاں نور اللہ نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ:

"وزراء ہر جمعہ کو شہر کی کسی بڑی مسجد میں نماز پڑھا کریں گے تاکہ مسلمانوں سے ربط ضبط پیدا کیا جا سکے۔"

وزراء نے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ خدا انہیں پابندی سے نمازِ پنجگانہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن اگر وہ مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ذرا ان لوگوں کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جو ہندوستان سے اپنا سب کچھ لٹا کے آئے اور اب پاکستان میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کیمپوں میں ہیں۔ کچھ سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ کچھ شہروں میں ہیں اور کچھ دیہات میں کس مپرسی اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور میاں صاحب کو نیک نامی کی ہوس ہے تو اس کام میں نیک نامی بھی ہاتھ آئے گی اور ثوابِ اُخروی بھی نصیب ہوگا۔ ہاں شاید ان کی ہر تقریر اخباروں میں نہ چھپ سکے۔ کیونکہ ہر گاؤں میں ایسوشی ایٹڈ پریس کا نمائندہ موجود نہیں۔

---

۲۷ / جون

شروع شروع میں لوگ سمجھتے تھے کہ الاٹ منٹ بھی کوئی دائمی اور مستقل چیز ہے۔ چنانچہ جس شخص کو کوئی دکان، مکان، زمین یا فیکٹری الاٹ ہو جاتی تھی وہ مارے غرور کے زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا لیکن چند دنوں کے اندر اندر ہی معلوم ہو گیا کہ الاٹ منٹ بھی وزارت کی طرح ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔

کچھ دنوں سے "ناجائز الاٹمنٹوں" کی تحقیقات کا کام بڑے زور سے ہو رہا ہے اور بعض لوگ جو دکانوں، مکانوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے "شتر بے مہار" یا یوں کہئے کہ "شتر بے الاٹمنٹ" بنے پھر رہے ہیں لیکن یہ نہ سمجھئے کہ جن لوگوں کو ان کی جگہ دکانیں اور زمینیں وغیرہ ملی ہیں ان کا قبضہ دائمی اور مستقل ہے۔ کیا عجب ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ الاٹ منٹ بھی ناجائز ثابت ہو اور یہ حضرات بھی "شتر بے الاٹ منٹ" ہو کے رہ جائیں۔

سُنا ہے میاں نوراللہ نے حکم دیا ہے کہ لائل پور کے آس پاس جتنی زمینیں ہیں، وہ ارائیوں کو دی جائیں تاکہ لائل پور کے لوگوں کو سبزی با فراط مل سکے۔ ہمیں اس حکم سے بحث نہیں۔ میاں نوراللہ نے کچھ سوچ ہی کے یہ حکم دیا ہو گا۔ لیکن اگر وزارت میں کوئی تبدیلی ہوئی اور میاں نوراللہ کی جگہ کوئی اور صاحب آ گئے تو ممکن ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو جائے اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی جائے کہ شہر کے آس پاس کی زمینیں گوجروں کو دی جائیں۔ کیونکہ لائل پور کے لوگوں کو سبزی سے زیادہ دودھ دہی کی ضرورت ہے —— اگر انجمن شاہان گوجر کے صدر صاحب کسی حادثہ کی وجہ سے وزیر بن گئے تو وہ یقیناً ارائیوں کو بے دخل کر کے یہ زمینیں گوجروں کو دلا دیں گے۔

غرض اصل بات یہ ہے کہ الاٹ منٹ وزیروں کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے تحصیلداروں کے

ساتھ ساتھ بدلتی ہے بلکہ کہیں کہیں تو پٹواریوں کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔ اگر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن والے یہ سمجھتے ہیں کہ یوم اقبال انہیں ہمیشہ کے لئے الاٹ ہو گیا تو وہ غلطی پر ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ یوم اقبال اگلے سال مسلم چیمبر آف کامرس یا ٹریڈرز یونین یا اقبال گھی سٹور کو الاٹ ہو جائے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن والے منہ تکتے رہ جائیں۔

الاٹمنٹ کے سلسلے میں بڑی بڑی دلچسپ باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً نائی کو دھوبی کی دکان، دھوبی کو ہیئر کٹنگ سیلون، تیلی کو چھاپہ خانہ اور چھاپہ خانے والے کو کولھو الاٹ ہو گیا ہے۔ نائی استرے سے استری کرتا ہے۔ دھوبی "کلین شیو" کے بجائے چہرے کو "ڈرائی کلین" کر کے سمجھتا ہے کہ بس میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ چھاپے خانے والا کولھو پر کاپی جمانا چاہتا ہے اور تیلی نے مشین مین کو موقوف کر کے اس کی خدمات بیل کے حوالے کر دی ہیں بنیا بزاز بن گیا ہے۔ اس لئے کپڑا تل کے بکتا ہے۔ بزاز بنیا بن بیٹھا ہے اور ہلدی کی گرہ کو ناپ کے بیچ رہا ہے۔

اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو دکانیں، زمینیں اور کارخانے الاٹ ہو چکے ہیں یا الاٹ ہو رہے ہیں ان میں سے کوئی مطمئن نہیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ الاٹمنٹ کا کیا اعتبار۔ نہ جانے یہ الاٹمنٹ کب ناجائز قرار پائے اور بے دخلی کا حکم آ جائے یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص کام جی لگا کے نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کی بے اطمینانی کی یہی کیفیت رہی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔

ناجائز الاٹمنٹ کی تحقیقات بہت اچھا کام ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اب جو الاٹمنٹ ہو رہی ہے کچھ عرصے کے بعد اسے بھی ناجائز قرار نہیں دے دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ ناجائز الاٹمنٹ کرتے ہیں انہیں تو کوئی پوچھتا نہیں۔ البتہ جن لوگوں کو کوئی زمین یا دکان الاٹ ہو جاتی ہے انہیں ضرور بے دخل

کر دیا جاتا ہے۔ جب تک ناجائز الاٹ منٹ کرنا جرم نہیں، ناجائز الاٹ منٹ ہوتی رہے گی اور کیا عجب ہے کہ ہماری حکومت الاٹ منٹ کے اس چکر سے کبھی نہ نکل سکے۔

۷ر جولائی

کہتے ہیں کہ کارپوریشن کے چیف انگزکٹو آفیسر نے حکم دیا کہ آج سے لاہور کی سڑکوں پر چھڑکاؤ نہ کیا جائے۔ یہ حکم غالباً رمضان شریف کے احترام کی وجہ سے دیا گیا ہے اور بات ٹھیک بھی ہے۔ لوگ بھوک پیاس کی سختیاں اٹھا رہے ہوں تو سڑکوں کو پیاس بجھانے کا موقع کیوں دیا جائے۔ انہیں بھی پیاسا رہنا چاہیے۔

پھر یہ بھی تو ہے کہ لاہور بہشت ہے۔ یا کم از کم کارپوریشن اسے بہشت بنانا چاہتی ہے اور ہم نے کبھی نہیں سنا کہ بہشت کی سڑکوں پر بھی بہشتی چھڑکاؤ کرتے پھرتے ہیں۔ دیکھیں ہمارے داروغۂ بہشت یعنی چیف انگزکٹو آفیسر لاہور کو پوری طرح جنّت نظیر بنانے کے لئے اور کیا کچھ کرتے ہیں۔ لیکن اے حضرت! کہیں اسے بہشت بناتے بناتے کربلا نہ بنا دیجئے گا۔

بہشت میں تین نہریں ہیں۔ کوثر، تسنیم اور سلسبیل۔ لاہور سے مولانا نصراللہ خاں عزیز کی ادارت میں اخبار کوثر تو نکل رہا ہے۔ اب سنا ہے کہ وہ تسنیم کے نام سے ایک اور اخبار جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ کارپوریشن والے ہمت کر کے اگر سلسبیل کے نام سے ایک اخبار جاری کر دیں تو لاہور کے بہشت ہونے میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے۔

مولوی صادق علی صاحب نے کچھ عرصے سے شور مچا رکھا ہے کہ مولوی حسین علی نے میرا ذہن چرا لیا ہے۔ وہ مجھے واپس مل جائے تو اہم سے اہم مسائل چٹکی بجاتے میں حل کر دوں۔ وہ

ہر روز اس سلسلے میں اخباروں کے ایڈیٹروں، وزرائے کرام اور اسمبلی کے ممبروں کو ایک آدھ خط لکھ دیتے ہیں لیکن کوئی انہیں ان کا حق دلوانے کی کوشش نہیں کرتا۔

مولوی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ پاکستان میں چوری نہیں ہوتی۔ البتہ الاٹمنٹ کا بازار ضرور گرم ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ مولوی جیون علی نے آپ کا ذہن چرایا نہیں بلکہ الاٹ کرالیا ہے۔ آپ بھی درخواست دے کے دیکھئے۔ کیا عجب ہے کہ آپ کو اپنا کھویا ہوا ذہن واپس مل جائے۔

لیکن اگر آپ کا ذہن تحقیقات سے "اعلیٰ درجے" کا ثابت ہوا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی وزیر یا . . . . کسی وزیر کا رشتہ دار آپ کا ذہن اپنے نام الاٹ نہ کرالے۔ اور ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے آپ نے اپنے ذہن کے متعلق اخباروں میں خط چھپوانے شروع کئے ہیں، کئی بڑے بڑے آدمی، جن میں بعض اخباروں کے ایڈیٹر بھی شامل ہیں، آپ کا ذہن الاٹ کرانے کی فکر میں ہیں۔ اس لئے اس معاملہ میں ذرا احتیاط سے کام لیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یار لوگ آپ کا ذہن تو اپنے نام الاٹ کرالیں۔ اور آپ کو کسی معمولی سے ذہن پر ٹرخا دیا جائے۔

---

۸ جولائی

اسٹیشن ماسٹروں کی یونین بن گئی۔ سکول ماسٹروں نے اپنی یونین قائم کرلی۔ ہیڈ ماسٹر بھی اس فکر میں ہیں کہ اپنی یونین قائم کرلیں۔ ہمارے خیال میں وزیروں کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہئیے۔ نئے اور پرانے یعنی بے روزگار اور برسرِ کار وزیر مل کے ایک یونین قائم کرلیں تو ہرج ہی کیا ہے۔ بچارے سر خضر حیات خاں مدت سے "یوسف بے کارواں" بنے ہوئے ہیں۔ لغاری[1] صاحب کا بھی کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں۔ یونین سے اتنا فائدہ تو ہوگا کہ ان بے کارواں

[1] سر محمد جمال خاں لغاری

کو پھر کاروان ہاتھ آجائے۔

وزیروں کی یہ یونین کوئی چھوٹی سی یونین نہیں ہوگی۔ جو لوگ وزیر رہے ہیں یا جنہوں نے کبھی وزارت کی آرزو کی ہے۔ اُن سب کو ملالیا جائے تو نفری کے لحاظ سے تانگے والوں کی یونین سے کچھ ہی کم ہوگی۔ آج کل ضلع وار آبادی کا بڑا چرچا ہے۔ ہماری رائے میں اگر وزیروں کی برادری کو ایک ہی جگہ آباد کیا جائے تو وزیرستان نہ سہی چھوٹا موٹا "وزیر آباد" تو ضرور ہی آباد ہو جائے گا۔ جس میں ہر طرف وزیر خان ہی وزیر خان نظر آئیں گے۔

وزیروں کی یونین کی تجویز پر مغربی پنجاب کے موجودہ وزرا کو ناک بھوں چڑھانے کے بجائے سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ دولت کی طرح وزارت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ سکرٹریٹ کے ان کمروں نے جہاں آج آپ رونق افروز ہیں۔ آپ ایسے کئی وزیر دیکھے ہیں جو اپنے اقتدار کے زمانے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس لئے اس دو دن کی وزارت پر غرور نہ کیجئے اور بے روزگاری کے زمانے کے لئے ابھی سے کچھ سامان کر لیجئے ع

کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

سُنا ہے میجر مبارک علی شاہ نے اپنے دفتر میں پلنگ بچھوا لیا ہے تاکہ کام کرتے تھک جائیں تو تھوڑی دیر پلنگ پر لیٹ کے کمر سیدھی کر لیا کریں۔ امید ہے کہ دوسرے وزرا بھی اُن کی پیروی کریں گے اور وزراء کے دفتر آہستہ آہستہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد کا دیوانِ خاص یا ابوالحسن تاناشاہ کی محل سرا بن کے رہ جائیں گے۔

اور کسی کو توفیق ہو نہ ہو شیخ کرامت علی صاحب کی خوش ذوقی سے ہمیں امید ہے کہ اس معاملے میں میجر مبارک علی شاہ کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ جن کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے ڈھائی لاکھ روپے کی مشین منگوائی گئی ہے۔ ان میں راحت و آرام کے سارے سامان جمع

ہونے چاہئیں۔ ایک طرف کسا کسایا پلنگ ہو۔ دوسری طرف چاندنی کا فرش۔ اس پر گاؤ تکیئے۔ ایک طرف پاندان۔ پاس ہی چھالیا کاٹنے کے لیے سروتا۔ تاکہ وزیر صاحب کو اور کوئی کام نہ ہو تو پان لگائیں۔ یا چھالیا کاٹ کاٹ کے جی بہلائیں۔ تھک جائیں تو پلنگ پر لیٹ جائیں یا گاؤ تکیئے سے ٹیک لگا کے کمر سیدھی کر لیں۔

کارپوریشن والے کہتے ہیں کہ ہم لاہور کو بہشت بنانا چاہتے ہیں۔ لاہور بہشت بنے نہ بنے۔ ہمارے وزراء نے تو سکریٹریٹ کو بہشت بنا لیا معلوم نہیں اس بہشت کا "رضوان" کون ہے۔ شیخ کرامت علی میجر مبارک علی شاہ یا خود خان ممدوٹ۔ بہرحال یہ ملحوظ رہے کہ سکریٹریٹ کا یہ بہشت جنّت الحمقا نہیں۔ جنّت الوزرا ہے۔ جنّت الحمقا میں تو ہم آپ رہتے ہیں جنہیں اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے وزرا اپنے اپنے دفتروں میں لیٹے لیٹے سارے قومی مسائل حل کر دکھائیں گے۔

۹ر جولائی

خان ممدوٹ نے کل ریڈیو پر تقریر کی ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ نالائق اور رشوت خور اہل کاروں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں۔ ورنہ انہیں اپنے عہدوں سے الگ کر دیا جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ رشوت خور اہل کار خان ممدوٹ کی تقریر سن کے رشوت لینا چھوڑ دیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم کی تقریر سے متاثر ہو کے نالائق اہل کار نالائقی سے توبہ کر لیں اور لائق بن جائیں۔

ایک چینی شاعر کی نظم آپ نے سنی ہو گی جس میں اس نے خدا سے دعا کی ہے کہ میرا لڑکا لکھنے پڑھنے میں ہمیشہ پھسڈی رہے تاکہ کسی صوبے کا گورنر ہو جائے۔ ہمارے ہاں نالائق لوگ اتنی ترقی نہیں کرتے کہ صوبے کے گورنر ہو جائیں۔ البتہ چھوٹے موٹے عہدے تو کہیں نہیں گئے

بلکہ کسی اُونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں تو وزیر بھی بن سکتے ہیں۔

میاں نوراللہ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ جو قیدی باقاعدگی سے نماز پڑھیں گے اور پورے روزے رکھیں گے۔ ان کی سزا میں تخفیف کر دی جائے گی۔ بات بہت اچھی ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ خان ممدوٹ بھی یہ حکم نہ دے دیں کہ جو رشوت خور اور نالائق افسر باقاعدگی سے نماز پڑھیں گے اور روزے رکھیں گے۔ ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

کبھی کبھی تو خیال آتا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو جس اہل کار کے ماتھے پر نماز کا گھٹا ہاتھ میں تسبیح اور منہ پر داڑھی نظر آئے گی۔ وہ جو کچھ چاہے گا کرے گا اور اس کے خلاف کاروائی نہیں کی جا سکے گی اور جس نے حج کر لیا، اسے تو یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ جتنے مکان اور دکانیں چاہے اپنے نام الاٹ کرا لے۔

ہم نے اسلام کا نام لے کے پاکستان حاصل کیا۔ جن لوگوں کو عہدوں اور وزارتوں کی تقسیم میں اپنا حصہ نہ ملا۔ اب وہ بھی شریعت اور دین کا نام لے لے کے اُونچے اونچے رتبوں پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وزیروں اور دوسرے عہدے داروں کے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ یہی مجرب نسخہ آزمائیں اور اپنے آپ کو سارے حریفوں سے زیادہ دین دار ثابت کر دکھائیں۔

۱۰ر جولائی

سُنا ہے کراچی کارپوریشن میں ہنگامہ ہو گیا۔ یعنی کارپوریشن کے ایک ممبر ڈاکٹر اے اے خان جن کی طبیعت میں کونین کی سی تلخی اور زبان میں نشتر کی سی تیزی ہے ایسے بگڑے کہ کارپوریشن

کے اجلاس کو عرصۂ کارزار بنا کے رکھ دیا اور دم بھر میں بس یہ نقشہ نظر آنے لگا ۔

ایک چانٹا ، ایک گھونسا ، ایک لات

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ڈاکٹر اے ۔ اے خان کو ہم نہیں جانتے ۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ فلسفہ کے ڈاکٹر ہیں ۔ یا ادب کے ۔ علم الابدان کے ماہر ہیں یا جراحی میں کمال رکھتے ہیں ، یا پھر صرف دانت ہی نکالتے ہیں ۔ تاہم ان کا نام جو اینٹی ایئر کرافٹ کی یاد دلاتا ہے جنگی ضرور ہے لیکن ناموں سے اس قسم کے اندازے لگانا غلط ہے ۔ یوں تو پروفیسر آل احمد سرور کا نام بھی آل انڈیا ریڈیو اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی یا اس قسم کے آل انڈیا اور آل پاکستان اداروں کی یاد دلاتا ہے لیکن پروفیسر صاحب کا تعلق اس قسم کے کسی ادارے سے نہیں ۔ بہرحال ڈاکٹر اے ۔ اے خان نام کے لحاظ ہی سے نہیں ۔ بلکہ کام کے لحاظ سے بھی بڑے دبنگ قسم کے بزرگوار ہیں ۔ اور کراچی کارپوریشن کے اجلاس میں انہوں نے جو کارنامہ کر دکھایا ہے ۔ وہ تو لندھور بن سعدان کی کسی داستان کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ کارپوریشن کے ایک ممبر مرزا آدم خان نے ڈاکٹر اے ۔ اے خان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کر رکھی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا ۔ لیکن ممبر مرزا نے انہیں بات تک کرنے نہ دی ۔ اس پر ڈاکٹر خان ہاتھوں کو تلوار کی طرح عَلم کئے ہوئے بڑھے اور میرزا کے دو گھونسے رسید کئے ۔ کہتے ہیں یہ دلیل بڑی "دندان شکن" تھی ، صرف محاورۃً ہی نہیں بلکہ یوں بھی ۔ کیونکہ اس جھگڑے میں مرزا آدم خاں کے دانتوں پر بھی آفت آئی ۔

ڈاکٹر اے ۔ اے خان حریف کو گرد برد کر کے نشۂ شجاعت میں جھوم رہے تھے کہ ڈپٹی میئر صاحب نے چلّا کے کہا ، "یہ حرکت پارلیمنٹری آداب کے خلاف ہے ۔" ڈاکٹر صاحب ڈپٹی میئر

کو پارلیمنٹری آداب سکھانے کے لئے بڑھے ہی تھے کہ دوسرے ممبروں نے انہیں روک لیا اور تھتو تھمبو کرکے ہال کے باہر پہنچا دیا۔

افسوس ہے کہ اے۔ اے خان اور آدم خان کی لڑائی کا صحیح نقشہ راقم الحروف سے نہیں کھنچ سکا۔ کیونکہ "خوانین" کا جنگ نامہ لکھنے کے لئے کسی نعمت خان عالی کا قلم درکار ہے۔ راقم الحروف مغربی پنجاب کے پہلوانوں کے دنگلوں کا حال ہی لکھ سکتا ہے۔

لاہور کارپوریشن میں کبھی کبھی زور کے معرکے ہو جاتے ہیں۔ مغربی پنجاب کی اسمبلی کے گزشتہ اجلاس میں بھی بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ گالیوں کی گولیاں بھی چلیں۔ طعنوں کی سنانیں بھی چمکیں۔ دشنام کے تیروں نے بھی سینوں کو چھلنی کیا۔ لیکن بحمد اللہ کہ لپا ڈگی تک نوبت نہیں پہنچی۔ گویا مغربی پنجاب کے ممبر فخر سے کہہ سکتے ہیں ؎

زخم ہا برداشتیم و فتح ہا کردیم لیک
ہرگز از خون کسے رنگیں نشد داماں ما!

۱۲ر جولائی

سالک صاحب انڈو اسلام لیگ کے تذکرے میں لکھتے ہیں :-

"اب یہ "مسلمان تارا سنگھ" بھی پیدا ہو گیا ہے اور خدا جانے کونسی طاقتوں کے اشارے پر اس قسم کا مطالبہ پیش کر رہا ہے جو مسلمانوں کی کسی جماعت نے آج تک پیش نہیں کیا۔"

"مسلمان تارا سنگھ" سے علامہ مشرقی مراد ہیں۔ جو مسلمانوں کو ان دنوں اس بات کا یقین دلانے میں مصروف ہیں کہ ہندو مشرقی پنجاب، یو پی، بہار اور مغربی بنگال ہمارے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم نے آج تک ان سے ان چار صوبوں کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔

علامہ مشرقی اور ماسٹر تارا سنگھ میں واقعی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں سکول ماسٹر رہے ہیں۔ دونوں نے برسوں لڑکے پڑھائے ہیں اور غالباً یہ اسی کا اثر ہے کہ دونوں ایسی باتیں کہتے ہیں۔ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ ماسٹر تارا سنگھ چاہتے ہیں کہ چناب تک سارے مغربی پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہو جائے۔ علامہ مشرقی کو یہ دھن ہے کہ ہندوستان کے چار صوبے مسلمانوں کے ہاتھ آجائیں۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ تو پیدائشی طور پر سکھ ہیں اور علامہ مشرقی اگرچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم انہوں نے محنت اور کوشش سے ماسٹر تارا سنگھ کا سا دماغ حاصل کر لیا ہے۔

علامہ مشرقی کے کمالات میں کوئی شک نہیں۔ تاہم ہمیں اس بات سے اختلاف ہے کہ انہیں "مسلمان تارا سنگھ" کہا جائے۔ ہمارے خیال میں انہیں علامہ "سردار اختر مشرقی" کہنا چاہیئے۔ تارا اور اختر دونوں ہم معنی ہیں اور سردار، سنگھ کا لفظی ترجمہ نہیں، تاہم اتنا تو ہے کہ ہر "سنگھ" آج کل سردار کہلاتا ہے۔ اگر آپ کو لفظی ترجمہ پر ہی اصرار ہے تو ان کا نام علامہ "شیر اختر مشرقی" رکھ دیجیئے۔

اس موقعہ پر ایک اور بات عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علامہ مشرقی سچ مچ "مشرقی" ہیں تو مغربی پنجاب میں کیا کر رہے ہیں مشرقی پنجاب تشریف لے جائیں۔ جہاں ان دنوں ان کے "بروز" ماسٹر تارا سنگھ براج رہے ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے فائدہ بھی تو مشرقی پنجاب ہی کو پہنچے گا۔ مغربی پنجاب کو تو سراسر خطرہ ہی خطرہ ہے۔

---

۴ ار جولائی

ترکی کے مشہور اخبار "الیوم" نے لکھا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو صحیح معنوں میں وزارت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس لیئے ایک مدرسہ قائم کر دینا چاہیئے۔ جس میں وزیروں

کو حکومت کے ادب آداب اور نظم و نسق کے طریقے سکھائے جائیں۔

ترکی میں "مدرسۂ وزرا" قائم ہو نہ ہو، ہمارے ہاں اس قسم کا ایک مدرسہ ضرور کھل جانا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے ہاں وزرا کمیاب ہیں۔ ایک وزیر استعفیٰ دے دیتا ہے تو مدت تک اس کا جانشین نہیں ملتا اور ہمارے وزیر اعظم کو وزارت قائم رکھنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

پچھلے دنوں آپ دیکھ چکے ہیں کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں نے استعفا دے دیا تو خان ممدوٹ کو نئے وزیروں کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا تھا۔ وہ تو کچھ ایسا ہی اتفاق ہو گیا کہ چوہدری محمد حسن ہاتھ نہ آئے، ورنہ خان ممدوٹ کو دو وزیروں کے عوض مغربی پنجاب کے خزانہ پر چار نئے وزیروں کا بوجھ ڈالنا پڑتا۔

وزیروں کا مدرسہ یا کارخانہ کھل جائے تو اتنا تو ہو گا کہ جب وزیر کی ضرورت پڑی مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر یا کارخانہ کے منیجر کو لکھ بھیجا اور اچھا خاصا وزیر مل گیا۔ اب تو حال یہ ہے کہ جو شخص وزارت کے عہدے کے لئے ملتا بھی ہے۔ وہ وزیر نہیں ہوتا بلکہ اسے وزیر بنانا پڑتا ہے۔

اور یہ بات عجیب بھی تو ہے کہ تین چار سو روپلی کا عہدہ دار جب تک یونیورسٹی کی سند کے علاوہ اپنے سابقہ تجربہ کے ثبوت میں سندات پیش نہ کرے، پبلک سروس کمیشن کے ہفتخوان سے نہ گذرے اسے نوکری نہیں ملتی۔ لیکن دو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کا وزیر جس کی ماتحتی میں کئی محکمے ہیں، نہ سند دکھاتا ہے، نہ پبلک سروس کمیشن کا مرحلہ طے کرتا ہے اور وزارت کی کرسی پر جا بیٹھتا ہے۔

سو روپے کی نوکری کے لئے بی۔اے پاس ہونا ضروری ہے، ڈیڑھ دو سو کی کلرکی کے لئے بی اے کی سند کے علاوہ تجربہ بھی شرط ہے، لیکن وزیر بننے کے لئے اس قسم کی کوئی شرط نہیں۔ انٹرینس پاس بلکہ انٹرینس فیل بھی وزیر ہو سکتا ہے اور کبھی کبھی تو اتنی استعداد بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی اور یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اس "مدرسۃ الوزراء" کے عملہ کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے گھسے ہوئے وزیر موجود ہیں جن کی عمریں وزارت کرتے گذر گئی ہیں۔ اگر مدرسہ کا ڈول ذرا سلیقہ سے ڈالا گیا تو اس کارخانے سے جو وزیر ڈھل کے نکلے گا۔ بس "آٹھوں گانٹھ وزیر" ثابت ہوگا۔ ہاں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ امتحانِ داخلہ ذرا سخت ہو۔ زیادہ سخت نہ سہی، کم از کم سنٹرل ماڈل سکول کے امتحانِ داخلہ جیسا تو ہو۔ ورنہ وزارت کے تمنائی دس بیس نہیں ہزاروں ہیں۔ آپ کس کس کو آدابِ وزارت سکھائیے گا اور کس کس کو وزیر بنا دیجئے گا؟

۱۵ر جولائی

پچھلے دنوں فوج کا کچھ فالتو مال فروخت کیا گیا تھا۔ اس میں خنزیر اور گائے کے گوشت کے کچھ ڈبے بھی تھے۔ بعض مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اخباروں میں یہ اطلاع چھپوا دی کہ بازار میں خنزیر کا گوشت بک رہا ہے مسلمانوں کو خبردار رہنا چاہئے۔ ساتھ ہی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ ان ڈبوں کو تلف کرا دیا جائے۔

یہ تجویز تو بہت اچھی تھی لیکن اس سلسلے میں بعض لوگوں کی طرف سے ایک اور بھی تجویز پیش کی گئی ہے۔ یعنی کہا گیا ہے کہ دوکانداروں کو یہ احتیاط بھی کرنی چاہئے کہ وہ یہ ڈبے

صرف غیر مسلموں کے ہاتھ بیچیں کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک خنزیر کا گوشت کھانا ہی گناہ ہے۔ اس کی خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ڈبے بیچنے والا کوئی انگریز افسر تھا اور خریدنے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان میں کیا ہے۔ انہوں نے سستا مال دیکھا اور خرید لیا اور کسی کے ہاتھ بیچا بھی تو نادانستہ طور پر۔ لیکن ان لوگوں کو کیا کہا جائے جو دکانداروں کو تلقین کر رہے ہیں کہ لحم خنزیر بیچو۔ لیکن صرف غیر مسلموں کے ہاتھ!

ہمارے خیال میں ان ڈبوں کو فوراً تلف کر دینا چاہیئے اور اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ حکومت ان ڈبوں کو تلف کرنے کا کوئی انتظام کرتی ہے یا نہیں۔ حکومت ایسی چوکس ہوتی تو ان ڈبوں کو فروخت ہی کیوں ہونے دیتی؟ آخر یہ از راز بھی تو عجب ہے کہ حکومت مجبور کرے تو خنزیر کا گوشت تلف کیا جائے گا، ورنہ بدستور فروخت ہوتا رہے گا۔

یہ عجب بات ہے کہ مسلمان خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ ہر کام میں حکومت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ روزہ رکھوائے تو ڈپٹی کمشنر، نماز پڑھوائے تو کوئی وزیر یا سکتر یا اسمبلی کا ممبر۔ ہمیں تو ڈر ہے آگے چل کے کہیں یہ نہ ہو جائے۔ کہ جب تک پولیس کا سپاہی آ کے منہ نہ دھلائے ہم منہ نہ دھوئیں، بلکہ دوپہر تک چارپائی پر پڑے پڑے انتظار کرتے رہیں کہ کب پولیس والا دو گدے رسید کر کے ہمیں چارپائی سے اٹھاتا اور ہمارا منہ دھلاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کپڑے بدلنے اور کھانا کھانے میں بھی ہمیں پولیس کا سہارا تلاش کرنا پڑے۔

جب سے رمضان شروع ہوا ہے۔ پولیس کو احتساب کے اختیارات بھی مل گئے ہیں۔ اب پولیس کا کنسٹبل یہی نہیں دیکھتا کہ گرہ کٹ کون ہے؟ چور کون؟ بلکہ یہ دیکھنا بھی اس کا کام ہے کہ کس نے روزہ رکھا ہے اور کس نے نہیں رکھا؟ کسی خوانچے والے نے کسی کے ہاتھ

کوئی چیز تو نہیں بیچی؟ کسی ریستوران میں دن کو کھانا پایا جائے تو فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ احتساب زیادہ تر شہر کے اندرونی حصّے ہی تک محدود ہے، مال روڈ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس سڑک سے گذریئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رمضان نہیں بلکہ شوال کا مہینہ ہے۔

ہمارے خیال میں عام مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ خود ہی کھانے پینے کی دکانیں بند کر دیتے اور سختی برتنے کے بجائے لوگوں کو نرمی سے سمجھاتے۔ راقم الحروف نے دیکھا ہے کہ رمضان کے مہینے میں کلکتہ بھر میں مسلمانوں کے تمام ہوٹل اور ریستوران بند رہتے ہیں۔ ماہِ صیام کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حکّام کی مداخلت کے بغیر ہوتا ہے۔

پولیس کے ڈر سے روزہ رکھنے یا رمضان کا احترام کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ خدا سے نہیں بلکہ پولیس سے ڈرتے ہیں۔ ہم حکّام کو مداخلت کا موقع ہی کیوں دیں؟ خود ہی کیوں نہ طے کرلیں کہ ہم رمضان کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھیں گے۔ اس بات کا انتظار کیوں کریں کہ پولیس آکے لحمِ خنزیر کے ڈبّوں کو تلف کرائے۔ جو لوگ یہ ڈبّے فروخت کر رہے ہیں آخر وہ بھی مسلمان ہیں۔ وہ خود ہی ان ڈبوں کو کیوں تلف نہیں کر دیتے۔

۱۶؍ جولائی

ہمارے ایک دوست نے جو کہنہ مشق اخبار نویس اور بڑے صاحب علم بزرگوار ہیں "استقلال" میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بخت نصر پر چڑھائی کی اور اللہ نے اس معرکہ میں انہیں کامیاب کیا تو انہوں نے بنی اسرائیل کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ آگے چل کر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مصر میں بخت نصر اور ٹیٹس کے بہت سے مندر موجود تھے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ بخت نصر حضرت موسیٰ کا ہمعصر تھا اور ٹیٹس ان سے بہت پہلے ہو گذرا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام ولادت مسیح سے ۱۵۷۱ برس پہلے پیدا ہوئے۔ بخت نصر کی تاریخ ولادت ۵۸۶ ق۔م ہے اور ٹیٹس تو مسیح سے بھی ۷۰ برس بعد پیدا ہوا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ اور بخت نصر میں ہزاروں برس کا فصل ہے اور ٹیٹس ان سے کوئی ۱۶ سو برس بعد ہوا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اہلِ علم کیسی کیسی غلطیاں کر گذرتے ہیں۔

ہم نے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر بیسویں دفعہ لشکر کشی کی تو اورنگ زیب عالمگیر نے اس کے قیام کے لئے لال قلعہ خالی کر دیا تھا اور اکبر بادشاہ نے فتح پور سیکری میں اس سے ملاقات کی تھی۔ یہ واقعہ سکندر ذوالقرنین اور حضرت امام حسینؑ کی لڑائی سے بہت پہلے کا ہے۔ بہرحال جب سلطان محمود سومنات سے واپس آیا تو لاہور پہنچ کے اس نے لورینگ ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں خان ممدوٹ اخبار "نوائے وقت" کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک تھے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی نے شاہ نامۂ اسلام پڑھ کے سنایا تھا جسے سن کے فردوسی نے خودکشی کر لی اور وارث شاہ ایسا ناراض ہوا کہ بہاولپور چھوڑ کے علاؤالدین خلجی کے دربار میں چلا گیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بابر بادشاہ اور ناصرالدین شاہ قاچار میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان کا باعث یہی پریس کانفرنس تھی۔

ہمارے خیال میں یہ مضمون چھاپنے میں "استقلال" کے ایڈیٹروں کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب اتنا بڑا اخبار نویس اور محقق یہ کہتا ہے کہ موسےٰ اور بخت نصر ہم عصر تھے، تو بات ٹھیک ہی ہوگی۔ اور ممکن ہے نئی تحقیق یہی ہو اور ہم نے جو سن رکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور منف تاہ فرعونِ مصر ہمعصر تھے وہ سراسر غلط ہو۔

۱۷ر جولائی

پچھلے دنوں مسٹر غضنفر علی خاں غیر مسلم عورتوں کی بازیابی کے سلسلے میں آزاد کشمیر کے علاقے میں گئے تو انہیں بارش کی وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی موٹر کہیں کیچڑ میں پھنس کے رہ گئی اور وزیر مہاجرین کو پیدل چلنا پڑا۔

رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں کانپور کی برسات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ؎

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

لیکن آزاد کشمیر کے مقابلے میں کانپور کی برسات کیا چیز ہے؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔

راقم الحروف کو جموں اور کشمیر کے مختلف علاقوں میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے ؎

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
اُدھر سے مدّتوں آیا گیا ہوں

پیرپنجال کے اُس پار جو علاقے ہیں۔ وہاں برسات ایسی سخت نہیں ہوتی۔ البتہ جاڑا بڑے زور کا ہوتا ہے اور جب برف پگھلتی ہے تو ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتی ہے۔ شاعر نے اسی لئے تو کہا ہے ؎

برف افتادہ و کوچہ ہا گِل شُد
دیدنِ روئے یار مشکل شُد

پیرپنجال سے اس طرف جو علاقہ ہے۔ وہاں کی برسات کا کیا کہنا۔ کبھی کبھی تو ساون کے مہینے میں ہفتہ ہفتہ بھر جھڑی لگی رہتی ہے۔ کچی سڑکوں پہ کیچڑ کی وجہ سے موٹروں کی آمد و رفت بند

ہو جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے نالے جو سال بھر سوکھے پڑے رہتے ہیں، ناقابلِ عبور ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے مسٹر غضنفر علی خاں کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ اس زمانے میں اس علاقے کا سفر کریں۔ وہ غیر مسلم عورتوں کی بازیابی کے لئے گئے تھے اور ہمیں ان کی بازیابی کی فکر پڑ گئی ہے۔

راقم الحروف نے ایک دفعہ اس قسم کے ایک برساتی نالے کے کنارے دو دن گذارے ہیں۔ نالہ چڑھا ہوا تھا۔ لاری کنارے پہنچ کے رک گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ پار چلنا چاہئے۔ کیونکہ وہاں خاصی آبادی ہے۔ سر چھپانے کا سہارا مل جائے گا۔ ایک صاحب نے گھوڑے کی دم پکڑی اور غوطے کھاتے ڈوبتے ترتے پار اتر گئے۔ باقی سب نے عبرت پکڑی اور جب تک پانی نہ اترا نالے کے کنارے ایک چھپر تلے بیٹھے رہے۔ مسٹر غضنفر علی خاں کو بھی اس واقعہ سے عبرت پکڑنی چاہئے۔

۱۹ر جولائی

مولوی صادق علی صاحب کا نام آپ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ مولوی حسین علی نے ان کا ذہن اپنے نام الاٹ کرا لیا ہے۔ جب تک اس ناجائز الاٹمنٹ کی تنسیخ نہیں ہوتی اور انہیں اپنا ذہن واپس نہیں مل جاتا، مغربی پنجاب کا نظم و نسق درست نہیں ہوگا۔

پچھلے دنوں ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ کے دفتر کے کچھ اہل کاروں کا اجلاس ہوا، جس میں انہوں نے مولوی عبد القادر سہارنپوری سے جو اس قضیہ میں "الاٹمنٹ آفیسر" کی حیثیت رکھتے ہیں، مطالبہ کیا ہے کہ مولوی حسین علی کا ذہن انہیں واپس دلا دیا جائے۔ سنا گیا ہے کسی نے مولوی صادق علی صاحب سے کہا ہم نے تو آج تک نہیں سنا کہ اس طرح کسی کا ذہن چرا لیا گیا ہو۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ آخر بابر بادشاہ نے بھی تو اپنے بیٹے ہمایوں کی بیماری . . . . . . اپنے نام الاٹ کرا لی تھی۔ انتقالِ مرض ہو سکتا ہے تو "انتقالِ ذہن" نہیں ہو سکتا؟ یہ دلیل ایسی تھی کہ معترض سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

ہمارے خیال میں جب اتنے لوگ کہتے ہیں کہ مولوی صادق علی کا ذہن واقعی مولوی حسین علی کے نام منتقل کر دیا گیا ہے اور پھر ان لوگوں میں ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ کے محکمہ کا عملہ بھی شامل ہے تو ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ مولوی صاحب کا دعویٰ صحیح ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ پچھلے دنوں الاٹمنٹ کے سلسلے میں جو بے قاعدگیاں ہوئی ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے یہ بے قاعدگی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔

مولوی حسین علی نے مولوی صادق علی کا ذہن اپنے نام منتقل کرا لیا تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہمارے وزیروں اور بڑے بڑے افسروں کے ذہن پہ بھی یہی آفت آئی یعنی لوگوں نے کسی پٹواری سے مل کے اُن کے ذہن اپنے نام منتقل کرا لئے تو ہم کیا کریں گے؟ شاید میاں محمد ممتاز دولتانہ اسی لئے لاہور چھوڑ کے مری چلے گئے ہیں کہ کہیں ان کا کوئی سیاسی حریف اُن کے ذہن پر بھی قبضہ نہ جما لے۔

یہ زمانہ واقعی نازک ہے۔ دکان، مکان، زمین اور کارخانے تو ایک طرف رہے، ذہن علم اور عقل بھی الاٹمنٹ کی بے قاعدگی سے محفوظ نہیں۔ ہم بچپن سے سنتے چلے آتے ہیں کہ "علم ایسی دولت ہے جو چرائی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ اب معلوم ہوا کہ علم کی دولت بھی چرائی جا سکتی ہے اور چرائی نہیں جا سکتی تو کم از کم الاٹ ضرور ہو سکتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ جو لوگ غیر معمولی طور پہ ذہین ہیں۔ ان کے ذہنوں پہ پہرہ بٹھا دیا جائے اور ہو سکتا ہے کہ "پانچویں کالم" والے چُپ چاپ انہیں اُڑا لیں اور ہم اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ "نفع باز" قسم کے لوگ "ذہنوں" کی بلیک مارکٹ ہی شروع کر دیں۔

بہر حال ہمیں مولوی صادق علی صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر حکومت انہیں ان کا ذہن نہیں دلا سکتی، تو ماسٹر تارا سنگھ کا ذہن ان کے نام الاٹ کرا دے۔ لیکن پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہیئے کہ ماسٹر تارا سنگھ اپنا ذہن چھوڑ گئے ہیں یا اپنے ساتھ پوربی پنجاب لے گئے ہیں۔

ماسٹر صاحب کے متعلق آج تک جو خبریں آئی ہیں، ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ذہن اُن کے پاس ہے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی ہندو یا سکھ تو اپنا ذہن چھوڑ گیا ہوگا۔ مولوی صادق علی صاحب کو اس پر قبضہ کر لینا چاہئے۔

مولوی صاحب کو ہمارا یہ مشورہ ہے کہ اگر اللہ اُن کے حال پر رحم کرے یعنی انھیں اپنا یا پرایا ذہن مل جائے تو انہیں چاہئے کہ سوتے وقت ذہن کو اتار کے تجوری میں رکھ دیا کریں اور صبح اٹھ کے اسے "پھر فٹ" کر لیا کریں اور صرف مولوی صادق علی صاحب ہی پر موقوف نہیں دوسرے ذہین لوگوں کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ آخر لوگ سوتے وقت چشمہ بھی تو اتار کے رکھ لیا کرتے ہیں۔ ذہن بھی اتار کے رکھ لیا کریں تو کیا حرج ہے؟

---

۲۰ جولائی

پاکستان کے قیام کے متعلق لاہور کی اکثر دکانوں کے نام بدلے سائن بورڈ بدلے دکانداروں کا انداز بدلا۔ پہلے سائن بورڈ انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔ اب نسخ میں ہیں یا نستعلیق ہیں۔ فرموں کے نام رکھنے میں بھی بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ مثلاً کپڑے کی ایک دکان کا نام تن زیب ہے۔ پاپوش محل میں جوتے بکتے ہیں معلوم نہیں جوتوں کی کسی دکان کا نام "کفش خانہ" بھی ہے یا نہیں؟ نہیں ہے تو ہونا چاہئے۔

ایک دکان کا نام ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ہے۔ نہیں معلوم دکان کاہے کی ہے، لیکن نام سے معلوم ہوتا ہے کہ دکان دار کو "گنج باد آور" ہاتھ آگیا ہے۔ یعنی خدا نے چھپّر پھاڑ کے دولت دی ہے۔ ممکن ہے دکان پر یہ آیت صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے لکھی گئی ہو کہ ہمیں یہ دکان حکام کی مہربانی سے نہیں بلکہ صرف اللہ کے فضل و کرم سے ہاتھ آئی ہے۔ اولاد کے معاملے میں یہی خیال ظاہر کرنا ہو تو لوگ بیٹے کا نام اللہ دتہ۔

اللہ داد۔ فضل اللہ۔ مولاداد۔ یا خدا بخش رکھ دیا کرتے ہیں۔

اس قسم کے نام رکھنے کا رواج چلا تو کوئی دن جاتا ہے کہ آپ کو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم ط جیسے نام بھی نظر آیا کریں گے۔ بسم اللہ عورتوں کا نام تو ہوتا ہے بعض علاقوں میں بسم اللہ بیگم کے ساتھ بسم اللہ خاں بھی مل جائیں گے۔ ایسی صورت میں کسی دکان یا مکان پر بسم اللہ یا لاحول ولا لکھ دیا جائے تو کیا ہرج ہے؟

میکلوڈ روڈ پر ایک دکان نظر آئی جس کا نام "ادویات وادبیات" ہے۔ اس دکان میں ٹنکچر اور مکسچر۔ خمیرہ اور لعوق۔ جوارش اور لبوب کے ساتھ ساتھ افسانہ۔ ڈرامہ۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی موجود ہیں۔ ایک طرف دیوانِ غالب، بانگِ درا، شعر العجم اور آبِ حیات ہیں۔ دوسری طرف جوارشِ جالینوس، معجونِ فلاسفہ، لبوبِ کبیر اور دواء المسک۔ ایک جانب میراجی کا کلام ہے، دوسری جانب ٹنکچر آیوڈین۔

ادویات اور ادبیات بڑی اَن مل اور بے جوڑ چیز معلوم ہوتی ہے یعنی ان میں کوئی معنوی قسم کا تعلق تو بالکل نہیں، البتہ ظاہری تعلق ضرور ہے۔ یعنی ادبیات اور ادویات دونوں ہم قافیہ بھی ہیں۔ پھر اُن میں تجنیسِ خطی بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکان کے مالک کوئی حکیم جلال لکھنوی کی قسم کے بزرگ ہیں جو طبیب کم ہیں اور شاعر زیادہ۔ بچارے دوائیں بیچتے بیچتے تجنیسِ خطی۔ رعایتِ لفظی اور ایطا کے پھیر میں پڑ گئے اور اس سے آج تک نہیں نکل سکے۔

معاصر پاکستان ٹائمز نے بنگال کے مشہور شاعر، قاضی نذر الاسلام کے حالات چھاپے ہیں لیکن انگریزی زبان کی بے تکلفی نے نذر الاسلام کو مختصر کر کے "نذرل" بنا دیا ہے۔

اس ترکیب سے نورالاسلام "نورل" بن جاتا ہے اور سراج الحسن نزاہ "سراجُل" رہ جاتا ہے

لیکن یہ بے تکلفی صرف انگریزی ہی تک محدود نہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس قسم کے نام اکثر ملتے ہیں۔ مثلاً "سجاول" اصل میں شجاع الملک تھا لیکن اب اس نے مختصر ہو کے اپنی الگ حیثیت پیدا کر لی ہے چنانچہ ان دنوں سجاول، نزا سجاول نہیں بلکہ سجاول خاں کہلاتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو بچارا رستم خاں بھی رسمت خاں بن گیا ہے۔

---

۴ ر جولائی

کریم بخش بکرا لاہور کے ایک مشہور وکیل تھے۔ جو میونسپلٹی کے انتخابی اکھاڑے کے بہت بڑے پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ بکرا نہ تو اُن کا نام تھا نہ تخلّص۔ لیکن شہر بھر میں وہ اسی نام سے مشہور تھے۔ انتخاب کے زمانے میں ایک بکرے کو سجا کے جلوس نکلتے۔ پھبتیاں کہتے، آوازے کستے، اُچھلتے کودتے۔ وکیل صاحب جوابی جلوس نکلتے اور دنوں بلکہ ہفتوں شہر میں بڑا ہنگامہ رہتا۔

وکیل صاحب کی عادت تھی کہ دوستوں کی محفلوں اور عام جلسوں میں جوانی کے زمانے کے واقعات اس آب و تاب سے بیان کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ دخل در معقولات کا تو انہیں مرض تھا۔ کوئی بات شروع کیجئے، وہ بیچ میں ٹوک دیتے اور ٹھنڈی سانس بھر کے فرماتے تھے "میاں ہمارے زمانے میں یوں نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے —" اس کے بعد وہ کوئی لمبا سا قصّہ شروع کر دیتے تھے۔ جس کا بیشتر حصّہ ان کی اپنی گھڑنت ہوتا تھا۔

ایک دفعہ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر نے جو ان دنوں نوجوان تھے اور انتخابی معرکوں میں چلتی تلوار سمجھے جاتے تھے۔ ایک محفل میں میاں کریم بخش بکرا سے پوچھا۔ یہ تو فرمایئے آپ کے

سامنے کبھی محرم اور رمضان بھی اکٹھے آئے ہیں۔ جواب ملا صرف ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے۔ لوگوں نے دن کو سبیلیں بند کر دی تھیں۔ شام کو افطار کے وقت کھلیں تو روزہ دار ٹوٹ پڑے۔ لیکن شکر ہے کہ کوئی بد مزگی نہیں ہوئی۔ خواجہ فیروز الدین نے کہا تو آپ کی جوانی کے زمانے میں جمعہ اور اتوار بھی ضرور اکٹھے آئے ہوں گے۔ اب میاں بکرے چونکے اور خیال آیا کہ یہ نوجوان چونا لگا گیا۔ لیکن تیر ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کیا کرتے۔ چند گھنٹوں کے اندر یہ لطیفہ سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔

میاں محمد نور اللہ وزراء میں سب سے زیادہ شریعت کے حامی ہیں اور بعض حلقوں میں تو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ شریعت گروپ والوں سے میاں صاحب کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ پیر صاحب مانکی شریف اور مولوی ابراہیم علی چشتی اسمبلی کے باہر لوگوں کو شرعی حکومت کی حمایت پہ آمادہ کریں گے۔ مولانا عبدالستار نیازی اور میاں نور اللہ اسمبلی کے اندر شریعت کے نفاذ کے لیے راستہ ہموار کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ یہ بھی سنتے ہیں کہ اسمبلی کے بیس بائیس ممبران کے ساتھ ہیں جو بعض مصلحتوں کے پیش نظر ابھی اپنے نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن میاں نور اللہ نے حال ہی میں "بینکنگ" کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس نے میاں صاحب کے بہت سے عقیدت مندوں کو سخت مایوس کر دیا ہے۔ وہ ایک طرف تو شریعت کے پرزور حامی ہیں۔ دوسری طرف ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "بینکنگ" کے بغیر مسلمانوں کی نجات ہی نہیں ہو سکتی۔ گویا انھوں نے بھی وہی غلطی کی ہے جو اس سے پہلے میاں کریم بخش بکرا کر چکے ہیں یعنی وہ جمعہ اور اتوار کو یکجا کرنا چاہتے ہیں جو قطعاً ناممکن ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

---

۲۱ جولائی

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں تو اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوششیں ہو رہی

ہیں لیکن ہندوستان کے لیڈر اپنے ہاں مذہبی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتے۔ وہاں آج کل جو حکومت قائم ہے وہ سراسر غیر مذہبی ہے اور ہمیشہ غیر مذہبی ہی رہے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان کے لیڈروں نے مذہبی حکومت قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ ہمارے آئین کی بنیاد مذہب پر ہونی چاہئے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ہاں جمہوریت کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں۔ صرف راج نیتی کے چند موٹے موٹے اُصول ہیں جو اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن یہ تو ہونے سے رہا کہ ہندوستان کے لیڈر پرانے انداز کی کوئی حکومت قائم کرلیں، جس میں ایک راجہ ہو، ایک منتری، ایک سیناپتی۔ راجہ چھتر پتی بننا چاہے تو اشومیدھ یگیہ کرے یعنی ایک گھوڑا چھوڑ دے۔ گھوڑے کے ساتھ ساتھ فوج ہو۔ کوئی راجہ گھوڑے کو پکڑ لے اور فوج اسے لڑ بھڑ کر چھڑا لے۔ جب یہ گھوڑا سارے ملک کی سرگشت کرکے واپس آئے تو یگیہ منایا جائے۔ جن جن علاقوں سے وہ گزرا ہے ان کے راجہ یگیہ میں حصّہ لیں اور جس راجہ نے یگیہ کیا ہے، وہ راجاؤں کا راجہ مانا جائے؟

ان باتوں سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اس کی بنیاد مذہب پر نہ ہوتی تو ۱۵ اگست کو ہَوَن کیوں کیا جاتا، وزرا کے ماتھے پر تلک کیوں لگایا جاتا، اردو کو دیس نکالا کیوں ملتا۔ اس کی جگہ ہندی کو کیوں رواج دیا جاتا، سومناتھ کا مندر نئے سرے سے کیوں تعمیر ہوتا؟ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس اصول کی بنا پر آبادی کا تبادلہ کیا گیا ہے۔ اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ ہندوستان کی حکومت بھی مذہبی ہے۔ وہ مذہبی نہ ہوتی تو آبادی کا تبادلہ کیوں ہوتا۔ ہندو اور سکھ پاکستان سے ہندوستان کیوں چلے جاتے۔ مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان آنے کی اجازت کیوں دی جاتی۔ تبادلۂ آبادی مذہب کی بنا پر ہوا ہے اور ہندوستانی لیڈروں نے اس اصول کو تسلیم کرلیا۔ اس لئے اب یہ کہنا کہ ہندوستان کی حکومت کا مزاج غیر مذہبی ہے نری دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے؟

انڈو پاکستان اسلام لیگ کی طرف سے اخباروں میں ایک اعلان چھپا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "لاہور کارپوریشن کے کونسلر محترم قیصر مصطفیٰ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی جو مشہور احرار لیڈر محترم مولانا مظہر علی اظہر کے فرزند ارجمند ہیں، انڈو پاکستان اسلام لیگ میں شامل ہو گئے ہیں" علامہ مشرقی ساری عمر جماعتِ احرار اور اس کے لیڈروں کو گالیاں دیتے رہے ہیں۔ لیکن مسٹر قیصر مصطفیٰ اسلام لیگ میں کیا شامل ہوئے، وہ اور ان کے والدِ بزرگوار دونوں محترم ہو گئے۔

دلی کے ایک بزرگ نے ایک دفعہ اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ میں علامہ اقبال کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔ یہ صاحب ایک تیل بھی بیچتے تھے۔ جو جوڑوں کے درد کے لئے مفید تھا۔ علامہ اقبال نے یہ تیل استعمال کیا اور انہیں لکھ بھیجا کہ آپ کا تیل جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے۔ ان بزرگوار نے اپنے اخبار کی اگلی اشاعت میں علامہ مرحوم کا یہ خط اس عنوان کے ساتھ چھاپا۔

"ہندوستان کے شاعرِ اعظم کی رائے"

گویا یہ ایسا کراماتی تیل تھا کہ اسے استعمال کرتے ہی علامہ اقبال ہندوستان کے شاعرِ اعظم بن گئے۔

اسلام لیگ میں مسٹر قیصر مصطفیٰ کی شرکت کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مولانا مظہر علی اظہر پہلے نہ تو "محترم" تھے نہ "احرار کے مشہور لیڈر"۔ لیکن بیٹے کی نیک اعمالی کی وجہ سے اُن کے گناہ بخش دیئے گئے یعنی وہ محترم بھی بن گئے اور احرار کے مشہور لیڈر بھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دنوں مولانا مظہر علی اظہر مجلسِ احرار کے صدر تھے۔ مشرقی صاحب نے انہیں کبھی "احرار کے مشہور لیڈر" نہیں کہا۔ لیکن جب وہ مجلسِ احرار سے الگ ہو چکے تو انہیں ان القاب سے نوازا گیا۔ غالباً مشرقی صاحب کو یہ بات معلوم نہیں کہ مولانا مظہر علی اظہر نہ اب احراری ہیں نہ لیڈر۔ البتہ مشہور ضرور ہیں اور کیا عجب کہ مسٹر قیصر مصطفیٰ کے اسلام لیگ میں شامل ہونے کے بعد وہ لیڈر بھی بن جائیں۔ احرار کے لیڈر نہ سہی۔ اسلام لیگ کے لیڈر سہی۔

۲۳ر جولائی

ہمارے ایک معاصر نے ایشیا کے مختلف ملکوں کے متعلق اعداد و شمار شائع کئے ہیں جن میں بڑی دلچسپ غلطیاں ہیں۔ مثلاً انڈونیشیا کی آبادی ۶۰ لاکھ ۷۲ ہزار ۳۲۳ بتائی گئی ہے اور ملایا کی ۱۴ لاکھ ۳۵ ہزار ۹۶۰۔ حالانکہ انڈونیشیا کی آبادی چھ کروڑ سے زیادہ ہے اور ملایا میں ۵۵ لاکھ انسان بستے ہیں۔

انڈونیشیا کی آبادی میں شاید کتابت کی غلطی ہو۔ یعنی ۶ کروڑ کو ۶۰ لاکھ لکھ دیا گیا ہو۔ اس قسم کی غلطیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کل کے حرف و حکایت میں دو جگہ ۹۲ کو ۹۳ لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن ملایا کی جو آبادی بتائی گئی ہے۔ اس میں کتابت کی غلطی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ کیونکہ چینی۔ ملائی اور ہندوستانی آبادی کے متعلق جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں انہیں جمع کر لیجئے تو حاصل جمع ۱۴ لاکھ ۳۵ ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

ہالینڈ والوں نے انڈونیشیا کے باشندوں پر ہزاروں ظلم کئے۔ ملایا بھی مدت سے برطانوی سرمایہ داروں کے جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ پھر بھی ان ملکوں کی آبادی میں کچھ ایسی کمی نہ ہوئی۔ اخبار نویس کا کمال دیکھئے کہ اس نے قلم کو ذرا سی جنبش دی اور انڈونیشیا کی آبادی اصل آبادی کا دسواں حصہ رہ گئی اور ملایا کی تین چوتھائی آبادی غت ربود ہو گئی۔

ایک اخبار نویس نے اپنے نوکر سے پوچھا:۔

"تمھیں معلوم ہے۔ چین کی آبادی کتنی ہے؟"

"نہیں صاحب۔ میں کیا جانوں!"

"دیکھو چین بہت بڑا ملک ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ جتنی دیر میں ہم سانس لیتے ہیں چین میں ایک سو انسان مر جاتے ہیں۔"

نوکر نے یہ سن کے زور زور سے سانس لینا شروع کر دیا۔ آقا نے حیران ہو کے پوچھا "ہائیں۔ یہ کیا کر رہے ہو؟"

جواب ملا "چین کی آبادی کم کر رہا ہوں"

مثل مشہور ہے کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ اخبار نویس تو آخر اخبار نویس ہے، اس کا نوکر بھی آبادی کم کرنے کا طریقہ جانتا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ اس قسم کے مضامین محض اضافۂ معلومات کے لیے شائع کئے جاتے ہیں لیکن یہ مضمون پڑھ کے تو معلوم ہوا کہ بعض مضامین کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی معلومات میں "قطع و برید" کی جائے۔ کیونکہ زیادہ علم بھی تو خطرناک چیز ہے۔ ہم مولوی صادق علی صاحب کے پہلے قائل نہیں تھے، اب قائل ہو گئے۔ علم گھٹایا جا سکتا ہے تو ذہن کیوں نہیں چرایا جا سکتا؟

---

۲۴ جولائی

ہم مدت سے سن رہے تھے کہ "ڈان" اردو میں نکل رہا ہے لیکن آج پہلی دفعہ اس کا ایک پرچہ باصرہ نواز ہوا۔ سارا اخبار "زمرد رقم" ہے یعنی سبز روشنائی سے چھاپا گیا ہے، سر خضر حیات خاں بھی اخبار نکالتے رہے ہیں لیکن یہ بات انہیں بھی نہ سوجھی۔ حالانکہ ان کے نام کی رعایت سے ان کے پرچے کو سبز پوش ہونا چاہئے تھا۔

"ڈان" کے اردو ایڈیشن میں انگریزی ایڈیشن کی ساری خصوصیات برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی خبروں کی ترتیب وہی ہے، مضامین وہی۔ اور تو اور مقالہ افتتاحیہ بھی انگریزی "ڈان" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ غرض "ڈان" کے اردو ایڈیشن کو دیکھ کے خیال ہوتا ہے کہ کسی گورے نے اسلام قبول کر کے سبز لباس پہن لیا ہے۔

"ڈان" کے اُردو ایڈیشن کا نام بھی "ڈان" ہے۔ حالانکہ جہاں مقالہ افتتاحیہ کا ترجمہ ہو سکتا ہے اس پر ایک لفظ کا ترجمہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً "الصباح" اچھا خاصا نام تھا۔ یہ نام پسند نہیں تھا تو اخبار کا نام "صبح صادق" رکھ دیتے۔ سویرا۔ فجر بھی اچھے خاصے ترجمے ہیں، اور "مطلع الفجر" بھی خاصا نام ہے اور ڈان کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری تھا تو اخبار کا نام "خانداں" بلکہ "خانڈان" رکھ دیتے۔ کیونکہ اخبار کے پرنٹر پبلشر کا نام مسٹر اے اے خان ہے۔ اس ترکیب سے اخبار کا نام قائم رہتا۔ بلکہ اس کے نام میں پرنٹر پبلشر کا نام بھی آجاتا۔

"ڈان" کے ترجمے میں بھی بڑی ثقالت اور غرابت نظر آتی ہے۔ مثلاً SEED'S MARKET کا ترجمہ "تخم بازار" کیا گیا ہے۔ حالانکہ "بیجوں کی منڈی" اچھا خاصا ترجمہ تھا۔ ورنہ تخم میں تو "تخمِ مرغ" یعنی انڈا بھی شامل ہے اور ہمارے ہاں تو "تخم" اچھی خاصی گالی ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو "ڈان" کا اردو ایڈیشن اُردو کے اخباروں میں اچھا خاصا اضافہ ہے اور ہم پر اس کے خیر مقدم کا فرض اس لئے بھی عائد ہوتا ہے کہ "ڈان" مہاجر اخبار ہے اور دِلّی سے ہجرت کر کے کراچی آیا ہے۔ اگرچہ اس کا اردو ایڈیشن مہاجر نہیں تاہم مہاجر زادہ تو ضرور ہے۔

اس تذکرے میں ہمیں مسٹر کے۔ ایل۔ گابا یاد آ گئے۔ گابا صاحب اخبار نہیں بلکہ اخبار نویس ہیں۔ لیکن وہ اپنا "اسلامی ایڈیشن" نکالنے کے باوجود کے۔ ایل گابا ہی رہے مسلمانوں میں وہ "خالد لطیف گابا" تھے اور ہندوؤں میں کنہیا لال گابا یعنی انہوں نے اپنا اسلامی ایڈیشن بھی نکال لیا اور اُن کے نام میں بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ اُس وقت بعض لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے اپنا نام "خالد لطیف" اس لئے رکھا ہے تاکہ سائن بورڈ نہ بدلنا پڑے۔ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مسٹر گابا مسلمان تو پکے ہیں لیکن ذرا کنجوس ہیں۔ آگے معلوم ہوا کہ صرف سائن بورڈ کا جھگڑا نہیں تھا۔ بلکہ یہ نام جوں کا توں رکھنے میں کچھ اور مصلحتیں بھی تھیں

پاکستان قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ گابا صاحب لاہور سے دلی چلے گئے اور آج تک واپس نہیں ہوئے۔ انہوں نے "انسائڈ پاکستان" یعنی "اندرونِ پاکستان" کے نام سے ایک کتاب لکھ ماری ہے۔ جس میں انہوں نے پاکستان اور پاکستانیوں کو جی بھر کے گالیاں دی ہیں۔ آپ کہیں گے جس شخص نے پاکستان دیکھا ہی نہیں۔ وہ "اندرونِ پاکستان" جیسی کتاب کیسے لکھ سکتا ہے ؟ لیکن کتاب خریدنے والے ان باتوں میں نہیں پڑتے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مصنف خالد لطیف گابا رہ چکا ہے۔ یا کم از کم لاکھوں مسلمان اسے خالد لطیف سمجھتے رہے ہیں۔ اس لئے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسٹر گابا اب مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں۔ لیکن یہ سراسر بے انصافی ہے مسٹر گابا نرے کے۔ ایل گابا ہیں اور نرے کے۔ "ایل" کے معنی کنہیا لال بھی ہو سکتے ہیں اور خالد لطیف بھی۔

۲۹ر جولائی

ہمارے بعض معاصرین نے کھلّم کھلّا یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو "امروز" ہرگز نہیں خریدنا چاہئے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی باتیں چھپتی ہیں۔ اسلامی اخبار پڑھنا ہے تو بس ہمارا اخبار پڑھئے۔

ہمارے جن معاصرین نے یہ انداز اختیار کر رکھا ہے۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ کوئی اخبار چاہے اس کے ایڈیٹر کتنے بڑے عالمِ دین کیوں نہ ہوں، اخبار ہی رہتا ہے۔ اسلام نہیں بن جاتا۔ جس اخبار کی ترتیب بہتر ہوگی، مضامین میں تنوّع کا خیال رکھا جائے گا، لکھائی چھپائی پہ زیادہ محنت صرف کی جائے گی، وہی زیادہ بکے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اور ہم ایک دوسرے سے اُلجھے بغیر اپنے اپنے اخباروں کو زیادہ دلچسپ اور مفید بنانے

کی کوشش کریں۔ اس طرح اخبار نویسی کا معیار بھی بلند ہوگا اور باہمی تعلقات میں تلخی بھی نہیں پیدا ہوگی۔ ذرا آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ آپ دو دو آنے میں اخبار بیچتے ہیں یا اسلام؟

امروز کے ایک معاصر نے جو جماعت اسلامی کا نقیب اور ترجمان ہے اپنے پہلے پرچے میں "امروز" کو سہام ملامت کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے آپ کو "خالص اسلامی" قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو دعا اس پرچے کا سرنامہ و عنوان ہے، اسی میں غلطیاں موجود ہے۔ ایک بڑی غلطی تو یہ ہے کہ غفور رحیم کو غفور الرحیم لکھا گیا۔ اگرچہ یہ غلطی عام ہے یعنی اکثر جہلا محمدؐ رسول اللہ کی بجائے محمد الرسول اللہ لکھ دیتے ہیں لیکن جماعت اسلامی کے اسلامی اخبار کا اسلامی ایڈیٹر اس قسم کی غلطی کر گزرے تو حیرت ہوتی ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے تو کسی نے کہا ہے کہ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

۳۱ر جولائی

یونائیٹڈ پریس کی روایت کے مطابق کراچی میں ان دنوں یہ خبر گرم ہے کہ چودھری نذیر احمد خاں جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہیں، مسٹر غضنفر علی خاں کی جگہ وزیر مہاجرین مقرر ہوں گے۔ چودھری صاحب کے کمالات کے متعلق ہمیں معلوم نہیں۔ البتہ اتنا سنا ہے کہ وہ سان فرانسسکو ہو آئے ہیں۔

اگر سان فرانسسکو ہو آنا ہی وزارت کے لئے کافی ہے تو ملک فیروز خاں نون کے بارے میں کیا ارشاد ہے جو سان فرانسسکو بھی ہو آئے ہیں اور کئی بار وزارت کی سان پر بھی چڑھ چکے ہیں۔ یار لوگ سان فرانسسکو کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے چودھری نذیر احمد خاں ہجرت کر کے سان فرانسسکو چلے گئے تھے۔ اس لئے انہیں معلوم ہے کہ ہجرت میں کیا کیا مشکلات پیش آتی

ہیں۔ یا سان فرانسسکو میں کوئی سکول ہے۔ جہاں "وزیر مہاجرین" بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

پھر یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ رستم زماں گاماں پہلوان کو وزیر مہاجرین بنا دینا چاہئے۔ کیونکہ وہ زبسکو کو پچھاڑ چکے ہیں اور زبسکو اور سان فرانسسکو ہم قافیہ ہیں۔ بہرحال قافیہ کی بحث میں آ کے ہم چودھری نذیر احمد خاں کے قائل ہو گئے۔ آخر وزیر اور نذیر بھی تو ہم قافیہ ہیں۔

وزارت اور سفارت کے معاملہ میں قافیہ کا خیال کبھی کبھی ہی رکھا جاتا ہے۔ چندریگر صاحب افغانستان گئے اور "بے قافیہ" ہو کے گئے۔ عبدالستار سیٹھ صاحب مصر پہنچے تو قافیہ کی رعایت کا سہارا بھی نہیں تھا۔ چندریگر صاحب کو نہ فارسی آتی تھی نہ پشتو۔ سیٹھ صاحب عربی نہیں جانتے۔ لیکن ایک افغانستان اور دوسرا مصر کی سفارت پر مسلط ہے۔ سچ ہے دینے والے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔

چودھری نذیر احمد صاحب اگرچہ "مہاجرین" بھی نہیں — اگر آپ کو اعتراض ہے کہ راقم الحروف نے مہاجر کے بجائے "مہاجرین" کیوں کہا تو کان کھول کے سن لیجئے کہ شیخ کرامت علی صاحب وزیر تعلیم ایسے موقعوں پر مہاجر کے بجائے "مہاجرین" ہی کہتے ہیں۔ گویا اس موقع پر "مہاجرین" صحیح نہیں فصیح ضرور ہے۔ کیونکہ وزیر تعلیم اپنے عہدے کی رعایت سے افصح الفصحا ہیں اور آپ گرامر کہاں لئے پھرتے ہیں۔ گرامر بدلی بھی جا سکتی ہے — تو ہاں۔ اگرچہ چودھری نذیر احمد صاحب "مہاجرین" بھی نہیں۔ تاہم لوگوں کا خیال ہے کہ انہی کو وزیر مہاجرین مقرر کیا جائے گا اور سچ پوچھئے تو مسٹر غضنفر علی خاں کہاں کے "مہاجرین" تھے؟ اور "مہاجرین" ہونا ہی وزارت کے لئے ضروری سمجھا جاتا تو چودھری محمد حسن کبھی کے وزیر ہو گئے ہوتے، کیونکہ وہ "اول المہاجرین" ہیں یعنی انہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وزیر یا سفیر بناتے وقت کیا کیا چیزیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ اور

بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص زور کی دو تقریریں جھاڑ دیتا ہے اور چند دنوں کے بعد وزیر سفیر یا کوئی چھوٹا موٹا عہدے دار بن جاتا ہے۔ آخر پروفیسر عبدالمجید خاں نے جو جدہ میں انڈین یونین کی طرف سے قونصل ہیں یہی کیا ہے؟ اور ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک لڑکے نے جلسے میں "زندہ باد" اور "اللہ اکبر" کے نعرے ذرا موقع محل دیکھ کے لگائے اور بہت سے لیڈروں کو اپنی ذہانت کا قائل بنا لیا، سکتری۔ صدارت اور سفارت کی راہیں یہیں سے تو نکلتی ہیں۔

۱۴راگست

سُنا ہے کہ مغربی پنجاب کی حکومت نے کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور محکموں کے اعلےٰ افسروں کو لکھا ہے کہ "دفتر کے اوقات میں گھر بیٹھے رہنا اچھا نہیں۔ وقت پر دفتر آیئے اور باقاعدگی سے کام کیجئے۔ معلوم نہیں اس فہمائش کا کیا اثر ہوا۔ تاہم حکومت نے اتنا تو مان لیا کہ بڑے بڑے افسر اپنے اپنے دفتروں میں باقاعدگی سے کام نہیں کرتے۔

دراصل باقاعدگی سے دفتر آنا چپراسیوں، کلرکوں اور دوسرے چھوٹے موٹے اہل کاروں کا کام ہے۔ معدودے چند افسروں کو چھوڑ کے باقی سب بڑے بڑے عہدے داروں کا یہ حال ہے کہ جب چاہا دفتر آ گئے۔ جب چاہا گھر چلے گئے۔ اس آنے جانے کے لئے کوئی قاعدہ قانون نہیں بلکہ ان کا دفتر آنا اور گھر چلے جانا "موڈ" پر موقوف ہے۔ کام کرنے کا "موڈ" ہے تو کام کر لیا۔ گپ اڑانے کا "موڈ" ہے تو گپیں اڑاتے رہے۔ حکومت احکام صادر کرتی ہے تو کرتی رہے۔ کام کرنے کا "موڈ" کیسے مہیا کرے گی؟ یہ جنس تو "بلیک مارکٹ" میں بھی نہیں ملتی۔

بیچارے شاعر کو پیٹ مجبور کرتا ہے تو طبیعت حاضر ہو نہ ہو، جوں توں کر کے بُرے بھلے شعر لکھ لیتا ہے لیکن بڑے صاحب کام کرنے کے "موڈ" میں نہ ہوں تو فائل پر دستخط بھی نہیں کرتے۔ دستخط کرنے کے لئے بھی "موڈ" کی ضرورت ہے۔ ہمارے ایک وزیر صاحب کو

بھی شروع شروع میں یہی مشکل پیش آتی تھی۔ دفتر آتے تھے تو کام کرنے کا "موڈ" غائب غلّہ ہو جاتا تھا۔ انھوں نے سوچ سوچ کے ایک ترکیب ڈھونڈھ نکالی۔ یعنی دفتر میں پلنگ بچھوا کے گھر کی سی فضا پیدا کر لی۔ اب "موڈ" اڑنے کے لئے پر پھڑپھڑاتا ہے تو وہ اسے بہلانے کے لئے کرسی سے اٹھ کے پلنگ پر جا بیٹھتے ہیں۔

لیکن ہر وزیر کا "موڈ" ہے جو اتنی سی بات میں بہل جاتا ہے۔ کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور مختلف محکموں کے اعلیٰ افسروں کا "موڈ" کبھی کبھی تو دفتر کی صورت دیکھتے ہی پھر سے اڑ جاتا ہے۔ اس مُرغِ وحشی کو رام کرنے کے لئے کوئی اور ترکیب ڈھونڈھنی پڑے گی۔ حکومت جہاں افسروں کے لئے بنگلے، کوٹھیاں، میز، کرسیاں، فرش فروش مہیّا کرتی ہے۔ وہاں اسے کام کرنے کا "موڈ" بھی مہیّا کرنا چاہیئے۔

جو افسر کلرکوں کے دفتر ہیں کام کرتے ہیں یعنی وقت پر دفتر پہنچتے ہیں اور وقت پر گھر آتے ہیں بلکہ بعض اوقات دفتر کے اوقات کے بعد بھی بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔ انھیں دوسرے افسر عزّت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور کبھی اُن کا ذکر آجاتا ہے تو کہتے ہیں۔ یہ لوگ افسر تھوڑے ہیں کلرک ہیں کلرک ۔۔۔ صاحب جب دفتر پہنچتے ہیں، اُس وقت تک میری آنکھ بھی نہیں کھُلی ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں نے تو افسری کو بدنام کر رکھا ہے۔ اگر کوئی افسر کلرکوں کی طرح وقت پر دفتر پہنچے اور وقت پر گھر آئے۔ اپنے آپ پر وہ ساری پابندیاں عائد کرے جو صرف کلرکوں کے لئے ہیں تو وہ افسر کاہے کو ہُوا، کلرک ہُوا۔

بڑے بڑے افسر تو الگ رہے، ایسے فرض شناس اور مستعد افسروں کو کلرک بھی پسند نہیں کرتے۔ دفتر کا وقت ختم ہو گیا لیکن بڑے صاحب بیٹھے ہیں۔ دو تین کلرک بھی متعلقہ کاغذات لئے حاضر ہیں۔ یہ جائیں تو وہ بھی جائیں۔ کبھی آپس میں اُن کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں "اجی عجب انسان سے پالا پڑ گیا۔ دفتر کا وقت کبھی کا ختم ہو چکا۔ لیکن یہ بیٹھے کام کئے جا رہے ہیں۔ سچ پوچھئے

تو — صاحب جیسا افسر نہیں دیکھا۔ کام کرنے کا "موڈ" ہے تو آ گئے۔ نہیں تو نہ سہی اور ایسے ہی کوئی ضروری فائل ہوا تو گھر پر منگوا لیا۔ ہم نے جو کہہ دیا مان لیا اور مین میکھ نکالے بغیر دستخط کر دیے۔ پھر دفتر بھی آئے تو یہ نہیں کہ چراغ ہی جلا دیتے۔ دو ڈھائی بجے آئے۔ گھنٹہ بھر میں کام ختم۔ ایک دو کلرک دفتر میں رہ گئے۔ باقی اپنے اپنے گھر سدھارے لیکن آخر تھے بھی کس باپ کے بیٹے؟ یہ بچارے ان کی برابری کیا کریں گے؟

---

۵ راگست

ایک زمانے میں اپنے دشمن سے بدلہ لینے کا سب سے آسان طریقہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے ہاں افیون یا کوکین رکھوا دی اور ساتھ ہی پولیس میں اطلاع دے دی۔ سنا ہے علامہ مشرقی نے قریب قریب یہی اختیار کیا ہے۔ یعنی دلّی یا کلکتہ کے جن مسلمانوں پر وہ احسان فرمانا چاہتے ہیں انہیں انڈو پاکستان اسلام لیگ کا لٹریچر بھیج دیتے ہیں۔ پولیس چھاپہ مار کے اسلام لیگ کا لٹریچر ضبط کر لیتی ہے اور جس شخص کے ہاں سے اس قسم کا لٹریچر ہاتھ آیا ہے، اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ علامہ مشرقی انڈو پاکستان اسلام لیگ کا لٹریچر بھیجنے کے بعد پولیس کو بھی اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دشمن نہیں دوست ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ نادان دوست ہیں۔ وہ تو اس خیال سے دلّی اور کلکتہ کے مسلمانوں کو اسلام لیگ کے پمفلٹ بھجوا رہے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ثواب دارین بھی حاصل ہوگا اور اجمیر، آگرہ، دلّی، بہار شریف وغیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن پولیس کو کسی نہ کسی طرح خبر ہو جاتی ہے۔ اور جس مسلمان کے پاس اسلام لیگ کا پمفلٹ نکل آتا ہے، اسے فوراً دھر لیا جاتا ہے۔

ابھی تو اسلام لیگ نے اپنا کاروبار شروع ہی کیا ہے۔ یعنی پمفلٹ چھپے ہیں، دو تین پریس

کانفرنسیں ہوئی ہیں، اخبار نویسوں کے وظیفے مقرر کئے گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ کلکتہ اور دلّی میں مسلمانوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ جب یہ تحریک پورے جوبن پر آئی۔ تو دیکھ لیجئے گا کہ کیا کیا ہوتا ہے۔

سُنا ہے۔ اسلام لیگ، ایک عظیم الشان کانفرنس کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مسٹر روزویلٹ سے تو خط و کتابت شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کے کئی خط پچھلے دنوں حضرت علامہ کے نام آئے ہیں۔ حضور نظام کو اسلام لیگ کی صدارت پیش کی گئی ہے۔ اسلامی ملکوں کے حکمرانوں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے ہیں۔ .... ان دعوت ناموں کا مضمون غالباً وہی ہوگا۔ جو عام انجمنوں کے دعوت ناموں کا ہوا کرتا ہے یعنی قیام و طعام کا انتظام مفت لیکن بستر ساتھ لائیے گا۔

---

۷ راگست

ایک زمانے میں دلّی اور لاہور رقیب سمجھے جاتے تھے۔ پھر لاہور اور امرتسر کی رقابت کا زمانہ آیا۔ وہ پانی تو ملتان گیا۔ اب کراچی اور لاہور رقیب ہیں۔ کراچی سارے پاکستان کا دارالحکومت ہے۔ لاہور صرف مغربی پنجاب کے صوبے کا صدر مقام۔ پھر بھی کراچی کے مقابلہ پر کسی شہر کا نام آتا ہے تو وہ لاہور ہی ہے۔

ہم کراچی کے طرفدار ہیں نہ لاہور کے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ لاہور میں جو بھاری بھرکم پن ہے، وہ کراچی میں نام کو نہیں۔ کراچی عزت اور رتبہ میں لاہور سے آگے سہی لیکن لاہور کا وقار کہاں سے لائے گا۔ لاہور میں سنجیدگی اور متانت ہے۔ کراچی میں تو نو دولتیوں کا سا چھچھوراپن۔ آخر عمر کا فرق بھی کوئی چیز ہے۔ لاہور دو ڈھائی ہزار سال کا بڈھا۔ کراچی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ کہاں کراچی کہاں لاہور؟

جو لوگ کراچی کی سڑکیں دیکھ کے آتے ہیں، کہتے ہیں کہ بھائی لاہور کی سڑکوں کو دیکھ کے جی بہت کڑھتا ہے۔ میں کہتا ہوں تم اس بڈھے کے چہرے کی جھریوں کا قصہ لے کے بیٹھ گئے۔ اس کے دوسرے کمالات پر بھی تو غور کرو۔ سنا نہیں۔ شاعر کہہ گیا ہے ؎

میرے چہرے کی جھریوں پہ نہ جا
دل ابھی تک جوان ہے پیارے

اور ہاں اس زمین میں کراچی کے حسب حال ایک شعر بھی تو موجود ہے ؎

دیکھ کر قدِ یار کہتا ہوں
تیری اونچی دکان ہے پیارے

کراچی میں بڑی خوبیاں سہی لیکن شالامار، جہانگیر کا مقبرہ، قلعہ لاہور، شاہی مسجد حضوری باغ جیسی عمارتیں کہاں سے لائیے گا۔ پھر نہ وہاں بھاٹی دروازہ ہے نہ موچی دروازہ، نہ گھوڑے شاہ کا تکیہ نہ داتا کا دربار، نہ ایسے جلے تن جو چلّے کے جاڑے میں ململ کے کرتے پہنتے ہیں لسی پیتے ہیں اور وارث شاہ کی ہیر پڑھتے ہیں۔ ذرا موچی دروازہ کے اندر چلے جائیے۔ صبح شام دودھ دہی کی دکانوں پر کیا بھیڑ بھڑکا ہوتا ہے۔ توبہ کیجئے۔ کہاں کراچی کہاں لاہور۔ صاف ستھری پکی سڑکوں، موٹروں کی بھیڑ بھاڑ، سمندر کے قرب سے تو کوئی شہر سچ مچ شہر نہیں بن جاتا۔

اور کراچی کو تو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی صاحب بہادر ذرا منہ میں سگار لئے گٹ پٹ کر رہے ہیں۔ اٹھتی جوانی ہے۔ دولت کی کمی نہیں۔ پھر بڑے چاؤ چوچلے میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے طبیعت میں ذرا اکل کھرا پن آگیا ہے۔ اسٹیشن سے آگے بڑھ کے شہر میں قدم رکھو تو جی ذرا جھجکتا ہے۔ پاؤں کچھ رکتے معلوم ہوتے ہیں اور خیال آتا ہے کہ نہ جانے کب ڈانٹ دیں؟

لاہور پر نظر ڈالو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرانا تم بڈھا جس کی سپید داڑھی نے

اس کے سینے کو ڈھانپ رکھا ہے، سر پر سپید پگڑ باندھے، ململ کا کرتہ پہنے، تہ بند باندھے، ایک ہاتھ میں لٹھ لئے دوسرا ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ مسکراہٹ کے نور سے جگمگا رہا ہے اور آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ جھجکتے کیوں ہو۔ آؤ۔ یہاں تم سب کے لئے جگہ موجود ہے۔ اس نے گردش لیل و نہار کے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے سینکڑوں مناظر اس کی نظروں سے گزرے ہیں۔ وہ دل پر صدیوں کا بوجھ لئے کھڑا ہے۔ لیکن چہرے سے کہیں دل گرفتگی کے آثار نظر نہیں آتے۔

لاہور میں متانت ہے۔ وقار ہے۔ حلم ہے اور حلم ہی نہیں علم بھی تو ہے۔ یہاں کی ادبی محفلیں، یہاں کی لائبریریاں، یہاں کے کالج اور سکول، یہاں کے اخبار کراچی میں کہاں؟ کراچی کے متعلق آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

غرورِ حسن با جہلِ پٹھانی

---

۱۱ راگست

اب کے عید کی چار چھٹیاں ہوئیں۔ ایک جمعۃ الوداع کی ایک عید کی ایک ٹرکی۔ ایک "پھر ٹر" کی۔ یہ پھرٹر نیا تیوہار ہے جو چھٹی کے لئے تراشا گیا ہے۔ عید پیچھے ٹر تو ہوتی ہے۔ اب کے ٹر کے پیچھے ٹر موجود تھی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس سال ٹر تہ دار تھی۔ ایک تہ اٹھائی نیچے سے دوسری تہ نکل آئی۔ اب آپ اسے "پھر ٹر" کہہ لیجئے یا "ٹر پیچھے ٹر"

کبھی تیوہار کے لئے چھٹی "تراشی" جاتی ہے کبھی چھٹی کے لئے تیوہار۔ "ٹر" اور "ٹر پیچھے ٹر" کے تیوہار تو چھٹیوں کے لئے "تصنیف" کئے گئے ہیں۔ لیکن بہت سے تیوہار ایسے موجود ہیں جن کے لئے کسی کو چھٹیاں تراشنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ مثلاً خلفائے راشدین میں سے کسی کے یوم ولادت پر بھی چھٹی نہیں ہوتی۔ دوازدہ امام کی بھی کوئی یادگار نہیں منائی جاتی۔ حضرت داتا

گنج بخشؒ کے عرس پر چھٹی تو ہوئی۔ لیکن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا یوم ولادت کوئی نہیں مناتا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ بختیار کاکی۔ حضرت فریدالدین شکر گنج، خواجہ نظام الدین زری زری بخش، خواجہ نصیرالدین چراغ، شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ نقشبند، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور چشتی، قادری نقشبندی، سہروردی سلسلوں کے سیکڑوں بزرگ ہیں جن کی یادگار منانا ضروری ہے۔

جب تک انگریزوں کی حکومت تھی، ہم سمجھتے تھے ان بدمذاق لوگوں کے ذہن میں یہ بات کیسے بٹھائی جائے کہ مسلمان ایسے ویسے نہیں جو آپ کی طرح دو ڈھائی تہواروں پر گزارہ کر لیں۔ یہاں تو اللہ کے فضل سے تہواروں کی لین ڈوری بندھی ہوئی ہے۔ کوئی دن تہوار سے خالی نہیں۔ بعض اوقات تو ایک ایک دن میں دو دو تہوار جمع ہو جاتے ہیں لیکن اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے سارے تہوار نہ منائیں اور دنیا کے کام دھندوں کے لئے اپنی عاقبت خراب کریں۔

ہمارے خداوندانِ نعمت نے عید کے موقع پر چار دن کی چھٹی کر دی۔ اس کے لئے دو تہوار تراشے اور سمجھ لیا کہ بڑا تیر مارا۔ ہم سے کہئے تو ہم تین سو ساٹھ تہواروں کی فہرست پیش کر سکتے ہیں۔ "ٹر" اور "ٹرپھپے ٹر" کی قسم کے مصنوعی تہوار نہیں جو چھٹی کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں بلکہ خالص اور اصلی تہوار۔ حکام کو چاہئے کہ ان کے لئے چھٹیاں تصنیف کریں۔ سارا سال آرام سے گزر جائے گا۔ نہ دفتر جانے کی ضرورت، نہ قلم گھسانے کی حاجت۔ سال بھر گھر بیٹھے تنخواہ وصول کیجئے اور عقبیٰ میں جو سرخروئی حاصل ہو گی وہ الگ رہی۔

مکتب کے لڑکوں کو وہی استاد اچھا معلوم ہوتا ہے جو پڑھاتا خاک نہ ہو۔ البتہ ذرا ذرا سی بات پر چھٹی دے دیتا ہو۔ اس ترکیب سے نالائق سے نالائق استاد بھی ہر دلعزیز بن جاتا ہے اور پھر بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی نالائقی پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ ہمارے حکام سمجھتے ہیں کہ یہاں تو

آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے یعنی ساری قوم "طفل مزاج" ہے۔ لاؤ اسے چھٹیوں سے بہلائیں۔ عید الفطر پر چار دن کی چھٹی۔ عید الاضحیٰ پر دس دن کی۔ محرم پر مہینے بھر کی۔ شب برات تین دن رہے گی۔ شب معراج دو دن۔ اور تو اور آخری چہار شنبہ بھی دو دن چلے گا۔ یعنی ایک دن آخری چہار شنبہ۔ دوسرے دن پنجشنبہ جو چہار شنبہ میں شامل ہو کے خود بھی چہار شنبہ یعنی اچھا خاصہ "مرکب تعطیلی" بن سکتا ہے اور اگر ہماری تجویز پر عمل کیا جائے یعنی چھٹیوں کے لئے تیوہار تصنیف کرنے کے بجائے تیوہاروں کے لئے چھٹیاں فراہم کردی جائیں تو گھر میں مزے سے پاؤں پھیلا کر سونے کے سوا کوئی کام ہی باقی نہ رہے۔

لڑکوں کو بہلانے کا ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی گولے، پٹاخے، رنگ برنگی جھنڈیاں اور بحمداللہ کہ حکومت اس طریقے سے بھی غافل نہیں یعنی عید کے دن گولے چھوڑے گئے، توپیں سر ہوئیں، چھتوں سے رنگ برنگے اشتہار پھینکے گئے۔ اب اگر ہر روز تیوہار رہو، دفتروں میں سارا سال چھٹی رہا کرے اور قوم کو روز گولوں اور جھنڈیوں یا رنگ برنگے اشتہاروں سے بہلانے کا انتظام کر دیا جائے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔

---

۱۲ اگست

سنا ہے امرتسر کے مہاجرین نے اب کے عید کی نماز "عید گاہِ امرتسریاں" میں پڑھی۔ یہ عید گاہ بیڈن روڈ پر ہے جسے ہمارے پرانے کرم فرما خواجہ دل محمد صاحب "بیدین روڈ" کہا کرتے ہیں۔

عید سے دو دن پہلے اعلان کر دیا گیا تھا کہ امرتسر کے مہاجرین کو "عید گاہِ امرتسریاں" میں نماز پڑھنی چاہیئے۔ چنانچہ نمازِ عید کے موقع پر یہاں خاصا اجتماع تھا جس میں امرتسری حضرات کے علاوہ بعض غیر امرتسری لیڈر بھی موجود تھے۔

لیکن اگر یہ تحریک چل نکلی تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں جالندھری، دہلوی، انبالوی، فیروزپوری، ہوشیارپوری، گورداسپوری مہاجرین الگ الگ مسجدیں نہ بنالیں اور یہ کیفیت نظر نہ آئے کہ امرت سر والے امرت سر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے ہیں اور گورداسپوریوں کا رُخ گورداسپور کی جانب ہے اور ہوشیارپوری کسی غیر ہوشیارپوری کو اپنی مسجد میں داخل نہیں ہونے دیتے اور دہلویوں کی مسجد میں جو شخص نماز پڑھنے آتا ہے، اس سے دلّی کا کوئی خاص محاورہ پوچھا جاتا ہے جو صرف دلّی والوں ہی کو معلوم ہے۔

مسلمانوں میں پہلے ہی مذہبی فروعات کی بنا پر کئی فرقے موجود ہیں۔ اگر اضلاع اور شہروں کی بنا پر الگ الگ فرقے بن گئے۔ تو روز سر پھٹول ہوگی اور دوسری قوموں کو اچھا خاصا تماشا ہاتھ آجائے گا۔

اصل میں امرت سر اور جالندھر وغیرہ کی لکیر پیٹتے رہنا شہروں کے ناموں پر حلقے اور گروہ بنانا اور پھر جو لوگ ان حلقوں سے باہر ہیں انھیں اپنے سے حقیر سمجھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمانوں کے پاس طلیطلہ۔ قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلیہ اور ملاغہ نہ رہے تو امرت سر اور جالندھر کس شمار و قطار میں ہیں۔ ہمارے قومی شاعر نے کیا صحیح کہا ہے ؎

مری نگاہ نہیں سوئے بصرہ و بغداد
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

ہمارے خیال میں یہ شوشے وہ لوگ چھوڑتے رہتے ہیں جو شہروں اور ضلعوں کا نام لے لے کے مہاجرین سے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ امرت سر کے کسی ایم۔ ایل۔ اے۔ صاحب یا ایم۔ ایل۔ اے بننے کے کسی خواہشمند بزرگ نے یہ شگوفہ کھلایا ہے تو ہمیں ان سے ہمدردی ہے۔ لیکن ہمیں ملک لال خاں سے جو آج کل "آنریری امرتسری" بنے ہوئے ہیں اور عید کے دن نماز پڑھنے "عیدگاہ امرت سریاں" میں جا پہنچے تھے، کوئی ہمدردی نہیں۔

بہر حال ہلک صاحب کا کیا ہے۔ وہ تحریکِ شہید گنج کے زمانے میں نیلی پوشوں میں شامل ہو کے لال خاں کی بجائے نیلی خاں بھی تو بن گئے تھے ؏

تفو بر تو اے چرخِ نیلی تفو

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ایم۔ اے اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں یونیورسٹی اور لاہور کے کالجوں میں جو جھگڑا چل رہا ہے، وہ اس لئے نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم عام طور پر اس قسم کے جھگڑوں میں نہیں پڑا کرتے۔ معلوم ہوتا ہے، ان صاحب کو اہلِ علم کے جھگڑوں کا حال معلوم نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ علم جھگڑنے پر آتے ہیں تو سیاست دان ان کے سامنے مات ہو کے رہ جاتے ہیں۔

ابھی جھگڑا شروع ہی نہیں ہوا، صرف گلے شکوے ہو رہے ہیں۔ جب یونیورسٹی نے جو دراصل علم و دانش کے "ملکوت" کا دوسرا نام ہے، ڈکٹیٹری کی شان دکھائی۔ یعنی کالجوں میں جو اُردو پڑھائی جا رہی ہے یا آگے چل کر پڑھائی جائے گی "ٹکسال باہر" قرار دے دیا تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہمیں تو یقین ہے کہ محاورہ محاورہ سے لڑے گا۔ کہاوت کہاوت سے دست و گریباں ہو جائے گی۔ تشبیہہ تشبیہہ کا مقابلہ کرے گی۔ استعارہ استعارے کا ٹینٹوا دبائے گا اور تلمیح تلمیح کا سر پھوڑے گی اور چونکہ یونیورسٹی آخر یونیورسٹی ہے، محاورہ اس نے دلی سے منگوایا ہے، تشبیہہ لکھنؤ سے اور تلمیح شیراز سے، اس لئے میدان اسی کے ہاتھ رہنا چاہیئے۔

کالجوں نے ایم۔ اے اردو کی کلاسیں کھول لی ہیں تو اس میں ایسی جھگڑے کی بھی کیا بات ہے۔ یونیورسٹی ابھی محاورہ اور تشبیہہ ہی کی منزل میں ہے یعنی اس سے ایم اے کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکا تو نہ سہی۔ ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکے یعنی پڑھانے والوں سے کتابیں پڑھائی نہ جائیں اور طلبہ کے لئے مشغلہ کے طور پر کوئی تحریک شروع کر دی جائے۔ وہ کتابوں کو چھوڑ چھاڑ کے "زندہ باد" اور "یاد رکھنا" کے نعرے لگانے شروع کر دیں اور ایس

قومی خدمت کے عوض مفت میں اُردو کے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لیں۔ یہ بڑا مجرب نسخہ ہے۔ جس کے اجزا میں نہ کتاب ہے نہ علم، نہ نظم نہ نثر، نہ عروض نہ قافیہ۔ نہ تشبیہہ نہ استعارہ، بلکہ صرف جلسہ، جلوس اور زندہ باد۔ گویا اجزا اسہل الحصول ہیں اور نسخہ تیر بہدف۔

---

۱۷ اگست

پنڈت جواہر لال نہرو نے دلّی میں ایک تقریر کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اخباروں کو اشتعال انگیز خبریں شائع نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً ہندی کے اخبار نے لکھ دیا ہے کہ پنڈت نہرو نے پاکستان سے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ آخر جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

پنڈت جی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جھوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی اور ہندی کے ایک اخبار نے اگر پنڈت جی کی گرما گرم تقریروں سے جو محض گرمیِ محفل کے لئے ارشاد فرمائی گئی تھیں، غلط نتیجہ نکالا تو اس کی کوئی بنیاد تو تھی۔ زیادہ سے زیادہ کہہ لیجئے کہ اس اخبار نے پر کا کوا اور رائی کا پربت بنا لیا۔ لیکن ہندوستان کے اخبار تو کبھی کبھی یہ شعبدہ بھی دکھاتے ہیں کہ رائی کا کہیں پتہ ہی نہیں اور مندراچل کے خیالی پربت جتنا بڑا پربت کھڑا کر دیا۔ پر موجود نہیں لیکن جب بے پر کی اڑانے پر آئے تو اچھا خاصا کوا تیار ہو گیا جو کائیں کائیں سے دماغ چاٹے جا رہا ہے۔

سائیس کہتا ہے "سائیسی علم دریاؤ ہے"۔ ہندوستان کا پیرٹ یعنی پناہ گیر قسم کا اخبار نویس جو لاہور سے گیا ہے، دلّی، جالندھر، امرت سر اور انبالہ میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ "اخبار نویسی علم دریاؤ ہے"۔ اور سچ کہتا ہے۔ پر کا کوا بنا لینا بڑا کمال سہی لیکن بے پر کا کوا بنانا اس سے بھی بڑا کمال ہے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ ہندوستان کے پناہ گیر اخباروں نے لکھا تھا کہ "سردار محمد ابراہیم کو آزاد کشمیر گورنمنٹ نے گرفتار کر لیا۔" بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسی بے پر کی اڑانے والا اخبار نویس موجود نہیں۔ ورنہ دوسرے دن لاہور کے اخباروں میں سردار پٹیل، اور سردار پٹیل نہیں تو شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کی خبر چھپ جاتی۔ چنانچہ میدان مشرقی پنجاب کے ہاتھ رہا اور اچھے "ضمیمہ قسم" کے ایک ایک ورقی اخبار جو رائی کا پربت بنانے میں مشہور ہیں، بغلیں جھانکتے رہ گئے۔

تین دن ہوئے دلی کے ہندو اخباروں نے یہ خبر چھاپ دی کہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کے بعض نیازمندوں نے لاہور کے ایک اخبار کے دفتر میں ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ شاہ صاحب کب گرفتار ہوئے؟ کس جرم میں گرفتار ہوئے؟ جیل میں ہیں یا حوالات میں؟ ادھر سے جواب دیا گیا۔ آپ کی مراد سید عطاءاللہ شاہ بخاری سے ہے تو وہ ملتان میں ہیں۔ روز ان کے ہاں محفل لگتی ہے۔ شعر سناتے ہیں، سنتے ہیں۔ آم کھاتے ہیں لیکن پیڑ نہیں گنتے۔ یعنی سیاسی الجھیڑوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں کوئی کیوں گرفتار کرے گا؟ ہاں اس نام کا کوئی اور شخص گرفتار ہو گیا ہو تو اور بات ہے۔

حال میں دلی اور مشرقی پنجاب کے بعض اخباروں نے یہ خبر چھاپی ہے کہ حفیظ جالندھری اور ڈاکٹر تاثیر راولپنڈی میں گرفتار کر لئے گئے۔ حالانکہ حفیظ جالندھری مری میں ہیں، ڈاکٹر تاثیر دو مہینوں سے لاہور میں مقیم ہیں۔ دونوں راولپنڈی میں کیسے گرفتار ہو گئے اور گرفتار بھی کیوں ہوتے؟ ابھی تو دلی کے اخباروں نے ان پر رحم کیا ہے کہ گرفتار ہی کرایا ہے، ورنہ وہ انہیں پھانسی دلوا دیتے تو کوئی ان کا کیا کر لیتا؟

---

۱۸ / اگست

"انڈو پاکستان اسلام لیگ" کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہندوستان میں پکڑ دھکڑ

شروع ہوئی تو علامہ مشرقی نے ایک بیان جاری کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "یہ سب پروپیگنڈا" ہے۔ ہندوستان میں تو جس شخص کے پاس سے اسلام لیگ کا لٹریچر نکل آتا ہے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں، اس کا جلوس نکالا جاتا ہے اور یہاں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ جس مسلمان کے پاس سے اسلام لیگ کے نقشے اور پمفلٹ نکلیں، اُسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

مشرقی صاحب عجیب کینڈے کے بزرگوار ہیں۔ اوّل تو بات ہی ایسی دماغ سے اتار کے لاتے ہیں جو آج تک کسی کو نہ سوجھی ہو۔ پھر لاکھ دلیلیں دیجیے۔ کیا مجال ہے مان جائیں "سب پروپیگنڈا ہے" کہہ کے آپ کی ہر دلیل کو اس طرح رد کر دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ اسلام لیگ کی سرگرمیوں نے ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں کو مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ ہندوستان کی حکومت احتجاج بھی کر چکی ہے لیکن مشرقی صاحب کہے جا رہے ہیں کہ "سب پروپیگنڈا ہے"۔

مشرقی صاحب اور ان کے پیروؤں کی باتیں سنئیے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ان لوگوں کا خیال ہے کہ انڈین یونین تو آدھا ملک ہمارے حوالے کرنے کو تیار ہے لیکن مسلمان اُن سے مطالبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر کروڑ دو کروڑ مسلمان پنڈت نہرو کو خط لکھ دیں کہ آدھا ہندوستان ہمیں دے دیجیے تو وہ آدھا بلکہ پورا ہندوستان ہمیں دے ڈالیں گے اور خود سارے ہندوؤں کو لے کے چین یا جاپان چلے جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ ان سے یہ آسان سا کام بھی نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کی بے تکی باتوں میں علامہ مشرقی کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ آج کل وہ ٹرومین، چرچل اور اٹیلی کے نام اس طرح لیتے ہیں، گویا ٹرومین سے ان کی دانت کاٹی روٹی ہے۔ چرچل ان کا دستار بدل بھائی ہے اور اٹیلی ان سے کہہ کیا یا نام حق پڑھتا رہا ہے۔ جن دنوں خاکسار تحریک

شروع ہوئی تو وہ کہا کرتے تھے کہ ہٹلر نے جو کچھ سیکھا ہے مجھی سے سیکھا ہے اور میری کتاب "تذکرہ" تو اُس نے شروع سے آخر تک پڑھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہٹلر اُردو نہیں جانتا تھا "تذکرہ" کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہوا۔

بہرحال یہ تو پرانے قصے ہیں۔ آج کل علامہ مشرقی انڈین یونین سے آدھا ہندوستان لینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے انڈین یونین سے آدھے ہندوستان کا مطالبہ کیا تو وہ بہت خوش ہوگی اور حق بحق دار رسید کہہ کے دہلی، اجمیر، آگرہ، یو۔پی اور بہار مسلمانوں کے حوالے کر دے گی اگر یہ بات صحیح ہے تو مشرقی صاحب پاکستان میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے؟ اُن کی تحریک ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے انہیں لاہور کی بجائے دلی کو اپنا مرکز بنانا چاہئے پھر ان کے قدردان یعنی پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ جو آدھا ہندوستان ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں دلی ہی میں ہیں۔ نہ جانے مشرقی صاحب دلی کب پہنچیں گے۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ "برات کی تیاری اور دُولہا غائب"۔

۱۹ر اگست

پاکستان نے اولمپک کے کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے جو ٹیمیں بھیجی تھیں، اُن میں دو ٹیموں کے متعلق لوگوں نے بڑی بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ ایک تو پہلوانوں کی ٹیم، دوسری ہاکی کی ٹیم۔ پہلوان تو وقت پر وزن کرانے نہ پہنچے۔ اس لئے بے قافیہ ہو کے رہ گئے۔ ہاکی ٹیم نے شروع شروع میں بڑا زور باندھا لیکن ہالینڈ سے مقابلہ پڑا تو برابر رہی۔ انگلینڈ سے ہار گئی۔ یعنی فائنل تک نہ پہنچ سکی۔

لوگ پوچھتے ہیں۔ ہاکی کے کھلاڑیوں کو کیا ہوا؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ وہی

نیا مرض جس نے سب کو ناچار کر رکھا ہے یعنی الاٹمنٹ۔ ایک نوجوان نے مچل کر کہا، "آپ کی وزارت میں ہم ولایت بھی نہ دیکھیں تو حیف ہے"۔ دوسرے نے کہا، "ہم نے کہا، ہم کیا پیچھے رہ جائیں گے!" غرض جس طرح دکانیں اور مکان، فیکٹریاں اور زمینیں الاٹ ہوتی ہیں، اسی طرح ہاکی کی ٹیم بھی الاٹ ہو گئی۔ فتح و شکست کے مقدروں کو جانے دیجئے۔ یہ کیا کم ہے کہ یار لوگوں نے مفت میں ولایت کی سیر کر لی۔

پاکستان میں ہاکی کے اچھے اچھے کھلاڑی موجود ہیں۔ لیکن ٹیم مرتب کرتے وقت اعلیٰ درجے کے کھلاڑیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسرے درجے کے کھلاڑیوں کو لے لیا گیا۔ لیکن ہاکی کی ٹیم وزارت نہیں کہ اس میں دوسرے درجے کا کھلاڑی بھی کھپ جائے۔ ہاں وزارت کے کھیل میں ایک خوبی ضرور ہے کہ اس کھیل میں ہار جیت کا پتہ نہیں چلتا، ٹیم برابر ہارتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ کہہ دیں کہ ہماری ٹیم جیت رہی ہے تو ٹھیک ہے جو کہے ٹیم ہار گئی اسے پانچواں کالم کہہ کے لاجواب کر دیجئے۔ ہاکی اور فٹ بال میں یہ اکھاڑ پچھاڑ بے کار ہے۔ وہاں جو ہار گیا، ہار گیا۔ ہمارے آپ کے شور مچانے سے جیت نہیں سکتا۔

بہر حال ہاکی ٹیم ہار گئی تو کیا ہوا۔ وزارت کی ٹیم تو جیت رہی ہے۔ یہ ٹیم گیارہ کھلاڑیوں کی نہیں پانچ کی ہے۔ اس لئے کھلاڑیوں کو دوہرے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ خان ممدوٹ گول کیپر بھی ہیں اور کپتان بھی۔ اصل میں گول کیپر تو شیخ کرامت علی کو ہونا چاہئے تھا، لیکن ان کے ذمے اور بھی بڑے بڑے کام ہیں۔ یعنی وہ سنٹر فارورڈ بھی ہیں اور ہاف بیک بھی وقس علیٰ ہٰذا۔

اور وزرا کی اس ٹیم کا مدِّ مقابل کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنے آپ ہی سے مقابلہ کر رہے ہیں اور فرض کر رکھا ہے کہ عوام کی پوری قوت ان کے مقابلہ پر ہے اور گول پہ گول ہو رہے ہیں سو اسی لئے تو محکمۂ تعلقات عامہ کو مناسب وقفہ کے بعد یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ وزرا کی ٹیم

جیت گئی۔

وزارت کے معاملہ میں لوگوں کو جو محرومیاں ہوئی ہیں۔ اُن میں چودھری محمد حسن کا معاملہ سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ جب پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہوا تو انھیں خیال تھا کہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں مخلوط وزارتیں قائم ہوں گی تو مشرقی پنجاب کی وزارت میں مجھے بھی لے لیا جائے گا لیکن فسادات شروع ہوتے ہی مجبوراً بھاگنا پڑا۔ یہاں آتے ہی لائزان افسری مل گئی۔ اس زمانے میں وہ بھی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ پھر اللہ نے فضل کیا، ممبری بھی ہاتھ آئی۔ اب چودھری صاحب نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ بڑھ کے وزارت پہ ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ کئی نقشے بن بن کے بگڑے اور وزارت ہاتھ آتے آتے رہ گئی۔

چودھری صاحب کی ہمت کی داد دینا چاہئے کہ وہ اب بھی وزارت کی طرف سے مایوس نہیں اور یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ "ضلع وار آبادی" اور "مہاجر گروپ" کا داؤ چل گیا تو خان ممدوٹ جاتے کہاں ہیں۔ سو وڑے سے دوڑے آئیں گے۔ لیکن وزیر اعظم کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ چودھری صاحب "اول المہاجرین" سہی۔ "خان ممدوٹ" صاحب الہجرتین" ہیں۔ پھر خود ہی مہاجر خود ہی انصاری۔ چودھری محمد حسن لدھیانہ کے ہیں۔ خان ممدوٹ فیروزپور کے۔ یہ ڈال ڈال وہ پات پات۔

---

۲۰ راگست

دو دن ہوئے "امروز" میں ایک خبر چھپی تھی کہ "بیڈن روڈ پر ایک ناشپاتی کے پیچھے" جھگڑا ہو گیا۔ اس پر ہمارے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ "ناشپاتی کے پیچھے" غلط ہے "ناشپاتی کے لئے" کہنا چاہئے تھا۔

پنجاب کے بعض ادیبوں اور اخبار نویسوں کا عام انداز یہ ہے کہ اردو اور پنجابی میں جو محاورے

مشترک ہیں، انھیں پنجابی سمجھ کے ترک کر دیتے ہیں۔ مثلاً "کھنڈ جانا" اردو اور پنجابی میں مشترک ہے۔ لیکن پنجاب کے ادیب ہمیشہ اس لفظ سے دامن بچا کے چلتے ہیں۔ "تھڑا" اُردو بھی ہے پنجابی بھی اور اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ موجود نہیں۔ لیکن کیا مجال کہ پنجاب کا کوئی ادیب اس لفظ سے قلم کو آلودہ ہونے دے۔ "چبوترہ" لکھیں گے۔ کوئی اور لفظ تراش لیں گے۔ لیکن "تھڑا" نہیں لکھیں گے۔

"ناشپاتی کے پیچھے" بالکل صحیح ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں "پیچھے" اور "لئے" کو ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ نوراللغات میں بھی یہ محاورہ موجود ہے۔ دلّی اور لکھنؤ کے فصحا بے تکلفی سے "لئے" کے معنوں میں "پیچھے" استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے عزیز معاصر نے خواہی نخواہی اسے پنجابی سمجھ کے اچھوت قرار دے دیا ہے۔

ہر اخبار میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور "امروز" بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن غلطیاں نکالنے میں صحیح کو بھی تو غلط قرار نہ دیجئے۔ ہم سے کہئے۔ ہم امروز سے زبان اور محاورے کی کئی غلطیاں نکال کے دکھا دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم سے زیادہ اپنی خامیوں کا احساس کسی کو نہیں۔

ڈاکٹر محمد حتّا انڈونیشیا کے مشہور لیڈر ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک معاصر نے لکھا تھا کہ "امروز" انہیں "محمد حتا" لکھتا ہے۔ حالانکہ اصل نام محمد عطا ہے۔ راقم الحروف کو بھی شروع شروع میں یہی شبہ ہوا تھا۔ لیکن ملایا کے مشہور روزانہ اخبار "اوتوسن ملایو" کے ایڈیٹر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اصل نام تو محمد حتّیٰ ہے۔ اب آپ جو چاہے لکھئے۔ کون پوچھتا ہے۔ "اوتوسن ملایو" کے پرچے دیکھے تو ان میں بھی یہ نام اسی طرح لکھا تھا۔

معلوم نہیں ہمارے ہاں ہر نام کو عربی بنا لینے کا اتنا شوق کیوں ہے۔ "سوتن شہریر" کو آپ نے سلطان شہریار بنا لیا۔ سکارنو بچ گیا۔ لیکن کب تک بچا رہے گا؟ کوئی نہ کوئی صاحب

اس پر بھی عمل تعریب جاری کر کے ہی رہیں گے۔ احمد کُٹی مالا باری ہیں۔ محمد لبے سیلونی۔ خبر نہیں احمد کُٹی کو احمد قُطبی کیوں نہیں بناتے۔ محمد لبے کو محمد لقے کیوں نہیں کہتے۔

عرب لیجئن کا کمانڈر گلب پاشا انگریز ہے۔ لیکن اخباروں نے اسے غالب پاشا بنا لیا۔ ایک آدھ اخبار نے ذرا احتیاط کی ہے تو غلب پاشا لکھ دیا ہے۔ بہر حال مادہ تو ایک ہی ہے۔ فرمائیے اس شوقِ تعریب کو کیا کہا جائے؟

۱۲ر اگست

لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں جن لوگوں کو پارلیمنٹری سکرٹری بنایا گیا ہے۔ اُن کی تعلیمی قابلیت بہت محدود ہے یعنی اٹک اٹک کے اخبار پڑھ لیا، ضرورت پڑی تو انگریزی یا اردو میں دستخط کر دیئے اور رائے انور خاں کھرل جو ہمارے نئے سکتروں میں سے ہیں، دستخط کرنا بھی نہیں جانتے، البتہ انگوٹھا ضرور لگا لیتے ہیں۔ نہ جانے انہیں کیوں سکتر بنا دیا گیا ہے؟

ہمارے خیال میں یہ اعتراض ہی سرے سے بے معنی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ دستخط کرنا نہیں جانتا تھا، پھر بھی اس نے برسوں سارے پنجاب پر حکومت کی ہے اور رائے انور خاں کھرل اگرچہ دستخط کرنے کے معاملہ میں رنجیت سنگھ کے مدِ مقابل ہیں، تاہم انہوں نے کبھی سارے پنجاب پر حکومت کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ بلکہ صرف سکتری پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں لیکن یار لوگ ہیں کہ انہیں اطمینان سے سکتری بھی نہیں کرنے دیتے۔

اصل میں خان ممدوٹ کو کشتہ سازی کا شوق ہے۔ سوچا ہوگا، ہڑتالوں کے اس دور میں ایک کھرل ضرور ہونا چاہئے۔ ہڑتال کو کھرل کر کے گل حکمت کریں گے۔ اُسے آنچ دیں گے اور اس کشتہ کو بقدر دو چاول بالائی میں رکھ کے کھائیں گے تو ہر قسم کے درد سے نجات ہو جائے گی۔

لوگوں نے خان ممدوٹ کی نیت کو نہ دیکھا، بلکہ بچارے کھرل کے پیچھے پڑ گئے۔

ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسمبلی کا ممبر ہو یا پارلیمنٹری سیکرٹری اُس کے لئے دستخط کرنے کا اہل ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کا "اہل الرائے" ہونا کافی ہے اور رائے انور خاں اور کچھ نہ سہی، "اہل الرائے" ضرور ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ اس وقت سے "اہل الرائے" ہیں۔ جب ہمارے ملک میں رائے کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ مسٹر ایم این رائے بھی ریڈیکل ڈیموکریٹ پارٹی کے نزدیک بڑے "اہل الرائے" ہیں۔ لیکن رائے ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ "رائے" آنکھ بچا کے غائب ہو گئی اور وہ اکیلے سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں۔ رائے انور خاں نے "رائے" کو آگے رکھا ہے اور خود اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور اُسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

افسوس کہ لوگ رائے انور خاں کھرل کے کمالات پر غور کیے بغیر اس بحث میں پڑ گئے کہ وہ دستخط کرنا نہیں جانتے، صرف انگوٹھا لگاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اس بات پر یقین نہیں آتا کہ رائے انور خاں کھرل دستخط کرنا بھی نہیں جانتے۔ دستخط کرنا دن بھر میں آجاتا ہے بلکہ "بقلم خود" اور "عفی عنہ" لکھنے کی مشق کرنے میں دو چار گھنٹے سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے۔ اگر یہ افواہ دشمنوں کی اُڑائی ہوئی نہیں یعنی وہ واقعی دستخط کرنا نہیں جانتے تو انہیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ تھوڑی محنت کر کے دستخط کرنا بھی سیکھ لیں، تاکہ ہم فخر سے کہہ سکیں کہ ہمارا ہر پارلیمنٹری سکرٹری دستخط کرنا جانتا ہے۔

اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ہم پارلیمنٹری سکرٹری کے دستخط کرنے کی صلاحیت ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو وزیروں کے لئے بھی یہ اہلیت رکھنا ضروری نہیں۔ دستخط سے پارلیمنٹری سکرٹری کے عہدے کا کیا تعلق؟ آج لوگ کہہ رہے ہیں کہ پارلیمنٹری سکرٹری دستخط کرنا تو ضرور جانتا ہو۔ کل کہیں گے کہ اسے کھانا پکانا بھی آتا ہو، وہ کشتی لڑنا بھی جانتا ہو۔ ہم نے تو

یہ بات اس لئے لکھی ہے کہ جو لوگ اعتراض کر رہے ہیں، اُن کی زبان بند ہو جائے۔

---

۲۳ راگست

جب سے سیلاب آیا ہے۔ لاہور سے گھی بالکل غائب ہو گیا ہے۔ بلیک مارکیٹ میں کہیں آٹھ یا دس رُپے سیر مل جائے تو اور بات ہے۔ ورنہ دکانیں تو خالی پڑی ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سیلاب آیا اور گھی کے سارے ذخیرے کو بہا کے لے گیا۔

سچ پوچھئے تو سیلاب کا بہانہ ہی بہانہ ہے۔ چور بازاری کے استاد نفع بازی کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتے ہیں۔ تحقیقات کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس قسم کے کسی استاد نے شہر کا سارا گھی خرید کے گھر بھر لیا ہے اور اب آٹھ اور دس رُپے کے حساب سے بیچ کے خوب نفع کما رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پولیس چھاپہ مار کے سارا گھی برآمد کیوں نہیں کرتی۔ لیکن پولیس ہزار چھاپے مارے گھی برآمد نہیں ہو گا۔ پولیس نے چھاپے مارنے کا جو ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے۔ وہ اس قسم کا ہے، کہ چھاپہ کامیاب تو نہیں ہوتا، البتہ لوگوں کو اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ پولیس کچھ نہ کچھ کر رہی ہے ہماری پولیس گیہوں کے ذخیروں کا پتہ نہ لگا سکی تو گھی کے ذخیرے کا پتہ کیسے لگا لے گی؟

قاعدہ ہے کہ پولیس جب خانہ تلاشی کے لئے نکلتی ہے تو کچھ معززین کو اپنے ساتھ لے لیتی ہے اکثر اوقات یہ معززین وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ذخیرہ اندوزی کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔ اس قسم کے چھاپوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور یہ "معززین" پولیس کے معتمد علیہ ہونے کے باعث اور زیادہ معزز ہو جاتے ہیں۔

لاہور کے بارے میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ مغربی پنجاب کے اکثر

شہروں میں پولیس چھاپے مار مار کے بعض معززین کی مزید "عزت افزائی" کر رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خلاف کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

لاہور سے گھی غائب کرنا کسی چھوٹے موٹے دکان دار کا کام نہیں۔ یہ شعبدہ بھی کسی "معزز" آدمی نے کر دکھایا ہے، جسے اس بات کا اطمینان ہے کہ نہ تو پولیس مجھ پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکے گی، نہ کسی شخص میں اتنی ہمت ہے کہ میرے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اب پولیس گھی کی تلاش میں ایک آدھ دکان پہ چھاپہ مار کے چپکی ہو جائے تو اس کی مستعدی کا چرچا تو ضرور ہو جائے گا لیکن گھی کی چور بازاری میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ پولیس کو چاہئے کہ اصل مجرم کا سراغ لگائے اور چاہے وہ کتنا ہی معزز شخص کیوں نہ ہو، اس پہ ہاتھ ڈالنے میں دریغ نہ کرے۔

گھی تو خیر ہفتے عشرے سے غائب ہے۔ چاولوں کو غائب ہوئے خاصی مدت ہونے کو آئی۔ جس دن چاولوں پر سے کنٹرول اٹھا، اس سے دوسرے دن چاول نایاب ہو گئے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چاول سرے سے ملتے ہی نہیں۔ لاہور اور صوبے کے دوسرے شہروں میں چاولوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ساٹھ روپے من کے حساب سے ہر جگہ بک رہے ہیں۔ لیکن امرا کے سوا اور کسی میں اتنی ہمت کہاں کہ ڈیڑھ روپے سیر چاول خرید کے کھائے تاہم بعض اوقات غریبوں کو بھی چاول خریدنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر اور حکیم ابھی تک پرہیزی غذا میں دودھ چاول، مونگ کی دال اور چاول یا مونگ کی کھچڑی بتائے چلے جاتے ہیں۔ دوا پہ جتنے دام خرچ ہوتے ہیں، اس سے دگنے پرہیزی غذا پر اٹھ جاتے ہیں۔

---

۲۷ / اگست

پچھلے دنوں "پاکستان ٹائمز" میں رائے انور خاں کھرل کا ایک خط چھپا تھا جس میں انہوں نے اپنے علاقے کے کسی داروغہ صفائی کی فرض شناسی اور مستعدی کی تعریف کی ہے۔ یہ خط اس

قسم کی غلط سلط انگریزی میں لکھا گیا تھا کہ جس نے پڑھا، مارے ہنسی کے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

ہم نے یہ خط پڑھ کے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ خط ہرگز کھرل صاحب کا خط نہیں ہو سکتا۔ خط کی زبان غلط سہی، لیکن جو شخص سرے سے انگریزی جانتا ہی نہیں، وہ غلط انگریزی کیسے لکھ سکتا ہے۔ غلط انگریزی جاننے کے لئے کسی قدر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ کھرل صاحب نہ اسکول گئے نہ انگریزی پڑھی۔ اور تو اور وہ انگریزوں کی صحبت میں بھی نہیں رہے کہ ان پر غلط انگریزی لکھنے کا الزام لگایا جا سکے۔

ہمارا خیال ٹھیک نکلا۔ رائے انور خاں صاحب کا ایک بیان اخباروں میں چھپ گیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ خط ہرگز میرا نہیں۔ میں تو ہمیشہ اردو کو انگریزی پر ترجیح دیتا ہوں ہاں یہ اور بات ہے کہ میرے کسی نوکر نے یہ خط لکھ کے مجھ سے دستخط کروا لئے ہوں۔

رائے صاحب کی صاف بیانی قابلِ داد ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں صاف صاف مان لیا ہے کہ بھائیو میں انگریزی لکھنا نہیں جانتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میرے کسی نوکر نے انگریزی میں یہ خط لکھ کے مجھ سے دستخط کرا لئے ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم کہ اس کم بخت نے اس خط میں کیا لکھ مارا ہے، اگر معلوم ہو جاتا کہ خط کی زبان غلط ہے تو میں ہرگز اس پر دستخط نہ کرتا۔

اس بیان سے ہمیں دو اور اہم باتیں بھی معلوم ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رائے انور خاں کے متعلق یار لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ صرف انگوٹھا لگانا جانتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ وہ انگوٹھا ہی نہیں لگاتے کبھی کبھی دستخط بھی کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خود تو انگریزی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ لیکن ان کے نوکروں کو تھوڑی بہت انگریزی ضرور آتی ہے۔

کھرل صاحب نے اس بیان کے آخر میں کہا ہے کہ مجھے اس لئے پارلیمنٹری سکرٹری نہیں بنایا گیا کہ میں کوئی بہت بڑا پڑھا لکھا آدمی ہوں بلکہ مجھے یہ عہدہ اس لئے ملا ہے کہ میں نے الکشن میں مسلم لیگ کا ٹکٹ لیا تھا۔

اس سلسلے میں ایک پُرانا لطیفہ یاد آگیا۔ ایک پٹھان انٹر کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا۔ تو خاں صاحب نے ڈاک خانے کا اکنّی والا ٹکٹ نکال کے دکھا دیا۔ ٹکٹ چیکر نے کہا۔ یہ تو ڈاک خانے کا ٹکٹ ہے۔ اسے میں کیا کروں؟ خاں صاحب بولے یہ ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو پشاور سے مدراس تک چلا جاتا ہے اور کوئی اسے نہیں روکتا۔ میں تو پشاور سے صرف راولپنڈی تک جا رہا ہوں۔

کھرل صاحب کا یہی حال ہے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو صرف دستخط کرنا جانتے ہیں۔ پھر پارلیمنٹری سکرٹری کیسے بن گئے؟ یہ سُن کے کھرل صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ میں نے بے ٹکٹ کبھی سفر نہیں کیا۔ پچھلے الکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہوا تھا اور اب تک یہ ٹکٹ میرے پاس موجود ہے۔ پوسٹ کارڈ جس پر تین پیسے کا ٹکٹ ہوتا ہے، پشاور سے کراچی تک چلا جاتا ہے۔ پھر میں ممبری سے پارلیمنٹری سکرٹری کے عہدے تک کیوں نہیں پہنچ سکتا۔ آپ علم دیکھتے ہیں لیکن خان ممدوٹ صرف ٹکٹ دیکھتے ہیں۔ اگر علم اور قابلیت سے پارلیمنٹری سیکرٹری کا عہدہ مل سکتا۔ تو آج جو ہزاروں بی۔ اے، ایم۔ اے مارے مارے پھر رہے ہیں، پارلیمنٹری سکرٹری نہ بن گئے ہوتے۔

راؤ انور خاں صاحب کھرل نے اس قضیئے میں جس تحمل کا ثبوت دیا ہے، وہ بے حد قابل داد ہے۔ یہ بیان دیتے وقت انھوں نے دانت نہیں پیسے۔ یہ نہیں کہا "کشتہ کر دوں گا۔" بلکہ بڑی متانت سے فرمایا کہ بھائیو۔ بگڑتے کیوں ہو؟ میرے پاس ٹکٹ ہے ٹکٹ۔ ڈاکخانے کا ٹکٹ نہیں، ریلوے کا ٹکٹ نہیں، لاٹری کا ٹکٹ نہیں، ما الاٹمنٹ کا پروانہ نہیں بلکہ مسلم لیگ

کا ٹکٹ۔ الکشن کا ٹکٹ! پہلے اس ٹکٹ کے طفیل ممبری ہاتھ آئی، اب کٹری مل گئی۔ "ایک ٹکٹ میں دو دو مزے" اسی کا نام ہے۔

---

۲۰ / اگست

مسئلۂ کشمیر کے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک مفصل بیان جماعتِ اسلامی کے ترجمان معاصر "تسنیم" نے چھاپا ہے جس میں مولانا نے ذرا وضاحت کے ساتھ وہی باتیں کہی ہیں جو وہ اس سے پہلے بھی بار بار کہہ چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ مولانا مودودی چپکے ہو رہتے تو کیا ہو جاتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اخبار اپنا ہو تو بیان چھاپنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ خاص طور پر جب دوسرے علما کہہ رہے ہوں کہ مودودی صاحب نے غلطی کی ہے تو مولانا مودودی کیسے مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہیں۔

مولانا مودودی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ کشمیر کی لڑائی جہاد نہیں۔ البتہ اگر مسلمان اسے جہاد بنانا چاہتے ہیں تو نسخہ ہم بتائے دیتے ہیں۔ اس پر عمل کرنا پاکستان کی حکومت کا کام ہے۔ اس لڑائی کو جہاد بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے پاکستان سے جو معاہدہ کر رکھا ہے اسے ختم کر کے کشمیر میں فوجیں بھیج دی جائیں۔

مولانا نے اپنا پہلو بچانے کے لئے نکتہ تو خوب نکالا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس پر عمل کون کرے؟ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے وہ تو ہندوستان سے لڑنا نہیں چاہتے اور جب تک مولانا مودودی کی جماعتِ اسلامی حکومت پر قبضہ کر کے خلافتِ الٰہیہ قائم کرے اس وقت تک کشمیر کے جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

مولانا کی ان نکتہ طرازیوں کے باوجود ہماری رائے یہی ہے کہ ان کے اس بیان سے

یہ مسئلہ سلجھا نہیں بلکہ اور زیادہ اُلجھ کے رہ گیا ہے اور سچ پوچھئے تو انہوں نے وہی باتیں کہی ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو اپنے بیانوں میں کہہ رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پنڈت جی جو کچھ کہتے ہیں، ہندوستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کہتے ہیں اور حضرت مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے، جماعت اسلامی کے امیر کی حیثیت سے فرمایا ہے۔

مولانا مودودی بہت بڑے عالم نہ سہی۔ تاہم اچھے انشا پرداز ضرور ہیں۔ ان کی جماعت نے بعض مفید کام بھی کئے ہیں لیکن جہاد کی بحث میں وہ جس طرح اُلجھے ہیں اس سے مسئلہ کشمیر کو کوئی نقصان پہنچے نہ پہنچے، جماعتِ اسلامی کو ضرور نقصان پہنچے گا۔ جماعتِ احرار کو تحریکِ شہید گنج نے ڈبویا۔ جماعتِ اسلامی کو جہاد کی یہ بحث لے ڈوبے گی۔ تعجب ہے کہ مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی اپنے "امیر" کو یہ نہیں سمجھاتے کہ کشمیر کی لڑائی جہاد نہیں تو نہ سہی۔ آپ کیوں "بیان بازی" میں اپنی جان ہلکان کر رہے ہیں۔

"تسنیم" میں ایک مضمون چھپا ہے جو کسی صاحب لالہ صحرائی نے لکھا ہے۔ لالہ پھول کا نام تو ضرور ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ لکھنا شروع کر دے تو کسی کو خیال نہیں آئے گا کہ لالہ پھول کا نام بھی تو ہے۔ سب یہی سمجھیں گے کہ یہ لالہ گھنشیام داس یا لالہ ساون مل کی قسم کا کوئی لالہ ہے۔ جس نے جماعت اسلامی کے اخبار میں مضمون نگاری شروع کر رکھی ہے۔ ہمارے خیال میں "لالہ صحرائی صاحب" کو اپنے لئے کوئی اور قلمی نام تجویز کرنا چاہئے۔

---

۱۳ / اگست

مسٹر غضنفر علی خاں کے پریس اٹاچی مسٹر ممتاز احمد سے بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ انہیں فارسی نہیں آتی۔ کیونکہ پچھلے دنوں مشہد کے ایک حجام سے انہیں فارسی بولنی پڑی تو "آرے" "بلے" کہہ کے رہ گئے۔ نہ اس کی بات سمجھ سکے، نہ اپنا مفہوم اس پر واضح کر سکے۔

اوّل تو مسٹر ممتاز احمد سے یہ توقع رکھنا ہی غلط ہے کہ انھیں فارسی آتی ہوگی۔ فارسی جانتے تو پریس اثاثی کیسے ہو جاتے؟ تیل کیوں نہ بیچتے۔ کوئی پٹرول پمپ اپنے نام الاٹ کیوں نہ کرا لیتے؟ اور وہ فارسی جانتے بھی . . . . . ہوں تو مشہد کے نائی سے فارسی بولنا ہنسی کھیل تھوڑا ہی ہے۔ ہمارے ہاں کا کوئی بڑے سے بڑا فارسی داں بھی ہوتا تو بغلیں جھانکنے لگتا۔ جدید ایران کے نائیوں کی اصطلاحیں نہ گلستانِ سعدی میں ہیں، نہ انشائے ابوالفضل میں مسٹر ممتاز احمد کو کچھ دنوں ایران میں رہنے دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا زناٹے کی فارسی بولتے ہیں۔

اور نائی تو چاہے مشہد کا ہو یا لاہور کا، دلی کا ہو یا پشاور کا، اس کی بات سمجھنا آسان نہیں ہے۔ آپ حیرت سے اس کا منہ تک رہے ہیں اور وہ ہے کہ موشگافیاں کرتا اور بال کی کھال اتارتا چلا جاتا ہے۔ ظالم کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کوئی کیا سمجھے اور کیسے سمجھے؟ کیونکہ ع

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جاست

یکم ستمبر

اکثر لوگوں کے نزدیک آزادی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جی میں جو آئے کرے۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ مثلاً تانگہ والوں کو شکایت ہے کہ پاکستان قائم ہوگیا۔ ہم لوگ آزاد ہو چکے، پھر بھی ہر نکڑ پر پولیس والا موجود ہے۔ ذرا کوئی بے قاعدگی ہوئی اور اس نے ٹیٹوا دبایا۔ مریض کہتا ہے کہ پاکستان قائم ہوگیا۔ لیکن ڈاکٹر کڑوی کسیلی دوائیں پلائے چلا جاتا ہے۔ اس پر پرہیز کی مصیبت بھی ہے۔ حالانکہ ایک آزاد ملک کے لوگوں کو پرہیزی غذا سے کیا سروکار؟

لوگوں نے آزادی کے بعد ایک ہی نئی چیز دیکھی ہے جسے "الاٹمنٹ" کہتے ہیں اور وہ اس کی خوبیوں کے قائل بھی ہیں اور بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ "الاٹ منٹ" آزاد قوموں کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ "الاٹ منٹ" کا قاعدہ ہر کام میں کیوں

جاری نہیں کیا جاتا؟ صحیح آزادی کے معنی تو یہ ہیں کہ جو شخص جس چیز کو پسند کرے، اس کے نام الاٹ کر دی جائے۔

سب سے زیادہ شکائت تو طلبہ کو ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان قائم ہوتے ہی اسکول اور کالج بند کر دیئے جائیں گے۔ صرف یونیورسٹی باقی رہے گی، جو امتحان لئے بغیر سندیں جاری کرتی رہے گی۔ اپنا شجرۂ نسب فرفر سنا دیا اور سند حاصل کر لی۔ کسی وزیر، سکتر، جج، مجسٹریٹ یا دوسرے اعلےٰ عہدے دار سے دور کا رشتہ بھی نکل آیا تو سبحان اللہ جتنی ڈگریاں سمیٹی جا سکیں، سمیٹ لو۔ لیکن ان لوگوں نے آزاد پاکستان کا جو تصور باندھ رکھا تھا، غلط نکلا۔ اسکول بھی موجود ہیں، کالج بھی۔ امتحان بھی ہوتے ہیں، پاس فیل کا پرانا جھگڑا ابھی موجود ہے، ممتحن پرچہ دیکھ کے طالب علم کی لیاقت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ شجرۂ نسب نہیں دیکھتے۔

پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن والوں نے طلبہ کو یونیورسٹی کی ڈگریاں دینے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی یعنی جس طالب علم نے ایک مقررہ مدت تک فیڈریشن سے وابستہ رہ کے مہاجرین کی خدمت گزاری کی۔ اس سے یونیورسٹی کی سند دلانے کا وعدہ کر لیا گیا۔ لیکن وہ دفتر بھی گاؤ خورد ہو گیا۔ یعنی کہا جاتا ہے کوئی صاحب بیچ ہی میں طلبہ کے فارم اور متعلقہ کاغذات لے اڑے۔ اب ان طلبہ کو فیڈریشن کی طرف سے خوشنودیِ مزاج کا پروانہ مل جائے تو مل جائے۔ یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

یونیورسٹی والے کہتے ہیں کہ امتحان لیں گے اور سندیں دیں گے۔ طلبہ کو ضد ہے کہ امتحان لیجئے۔ لیکن فیل پاس کا جھگڑا مٹا دیجئے اور پاکستان کا کوئی نوجوان فیل ہی کیسے ہو سکتا ہے؟ فیل ہونا تو اس کی توہین ہے۔ پورے پاکستان کی توہین ہے۔ آپ ہمیں فیل کر کے پورے پاکستان کی توہین نہ کیجئے۔

سنا ہے پچھلے دنوں ایک سرحدی نوجوان یونیورسٹی کے احاطے میں رجسٹرار اور اپنے

ممتحن کو تلاش کر رہا تھا۔

ایک چپراسی نے پوچھا۔ "آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟"

نوجوان بولا۔ "ہم رجسٹرار کو تلاش کر رہا ہے۔ اپنے ممتحن کو تلاش کر رہا ہے۔ اس نے ہمیں فیل کیا ہے۔ ہم سب کو ڈز کر دے گا۔"

چپراسی عقلمند تھا۔ کہنے لگا۔ "اس گرمی میں وہ یہاں کہاں ٹک سکتے ہیں۔ سب مری چلے گئے۔ وہیں جائیے اور انہیں شوق سے ڈز کیجئے۔ آپ ہی اکیلے فیل نہیں ہوئے۔ میرا لڑکا بھی تو فیل ہو گیا ہے۔" خاں صاحب یہ سن کے چل دئیے اور ان دنوں غالباً مری میں ہیں۔

---

۱۸ ستمبر

"پربھات" کے ایڈیٹر مہاشہ نانک چند ناز ان دنوں بہت بڑے ماہرِ فنِ حرب بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے اخبار میں جو مضامین چھپ رہے ہیں۔ اُن کا مفہوم عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہم نے آپ کو پاکستان سے لڑائی چھیڑنے کا مجرب نسخہ بتا دیا۔ بس اس پر عمل کیجئے اور آن کی آن میں سارے پاکستان کو فتح کر ڈالئے۔

اصل میں مہاشہ جی نے آج تک لڑائی دیکھی نہیں۔ صرف کتابوں میں اس کا حال ہی پڑھا ہے۔ پھر انہوں نے دیوتاؤں اور دوسروں کی لڑائیوں ہی کا حال پڑھا ہے۔ بہت ہوا تو کسی کتھا واچک سے ارجن اور کرن کے یدھ کا حال یا انردھ اور اوشا کی کتھا سن لی۔ اس لئے وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اگر لڑائی چھڑ گئی تو کرشن جی سدرشن چکر لے کے نکلیں گے یا وشنو مہاراج گرڑ پہ سوار ہو کے تشریف لائیں گے اور دوجوں کی فوجوں کو پل بھر میں تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ورنہ اگر مہاشہ جی کو معلوم ہو جائے کہ اس زمانے کی لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں تو بیچارے لڑائی کا نام بھی نہ لیں۔

ہمارے خیال میں ہندوستان کی حکومت کو چاہیئے کہ مہاشہ نانک چند ناز کو کچھ دنوں کے لئے کشمیر کو بھیج دے۔ پانڈو کی پہاڑی کو دیکھ کے مہاشہ جی کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کورو پانڈو کی لڑائی نہیں کہ گرز اٹھایا اور ساری فوج کا صفایا کر ڈالا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مہاشہ جی نے کشمیر کی لڑائی کی ایک جھلک دیکھ لی تو انہیں ہمیشہ کے لئے کان ہو جائیں گے اور وہ عمر بھر لڑائی کا نام نہیں لیں گے۔

پچھلے دنوں مہاشہ ناز سے لوگوں نے پوچھا کہ مشرقی پنجاب میں لڑائی کی افواہیں گرم ہیں امرت سر اور فیروز پور سے لوگ بھاگ رہے ہیں اور بڑی سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ مہاشہ جی نے فرمایا:۔ "اجی آپ کو کیا معلوم لاہور اور قصور کا کیا حال ہے؟ دونوں شہر بالکل خالی ہو گئے ہیں"۔ اور یہی نہیں کہ مہاشہ جی نجی کی ایک صحبت میں یہ بات کہہ کے چپکے ہو رہتے۔ بلکہ انھوں نے دوسرے دن جھپاک سے اخبار میں چھاپ بھی دیا کہ صرف امرت سر اور فیروز پور ہی خالی نہیں ہوئے۔ لاہور اور قصور بھی تو خالی ہو گئے ہیں۔

مہاشہ نانک چند ناز جن دنوں لاہور میں تھے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے قیام لاہور کا زمانہ پھر غنیمت تھا۔ وہ فوراً ہتھے پر سے اکھڑنے لگتے تھے تو یار لوگ چھیڑنا شروع کر دیتے تھے اور انہیں ہوش آجاتا تھا۔ لیکن مشرقی پنجاب میں انہیں چھیڑنے والا کوئی نہیں۔ اس پر ماسٹر تارا سنگھ۔ گیانی کرتار سنگھ۔ اور ادھم ناگو کے وغیرہ کی صحبتیں سونے پر سہاگہ ہو گئی ہیں۔ مہاشہ جی جتنی غیر معقول باتیں کرتے ہیں، اتنی ہی زیادہ داد ملتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر ان کے بے ڈھنگے پن کا یہی حال رہا تو وہ سکھوں کے لیڈر بن کے رہیں گے اور ان کے سامنے ماسٹر تارا سنگھ کی بھی دال نہیں گلے گی۔ مہاشہ ناز اکالی نہ سہی، آریہ سماجی سہی، لیکن دل تو اکالیوں کا سا پایا ہے۔ صورت شکل پر نہ جائیے۔ ان کی باتیں سنئے مضمون پڑھئے اور پھر کہئے کہ مہاشہ جی آریہ سماجی ہیں یا اکالی۔

---

۹ ستمبر

ایک مقامی اخبار میں "سرخ پوشی سے توبہ" کے عنوان سے ایک خبر چھپی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے جو خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شامل تھے۔ اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ لیکن عنوان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سرخ لباس پہننا ہی گناہ ہے۔ اس لئے ان بزرگوار نے سرخ لباس پہننا ترک کر دیا ہے۔

اگر "سرخ پوشی" یعنی سرخ لباس پہننا گناہ ہے تو بہتر ہے کہ بزاز کو سرخ کپڑا بیچنے کی ممانعت کر دی جائے۔ نہ سرخ کپڑا ہوگا نہ لوگ سرخ لباس پہنیں گے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اور تو اور لوگ یہ شعر بھی پڑھنا ترک کر دیں گے ؎

سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید

نہ بزور و نہ بزاری نہ بہ زر می آید

حالانکہ یہ شعر اس زمانے میں لکھا گیا۔ جب نہ تو خان عبدالغفار خاں تھے اور نہ ان کے خدائی خدمتگار، جنہوں نے سرخ وردی اختیار کر کے اس رنگ کو جو حسن و جوانی سے خاص مناسبت رکھتا ہے، موردِ عتاب بنا دیا۔ ملک لال خاں کی وضعداری کی داد دینی چاہیئے کہ وہ اس زمانے میں بھی وضع نباہے چلے جاتے ہیں۔ یعنی انہوں نے ابھی تک اپنا نام نہیں بدلا۔

"سرخ پوشی" سے لوگ توبہ کر رہے ہیں لیکن تعجب ہے، ابھی تک کسی نے شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ نہیں کی۔ حالانکہ سرخ پوشی کی طرح شاعری اور افسانہ نگاری بھی ان دنوں برقِ عتاب کی زد میں ہیں۔ ہمارے خیال میں ادب و شاعری اسی طرح زیرِ عتاب ہے تو بہت سے لوگوں کو شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ کرنی پڑے گی۔ کوئی عجب نہیں کہ سعادت حسن منٹو چند دنوں کے بعد اعلان کر دے، میں نے افسانہ نگاری سے توبہ کر لی ہے۔ آئندہ میں صرف "کھاد" کے متعلق مضامین لکھا کروں گا۔ غلام عباس کہے کہ میں نے اپنے نئے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کا ارادہ ترک

کر دیا ہے۔ میری اگلی کتاب کا نام "مرغی خانہ" ہوگا۔ "مکمل مرغی خانہ بانصویر"۔ شائقین اپنے نام ابھی سے رجسٹر درج کرالیں۔ کوئی عجب نہیں کہ یہ کتاب ایم۔اے کے نصاب میں شامل کرلی جائے اور ڈھونڈے سے نہ ملے۔ باقی ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس قسم کے موضوع تلاش کرنے پڑیں گے

شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ مشکل ہے ؎ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی لیکن جب سیفٹی ایکٹ کا لٹھ سر پر ہو تو توبہ کرنی ہی پڑے گی۔ آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھی ناچتا ہے۔ پھر بیچارا شاعر اور ادیب کیا مال ہے؟ یہ اور بات ہے کہ یہ توبہ کچھ اس قسم کی ہوگی جس کا ذکر شاعر نے یوں کیا ہے ؎

در دل ہوسِ شرابِ و بر لب توبہ
زیں توبۂ نادرست یا رب توبہ

اس سے ملتا جلتا شعر یہ بھی ہے ؎

کردم ز شرابِ ناب توبہ
وز توبۂ ناصواب توبہ

ہمارے خیال میں حکومت کو چاہئیے کہ اس معاملہ میں ذرا نرمی سے کام لے۔ شعر و ادب کو سیفٹی ایکٹ کے زور سے بالکل مٹا دینا اچھا نہیں۔ مناسب ہوگا کہ شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک خاص ضابطہ مرتب کردیا جائے۔ اگر کوئی شاعر اور ادیب اس ضابطہ سے انحراف کرے تو پھر حکومت کو اختیار ہے چاہے توپ دم کردے چاہے پھانسی دے دے۔

ہماری رائے میں غزل کی تو بالکل ممانعت کردینی چاہئیے، کیونکہ اس سے نوجوانوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ قصیدہ ضروری ہے، کیونکہ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ خاص طور پر جب قوم پر "الاٹمنٹ" کا زمانہ آیا ہو، قصیدہ بڑی مفید چیز ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ تصریح بھی کردی جائے کہ قصیدہ چپراسی سے لے کے وزیر اعظم تک کا لکھا جاسکتا ہے۔

اس کے صلے میں خوانچے سے لے کے برف کا کارخانہ تک الاٹ ہو سکتا ہے۔ افسانوں میں سرمایہ رسانی کے افسانے جائز ہیں۔ افسانے یا ڈرامے کی شکل میں اگر کپاس وغیرہ کی کاشت کے طریقے بیان کئے جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھو تو شرارت کی بات ہے۔

---

۱۱ ستمبر

خبر آئی ہے کہ اب کے ایک خاتون ایم۔ اے کے جغرافیہ کے امتحان میں فسٹ رہی ہیں۔ اور فسٹ ہی نہیں رہیں بلکہ انھوں نے یونیورسٹی کا ریکارڈ توڑ ڈالا ہے۔ یہ خاتون تو یقیناً مبارک باد کی مستحق ہیں۔ البتہ ہم اس موقع پر ضرور کہیں گے کہ جغرافیہ میں آئے دن جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی وجہ سے جغرافیہ پڑھنا پڑھانا بے سود ہو گیا ہے۔ باور نہ ہو تو منشی احمد دین سے پوچھ لیجئے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو کشمیر کا جغرافیہ اور تھا۔ ہندوستان گئے تو اور ہو گیا۔

راقم الحروف نے ایک زمانے میں پنجاب کا جغرافیہ لکھا تھا۔ لیکن یہ زمانہ قبل از تاریخ یعنی ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کا جغرافیہ تھا۔ اس تاریخ کے بعد زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ پنجاب کا حلیہ ہی بدل گیا ہے اور پُرانا جغرافیہ پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دھات کے زمانے سے بہت پہلے پتھر کے زمانے میں لکھی گئی تھی اور لکھی کیا گئی تھی پتھر کی سلوں پر کھود دی گئی تھی۔

اس زمانے میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے اچھی خاصی کتاب کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر چند بڑی بڑی تبدیلیوں کو لیجئے۔ پُرانے زمانے میں پنجاب ایک ہی صوبہ تھا جو سرحد سے لے کے صوبہ دہلی کی حدود تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ اب مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب دو مختلف ملکوں کے صوبے ہیں جنہیں "بحر واہگہ" نے جسے "واگہ ساگر" بھی کہتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں خشکی تھی، لیکن اب اک بہت

بڑا سمندر ہے جس میں کوئی جزیرہ نظر نہیں آتا۔

زمانہ قبل از تاریخ میں اکالی جنگلات اس سمندر کے مغرب کی جانب واقع ہیں۔ مشرق کی جانب کہیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں نظر آجاتی ہیں۔ لیکن اب اکالی جنگلات اور کانگریسی سلسلۂ کوہ دونوں "بحر وانگاہ" سے مشرق کی جانب واقع ہیں۔ کانگریسی سلسلۂ کوہ زمانۂ قدیم میں آتش فشاں پہاڑ تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی حرارت ٹھنڈی پڑ گئی۔ آج کل اکالی جنگلات اس سلسلۂ کوہ کے دامن اور اس کی ڈھلوانوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ آہستہ آہستہ سمٹتا اور سکڑتا جا رہا ہے اور جنگلات زیادہ گھنے ہوتے جاتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر یہی کیفیت رہی تو یہ پہاڑ جھیل کی صورت اختیار کر لیں گے۔

آپ نے زمانہ قبل از تاریخ کا جغرافیہ پڑھا ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ اُن دنوں اس سرزمین میں احرار کے خانہ بدوش آباد تھے جو چارہ اور پانی کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ یہ لوگ کبھی مسلم لیگ کے کوہستانوں اور کاہستانوں میں گلّے چراتے پھرتے رہتے تھے کبھی ہٹ کے کانگریسی سلسلۂ کوہ کے زرخیز دامن میں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ لیکن ان قبائل پر قریب قریب وہی ماجرا گزرا ہے جو امریکہ اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر گذر چکا ہے۔ یعنی ان کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ ان کے گلّے بہت چھوٹے چھوٹے رہ گئے ہیں۔ نہ وہ دودھیل گائیں ہیں، نہ وہ موٹے تازے مینڈھے اور بکریاں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ چارہ اور پانی کی تلاش میں کس طرف کا رُخ کریں۔ مشرق میں "بحر وانگاہ" یعنی واگہ ساگر راستہ روکے کھڑا ہے۔ مغرب کی جانب کچھ اور خانہ بدوش قبیلوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

پھر نہ سکندر مونٹ ہے نہ میاں کا ٹیلہ۔ جہاں ندّی نالے تھے وہاں لق و دق صحرا ہیں۔ جہاں ریگستان تھے وہاں دریا لہریں مار رہے ہیں۔ سکندر مونٹ کی جگہ ممدوٹ اکے اکھاڑے نے لے لی ہے۔ میاں کے ٹیلہ کی جگہ شیخ کی کراماتی پہاڑی ہے۔ دریائے تھر اور ریائے سالک

پر جو پل باندھے گئے تھے وہ ٹوٹے پڑے ہیں۔ پہلے یہ دریا آہستہ آہستہ بہتے تھے۔ اب وہ آبشاریں بنانے۔ جھاگ اڑاتے چٹانوں سے سر ٹکراتے بہہ رہے ہیں۔ پہلے ان میں جہاز رانی ہوتی تھی، اب کشتی بھی نہیں چل سکتی۔

یہ تو جغرافیہ کی بعض عام تبدیلیوں کا بیان ہے، ورنہ کس کس تبدیلی کا ذکر کیجئے۔ لیکن اس مختصر بیان سے اتنا تو ظاہر ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ کا جغرافیہ پڑھ کے کوئی شخص جغرافیہ کا ماہر نہیں کہلا سکتا۔

---

۱۹ ستمبر

ایک اخبار نے سید فقیر احمد جالندھری منجم کا ایک بیان چھاپا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اکتوبر کے مہینے میں ہندوستانی فوجیں حیدر آباد کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی۔ ۱۹۴۹ء میں پنڈت نہرو اسلام قبول کر لیں گے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان ہندوستان کو فتح کرے گا اور ۱۹۶۵ء میں ہندو بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ نجومی صاحب نے یہ بیان انگریزی میں لکھ کے بھیجا ہے؛ اس لئے معتبر ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان کے جوتشیوں کو چیلنج دیا ہے کہ اگر ان میں ہمت ہے تو ان پیش گوئیوں کو غلط ثابت کر دیں۔ چونکہ اس وقت تک ہندوستان کے کسی نجومی نے ان پیش گوئیوں کو غلط ثابت کرنے کی جرأت نہیں کی، اس لئے نجومی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔

ان پیش گوئیوں کو شائع ہوئے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ حیدر آباد کی فوجوں نے لڑائی بند کر دی۔ ہمارے خیال میں اب باقی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا انتظار کرنا بے سود ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ ان نجومی صاحب کو تلاش کر کے ایسی کفش کاری کریں کہ ان کا فرقِ اقدس

دوازدہ بروج کا نقشہ بن کے رہ جائے۔

ہم سمجھے تھے کہ نجوم، جفر اور رمل وغیرہ کا رواج بہت کم ہوگیا ہے اور لوگوں کا اعتقاد ان چیزوں پر سے اٹھتا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے چند مہینوں سے نجومیوں اور رمالوں نے پھر بڑا زور باندھ رکھا ہے۔ پہلے تو کوئی نجومی کسی درخت تلے بیٹھا مینکھ کرک تلا بکھانتا نظر آجاتا تھا یا بعض نجومیوں اور جفاروں کو کسی ریاست میں جگہ مل جاتی تھی۔ لیکن اب تو نجومیوں کا یہ حال ہے کہ اخباروں میں لمبے لمبے بیان چھپواتے ہیں اور اخبار والے ان کے بیانوں کو ٹرومین اور سٹالین کی تقریروں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اور سچ پوچھئے تو ان دنوں بعض اخباروں میں جو خبریں چھپتی رہی ہیں، انھیں پڑھ کے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبریں کسی خبر رساں ایجنسی نے نہیں بھیجیں بلکہ نجوم کے زور سے حاصل کی گئی ہیں۔ جو صاحبِ کمال نجومی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں کیا ہونے والا ہے؛ اس کے لئے یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے کہ اس وقت حیدر آباد یا کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ رواج چل نکلا تو ہر اخبار کو اپنے عملے میں ایک نجومی بھی رکھنے پڑیں گے اور کوئی عجب نہیں کہ آگے چل کے نہ خبر رساں ایجنسیوں کی ضرورت باقی رہے۔ نہ سٹاف رپورٹروں کی بلکہ خبریں فراہم کرنے کا کام جوتشیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ ابھی تو اخبار والے یہ نہیں بتاتے کہ فلاں خبر نجوم کے ذریعے حاصل کی گئی ہے بلکہ نجومی کو نامہ نگار خصوصی بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ رواج عام ہوا تو نہ ایسوسی ایٹڈ پریس رہے گا، نہ رائٹر۔ نہ کوئی اورینٹ پریس کا نام لے گا اور نہ یونائیٹڈ پریس کا۔ بلکہ اخبارات بڑے فخر سے کہا کریں گے کہ ہمارے خاص نجومی نے یہ خبر اپنے علم کے زور سے حاصل کی ہے۔ ہمارے عملہ کے رمال نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اخبارات موجودہ زمانے کے متعلق ہی نہیں بلکہ مستقبل کے متعلق بھی خبریں چھاپ سکیں گے اور ہر شخص جو اخبار پر دو آنے خرچ کر سکتا ہے، گھر بیٹھے موجودہ اور آیندہ زمانے کے حالات بآسانی معلوم کر سکے گا۔ بہر حال ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کا زمانہ ختم ہوگیا۔ یہ نجوم، رمل اور جفر کا زمانہ ہے۔ اب اخباروں کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر نظر نہیں آئیں گے بلکہ ان کی جگہ اصطرلاب دکھائی دیں گے۔ اخبار نویسوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ یا تو نجوم اور رمل سیکھئے۔ ورنہ اپنی جگہ خالی کرنے کے لئے تیار رہئے۔

ہمارے خیال میں یونیورسٹی کو نجوم۔ رمل۔ جفر اور سامدرک کی الگ الگ کلاسیں کھولنی چاہئیں۔ خوش قسمتی سے لاہور کے اہلِ علم میں سیّد عبدالقادر صاحب سابق استاذ تاریخ اسلامیہ کالج لاہور جیسے بزرگوار موجود ہیں جو نجوم اور سامدرک دونوں بہت اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ رمل اور جفر میں بھی تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی اگر اس شعبہ کے لئے ان کی خدمات حاصل کرے تو ان علوم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ ان کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹی میں جرنلزم کی جو کلاس ہے، اس کے نصاب میں نجوم لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کر لیا جائے جو اخبار نویس اس دور میں نجوم نہیں جانتا وہ کچھ نہیں جانتا۔

---

۲۸ ستمبر

اگلے زمانے کے بزرگوں کو اپنی زبان کی حفاظت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ میر تقی دلّی سے نکلے تو تانگے کا پورا کرایہ پاس نہیں تھا۔ ایک دیہاتی سے ساجھا کیا۔ تھوڑی دُور گئے تھے کہ اس نے کہا:

"میاں تم یوں گم سُم کیوں بیٹھے ہو۔ کچھ اپنی کہو۔ کچھ ہماری سنو کہ راستہ کٹے۔"

میر صاحب نے جواب دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم سے باتیں کروں اور اپنی زبان خراب کروں؟ میں نے کرایہ میں ساجھا کیا ہے، باتیں کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔"

تقسیم کے بعد دلّی والوں کو گھر بار چھوڑ کے پاکستان آنا پڑا تو لاہور کے بعض بزرگوں نے جنہیں میر تقی مرحوم کی زندگی کا یہ واقعہ یاد تھا، سوچا کہ دلّی والے لاہور میں رہے تو ان کی زبان خراب ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ شرفائے دہلی کی ایک بستی بسائی جائے۔ تاکہ ان کی زبان محفوظ رہے اور سند کے طور پر کام آئے۔ سنا ہے انہیں کچھ حامی بھی مل گئے تھے اور ماڈل ٹاؤن کے قریب دلّی والوں کی بستی کے لئے ایک قطعہ زمین بھی تجویز کر لیا گیا۔ لیکن بیچ میں کچھ ایسے پیچ آ پڑے کہ یہ سکیم دھری رہ گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس سکیم کو ختم کرنے کا سہرا بھی دلّی ہی کے ایک بزرگ وار کے سر ہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ دلّی والوں کے لئے الگ بستی بسائی جا رہی ہے تو وہ بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے، لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے ہمیں جانور مقرر کیا ہے کہ شہر سے باہر ہمارے لئے ایک چڑیا گھر بنوانا چاہتے ہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ صرف زبان کے تحفظ کے خیال سے یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے تو وہ چلّا کے بولے :۔

"زبان جائے بھاڑ میں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس پیرانہ سالی میں تماشا بن کے رہ جاؤں۔ صرف دلّی والوں سے بات کروں۔ دلّی والوں میں رہوں اور کوئی غیر دہلوی مجھ سے بات کرنا چاہے تو میر تقی کی طرح اسے یہ کہہ کے روک دوں: تم سے بات کرنے میں میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

اور بات ٹھیک بھی ہے۔ یہ میر تقی کا زمانہ نہیں کہ لوگ زبان کی حفاظت کے لئے اتنا اہتمام کریں اور خود دلّی بھی مدّت سے پنجاب بنی ہوئی تھی یعنی دلّی میں پنجابیوں کی آبادی تہائی تو ضروری تھی۔ بعض پرانے بزرگوں کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ پنجابیوں کے اثر سے دلّی والوں کی زبان خراب ہو گئی۔ ایک موقع پر حکیم بھورے میاں نے چند پنجابیوں کے سامنے یہ ذکر چھیڑا اور کہنے لگے۔ "تم پنجابیوں نے ہماری زبان خراب کر دی۔" سب لوگ تو چپ رہے لیکن ایک بگڑے دل کہنے لگا :۔

"حکیم صاحب آپ کی زبان پنجابیوں نے نہیں بلکہ چونے نے خراب کی ہے۔ میں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ اتنا چونہ نہ کھایا کیجئے۔"

شکر ہے کہ یہ دہلوی بزرگوار بات کو پا گئے اور یہ سکیم چل نہ سکی۔ ورنہ دہلی والوں کی یہ بستی اچھا خاصا مذاق بن جاتی اور صاحب ان لوگوں کا کیا ہے۔ آج یہ مضحک سکیم پیش کی ہے، کل یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ حضراتِ دہلی کو تبرک کے طور پر مختلف شہروں میں بانٹ دیا جائے۔ ہمارے ہاں بھی کیسے کیسے عجیب لوگ ہیں اور کیا کیا تجویزیں دماغ سے اتار کے لاتے ہیں کہ بس سُنئے اور سر دُھنئے۔

---

۲۹ ستمبر

پاکستان کے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے لاہور کے ایک اجتماع میں جو تقریر ارشاد فرمائی ہے۔ اس میں انہوں نے نجوم اور نجومیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں سید فقیر احمد جالندھری کہاں چلے گئے۔ انھیں تو داد وصول کرنے کے لئے اس موقع پر موجود ہونا چاہئے تھا۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ اگر کوئی شخص افواہیں پھیلاتا نظر آئے تو اسے پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیجئے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر کوئی نجومی کسی اخبار میں چند بے معنی باتیں پیش گوئی کے نام سے چھپوا کے غائب ہو جائے تو لوگ اسے کیسے پکڑیں؟

پچھلے دنوں جنوبی امریکہ کی ایک ریاست چلی اور وہاں کے صدر کا ذکر اخباروں میں آیا تھا۔ ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ چلی کے صدر کا کیا نام ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے

کہ قاعدہ کے رو سے تو چلّی کے صدر کا نام شیخ چلی ہونا چاہیئے لیکن چلّی والوں سے اتنی خوش ذوقی کی امید کہاں؟ اگر مانگرول کے حکمران کا نام شیخ مانگرول ہو سکتا ہے تو چلّی کے صدر کا نام شیخ چلّی کیوں نہیں ہو سکتا؟

ہم میں سے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے ہندوستان، پاکستان یا مشرق کے کسی اور ملک کے متعلق سہواً کوئی غلط بیانی ہو جائے تو ہو جائے، کم از کم یورپ اور امریکہ کے متعلق اس سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ۲۶ ستمبر کے "سول" میں ایک خبر چھپی ہے کہ "نیویارک ٹائمز" نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں حکومت پر بڑی لے دے کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ امریکہ کے ملوکیت پسند اتحادی قوموں کی انجمن کو امریکی سرمایہ داروں کا کھلونا بنا لینا چاہتے ہیں۔

"نیویارک ٹائمز" امریکی ملوکیت پسندوں کا اخبار ہے۔ اس لئے اس قسم کی باتیں اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں نہیں لکھ سکتا۔ یہ باتیں امریکی کمیونسٹوں کے اخبار "نیو ٹائمز" نے کہی ہوں گی، جو سول کے عملۂ ادارت کے کسی رکن نے "نیویارک ٹائمز" سے منسوب کر دیں۔ اصل خبر میں تو "نیو ٹائمز" ہی تھا۔ لیکن سب ایڈیٹر صاحب نے سوچا ہو گا کہ امریکہ کا سب سے بڑا اخبار تو "نیویارک ٹائمز" ہے، یہ "نیو ٹائمز" کہاں سے ٹپک پڑا۔ لاؤ اس غلطی کی اصلاح ہی کر دیں، ورنہ دنیا کیا کہے گی؟

بہت مدت ہوئی۔ راقم الحروف کو اس قسم کے ایک منطقی کاتب سے واسطہ پڑا تھا۔ مضمون میں ایک جگہ رشید احمد صدیقی علیگ آیا تھا۔ کاتب صاحب نے علیگ کو پلیگ بنا دیا۔ میں نے کہا، پلیگ نہیں علیگ لکھئے۔ کہنے لگے، میں نے آج تک علیگ نہیں سنا۔ پلیگ ہی سنتا رہا ہوں اور سنتا کیا رہا ہوں۔ میں تو ایک دفعہ خود پلیگ کی وجہ سے مرتے مرتے بچا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ علیگ کہلاتے ہیں۔ کاتب صاحب ذرا

پرانی قسم کے بزرگ تھے اور علی گڈھ سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ کہنے لگے، اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص علی گڑھ میں پڑھتا ہے، وہ علیگ کیوں کہلائے اور فرض کیجئے آپ کی یہ بات صحیح ہے تو یہ علی گڑھ والے پلیگ سے کیا کم ہیں؟ اس لئے اس لفظ کے بدلنے پر اصرار نہ کیجئے اور پلیگ ہی رہنے دیجئے۔

یکم اکتوبر

ہم نے کل کی اشاعت میں عرض کیا تھا کہ محکمۂ مالیات کے سکتر صاحب نے اردو کو نوازا ہے۔ تو اب اہل کاروں کو اردو سکھانے کا بھی کوئی انتظام ہونا چاہئے۔ ورنہ ڈر ہے کہ یار لوگ انگریزی میں سوچیں گے، اردو میں لکھیں گے اور ایسی جناتی زبان رواج پا جائے گی، جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ لیکن ہمارے ایک معاصر کی رائے ہے کہ جہاں اردو کا لفظ نہیں سوجھتا، وہاں انگریزی لفظ ہی رہنے دیجئے۔ مثلاً راشن لینے کا ٹائم ہو گیا ہے: اردو کا فقرہ ہے، اسے انگریزی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے فقروں سے کام چلتا ہے تو چلائیے اور اس پھیر میں نہ پڑیئے کہ اردو میں ٹائم کو کیا کہتے ہیں؟

جہاں اردو کی اصطلاح نہ سوجھے، وہاں انگریزی کے لفظ سے کام نکال لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن گستاخی معاف "ٹائم" تو کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا اُردو ترجمہ کسی کو نہ سوجھے "ٹائم" کو اُردو میں وقت کہتے ہیں اور "نوائے وقت" مشہور اخبار ہے جسے محکمۂ مالیات کے اہل کار ضرور پڑھتے ہوں گے، ورنہ یوں تو یہ فقرہ بھی اردو میں ہے:-

"دو روپی قیمت۔ خوشی ٹیک۔ خوشی نہ ٹیک۔"

اکثر پڑھے لکھے لوگ تو کچھ ایسی کھچڑی قسم کی اُردو بولتے ہیں کہ بس کیا کہئے۔ مثلاً:-
"میں نے آپ کو کانفیڈنشل لیٹر لکھا تھا۔ اس کا ریپلائی آپ نے نہیں دیا اور فادر سان سسٹ

کر رہے ہیں کہ اب تک ریپلائی آجانا چاہئے اور ایڈیو نو فاور کا موڈ آج کل بہت خراب ہے۔
محکمہ مالیات نے بھی اگر اسی قسم کی زبان اختیار کر لی تو اس کا انداز کچھ اس قسم کا ہوگا۔
"میں اس پروپوزل سے ایگری نہیں کر سکتا۔ اس میں کئی ڈیفیکٹ ہیں۔ اس لئے فائل ان ریمارکس کے ساتھ ریٹرن کیا جاتا ہے کہ اس پروپوزل کو فارملی پٹ کرنے سے پہلے مجھ سے زبانی ڈسکس کر لیا جائے۔"

یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر محکمۂ مالیات پر پرانی قسم کے محرروں نے قبضہ جما لیا تو اس قسم کے فقرے اکثر نظر سے گزریں گے "کاغذات بسلسلہ مرمت گڈھا و چھکڑہا کہ از جانب صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل خانجات موصول ہو کر پیش ہوئے تھے بحکم اسسٹنٹ سکرٹری بہادر برائے درستی غلطی ہا و میزان دوبارہ ابلاغ خدمت کئے جاتے ہیں۔"

ہمارے خیال میں دفتری زبان اس سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اردو سیکھنے کی طرف توجہ کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ صاحب بہادر نے جو لکھ دیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا۔

محکمۂ مالیات[1] کے سکتر صاحب کی ہمت قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنے محکمہ سے انگریزی کو نکال کے اردو کو اس کی جگہ دلوا دی۔ آج کل سو روپے ماہانہ تنخواہ کے کلرک کو برطرف کرنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے لوگ پیٹ پکڑے سفارش کے لئے دوڑے آتے ہیں اور انگریزی تو سو برس سے پنجاب پر راج کر رہی ہے۔ لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ انگریزی کو اپنے اپنے محکمہ سے تو نکال دیا، اسے لوگوں کے دماغوں سے نکالنے میں بڑی کھکھیڑیں اٹھانی پڑیں گی۔

۲ر اکتوبر

کراچی کے وکٹوریہ والوں اور رکشا والوں میں کچھ عرصہ سے بڑے جھگڑے ہو رہے ہیں۔

---

[1] صوبہ پنجاب کے محکمہ مالیات کے سکتر مسٹر احمد دین اظہر نے سرکاری دفتروں میں اردو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔

کبھی وکٹوریہ والوں کا جلوس نکلتا ہے۔ کبھی رکشا والے جلسے اور جلوس پہ اتر آتے ہیں۔ حکام نے بڑی کوشش کی کہ دونوں گروہوں میں صلح صفائی ہو جائے۔ لیکن ایک طرف وکٹوریہ والے ہیں کہ کسی کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ دوسری طرف رکشا والے ہیں کہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جا رہے ہیں۔

وکٹوریہ ایک قسم کی گھوڑا گاڑی کا نام ہے جس کا رواج کلکتہ۔ بمبئی۔ کراچی وغیرہ میں عام ہے۔ رکشا گاڑی جسے ہاتھ سے کھینچا جاتا ہے، مشرق بعید کے ممالک میں تو کثرت سے رائج ہے، البتہ ہندوستان اور پاکستان میں صرف کہیں کہیں اس کا رواج ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کراچی میں رکشا کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن یو۔پی اور شملہ وغیرہ سے مسلمان رکشا والے بھاگ کے کراچی پہنچے تو ہر طرف رکشا ہی رکشا دکھائی دینے لگے۔

رکشا کی سواری ایک تو "پناہ گیر" سواری ہے، دوسرے سستی بھی پڑتی ہے۔ اس لئے مہاجرین نے اسے فوراً اپنا لیا۔ اس پہ وکٹوریہ والے جو اپنی سواری کو ملکہ وکٹوریہ کی نسبت سے شاہی سواری سمجھتے ہیں بہت بگڑے اور کہنے لگے کہ رکشا والے آخر "کہار" ہی تو ہیں۔ ڈولی نہ اٹھائی رکشا کھینچنے لگے۔ لوگوں کی مت ماری گئی ہے جو وکٹوریہ کو چھوڑ کے رکشا پہ لدے پھرتے ہیں۔

وکٹوریہ والوں نے شور جو مچایا تو حکام نے حکم دے دیا کہ رکشا والے عورتوں اور بچوں کے سوا کسی کو رکشا پر سوار نہیں کر سکتے۔ اس پہ رکشا والے بہت بگڑے اور کہنے لگے کہ رکشا پناہ گیر، ہم پناہ گیر۔ اگر سرکار نے حکم واپس نہ لیا تو ہمیں فاقے کرنے پڑیں گے۔ کراچی میں جو مہاجرین ہیں انہوں نے بھی رکشا والوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ یہ حکم واپس لے لیا گیا۔

اس پہ وکٹوریہ والے بہت جز بز ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ہڑتال کر دی اور ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ ان کے نمائندوں نے خواجہ شہاب الدین سے بھی ملاقات کی اور کہا رکشا والوں

کی وجہ سے ہماری آمدنی بہت کم ہوگئی ہے۔ خواجہ شہاب الدین اگر نرے وزیر داخلہ ہوتے تو اور بات تھی۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ وزیر مہاجرین بھی ہیں۔ اس لئے رکشا والوں کو جو قریب قریب سب کے سب مہاجرین ہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انھوں نے وکٹوریہ والوں سے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں، آئندہ رکشا والوں کو بھی لائسنس لینا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کوئی رکشا والا دو آدمیوں سے زیادہ کو سوار نہیں کر سکے گا۔

دراصل وکٹوریہ والے چاہتے ہیں کہ رکشا ڈولی کی طرح صرف زنانہ سواری بن کر رہ جائے۔ اس لئے وہ خواجہ شہاب الدین کی باتیں سن کے مطمئن نہیں ہوئے ہوں گے۔ لیکن آخر بچارے کریں بھی کیا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ سارے رکشا والوں کو توپ دم کرا دیا جائے۔ اس موقع پر دلیلوں ہی سے کام نکل سکتا تھا، سو دلیلوں کا بھی خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ رکشا والے اگر کہہ دیں کہ وکٹوریہ زنانہ نام ہے، اس لئے یہ سواری بھی زنانہ ہے تو وکٹوریہ والوں اور ان کے حامیوں سے بغلیں جھانکنے کے سوا اور کچھ بن نہ پڑے۔

شکر ہے کہ لاہور میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہاں نہ وکٹوریہ ہے نہ رکشا بلکہ تانگے ہی تانگے ہیں۔ دلی وغیرہ سے جو مہاجرین بھی آئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی رکشا والا نہیں۔ البتہ تانگے والے ضرور موجود ہیں جو آتے ہی اپنی برادری میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ مہاجر اور انصار تانگے والوں میں کوئی تمیز ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ دلی کے تانگہ والوں نے تو لاہور آکے "بچ موڑ توں" بھی کہنا سیکھ لیا ہے۔

---

۷ راکتوبر

اتحادی قوموں کی جنرل اسمبلی کے صدر ایوٹ صاحب نے کہا ہے کہ اگلے دو مہینے دنیا کے امن کے لئے خطرناک ہیں۔ لیکن پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ آئندہ سو برس تک تو دنیا کے امن کو

کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ پاکستان سو سال تک کشمیر پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔ ہندوستانی فوجیں اس سرزمین میں مزے سے دندنائیں گی اور پناہ گیر جو پہلے شرنارتھی تھے پھر پیٹرٹ بنے اور اب پرشارتھی ہیں اور جنہیں سر چھپانے کا ٹھکانا الگ رہا، ٹھکانے کا نام بھی نہیں ملتا، یونہی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے آلھا گاتے اور بھارت کی جے کے نعرے لگاتے رہیں گے۔

ایوٹ رائے بڑے صاحب اثر آئے شخص سہی لیکن پنڈت جی آخر برہمن ہیں اور جہاں جوتش کا سوال آئے گا، ہمیں مجبوراً پنڈت جی کو ان پر ترجیح دینی پڑے گی۔ مرزا غالب ترکِ افراسیابی تھے، لیکن برہمنوں کے وہ بھی قائل تھے۔ اسی لئے تو کہہ گئے ہیں ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

مرزا صاحب کو جس برہمن سے سابقہ پڑا۔ اس نے تو سال بھر کا حال بتایا تھا۔ اس کشمیری برہمن نے سو سال کا حال بتا دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اتنے بڑے لیڈر اور ہندوستان کے وزیر اعظم نہ ہوتے تو کشمیر کا جھگڑا اتنی دیر بھی نہ چلتا۔ پنڈت جی کو کشمیر سے صرف اتنا تعلق ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کشمیر سے اٹھ کے نہر سعادت خاں کے کنارے آ بسے اور نہرو کہلائے۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت نہرو نہر سعادت خاں اور رپل بنگش کی طرح کشمیر کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اسی فکر میں ہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ڈل کے کنارے جا بسیں اور "ڈلو" کہلائیں۔ لوگوں نے ہزار کہا کہ کشمیر کے قضیے کو چھوڑیئے۔ اس مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے آخر کیا فائدہ؟ اب تو لوگ بھی اس قسم کی خبریں سن کے اکتا گئے ہیں کہ آج ہندوستانی فوجیں ڈیڑھ فٹ بڑھ گئیں۔ آج ہم نے ایک ٹیلے پر قبضہ کر لیا ہے جو ساٹھ فٹ اونچا اور پندرہ فٹ چوڑا ہے لیکن پنڈت جی آئیں تو جائیں کہاں؟ بس ضد کئے جا رہے ہیں کہ ہم تو کشمیر لے کے ہی رہیں گے۔ تو یہ ہے کشمیر نہ ہوا جھنجھنا ہو گیا۔

ہم نے اکثر نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھتے ہی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے۔ دوستوں نے موقع پاکے یا شراب کی چاٹ لگائی یا عشق و عاشقی کے کوچے میں لا ڈالا اور دیکھتے دیکھتے بزرگوں کی جمع جتھا الٹے تلّلوں میں اڑ گئی۔ پنڈت نہرو نے ان راستوں پر قدم نہیں رکھا تو کیا ہوا۔ کشمیر کا عشق جان کا لاگو ہو گیا۔ تیس لاکھ روپیہ روزانہ خرچ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر دم خم یہ ہیں کہ برابر سو برس تک خرچ کرتے چلے جائیں گے۔ انگریزوں سے جو ہوائی جہاز تزکہ کے طور پر ہاتھ آئے تھے۔ سامان ڈھوتے ڈھوتے ان کا پلیتھن نکل گیا۔ گولہ بارود کے ذخیرے، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک عشق و عاشقی کے اِس کھیل کی نذر ہو گئے۔ لیکن پنڈت جی پھر بھی نہ مانے۔ تجوریوں کے مُنہ کھُلے ہیں، سامانِ جنگ منگوایا جا رہا ہے اور کشمیر کے پہاڑوں میں انسانی شکار کی مشق ہو رہی ہے۔

پنڈت نہرو کو اور سب کچھ آتا ہے، لیکن حساب نہیں آتا۔ انہیں کیا معلوم تیس لاکھ روزانہ کے حساب سے سو برس تک روپیہ خرچ ہوتا رہا تو کل کتنی رقم خرچ ہوگی؟ اور سچ پوچھئے تو اتنا لمبا حساب ہمیں بھی نہیں آتا۔ لیکن برلاجی اور ڈالمیاجی تو جانتے ہیں کہ پنڈت جی مہاراج اگر اسی حساب سے روپیہ لٹاتے رہے تو ہندوستان کے خزانے میں خاک اڑنے لگے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بیلنے جو عمر بھر بہی کھاتوں اور تجوریوں سے گھرے رہے ہیں، ٹھنڈی سانسیں بھر کے کہہ رہے ہیں کہ نہ جانے مہامنتری جی کیا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے مہاپُرش کہہ گئے ہیں کہ سارا دھن جاتا دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ۔ سارا کشمیر ہاتھ آتا دکھائی نہیں دیتا۔ روپیہ میں سے اٹھنی اور اٹھنی نہیں، تو چونی ہی بہت ہے۔ پر ہمیں ایسا لگتا ہے کہ مہامنتری جی سب کچھ گنوا کے ہی رہیں گے اور روپے میں سے چونی بھی ہاتھ نہیں آتی، تو اپنی گرہ سے کوڑی بھی کیوں خرچ ہو۔ حیدرآباد ہاتھ آ گیا تو اسے ہی بہت جانئے۔ کشمیر جاتا ہے تو جائے۔ رہتا پانی رہ گیا اور بہتا پانی بہہ گیا۔ ہم اس گھاٹے کے بیج میں روپیہ کیوں لگائیں۔

ہٹ تین طرح کی مشہور ہے۔ راج ہٹ، بال ہٹ اور تریا ہٹ۔ پنڈت نہرو راجہ بھی اور بالک بھی۔ یعنی ان میں راج ہٹ بھی ہے اور بال ہٹ بھی۔ گویا نہرو ہٹ جو پنڈت جی کے حصے

میں آئی ہے، راج ہٹ اور بال ہٹ کا مجموعہ ہے اور یہ اسی نہرو ہٹ کا نتیجہ ہے کہ کشمیر میں ہندوستانی فوجیں برابر ہٹ رہی ہیں۔ یہ ہٹ کی ایک اور قسم ہے جسے "پیچھے ہٹ" کہنا چاہئے۔ غرض کشمیر کی لڑائی کو پنڈت نہرو جو چاہیں کہہ لیں، دنیا کو تو یہ لڑائی نری "عیاشی" معلوم ہوتی ہے۔

۸ر اکتوبر

ایک اخبار نے جس کی لکھائی چھپائی بہت ناقص ہے، لکھا ہے کہ جس اخبار کی چھپائی اچھی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کی اشاعت تین چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ جتنا اخبار زیادہ چھپے گا، چھپائی اتنی ہی ناقص ہوگی اور جو اخبار بیس ہزار چھپتا ہو۔ اس کی چھپائی کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اخبار بیس ہزار چھپتا ہے۔ اس لئے چھپائی ناقص ہے لیکن بندہ نواز! یہ تو فرمائیے، آپ کے اخبار میں یہ جو غلط سلط نظمیں چھپتی رہتی ہیں، انہیں بھی کیا اسی کثرتِ اشاعت کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ کس اخبار کی اشاعت کتنی ہے؟ البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ہمارے اس معاصر کی اشاعت چار پانچ ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔ ناقص چھپائی کو دعا دیجئے، جس کی بدولت اشاعت بیس ہزار تک جا پہنچی۔ اگر کچھ دنوں میں چھپائی اور خراب ہوگئی تو بڑی بے تکلفی سے کہہ دیا جائے گا کہ جس اخبار کی چھپائی اتنی ناقص ہو کہ ایک لفظ بھی نہ پڑھا جائے تو بس سمجھ لیجئے کہ اس کی اشاعت چالیس ہزار ضرور ہوگی۔

مسٹر غضنفر علی خاں جو پاکستان کی طرف سے سفیر مقرر ہو کے ایران گئے تھے، ان دنوں پاکستان میں ہیں۔ کل کراچی پہنچے آج لاہور پہنچ گئے ہوں گے یا کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے۔ ان کے لاہور تشریف لانے پر اخبار نویسوں کا ایک آدھ اجتماع بھی ہوگا۔ جس میں غالباً وہ فارسی میں تقریر کریں گے۔ کیونکہ لاہور سے رخصت ہوتے وقت وہ کہہ گئے تھے کہ طہران سے واپس آیا تو فارسی میں گفتگو ہوگی۔

شکر ہے کہ مسٹر غضنفر علی خاں کو اتنے تھوڑے عرصے کے بعد ایران سے پاکستان آنے اور اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ باقی رہی اُن کی فارسی تو وہ کچھ ایسی ڈرنے کی چیز نہیں۔ ہم نے ان کی اردو سنی ہے، پنجابی سُنی ہے، انگریزی سُنی ہے، خدا نے چاہا تو فارسی بھی سنیں گے اور اس معرکۂ امتحان میں بھی پورے اتریں گے۔ ہم پر زندگی میں ایسے بڑے بڑے سانحے گزرے ہیں اور اللہ کے فضل سے ابھی تک زندہ ہیں۔

مدت ہوئی، راقم الحروف کو ایک صاحب بہادر نے جو فوج میں لفٹنٹ کرنل تھے، انگریزی کے ایک گیت کا اردو ترجمہ سُنایا تھا۔ ترجمہ خود انھوں نے کیا تھا۔ اصل گیت کی دُھن میں گاتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ کچھ مصرعے یاد رہ گئے ہیں، آپ بھی سُن لیجیے:

ہم ایک ڈُم پُورا ہے
ہم ایک ڈم خوشی ہے۔
ہمارا نام ہے جیک میکرول
ہمارا ملک سب سے اچھا ہے
ہم کچھ نہیں مانگتا
ہم ایک ڈم پُورا ہے۔
ہم ایک ڈم خوشی ہے۔
تھوڑا شراب باٹل میں ہے
فجر کے واسطے

جس قسم کی یہ اُردو ہے مسٹر غضنفر علی خاں ہمیں مرعوب کرنا چاہیں گے تو اسی قسم کی فارسی بولیں گے۔ اس لیے ہمیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ غضنفر علی خاں لاہور آتے ہیں تو آنے دیجیے، تقریر کرتے ہیں تو کرنے دیجیے، فارسی بولتے ہیں تو بولنے دیجیے، ہم ہنسی خوشی یہ مصیبت بھی برداشت کرلیں گے اور "سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" کہہ کے چُپکے ہو رہیں گے۔

۱۴ر اکتوبر

بعض حلقوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ مجلسِ اربابِ علم کے ارکان تو بچارے سیدھے سادے لوگ ہیں حکومت نے انہیں خواہ مخواہ ترقی پسندوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ یہ شبہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اربابِ علم اگلے وقتوں کے لوگ سہی لیکن اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ خود کھڑے ہی نہ ہو سکیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کے ایما کے بغیر خود ترقی پسندوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہاں حکومت اُن کی اس حرکت کو حُسنِ خدمت سمجھے اور انہیں نوازنا چاہے تو اور بات ہے۔

اگرچہ "علم" اور "ترقی" کی اس لڑائی کی لم ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ تاہم اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں جو جھگڑا شروع ہوا تھا، وہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ نہ اربابِ علم ترقی پسندوں کے جلسوں میں جاتے ہیں، کیونکہ انہیں "ترقی" سے ڈر لگتا ہے اور نہ ترقی پسند اربابِ علم کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ کیونکہ ع

بیچ میں علم کھڑا ہے

اِس جھگڑے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پہلے حلقہ اربابِ علم، انجمن ترقی پسند مصنفین دونوں کے جلسے دیال سنگھ لائبریری میں ہوتے تھے۔ لیکن اب لائبریری کے دروازے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لائبریری کی سیڑھیاں جن میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے، دونوں پر بند ہیں۔ جہاں حلقہ اربابِ علم کا کوئی رکن یا کوئی ترقی پسند سیڑھیوں سے چڑھتا نظر آیا، لائبریری والوں نے "ہالٹ ہو کمز دیئر" کہہ کے روک دیا۔ یا یہ کہہ دیا کہ ہاں ہاں کہاں بڑھے چلے آتے ہو، یہاں کوئی جلسہ نہیں ہو سکتا اور انداز کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ بابا معاف کر۔ آج گھر میں برکت ہے۔

خیال یہ تھا کہ اربابِ علم اور ترقی پسندوں پر دیال سنگھ لائبریری کا دروازہ بند ہوا ہے تو

"ترقی" اپنا راستہ لے گی اور "علم" سر چھپانے کے لئے کوئی ایسا ٹھکانا ڈھونڈے گا، جہاں "ترقی" کا سایہ نہ پڑے۔ لیکن دونوں کو ایک ہی ٹھکانا ہاتھ آیا۔ یعنی اب دونوں کے جلسے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ہوتے ہیں۔ سنیچر کو "ترقی" خیال الاپتی ہے، اتوار کو "علم" اپنا دھرپد چھیڑ دیتا ہے۔ اگرچہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں، پھر بھی دونوں میں جو اختلاف ہے، وہ برابر قائم ہے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ؎

تم اپنا منہ اُدھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں

---

۱۵ راکتوبر

ہمارے ایک کرم فرمانے ہمیں ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک مقامی روزنامہ کے ایک ہفتہ وار ایڈیشن میں "کشمیر اور پاکستان کا تعلق" کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق جتنی باتیں کہی گئی ہیں، ان میں اکثر و بیشتر غلط ہیں ہمیں تو یہ یقین ہے کہ یہ مضمون چین میں بھی لکھا جاتا تو اس میں اتنی غلطیاں نہ ہوتیں۔

غالباً ان غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ جناب غلام رسول لودھی جنہوں نے یہ مضمون لکھا ہے، لودھی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور لودھیوں کے زمانے میں کشمیر دلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت نہیں تھا۔ بہر حال لودھی صاحب کشمیر پر مضمون لکھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے تو ایڈیٹر صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھپاک سے مضمون چھاپ دیا۔

دوسری غلطیوں کو تو جانے دیجئے، لودھی صاحب نے بانہال روڈ کے متعلق ایسے ایسے معلومات کے موتی بکھیرے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے:۔

"بنیال روڈ۔ یہ سڑک وادیٔ کشمیر کو شمالی پنجاب اور صوبۂ سرحد سے ملاتی ہے۔"

بہت خوب۔ مضمون نگار صاحب نے جس سڑک کو بنیال روڈ بنا دیا ہے۔ وہ اصل میں

بانہال روڈ کہلاتی ہے۔ صوبہ سرحد سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ سڑک جموں سے شروع ہوتی ہے اور درہ بانہال سے گزر کے سری نگر جا پہنچتی ہے۔ کم از کم جب ہم نے اس سڑک پر سفر کیا تھا تو اس کی یہی حالت تھی۔ اب پٹھان اسے اٹھا کے پشاور لے گئے ہوں تو اور بات ہے۔ ہمیں اس حادثہ کی اطلاع نہیں۔

آگے چل کے اس سڑک کے متعلق مزید معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ مثلاً :-

"بنیال روڈ۔ یہ ایک پختہ سڑک ہے جو سیدھی راولپنڈی سے سرینگر کو جاتی ہے۔"

ایں گُلِ دیگر شگفت۔ بانہال روڈ، سرینگر سے راولپنڈی پہنچی اور ہمیں خبر نہ ہونے پائی تسکر کیجئے۔ یہ سڑک سری نگر تو جا پہنچی۔ ورنہ وہ اگر بارہ مولا روڈ سے جا ملتی تو کوئی اس کا کیا کر لیتا۔ ہمارا تجربہ ہے۔ سڑکیں بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

لودھی صاحب نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے :-

"جموں سے سانبہ ستر میل ہے۔"

اب ستر میل ہی ہوگا۔ لیکن پہلے چوبیس میل ہوا کرتا تھا۔ اصل میں سڑکیں جب بغاوت کرتی ہیں تو کبھی پھیل جاتی ہیں، کبھی سکڑ جاتی ہیں۔ پھر سُنا ہے کہ زمین کی طنابیں کھینچ کے سڑکوں کو مختصر بھی کیا جا سکتا ہے۔

کشمیر کے سیبوں کے متعلق بھی مضمون نگار نے خاصی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ مثلاً :-

"کشمیری سیب اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ طویل سفر کا متحمل ہو سکے۔ سُنا ہے، کشمیر میں سیب کی قیمت ایک آنہ فی درجن ہے۔"

ہم نے کشمیری سیب کو اس کی جوانی کے زمانے میں دیکھا ہے۔ جب تو بڑے بڑے لمبے سفر کر لیا کرتا تھا۔ اب بچارے کا بڑھاپا ہے۔ دو قدم چلتا ہے اور ہانپنے لگتا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ سڑکیں بھی باغی ہو چکی ہیں۔ بچارا کشمیری سیب بھی کیا کرے۔ بانہال روڈ جموں کو چھوڑ کے راولپنڈی

چلی گئی۔ جہلم ڈیلی روڈ کا کہیں اتا پتہ نہیں ملتا۔

تفنن برطرف۔ لودھی صاحب نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ "جہلم ڈیلی روڈ" کو جو راولپنڈی کو سری نگر سے ملاتی ہے، بانہال روڈ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بنیال روڈ سمجھ لیا، حالانکہ یہ دو الگ الگ سڑکیں ہیں۔ جہلم ڈیلی روڈ پرانی سڑک ہے اور کشمیر کی زیادہ تجارت اسی سڑک کے ذریعے ہوتی ہے۔ بانہال روڈ بہت بعد میں بنی اور اس پر زیادہ آسانی سے سفر نہیں ہو سکتا۔ دونوں سڑکوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ سری نگر سے راولپنڈی اور جموں قریب قریب یکساں فاصلے پر ہیں۔ تاہم سرینگر سے ایک دن میں لاریاں راولپنڈی پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن ایک دن میں جموں پہنچنا مشکل ہے۔ خیر ان باتوں سے مضمون نگار یا اخبار کے ایڈیٹر کو کیا واسطہ؟ نہ مضمون نگار صاحب کو معلوم ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ نہ ایڈیٹر صاحب کو اس سے واسطہ ہے کہ وہ کیا چھاپ رہے ہیں۔

۱۹ر اکتوبر

خان قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس کا بیان ہے کہ پولیس والوں کی اصلاح کے لئے جو تھانے دار مولوی بھرتی کئے گئے ہیں، وہ اپنے مقصد میں چنداں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی تھانہ دار ہو جائے تو مولوی نہیں رہتا بلکہ تھانہ دار ہو جاتا ہے

شد غلامے کہ آبِ جو آرد
آبِ جو آمد و غلام ببرد

جو مولوی تھانہ دار بننے کے باوجود مولوی ہیں۔ ان کا بھی یہ حال ہے کہ مولوی کم ہیں اور تھانیدار زیادہ۔ پھر کون اصلاح کرے اور کس کی اصلاح کرے۔ تھانے دار تھانے دار کی اصلاح کر سکتا تو اتنا بکھیڑا ہی کیوں کیا جاتا؟

بہرحال مولوی مولوی نہ رہا تو کیا ہوا۔ شکر کیجئے کہ تھانے دار تو ابھی تک تھانے دار ہی ہے

واعظ ز دیں بر آمد و صوفی ز اعتقاد
ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

ہمارے خیال میں حکومت کو مولویوں کا کوئی اور مصرف تلاش کرنا چاہئے۔ شراب ممنوع ہو چکی، مے خانے بند پڑے ہیں، لیکن چھپ کے پینے پلانے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔ کیا اچھا ہو کہ ایک دارالاحتساب کھولا جائے اور اس کا سارا انتظام تھانہ دار مولویوں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں درّے لئے شہر کے گلی کوچوں میں پھیل جائیں اور خلوت کدوں کے گوشوں سے پھر یہ صدا بلند ہو کہ ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است
ببانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

کیا عجب کہ اس طرح ہماری پرانی شاعری پھر زندہ ہو جائے اور ہمارے ہاں کوئی حافظ جیسا شاعر پیدا ہو جائے جو اس قسم کے شعر کہہ سکے ؎

بہ رمز نکتہ ادا مے کنم کہ خلوتیاں
سر سبو بگشادند و در فرو بستند

حافظ کے عہد کی فضا تو قریب قریب پیدا ہو چکی ہے، صرف حافظ جیسے شاعر کی کمی ہے۔

پولیس کی اصلاح کے ذکر میں یاد آ گیا کہ روس کے مشہور مصلح اور ادیب کونٹ لیو ٹالسٹائی کو ایک زمانے میں پولیس کی اصلاح کا خیال آیا۔ ایک دن گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک پولیس کنسٹیبل ایک غریب آدمی کو پیٹ رہا ہے۔ ٹالسٹائی ہجوم کو چیر کے بڑھا اور پولیس والے کے قریب جا کے پوچھنے لگا "کیا تم نے بائبل پڑھی ہے؟"

کنسٹبل نے جواب دیا "مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بائبل نہیں پڑھی۔ لیکن کیا تم نے پولیس کے قواعد پڑھے ہیں؟" ٹالسٹائی سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ واپس چلا آیا۔ تھانہ دار مولویوں کا معاملہ اگر اسی قسم کا ہے تو انہیں بھی تھانہ سے واپس چلا آنا چاہئے۔ ان کا اصلی مقام

مسجد ہے اور ع

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

"قومی آواز" کے ایڈیٹر حیات اللہ صاحب انصاری نے گاندھی جینتی کے موقع پر ایک "نظم" لکھی ہے جس کے کچھ حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

ہمالیہ کی برف پوش چوٹیو
تمہاری بلندی کدھر گئی
گنگا کے بہتے دھارو
تمہاری روانی کیا کم ہو گئی
الورا اجنتا اور تاج محل
تمہاری رونق کہاں کھو گئی
چمکتا ہوا سورج بکھر گیا
پر رات اندھیری نہ ہوئی
قند کا کوزا غائب ہو گیا
پر زندگی تلخ نہ ہوئی
وہ سورج غروب کب ہوا
روشنی میں منتقل ہو کر بکھر گیا
وہ قند کا کوزا غائب کہاں ہوا
سمندر میں گھل کر امرت بن گیا

اس "نظم" میں نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ نظم نہ ہو نثر ہی ہو۔ جسے نظم کی طرح چھاپ دیا گیا ہے۔ لیکن اس میں نثر کی کوئی خوبی بھی تو نظر نہیں آتی اور کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے محض "ضرورتِ شعری" سے مجبور ہو کے محاورہ کا خون کیا ہے ؛ ذرا

انصاری صاحب ہی بتائیں کہ "یہ سورج بکھر گیا" اور "روشنی میں منتقل ہو کے نکھر گیا"، کیا ہے اور کیوں ہے؟ پھر یہ نظم ہے یا نثر ہے۔ یا دونوں کے بین بین کوئی تیسری "جنس" ہے؟ جسے "ایجادِ بندہ، اگرچہ گندہ" کہنا چاہئے۔

۲۱ر اکتوبر

لائل پور کے زراعتی کالج کے پرنسپل صاحب نے کالج کے عملہ اور طلبہ کو حکم دے دیا ہے کہ آئندہ کوئی شخص کسی کے نام کے ساتھ "مسٹر" نہ لکھے۔ خطابوں پر تو پہلے ہی آفت آ چکی، سر گئے، خان بہادر گئے، خان صاحب گئے، اب مسٹر کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔

ایک زمانے میں لوگ "خان بہادر" اور "خان صاحب" کہلانے پر تو فخر کرتے تھے لیکن اگر کوئی مسٹر کہہ دیتا تھا تو ناراض ہو جاتے تھے۔ اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی جج تھے، خان بہادر تھے، لیکن انہیں مسٹر بلکہ مولانا بھی ناپسند تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

یہ زمانہ اکبر کا زمانہ نہیں۔ خاص طور پر جب سے خطابات پر آفت آئی ہے۔ بڑے بڑے خطاب یافتہ لوگوں کو "مسٹر" پر قناعت کرنی پڑی ہے۔ اب زراعتی کالج کے پرنسپل صاحب یہ اڈہ بھی اڑانے پر تلے ہوئے ہیں تو بتائیے کوئی کیا کرے اور کہاں جائے۔

"مسٹر" کا غیر زراعتی ہونا تو مسلّم ہے اور اسے اگر غیر زراعتی ہونے کی بنا پر زراعتی کالج سے اخراج کا حکم ملا ہے، تو ہم پرنسپل صاحب کے حامی ہیں لیکن انہوں نے "مسٹر" کا کوئی بدل بھی تو تجویز نہیں فرمایا۔ ہماری رائے میں "چودھری" خالص زراعتی ہے۔ "راجہ" کے زراعتی ہونے میں بھی

کوئی شک نہیں۔ لیکن کیا زراعتی کالج کے پرنسپل صاحب یہ گوارا فرمائیں گے کہ لوگوں کو مسٹر کے بجائے "راجہ" یا "چودھری" کہا جائے۔

جو لوگ سیّد یا شیخ یا مرزا ہیں، اُنھیں تو کوئی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ سیّد اور شیخ وغیرہ مرزا سے ہر حالت سے بہتر ہیں۔ خان ممدوٹ پہلے نواب ممدوٹ تھے۔ نوابی سے ہاتھ اٹھایا تو خان ممدوٹ ہو گئے۔ شیخ کرامت علی پہلے بھی شیخ تھے۔ اب بھی شیخ ہیں۔ سیّد مبارک علی، مسٹر عبدالحمید دستی اور میاں نور اللہ بھی مسٹر کے دست نگر نہیں لیکن کہیں کہیں بڑی مشکل بھی آپڑتی ہے۔ مثلاً مسٹر غضنفر علی خاں پہلے راجہ غضنفر علی خاں کہلاتے تھے۔ خطابات کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر چند راجہ خطاب نہیں تھا لیکن بظاہر خطاب ضرور معلوم ہوتا تھا، اس لئے انہیں راجہ کو چھوڑ کے مسٹر پر قناعت کرنا پڑی۔ اب اگر خدانخواستہ مسٹر پر بھی آفت آئی یعنی زراعتی کالج کے باہر بھی اس کا استعمال معیوب سمجھا جانے لگا تو مسٹر غضنفر علی خاں کیا کریں گے؟

ایک زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے مسٹر اور مولانا دونوں کو ترک کر کے لوگوں کے ناموں کے ساتھ "آقا" لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے خیال میں بہتر ہو گا کہ مسٹر غضنفر علی خاں بھی اپنے نام کے ساتھ "آقا" لکھا کریں۔ وہ ایران ہو آئے ہیں اور ایرانی اخبارات انہیں آقائے غضنفر علی خاں ہی کہتے ہیں۔ پھر "آقا" راجہ کا صحیح بدل بھی ہے۔ کیونکہ اس میں "راجگی" کا طنطنہ پایا جاتا ہے۔ کیا عجب ہے۔ "آقا" ایسا رواج پا جائے کہ اس کے سامنے "مسٹر" گر و ہو کے رہ جائے۔ بہر حال اچھا ہوا کہ مسٹر علی بخش ایڈیٹر "مسٹر گزٹ" کا انتقال اس حادثہ سے بہت پہلے ہو گیا اور انہیں جیتے جی یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑا۔

۲۳ر اکتوبر

سیٹھ والمیاجن کا کاروبار ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں پھیلا ہوا ہے آج کل

ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ تو ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا. کہ وہ دنیا میں ایک حکومت کیونکر قائم کریں گے لیکن داد سب دے رہے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ والمیاجی سمنٹ کے کئی کارخانوں کے مالک ہیں اور بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ سمنٹ کے اسرار و رموز کو جتنا وہ جانتے ہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ سمنٹ اینٹوں اور پتھروں کو جوڑ کے عالی شان عمارتیں کھڑی کر دیتا ہے تو مختلف ملکوں کو جوڑ کے دنیا بھر میں ایک حکومت کیوں نہیں قائم کر سکتا۔ اگر ہمارا خیال صحیح ہے یعنی والمیاجی نے صرف سمنٹ کے بل پر دنیا بھر میں ایک حکومت قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ فوراً ہندوستان واپس چلے آئیں سمنٹ اینٹوں کو جوڑ سکتا ہے، دلوں کو نہیں جوڑ سکتا۔ خدا جانے والمیاجی کو اینٹ اور دل کا فرق بھی معلوم ہے یا نہیں۔

سُنا ہے۔ مغربی پنجاب کے وزیر مال میجر مبارک علی شاہ حافظ آباد تشریف لے گئے تو ان کی خدمت میں جو ایڈرس پیش کیا گیا، اس میں عام قاعدے کے مطابق میجر صاحب کی تعریف و توصیف کرنے کے بجائے اُن پر بڑی لے دے کی گئی تھی۔ لوگوں کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ میجر صاحب حافظ آباد کے بڑے بڑے تاجروں کے ہاں جو بلیک مارکٹ اور ناجائز نفع اندوزی کی وجہ سے بہت بدنام ہیں، دعوتیں اڑاتے رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ میجر صاحب اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دے سکے اور انھیں اظہارِ افسوس کرنا پڑا۔ لیکن ہم سے پوچھئے تو اس اعتراض کا بڑا معقول جواب دیا جا سکتا تھا۔ یعنی میجر مبارک علی شاہ کہہ سکتے تھے کہ میں وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ پیر کی حیثیت سے دعوتیں قبول کرتا رہا ہوں۔ مرید چاہے چور بازاری کرے، چاہے رشوت کھائے اور چاہے ڈاکے ڈالے، پیر کے لئے اس کی دعوت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پھر مبارک علی شاہ وزیر کیا ہو گئے۔ جان آفت میں آ گئی۔ لوگ چاہتے ہیں کہ بس وزارت پر قناعت کر کے بیٹھ رہیں۔ نہ مریدوں سے ملیں۔ نہ ان کے ہاں دعوتیں کھائیں اور نہ تعویذ لکھیں۔ اصل میں یہ لوگ جانتے نہیں کہ وزارت عارضی چیز ہے اور پیری مریدی کا سلسلہ موروثی اور دائمی۔ وزارت کے عہدے کے لئے جس کا کوئی اعتبار نہیں، کوئی اپنے پرانے طریقے سے کیسے ہاتھ اٹھا لے؟ مریدوں سے کیونکر آنکھیں پھیر لیں۔

مولانا سالک نے "افکار و حوادث" میں لکھا ہے کہ شراب کی ممانعت پر پاکستان کے شعراء خاموش ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی حالت یو۔ پی کی سی نہیں، جہاں ہر شعر کہنے والا اپنے آپ کو میخواری کا حق دار سمجھتا ہے۔ یہ الفاظ پڑھ کے ہمیں بے اختیار شاہ شجاع کی یہ رباعی یاد آ گئی ؎

در مجلسِ دہر سازِ مستی پست است
نے چنگ بہ قانون و نہ دف بر دست است
رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند
جز محتسبِ شہر کہ بے مے مست است

صرف ایک محتسبِ شہر ہی پر موقوف نہیں، الاٹمنٹ اور بلیک مارکٹ کے اس دور میں اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو بے شراب پیئے مست ہیں۔

یہ شاہ شجاع شیراز کے حاکم امیر مبارز الدین کا بیٹا تھا۔ باپ نے شراب کی ممانعت کر دی تھی۔ بیٹے کا زمانہ آیا تو اس نے یہ پابندی اٹھا دی۔ چنانچہ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

---

۲۵ ؍ اکتوبر

پنڈت للتا پرشاد لکھنوی نے اردو کے متعلق ایک بیان دیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ اردو کی ترویج اور ترقی میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب شریک ہیں۔ اس لئے اُسے مسلمانوں کی زبان کہنا غلط ہے اور اردو کا رسم الخط تو ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ہے۔

پنڈت للتا پرشاد کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن اسے کیا کیا جائے کہ موجودہ ہندی کی ترویج سراسر ہندوؤں کی مرہونِ منّت ہے۔ اب پٹیل جی، ٹنڈن جی وغیرہ سے یہ کیسے امید ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی زبان کو جو صرف ہندوؤں کی زبان ہے، چھوڑ کے ساجھے کی زبان اختیار کر لیں۔

اور سچ پوچھئے تو کھڑی بولی جسے ہندی کے نام سے ہندوستان کی راشٹر بھاشا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جسے قریب قریب وہی درجہ دیا جا رہا ہے جو گائے کو حاصل ہے، عام ہندوؤں کی زبان بھی نہیں۔ صرف پٹیل جی، ٹنڈن جی، یا اس قسم کے چند لوگوں کی زبان ہے، ورنہ آل انڈیا ریڈیو پر جو جناتی زبان بولی جاتی ہے، اسے اچھے اچھے پڑھے لکھے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔

دراصل یہ زبان جس پر پٹیل جی ریشہ خطمی ہوئے جا رہے ہیں، زبان کیا ہے "گاؤ زبان" ہے۔ مغربی پنجاب سے جو ہندو دلّی یا یو-پی گئے ہیں، انھیں یہ نسخہ ابھی تک راس نہیں آیا اور شاید کبھی راس نہ آئے۔

---

۲۹ ؍ اکتوبر

کہا جاتا ہے کہ دولتانہ صاحب مغربی پنجاب کی وزارت میں شریک ہونے پر اور خان ممدوٹ

انھیں شریک کرنے پر آمادہ ہیں۔ گویا جہاں تک ان کی شرکت کے معاملہ کا تعلق ہے وہ طے ہو چکا۔ اب صرف کراچی جانا اور "ایجاب و قبول" کی رسم ادا کرنا باقی رہ گیا ہے۔ یہ خبر اگر صحیح ہے اور بظاہر اس کے غیر صحیح ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو ہم بھی مبارک باد پیش کرتے۔

دولتانہ صاحب وزارت سے الگ ہوئے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کوچے میں پھر عمر بھر قدم نہ رکھیں گے۔ انھوں نے اس موقع پر جو واسوخت پڑھ کے سنایا تھا، اس کے اکثر حصے ہمارے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔ بس کچھ اس قسم کا مضمون تھا کہ ع

مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے قدم خود بخود پھر اس کوچے کی طرف اٹھ گئے۔ یہ وزارت سے علیحدگی اور وابستگی کا معاملہ نہیں عشق و عاشقی کا قصہ ہے۔ اہلِ محبت پر ایسے معاملات اکثر گذر جاتے ہیں ؎

ہزار بار قسم خوردہ ام کہ نامِ ترا
بلب نیاوردم اما قسم بہ نامِ تو بود

عوام کو تعجب ہے کہ دولتانہ صاحب کیوں گئے اور کیوں آئے، اس لئے وہ حیران ہو ہو کے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ انھیں پھر وزارت قبول کر لینا تھا تو اس سے الگ ہی کیوں ہوئے تھے، آخر یہ جانا اور آنا اور یہ روٹھنا اور مَن جانا کیا ہے ؎

جاتے ہیں رُلانے کو آتے ہیں ہنسانے کو
اِس جانے کو کیا کہئے، اس آنے کو کیا کہئے

لیکن یہ معاملات عام لوگوں کے دائرۂ فہم سے باہر ہیں ؎

عاشق نہ شدی محنتِ اُلفت نہ کشیدی
کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

ہمیں معلوم ہے کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ وزارت قبول کرتے وقت کیا کہیں گے۔ یہی کہ میرا جی تو اب یہی چاہتا تھا کہ باقی عمر یادِ الٰہی میں گزار دوں لیکن ہماری قوم ایسے نازک دور سے گزر رہی ہے کہ اس موقع پر ذمہ داریوں سے الگ رہنا اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب اکثر احباب خصوصاً بعض بزرگوں نے مجھ سے بار بار کہا اور خان ممدوٹ نے بھی جو میرے پرانے رفیق ہیں۔ سخت اصرار کیا تو میں مجبور ہو گیا۔ بہرحال ع

معذور ہوں کہ خود نہیں توبہ شکن ہوا

وزیر جائیں یا آئیں، روٹھیں یا منیں، لڑیں یا صلح کریں، ہماری قوم کی گردن ہر موقع پر بارِ احسان سے جھک جاتی ہے۔ دولتانہ صاحب وزارت سے الگ ہوئے تھے تو انہوں نے قوم کی گردن پر احسان کا بارِ گراں رکھ دیا تھا۔ اب واپس تشریف لا رہے ہیں تو پوری قوم کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ ع

ایں چہ احسان است قربانت شوم

لیکن میاں محمد ممتاز دولتانہ گئے تھے تو ان کے ساتھ سردار شوکت حیات بھی تھے۔ سردار صاحب کو تو انہوں نے "متاعِ گرانمایہ" سمجھ کے نیشنل بنک میں رکھوا دیا جہاں وہ ہر حیثیت سے محفوظ ہیں۔ اور خود اکیلے چلے آئے۔ مروّت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ آئے تھے تو انہیں بھی ساتھ لاتے اور ہمارے سر پر احسان کا چھپر رکھ دیتے۔ یقین کیجئے کہ قوم اس "حادثہ" کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیتی، کیونکہ ہم پر اس قسم کے بہت سے سانحے گزر چکے ہیں۔

---

۳۰ اکتوبر

سنا ہے۔ کراچی کے پانچ اخبار پنجے جھاڑ کر پیر الٰہی بخش کے پیچھے پڑ گئے ہیں لیکن پیر صاحب کوئی پیر مانکی شریف تو نہیں کہ اخباروں کے اعتراضات سنتیں اور کچھ نہ کہیں۔ وہ وزیروں کے

پیر ہیں اور تعویذ گنڈے سے زیادہ پولیس کے ڈنڈے پر اعتماد رکھتے ہیں۔ انہوں نے اگر کہدیا کہ یہ پانچوں پانچویں کالم سے تعلق رکھتے ہیں تو بتائیے "ڈان" یا "سندھ آبزرور"، "انجام" یا "جنگ" کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

پیر الٰہی بخش کے نزدیک سندھ سے مغربی پنجاب اور مغربی پنجاب سے صوبہ سرحد اچھا۔ جہاں کے اخباروں میں وزارت کے خلاف ایکا کرنے کی ہمت ہی نہیں۔ اگر کبھی کوئی اخبار وزارت پر اعتراض کر بیٹھے تو انگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں۔ وزرا کے اہالی موالی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ارے بھئی! یہ کوئی نکتہ چینی کا موقع ہے۔ یہ اخبار والے دیکھتے نہیں پاکستان پر کیسا نازک وقت ہے۔ اُدھر کشمیر کے مسئلے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا، ادھر انڈین یونین سے تلخی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وزارت تو خیر بڑی چیز ہے، آج کل تو کسی سرکاری افسر کے خلاف بھی زبانِ اعتراض نہیں کھولنی چاہئے۔

سندھ اور مغربی پنجاب میں سچ مچ بڑا فرق ہے۔ یہاں جسے دیکھو خلق کا داروغہ بنا ہوا ہے۔ بات نہیں کرنے دیتا۔ الاٹمنٹ کا نام نہ لیجئے۔ اقربا پروری کا ذکر نہ کیجئے، لوگ فاقے کر رہے ہیں تو کرنے دیجئے، یہ کوئی اس قسم کی باتوں کا وقت ہے"۔ اور سندھ میں پانچ اخبار مل کے وزیرِ اعظم پر لے دے کر رہے ہیں اور اُن سے کوئی نہیں کہتا کہ یہ کوئی نکتہ چینی کا وقت ہے؟ پیر الٰہی بخش جیسے بھی ہیں، آخر ہمارے وزیر ہی نہیں پیر بھی ہیں۔ ہم اُن کے خلاف کوئی بات کیسے سُنیں؟

۳۱ر اکتوبر

توسیع وزارت کے سلسلے میں تازہ خبر یہ ہے کہ دولتانہ صاحب اکیلے وزارت میں شامل نہیں ہوں گے بلکہ اپنے ساتھ نون صاحب کو بھی لائیں گے۔ دراصل دولتانہ کے نام ہی میں "نون" موجود ہے۔ نون نہ ہو تو نرے "دولتاہ" رہ جائیں۔ سردار شوکت حیات سوچتے ہوں گے کہ کہیں یہ

استعفا کا سوانگ صرف مجھے وزارت سے نکالنے کو تو نہیں رچایا گیا تھا۔

اور سردار شوکت حیات خاں صاف صاف یہ بات کہہ بھی دیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ آخر وہی خان ممدوٹ ہیں۔ وہی میاں محمد ممتاز دولتانہ یعنی بس کچھ اس قسم کا معاملہ ہے کہ ؎

پھر وہی ہیں وہی نظر ان کی
دین و دل کی یاریاں نہ گئیں

صرف بیچارے سردار شوکت حیات خاں ہی نہیں۔ بچارے سردار صاحب سپاہی ہیں، پہلوان نہیں۔ اس لئے وہ ان پہلوان لوگوں کی ملی بھگت کو کیا جانیں۔ یہ لوگ "مل" کے بھی کشتی لڑ لیتے ہیں۔

پہلے چار وزیر تھے۔ دو نکال دیئے گئے باقی رہ گئے دو۔ تین جمع کئے گئے ہوگئے پانچ۔ اب ان پانچ میں دو اور جمع ہوں گے تو سات ہو جائیں گے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کو ریاضی نہیں آتی۔ کم از کم جمع اور تفریق کے قاعدے تو ضرور آتے ہیں۔ بلکہ ہم لوگ ضرب اور تقسیم کے قاعدوں سے کام بھی جانتے ہیں۔ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خان ممدوٹ ایک اور قدم بڑھائیں اور سات میں ایک کا اضافہ کر دیں۔ ورنہ ان کے دامن پر ہمیشہ کے لئے یہ دھبہ رہ جائے گا کہ صرف سردار شوکت حیات کو وزارت سے بے دخل کرنے کے لئے سارا بکھیڑا کیا گیا۔ وزیر سات ہو سکتے ہیں تو آٹھ بھی ہو سکتے ہیں۔ چھاچھ کا کیا ہے پانی کا ایک گلاس اور ڈال دیجئے جب بھی چھاچھ ہی رہے گی۔

جب خان ممدوٹ اور ان کے رفیقوں میں جھگڑا شروع ہوا تھا تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ بحث "حصولی" نہیں "اصولی" ہے۔ نہ ہماری سمجھ میں اس وقت آیا تھا کہ وہ اصول کیا تھا جس کی بنا پر "فراق" تک نوبت پہنچی اور نہ اب سمجھ میں آئے گا کہ وہ "اصول" کیا ہے جس نے ان لوگوں کو متحد کر دیا ہے۔ لیکن "فقدان اصول" بھی تو بجائے خود ایک بہت بڑا "اصول" ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ لیا جائے تو ساری کنج کاویاں بے سود معلوم ہوتی ہیں۔

یکم نومبر

کشمیر میں بعض دفعہ کسی چھوٹے موٹے واقعہ پر کسی شخص کا نام پڑ جاتا ہے اور پھر سارے خاندان کے لوگ اسی نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کی ملاقات ایک کشمیری پنڈت سے ہوئی جو کھڈو کہلاتے تھے، میں نے پوچھا۔ کھڈو کوئی گوت ہے؟ کہنے لگے، گوت تو نہیں میرا خاندانی نام ہے اور مجھے خود کھڈو کہلاتے شرم آتی ہے۔ لیکن اس نام سے مخلصی پانے کی کوشش اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں لوگ کوئی اس سے بھی زیادہ ذلیل نام نہ رکھ دیں۔

میں نے کہا، یہ کیسے ممکن ہے؟ کہنے لگے آپ نہیں جانتے۔ میرے والد دو مرتبہ اس قسم کی کوشش کر چکے ہیں اور در اصل یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ یہ نام ہمارے پلّے پڑا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مکان کے صحن میں ایک اونچا درخت تھا۔ کشمیر میں کل درخت کو کہتے ہیں۔ اس لئے لوگ ہمیں "کلو" یعنی درخت والے کہنے لگے۔ والد کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ انہوں نے درخت کٹوا دیا۔ لیکن اس کی جڑ باقی رہ گئی تھی۔ لوگوں نے جڑ کی نسبت سے ہمارا نام "مڈھو" رکھ دیا۔ والد نے یہ جڑ اکھڑوا دی۔ لیکن اس کے اکھڑنے سے گڑھا پڑ گیا اور ہم کھڈو کہلانے لگے۔

میں نے کہا۔ آپ نے گڑھے کو بھروا دیا ہوتا۔ کہنے لگے۔ اس ڈر سے نہیں بھروایا کہ لوگ کہیں "کھڈو" سے بھی زیادہ گھٹیا نام نہ رکھ دیں۔ آپ نے غور نہیں کیا "کھڈو" سے "مڈھو" اچھا تھا۔ اور "مڈھو" سے "کلو" بہتر تھا۔ یعنی آج تک ہم نے اپنے خاندانی لقب سے پیچھا چھڑانے کی جتنی کوششیں کی ہیں، ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ اب گڑھے کو بھروا دیا جائے تو نہ معلوم اور کیسی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ جن دنوں مسٹر آصف علی نے مس آرونا گنگولی سے شادی کی اور اخباروں میں اس واقعہ کا بہت چرچا ہوا، ایک کشمیری بزرگوار کہنے لگے: "ہائے افسوس

مسٹر آصف علی کشمیر میں نہ ہوئے۔" میں نے پوچھا "کشمیر میں ہوتے تو کیا ہو جاتا؟" کہنے لگے "ہوتا کیا۔ مس گنگولی کی نسبت سے لوگ ان کا نام گونگلو رکھ دیتے اور صدیوں تک اس نام سے ان کے پورے خاندان کا پیچھا نہ چھوٹتا۔

یہ رسم پنجاب اور دہلی میں بھی ہے لیکن بہت کم۔ مثلاً لاہور کے تاجروں کا ایک خاندان جو آسٹریلیا میں تجارت کرتا رہا ہے۔ آسٹریلیا والے کہلاتا ہے۔ دلی کے کچھ سوداگر جن کی تجارت جاپان سے رہی ہے۔ جاپان والے مشہور ہیں۔ لاہور کے بعض خاندان تو اس سے معمولی نسبتوں کی بنا پر مختلف ناموں سے مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً ماہل واہڈا۔ کاہڈا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کشمیری ناموں میں جو اختصار ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔

کشمیریوں کے ان ناموں کے آخر میں عام طور پر واؤ معروف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس قاعدے سے انحراف بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً کشمیر کے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے سری نگر میں گاندھی ٹوپی کو رواج دیا، اس لیے وہ اب غلام محمد گاندھی کہلاتے ہیں۔ حالانکہ قاعدے کے رو سے ان کا نام "گاندھو" ہونا چاہیے تھا۔ اس سے اور کوئی فائدہ نہ ہوتا، کم از کم وہ "نہرو" کے ہم قافیہ تو ہو جاتے اور آپ جانتے ہیں ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

لطف یہ ہے کہ کشمیر میں تو بخشی غلام محمد گاندھی کہلاتے ہیں اور وہ بھی صرف گاندھی ٹوپی پہننے کی وجہ سے اور کشمیر کے باہر شیخ محمد عبداللہ مدت تک "کشمیر کا گاندھی" کے لقب سے مشہور رہے ہیں لیکن اب انہیں کشمیر کا گاندھی کوئی بھی نہیں کہتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی کبھی ریاست کے وزیر اعظم نہیں رہے۔

۲ر نومبر

ہمارے وزرائے کرام کے دوروں کا پروگرام بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ میجر مبارک علی شاہ

چاہے راولپنڈی جائیں یا ملتان کا قصد کریں۔ جھنگ اور شاہ جیونا کی منزلیں اس سفر میں ضرور آتی ہیں دستی صاحب لائل پور بھی تشریف لے جاتے ہیں تو مظفر گڑھ سے انہیں ضرور گزرنا پڑتا ہے معلوم نہیں، شیخ کرامت علی کے دورہ میں نارووال کی منزلِ سفر کبھی آئی ہے یا نہیں۔

وزرا کو یہ دورے ضرور کرنے چاہئیں۔ کیونکہ ان کے بغیر کوئی چارہ نہیں لیکن لاہور کی مسجدوں سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ وزارت کے عہدے پر فائز ہوتے وقت انہوں نے جس ذوق و شوق سے لاہور کی مسجدوں میں جا جا کے نمازیں پڑھنی شروع کی تھیں۔ اب اُن میں وہ ذوق و شوق نظر نہیں آتا اور نواب سردار شوکت حیات بھی جب سے وزارت سے الگ ہو کے نیشنل بنک میں ملازم ہو گئے ہیں، لوگوں نے انہیں مسجد میں بہت کم دیکھا ہے۔

ہمارے دوست مولانا مرتضیٰ احمد خاں صاحب میکش نے امتناعِ شراب سے بہت پہلے اپنے نام کے ساتھ میکش لکھنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن آثر صہبائی صاحب اب بھی اپنے نام کے ساتھ صہبائی ضرور لکھتے ہیں۔ تعجب ہے حکومت نے صہبائی صاحب جیسے "اقراری مجرموں" کی جانب اب تک کیوں توجہ نہیں کی؟

فارسی اور اردو شعرا کا کلام شراب کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔ حافظ و خیام تو اس معاملہ میں سب سے آگے نظر آتے ہیں لیکن دوسرے شاعروں کے ہاں بھی شراب کا ذکر جا بجا موجود ہے۔ تعجب ہے کہ امتناعِ شراب کے بعد بھی ان لوگوں کا کلام کتاب فروشوں کی دکانوں پر بکتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے اور بڑے بڑے سپید ریش بزرگ طلبہ کو رحیق ارغوانی رطل گراں ساتگیں اور پیر مغاں وغیرہ کے معنی سمجھانے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی تمام کتابیں ضبط کر لی جائیں اور ان کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دیا جائے اور شاعروں کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ کوئی اس قسم کا شعر نہ کہیں جس میں شراب یا شراب کے تعلقات کا ذکر آئے۔

فارسی اور اُردو کے شعراء کے کلام میں شراب پینے کی نہایت خطرناک ترغیب موجود ہے اور بعض اشعار تو اس قسم کے ہیں جو سیفٹی ایکٹ کی زد میں آ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

نہ کُنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل

یہ شعر مغربی پنجاب کی حکومت کی پالیسی پر بڑی خطرناک تنقید ہے۔ کیونکہ حکومت نے شراب کو صرف مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہے۔ غیر مسلموں کو پینے پلانے کی عام اجازت دے رکھی ہے۔

اور سنئے ؎

بہ رمز نکتہ ادا می کُنم کہ خلوتیاں
سرِ سبو بکشادند و درِ فرو بستند

اس شعر میں چھپ چھپ کے پینے کی ترغیب موجود ہے۔ معلوم نہیں آج کتنے لوگ اس شعر پر عمل کر رہے ہیں یعنی سرِ شام دروازے بند کر کے پینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ شعر کتنا خطرناک ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ ساغرِ رطلِ گراں بگردانیم

شراب کی اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوگی کہ اس کے ایک ساغر سے تقدیر پلٹی جا سکتی ہے اور مُلّا شیدا تو حد سے بڑھ گیا۔ یعنی جوش میں آ کے کہہ دیا کہ ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے
حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے شیدا کو اس شعر کی بنا پر دِلّی سے نکال دیا تھا۔ لیکن جن تذکروں میں یہ شعر موجود ہے۔ انہیں کوئی نذرِ آتش نہیں کرتا۔

فیضی، نظیری، عرفی وغیرہ نے جا بجا اس قسم کی گستاخیاں کی ہیں۔ مثلاً فیضی کہتا ہے ؎

یارب زسیلِ میکدہ طوفاں رسیدہ باد بُت خانہ ایکہ خانقہش نام کردہ اند

آج یہ شعر پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا روئے سخن وزارت کی خانقاہ کی جانب ہے۔ جہاں سے شراب کی ممانعت کا فتوے اجاری ہوا ہے۔ دیکھیں حکومت اس سلسلے میں کیا قدم اٹھاتی ہے اور لوگوں کو مے کشی کی اس خطرناک ترغیب سے بچانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتی ہے۔

۳ر نومبر

کل کے "امروز" میں امتناع شراب کا ذکر آیا۔ ایک صاحب نے جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے امتناع شراب کی دو تاریخیں لکھ کے بھیجی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

مے نہیں مینا نہیں ساغر نہیں ساقی نہیں
اُٹھ گیا پیرِ مغاں اور مغبچے باقی نہیں
دخترِ رز کے ہجر میں جو رند ہے بے حال ہے
ہم نشیں "خم خانے خالی آہ" اس کا سال ہے
۱۹۴۸ء

مادۂ تاریخ بہت اچھا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جس پائے کا مادۂ تاریخ ہے۔ اس پائے کے مصرعے نہیں لگ سکے۔

شاعر نے امتناعِ شراب کی ہجری تاریخ "ہائے ساغر واژگوں" سے نکالی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

امتناعِ خوردنِ مے چوں شنید
گفت رندے "ہائے ساغر واژگوں"
۱۳۶۷ھ

تاریخ گوئی کا فن قریب اُٹھ گیا۔ ہمارے زمانے کے شاعروں میں جنابِ حفیظ ہوشیارپوری اور ان کے بڑے بھائی جناب راحل ہوشیارپوری اس فن سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ راحل صاحب کو تو خصوصیت سے تاریخ گوئی میں بڑی مہارت ہے۔ پانچ دس منٹ میں اچھی خاصی تاریخ نکال لیتے ہیں۔ اس فن میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن کی مدد سے تاریخ گوئی بہت

آسان ہو جاتی ہے۔

ایک زمانے میں شعراء کو اس فن میں بڑی مہارت تھی۔ قصیدوں کے قصیدے لکھتے چلے جاتے تھے اور اُن میں یہ التزام کرتے تھے کہ ایک مصرع سے کسی خاص واقعہ کی ہجری تاریخ نکلتی ہے اور دوسرے سے عیسوی۔ لیکن ان قصیدوں میں اچھے شعر بہت کم ہوتے تھے۔ منتخب التواریخ کے مصنف ملّا عبدالقادر بدایونی، تاریخ گوئی کے بڑے ماہر تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ انھوں نے معمولی معمولی واقعات کے متعلق تاریخیں کہی ہیں۔ مثلاً شادی کی تو اس موقع پر ذیل کا قطعۂ تاریخ لکھا ؎

چوں مرا از عنایت ازلی — از دو ابجے بہ ماہ چہرے شد
عقل تاریخ کد خدائی را — گفت "ماہے قرین مہرے شد"

تاریخ میں تعلّی اور خود ستائی کا پہلو بھی موجود ہے۔ یعنی دلھن کے حُسن و جمال کی تعریف کے ساتھ اپنے حُسن کی تعریف بھی کر گئے ہیں۔ مادۂ تاریخ کیا ہے۔ فارسی میں "چاند سورج کی جوڑی بھی خوب" کا آزاد ترجمہ ہے۔

---

۴ ر نومبر

ہمارے ایک معاصر نے بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر سیتا رامیہ اردو ادب کا شستہ مذاق رکھتے ہیں اور بڑی روانی کے ساتھ فارسی آمیز اُردو بولتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے معاصر موصوف کو ڈاکٹر سیتا رامیہ پر ڈاکٹر تارا چند یا بابو سندر لال کا دھوکا ہوا ہے اور کیا عجب ہے کہ ہمارے معاصر نے ڈاکٹر سیتا رامیہ کو منشی پریم چند سمجھ لیا ہو۔

بہر حال اس موقع پر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو صاحب کانگرس کے صدر چنے

گئے ہیں، وہ نہ تو منشی پریم چند ہیں، نہ ڈاکٹر تاراچند یا بابو سندر لال بلکہ ان کا نام ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ ہے۔ اندھرا ان کا وطن ہے۔ تامل اور تلگو دونوں زبانیں بول لیتے ہیں۔ گاندھی جی کے فیض صحبت سے انہیں ایک اور زبان بھی تھوڑی بہت آگئی ہے۔ جسے بعض لوگ ہندی اور بعض ہندوستانی کہتے ہیں۔ اسے اردو بھی کہہ لیجئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ کہنا تو غلط ہے کہ ڈاکٹر سیتا رامیہ اردو ادب کا شستہ مذاق رکھتے ہیں اور بڑی روانی کے ساتھ فارسی آمیز اردو بولتے ہیں۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ بابو پرشوتم لال ٹنڈن ڈاکٹر سیتا رامیہ پر فوقیت رکھتے ہیں یعنی بہت اچھی اردو جانتے ہیں اور چاہیں تو فارسی آمیز اردو بھی بول سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آج کل ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ فارسی کا کوئی لفظ ان کی زبان پر نہ آنے پائے۔

صرف ٹنڈن جی کا یہ حال نہیں۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو اردو فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں لیکن اردو کی مخالفت میں ہمیشہ آگے نظر آتے ہیں۔ راجہ نریندر ناتھ تو ہندو سبھائیوں کے لیڈر اور ہندی کے بڑے حامی تھے۔ لیکن بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ فارسی کے اشعار انہیں کثرت سے یاد تھے۔ پنڈت مالویہ کا بھی یہی حال تھا۔ اُن کے خاندان کے ایک شخص پنڈت کرشنا کانت مالویہ تو اردو میں اچھے خاصے شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔

ہم نے ایک پچھلی اشاعت میں فارسی کے بعض ایسے اشعار نقل کئے تھے جن میں شراب کی تعریف کی گئی ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری صاحب نے ان میں سے بعض اشعار میں کسی قدر تصرف کر کے امتناعِ شراب کی تاریخیں نکالی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

بہرِ ما پسرے از ہندسہ اے ساقی
محتسب تا نہ کند اہلِ طرب را تذلیل
تو دریں دور غنیمت بشمار اے ساقی
"او بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل"

۱۳   ۵   ۶۷

"بہ رمز نکتہ ادا مے کنم کہ خلوتیاں"
ز جورِ محتسب و خوفِ ماؤ تو رستند
بہ محتسب نرسانید ایں خبر" دی روز
سرِ سبو بکشادند و در فرو بستند
۱۹۴۸ء

قضا بہ گردشِ رطل گراں بگردانیم
چہ خوب غالب صہباکش و سخنور گفت
شنید چوں خبر امتناع صہبا" آہ
"قضا بہ گردشِ رطلِ گراں" ز کوثر گفت
۱۹۴۷ء

ہم تو پرانے شاعروں کو روتے تھے اور یہاں آج کل کے شاعروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی غزلوں میں شراب و ساقی کا ذکر کرتے ہیں، حافظ اور غالب کے مصرعوں میں تصرف کر کے امتناعِ شراب کی تاریخیں نکالتے ہیں، لیکن انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں ہمیں تو یقین ہے کہ جب تک اس قسم کے شاعر موجود ہیں۔ لوگ چھُپ چھُپ کے شراب ضرور پیتے رہیں گے اور امتناعِ شراب کی ساری کوششیں بے سُود ثابت ہوں گی۔ اصل میں یہ شاعر لوگ آبکاری کے "محکمہ تعلقاتِ عامہ" کے کارکن ہیں جب تک تعلقاتِ عامہ کا یہ محکمہ قائم رہے گا، شراب کی حکمرانی بھی قائم رہے گی۔

یہ جو لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ شعرا کی شراب دراصل شرابِ معرفت ہے: بالکل غلط ہے۔ وہ دراصل یہی شراب ہے جو کشید ہو کے بوتل میں بند ہوتی ہے اور بازاروں میں بکتی ہے۔ اُسی کے متعلق غالب نے کہا ہے کہ ع

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شُدہ است

اور مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر بھی اسی کے حق میں ہے ؎

دخترِ رز گرچہ پہلے بھی غضب کی تھی شریر
پڑ کے بھولا رام کے گھر اور نٹ کھٹ ہو گئی

۷ر نومبر

کسی شخص نے فارسی زبان کے مشہور شاعر مرزا صائب کا یہ شعر کسی مُلّا ئے مکتبی کے سامنے پڑھا:

سرو من طرحِ نو انداختہ یعنی چہ
جامہ را فاختہ ساختہ یعنی چہ

مولوی صاحب نے کہا ردیف غلط ہے "یعنی چہ" غائب کے لئے تو آسکتا ہے، مخاطب کے لئے نہیں آسکتا۔ مرزا کے سامنے کسی نے اس اعتراض کا ذکر کیا۔ اس نے کہا "شعرِ مرا بہ مدرسہ کہ بُرد؟"

معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے فرقہ وارکشیدگی کو دُور کرنے کے لئے اپنے ملک کی یونیورسٹیوں سے رجوع کیا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی، تاریخ داں، اقتصادیات اور نفسیات کے ماہر اس بات پر غور کریں گے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان جو کشیدگی پائی جاتی ہے اس کے اسباب کیا ہیں اور اسے کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟

مرزا صائب کو اس بات پر اعتراض تھا کہ شعر کو اہلِ مدرسہ سے کیا تعلق ہے، خیر شعر کو مدرسہ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے، لیکن فرقہ وار کشیدگی کو مدرسہ سے کیا واسطہ ہے، یہ اور بات ہے کہ اہلِ مدرسہ نے فرقہ وار کشیدگی کو تقویت دینے میں ضرور حصّہ لیا ہے۔ آخر ماسٹر تارا سنگھ بھی تو مدرسہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں یعنی مدّتوں لڑکے پڑھاتے رہے ہیں۔

دراصل مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں فرقہ وارکشیدگی کے بہت بڑے مرکز ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان حکمرانوں کی لڑائیوں کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ لڑائیاں مذہب کی خاطر لڑی گئی تھیں۔ زبان کے معاملہ میں بھی ہندو اور مسلمان طلبہ پہلے الگ نہیں تھے تو اب ضرور الگ ہو گئے ہیں۔ یعنی اردو صرف مسلمان طلبہ پڑھتے ہیں۔ ہندو صرف ہندی پڑھتے ہیں اور مسلمان طلبہ سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ اردو چھوڑ کے ہندی پڑھنا شروع کر دیں اور اس طرح پکے ہندوستانی بن جائیں۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ فرقہ وارکشیدگی کا علاج کالجوں اور یونیورسٹی والوں سے نہیں ہو سکے گا۔ کوئی تاریخ دان بڑا کمال کرے گا تو ہندو مسلمانوں کے پرانے جھگڑوں کی تاریخ مرتب کر کے رکھ دے گا۔ لسانیات کا ماہر کہے گا کہ اصل مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمان اردو بولتے ہیں۔ اردو لکھتے ہیں جب تک یہ لوگ اپنی زبان ترک نہیں کرتے، یہ جھگڑے یونہی ہوتے رہیں گے، باقی رہا ماہرِ اقتصادیات تو اس نے اگر کوئی کام کی بات کہہ دی تو اِس نقار خانے میں اس کی آواز کون سنتا ہے؟

اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جب تک مسٹر پٹیل تقریریں کرتے رہیں گے، ماسٹر تارا سنگھ کو اس بات کی کھلی اجازت ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جب چاہیں کہیں، فرقہ وارکشیدگی دور نہیں ہو گی جتنی کوشش چاہیے کر لیجیے۔ مسٹر پٹیل اور ماسٹر تارا سنگھ سلامت ہیں تو دو فقرے کہہ کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیں گے۔

۸ر نومبر

تین چار مہینے ہوئے راقم الحروف کو ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ مشاعرے میں زیادہ تر انہیں لوگوں کو داد ملی جنھوں نے اپنی غزلیں اور نظمیں گا کے پڑھی تھیں جو لوگ بے سُرے

تھے۔ انھیں لوگوں نے شور مچا کے بٹھا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ایسے شعرا کی نظمیں بھی کامیاب ہوئیں جنہوں نے اپنا کلام تحت اللفظ پڑھ کے سنایا تھا۔ لیکن یہ لوگ بڑے مشہور شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ورنہ کوئی ایسا ویسا شاعر اس انداز سے شعر سناتا تو "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ" کا شور مچ جاتا۔

ترنّم سے شعر سنانے کا رواج پرانے زمانے میں بھی تھا لیکن آہستہ آہستہ مٹ گیا۔ اردو شعرا زیادہ تر اپنا کلام تحت اللفظ ہی پڑھ کے سناتے رہے ہیں۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ مولانا شبلی نے بعض محفلوں میں اپنا کلام ترنّم سے پڑھ کے بھی سنایا ہے۔ علاّمہ اقبال بھی انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ترنّم سے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ دہلی کے شعرا میں نواب سائل ترنم سے پڑھتے تھے لیکن اس زمانے میں ترنّم کا کچھ ایسا رواج نہیں تھا کہ جو شاعر گانہ سکے اسے شور مچا کے بٹھا دیا جائے اور وہ بچارا "بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں" کہہ کے بیٹھ جائے اور اب تو ہمارے شاعروں میں اللہ کے فضل سے بڑے بڑے تان رس خان اور تان توڑ خاں موجود ہیں جو شعر پڑھنا شروع کرتے ہیں تو میاں تان سین کی روح کو وجد میں لے آتے ہیں۔

ایک دفعہ تو ایک صاحب نے کمال کر دیا یعنی اس شان سے شعر پڑھنے تشریف لائے کہ آگے آگے ہارمونیم لئے خود ہیں اور پیچھے پیچھے کرائے کا طبلچی بھی موجود ہے۔ اُدھر انہوں نے ہارمونیم کے ساتھ غزل چھیڑی۔ اِدھر طبلے پر تھاپ پڑنے لگی لیکن لوگوں کی بدمذاقی اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ ہارمونیم اور طبلے کو گوارا کر لیتے۔ اس لئے اس طریقے نے زیادہ رواج نہ پایا۔

بعض لوگوں نے تحت اللفظ خوانی میں بھی نئے نئے راستے نکالے ہیں۔ ایک صاحب اس زور شور سے کلام پڑھ کے سناتے ہیں، گویا میدانِ جنگ میں حریفوں سے گھرے ہوئے کھڑے ہیں۔ وہ کلام پڑھنا شروع کرتے تھے تو لوگ اپنی اپنی جگہ سے سرک جاتے تھے۔ بعض لوگ تو ان کے پاس بیٹھنے سے ڈرتے تھے کہ خدا جانے کیا آفت آجائے۔ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل

پڑھ رہے تھے۔ یکایک لوگوں نے دیکھا کہ شاعر کا مُنہ اور اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی ہل رہے ہیں اور ابرو پر بھی بل پڑے ہوئے ہیں لیکن آواز نہیں نکلتی۔ بات یہ تھی کہ شاعر صاحب کے دانت مصنوعی تھے۔ جوشِ سخن میں وہ مُنہ سے نکل کے باہر گر پڑے اور شاعر کو خبر تک نہ ہوئی۔

ایک اور صاحب رو کے اپنا کلام سناتے تھے۔ کلام تو واجبی ہوتا تھا؛ لیکن وہ عام طور پر اس حربے کی بدولت محفلِ مشاعرہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ روتے تھے اور لوگ ہنستے تھے۔ شعر کی داد کوئی بھی نہیں دیتا تھا۔ البتہ اُن کے رونے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ لوگ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

جن شاعروں کو یہ خیال ہے کہ اگر انھیں ترنّم سے پڑھنا آتا تو وہ مشاعروں میں لوگوں کو ضرور اپنی جانب متوجہ کر لیا کرتے اور انھیں ہر بار "بیٹھ جاؤ اور نہیں سنتے" کی قسم کے فقرے نہ سننے پڑتے، انھیں چاہیئے کہ اس قسم کا کوئی طریقہ آزما کے دیکھیں کہ ان کی مشکل آسان ہو جائے اور لوگ ان کا کلام توجہ سے سُنا کریں۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھیئے کہ گانا مشکل ہے اور رونا آسان ہے۔ یوں تو کہنے کو لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ لیکن اکثر لوگوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا اور گانا نہ آیا۔ رو کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تال سُر کے ساتھ رونا اور اس طرح کہ دیکھنے والے رونے کے بجائے ہنس پڑیں؛ اچھا خاصا مشکل کام ہے۔

۱۳ر نومبر

پیرس کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر کو ڈیوٹی کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انتخاب کے نتیجہ کی خبر آنے سے پہلے ہی اس نے اپنے اخبار میں ڈیوٹی صاحب کی کامیابی کی خبر شائع کر دی۔ جب

انتخاب کا نتیجہ معلوم ہوا تو بیچارہ سر پیٹ کے رہ گیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اخبار چھپ کے بازار میں پہنچ چکا تھا اور لوگ ایڈیٹر صاحب کی وسعتِ معلومات کی داد دے رہے تھے۔

ہمارے ملک میں بعض لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ بہت مدت ہوئی ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے ایک جلسہ کی کارروائی جلسہ ہونے سے پہلے ہی اپنے اخبار میں چھاپ دی۔ جلسہ شام کو تھا۔ اخبار صبح کو چھپ گیا۔ جلسہ بیگم صاحبہ بھوپال کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ لیکن عین وقت پہ ان کی طبیعت ناساز ہو گئی اور منتظمین کو جلسہ ملتوی کر دینا پڑا۔ بہرحال اخبار میں روئداد موجود تھی۔ اور جلسہ ہوتا بھی تو اس کی کارروائی قریب قریب وہی ہوتی جو اخبار میں چھپ چکی تھی۔

جن دنوں افغانستان میں شورش ہوئی اور امان اللہ خاں کو کابل سے بھاگ کے قندھار چلا جانا پڑا۔ جنرل نادر خاں جو آگے چل کر اعلیٰحضرت نادر شاہ فرمانروائے افغانستان کہلائے، پیرس میں تھے اور لاہور میں ان کے متعلق طرح طرح کی خبریں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک اخبار نے اس موقع پہ یہ شوشہ چھوڑا کہ جنرل نادر خاں پیرس سے قندھار پہنچ گئے ہیں۔ خبر کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی، جس میں ایک شخص جو موصوف سے کسی قدر مشابہ معلوم ہوتا تھا، ہوائی جہاز سے اترتا دکھایا گیا تھا۔

شام کو دہلی دروازے کے باہر عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے بڑے زور کی تقریر کی اور اس خبر کی بنا پہ کہہ دیا کہ اب فکر نہ کیجیے۔ جنرل نادر خاں قندھار پہنچ گئے ہیں۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں کی نظم "قندھار چلو قندھار چلو" بچے بچے کی زبان پہ تھی۔ "اللہ اکبر اور زندہ باد" کے نعروں کے ساتھ "قندھار چلو قندھار چلو" کی صدا کچھ اس طرح بلند ہوئی کہ سارا دلی دروازہ گونج اٹھا۔

واضح رہے جنرل نادر خاں اس واقعہ سے کئی مہینے کے بعد یورپ سے آئے لیکن قندھار نہیں گئے۔ حالانکہ تصویر میں انہیں قندھار کے ہوائی اڈے پر اترتے دکھایا گیا تھا۔

بہرحال پیرس کے اس اخبار نویس کی اس حرکت سے اتنا فائدہ ہوا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان

کے اخباروں کے لئے سند مہیا ہو گئی ہے۔ اخبار نویسی یورپ سے ہمارے ملک میں آئی ہے۔ یورپ کے اخبار اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو ہمارے ملک کے اخباروں کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھنا چاہیئے۔

ایک خبر رساں ایجنسی کا بیان ہے کہ پچھلے دنوں جنوبی افریقہ میں چاول کی کاشت کے متعلق جو تجربے کئے گئے تھے، ان سے معلوم ہوا ہے کہ اس ملک میں بڑے وسیع پیمانے پر چاول کی کاشت ہو سکتی ہے۔ جنوبی افریقہ والے یہ کس بکھیڑے میں پڑ گئے۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ چاول کی کاشت جتنے وسیع پیمانے پر کیجیئے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر ہمارے ملک میں بھی تو کثرت سے چاول پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن پیدا ہوتے ہی "انتقال" فرما جاتے ہیں۔ کم از کم اچھی قسم کے چاولوں کا تو یہی حال ہے۔ راشن کے ڈپوؤں پر جو چاول ملتا ہے، وہ چاول تھوڑے ہی ہے۔ اُسے کھا کے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جَو اور چاول کے بین بین کوئی تیسری جنس ہے۔ ہم نے چاول کی کاشت سے کیا فائدہ اٹھایا، جو اب جنوبی افریقہ والے کسی فائدے کی توقع کریں۔

پچھلے دنوں لاہور کے راشن ڈپوؤں پر "رنگین" چاول ملتے تھے اور سپید چاول صرف بلیک مارکیٹ یعنی کالی منڈی میں دستیاب ہوتے تھے۔ ان دنوں جو چاول مل رہے ہیں، وہ سندھی ثم لاہوری ہیں۔ رنگت تو اللہ کے فضل سے سپید ہے۔ لیکن ڈیل ڈول کا یہ حال ہے کہ چاول نہیں بلکہ چاولوں کے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ نہ جانے وہ لمبے نکیلے دھان پان سے چاول جو باسمتی کہلاتے تھے، کہاں غائب ہو گئے کہ

اب اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

---

۱۸ نومبر

ڈیڑھ دو مہینے سے وزارت کا جو قضیہ چل رہا تھا، کل اس کا نتیجہ نکل آیا۔ یعنی شیخ کرامت علی

رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ چودھری فضل الٰہی تشریف لے آئے۔ لوگ حیران ہیں کہ آیا یہ بکھیڑا صرف اتنی سی بات کے لئے کیا گیا تھا کہ شیخ صاحب جائیں اور چودھری صاحب تشریف لے آئیں اور پھر یہ بھی تو کوئی نہیں بتاتا کہ وہ گئے تو کیوں گئے اور یہ آئے تو کیوں آئے؟

اور یہ باتیں خان ممدوٹ کے سوا بتائے تو اور کون بتائے؟ اور ان کا یہ حال ہے کہ پہلے بات کو تولتے ہیں اور پھر بولتے ہیں اور کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تولتے ہی رہ جاتے ہیں اور بولنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اب کے وہ بولیں گے تو ضرور۔ کیونکہ میاں محمد ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خاں نون کے بیانات کے بعد چپ رہنے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ فی الحال باتیں کانٹے پہ تل رہی ہیں۔ دلائل کا وزن ہو رہا ہے۔ کل تک تولنے کا تصفیہ ختم ہو چکے گا اور بولنے کا مرحلہ آجائے گا۔

وزارت شکنی اور وزارت سازی دونوں اعلیٰ درجے کے ہنر ہیں اور خان ممدوٹ نے ان میں اچھا خاصا کمال پیدا کر رکھا ہے۔ وہ ریت کی دیوار اٹھاتے ہیں اور اس کا انتظار بھی نہیں کرتے کہ ہوا کا کوئی جھونکا اسے گرا دے۔ بلکہ خود ہی اسے گرا دیتے ہیں تا کہ وزارت شکنی کی سعادت کہیں "حوادث" کے حصے میں نہ آجائے۔ ان کی سیاسی زندگی کا زیادہ حصہ تخریب و تعمیر میں گزر گیا ہے۔ یہ شعر شاید شیخ کرامت علی صاحب کا ہے۔ لیکن کسی کا بھی ہو خوب ہے ؎

لکھا زمیں پہ نام مرا اور مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

خان ممدوٹ نے پچھلے سال پہلی دفعہ وزارت قائم کی تو اس میں اُن سمیت چار وزرا شامل تھے ان میں سے دو یعنی میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات مئی کے مہینہ میں مستعفی ہو گئے۔ شیخ کرامت علی رہ گئے۔ انہیں بھی رخصت ہو جانا پڑا۔ اب پرانی وزارت کے ارکان میں صرف خان ممدوٹ رہ گئے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگلی دفعہ وزارت پہ اسی قسم کا کوئی حادثہ گزرا تو

کہیں وہ خود بھی اپنے پرانے رفیقوں سے نہ جا ملیں۔

مغربی پنجاب کی وزارت جس طرح بن بن کے بگڑی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیراعظم کا کام صرف یہ ہے کہ وزارت بنائے اور بگاڑے۔ ریت کی دیوار اٹھائے اور گرائے۔ تنکا تنکا جمع کرکے آشیاں بنائے اور پھر اُسے خود ہی آگ لگائے۔ اس مشغلہ میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے، کہ وقت آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر کسی دوسرے بکھیڑے میں پڑنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ لوگوں میں مفت کی واہ واہ بھی ہو جاتی ہے۔ سب کہتے ہیں، صاحب کس بلا کا پہلوان ہے؟ کیسے کیسے داؤں رواں کر رکھے ہیں جو سامنے آیا آڑنگے پر رکھ کر ایسی پٹخنی بتائی کہ چاروں شانے چت کر دیا۔ ان کھیل تماشوں میں لوگوں کا جی بھی بہلا رہتا ہے۔ کسی کو یاد بھی نہیں آتا کہ ہمیں کچھ اور بھی کرنا ہے۔ پھر کھیل گھنٹے دو گھنٹے کا نہیں بلکہ مہینوں دیکھئے اور بے ٹکٹ دیکھئے۔ آپ دیکھتے دیکھتے تھک جائیے۔ لیکن کھیل دکھانے والے نہیں تھکتے۔ غرض وزارت کی یہ کبڈی ایسی ہے جو مہینوں چلتی ہے اور ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔

اس جھگڑے میں بعض بڑی دلچسپ باتیں ہیں۔ چودھری فضل الٰہی دولتانہ صاحب کے سکتر تھے۔ دولتانہ صاحب نے استعفا دیا تو وہ بھی مستعفی ہو گئے۔ لیکن آج وہ وزارت کے اندر ہیں اور دولتانہ صاحب باہر۔ سکتر وزیر ہے اور وزیر کچھ بھی نہیں۔

۲۰ر نومبر

کچھ عرصہ سے مشاعروں کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً کالج جب سے کھلے ہیں ایک مشاعرہ بھی نہیں ہوا۔ البتہ مناظرے ضرور ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں دیال سنگھ کالج میں دو بڑے زور کے مناظرے یا مباحثے ہوئے تھے۔ ان دنوں ایم۔ اے۔ او کالج میں مباحثے کا انتظام ہو رہا ہے اور امید ہے کہ دوسرے کالج بھی اس معاملہ میں پیچھے نہیں رہیں گے۔

ایک زمانہ تھا کہ ملک بھر میں شعر و شاعری کا زور تھا۔ شاعری کی مانگ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ٹانڈلیانوالہ اور اوکاڑہ منڈی میں بھی کوئی شاعر نظر آجاتا تو یار لوگ اسے گھیر گھار کے "آل انڈیا" قسم کے کسی مشاعرہ میں پہنچا دیتے تھے اور شاعر کو کہیں جانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں مشاعرہ موجود تھا اور تو اور بعض دیہات بھی اس جنس سے خالی نہیں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بعض دیہات میں مشاعرہ "مسائرہ" بن کے رہ گیا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ مشاعرہ غائب ہو گیا اور شاعر کی کھپت کا کوئی انتظام نہ رہا۔ اللہ کے فضل سے شاعر کی تو اب بھی کوئی کمی نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو پٹ سن گندم اور کپاس کے بعد ہمارے ملک کی سب سے بڑی پیداوار شاعر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے نہ دساور میں اس کی مانگ ہے۔ نہ اپنے ملک میں پہلی سی کھپت رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے شاعر غزل کے پلندے اور نظموں کے طومار بغل میں دبائے بیٹھے ہیں لیکن کوئی پوچھتا تک نہیں۔

روئی کی طرح ہمارے ہاں ہر قسم کا شاعر بھی موجود ہے۔ لمبے ریشے والا شاعر بھی۔ چھوٹے ریشے والا بھی اور بالکل بے ریشہ بھی لیکن مصیبت یہ ہے کہ پان کی طرح اس کی مانگ بھی ہندوستان اور پاکستان تک محدود ہے۔ امریکہ۔ برطانیہ۔ ہالینڈ یا فرانس سے یہ توقع نہ رکھئے کہ وہ ہندوستان سے پان اور پاکستان سے شاعر منگوائیں گے۔ ان ملکوں میں نہ پان کھانے کا رواج ہے۔ نہ مشاعرہ کی صنعت موجود ہے۔ پھر پان یا شاعر کوئی منگوائے تو کیوں منگوائے؟

پچھلے دنوں ایک صاحب نے محرم کی دسویں کو مشاعرہ منعقد کر کے شاعروں کی کھپت نکالی تھی اور یہ ترکیب چل جاتی تو اور کچھ نہ سہی سال کے سال محرم کے مہینے میں اس قسم کے پانچ دس ماتمی مشاعرے ہو جایا کرتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کچھ ایسا کامیاب ثابت نہیں ہوا اور مشاعرہ مجالس عزا کی جگہ نہیں لے سکا اور مشاعرہ اس موقع پر سرسبز بھی کیسے ہو سکتا تھا "نالہ پابندِ نَے نہیں ہے"!

مشاعرہ ہمارے ملک کی اہم صنعتوں میں سے ہے۔ حکومت کو اس کی طرف ضرور توجہ کرنی چاہئے۔ اس موقع پر تو یہ عذر بھی پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ہاں مشینری موجود نہیں۔ اس لئے

اس صنعت کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ مشاعرے کی صنعت کو مشینری کی بھی حاجت نہیں۔ یہ تو ہماری گھریلو دستکاریوں میں سے ہے۔ "خام جنس" موجود "کاریگر" موجود، پھر دساور نہ سہی ملک کے اندر "مانگ" بھی خاصی ہے، لیکن حکومت اس طرف توجہ ہی نہیں کرتی۔

۲۱ر نومبر

پنڈت جواہر لال نہرو گورو نانک کے یوم پیدائش پر دلی کے ایک گوردوارے میں تشریف لے گئے تھے۔ تقریر کر کے رخصت ہونے لگے تو جوتا غائب، پایا۔ ایک سکھ نے بڑھ کے نیا جوتا پیش کیا۔ لیکن پنڈت جی صاحب کے پکے نکلے یعنی ننگے پاؤں گھر آئے۔

اخباروں کا بیان ہے کہ سکھوں نے خود پنڈت جی کو گوردوارہ میں آ کے تقریر کرنے کی دعوت دی تھی لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ بکھیڑا صرف پنڈت جی کے جوتے چرانے کے لئے کیا گیا تھا۔

حاجی میاں محمد صادق صاحب منجّم و جفّار نے دُم دار ستارہ کے متعلق ایک اعلان چھپنے کو بھیجا ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ دُم دار ستارہ بہت بُری بلا ہے۔ جب کبھی دکھائی دیا ہے، لوگوں پر بڑی آفت آئی ہے۔ اب کے بھی چین، جاپان، جاوا، سماٹرا، ملایا، ہندوستان، کشمیر، جنوبی افریقہ اور شمالی افریقہ کے ایک حصہ، ریاست ہائے بلقان، چلّی، پیرو اور ارجن ٹائن پر اس کا بڑا اثر پڑے گا۔ قحط پھیلے گا، بغاوتیں ہوں گی، کمیونسٹ زور پکڑیں گے، بھونچال آئیں گے، دریاؤں میں طوفان آئے گا۔

لیکن حاجی صاحب کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس قسم کے حوادث کچھ دُم دار ستارہ پر ہی موقوف نہیں یوں بھی بھونچال اور سیلاب آتے رہتے ہیں، قحط پھیلتا ہے، بغاوتیں ہوتی ہیں اور کمیونسٹوں کی تحریکیں برابر ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔ غرض دُم دار ستارے ہی منحوس نہیں بے دُم ستارے بھی بہت منحوس ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں ایک بھی دم دار ستارہ نظر نہیں آیا۔ البتہ بے دُم ستارے سال بھر دکھائی دیتے رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ دوسری جنگِ عظیم بھی اصل میں بے دُم ستاروں کی کارستانی تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۹ء میں بھی کوئی دُم دار ستارہ نظر نہیں آیا۔

اصل میں بچارے دم دار ستارے کو منجم حضرات نے مفت میں بدنام کر رکھا ہے۔ عام طور پر ستاروں کے دُم نہیں ہوتی۔ اس لئے جب کبھی دُم دار ستارہ نظر آجاتا ہے۔ لوگوں میں شور مچ جاتا ہے۔ گدھے کے دُم ہوتی ہے، اس لئے "خرِ بے دم" بہت زیادہ بدنام ہے اور اگلے زمانے کے لوگ بھی تو کہہ گئے ہیں کہ "نکٹوں میں ناک والا نکو"۔

آگے چل کے حاجی صاحب نے لکھا ہے :۔

"دو سال تک جو مسلمان ہفتہ یا اتوار کے دن نکاح کریں گے، ان کے گھروں میں باہمی محبت کم ہو گی بلکہ لڑائی، جھگڑے، فساد اور طلاقیں بہت زیادہ ہوں گی"

اس کے معنی یہ ہیں کہ دم دار ستارہ کی نحوست دو برس تک رہے گی اور اس سے صرف مسلمان متاثر ہوں گے۔ پھر مسلمانوں میں بھی صرف انہیں لوگوں پر اثر پڑے گا، جن کا نکاح اتوار یا سنیچر کو ہو گا۔ اکثر لوگ شادی بیاہ کے لئے اتوار کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس روز چھٹی ہوتی ہے۔ احباب اور عزیز و اقربا آسانی سے شریک ہو سکتے ہیں۔ آج سے اتوار کو بیاہ کرنے کی بھی ممانعت ہو گئی۔ ذرا حاجی صاحب کو دُم دار ستارہ سے اچھی طرح پوچھ لینا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اتوار کے بجائے جمعہ کو نکاح پڑھوانا شروع کر دیں اور دُم دار ستارہ پھر بھی خوش نہ ہو۔

ہمارے نزدیک نجوم محض ظنی اور قیاسی چیز ہے اور اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔ ستارے بے دُم ہوں یا دُم دار۔ ان کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ نجومیوں کے جی میں جو کچھ آتا ہے، کہہ دیتے ہیں اور توہم پرست لوگ اسے مانتے چلے جاتے ہیں۔

۲۳ر نومبر

مغربی پنجاب کے فنانشل کمشنر صاحب نے جہلم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا "رشوت پاکستان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔" تعجب ہے، اس موقع پر اہلِ جلسہ میں سے کسی نے اٹھ کے یہ نہ کہہ دیا کہ رشوت پاکستان کی دشمن ہے تو جو لوگ اس دشمن کو کچا کھا جاتے ہیں، وہ پاکستان کے دوست ٹھہرے۔

رشوت خور اہل کار، رشوت کو نذرانہ یا بالائی آمدنی کہتے ہیں اور بعض لوگوں نے تو اس کا نام "دستِ غیب" رکھ چھوڑا ہے۔ مدت ہوئی، راقم السطور کی ملاقات ایک پیر صاحب سے ہوئی تھی جو لوگوں کو دستِ غیب کے وظیفہ کی اجازت بھی دیتے تھے۔ تھانہ کے ایک محرر کو انہوں نے اس وظیفہ کی اجازت دے رکھی تھی۔ اُسے کہیں نہ کہیں سے روزانہ دس روپے ضرور مل جاتے تھے۔

ان پیر صاحب کے مرید کہتے تھے کہ خود انہیں بھی دس روپے روز مل جاتے ہیں اور اس کے لئے انہیں کوئی دوا دوش بھی نہیں کرنی پڑتی۔ صبح سویرے نماز اور وظیفہ سے فارغ ہو کے مصلے کا کونہ اٹھایا اور دس روپے نقد چہرہ شاہی مل گئے۔ خدا جانے اُن کے مصلے کے نیچے یہ روپے کون رکھ جاتا تھا۔ ایک محفل میں پیر صاحب کی کرامتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ دس روپوں کا قصہ چھڑا تو ایک شخص کہنے لگا پیر صاحب خود اپنی بزرگی جتانے کے لئے مصلے کے نیچے روپے رکھ دیتے ہوں گے۔ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے تھے کہ معتقدین چاؤں چاؤں کر کے لپٹ گئے اور اسے دھکے دے کے محفل سے نکال دیا۔

کشمیر میں پیر نباں ایک گاؤں ہے۔ جہاں پیروں کا ایک مشہور خاندان آباد ہے۔ یہاں کے ایک پیر صاحب "کشائشِ رزق" کا وظیفہ جانتے تھے اور بہت سے لوگ جن میں زیادہ تعداد سرکاری ملازمین کی تھی، اس وظیفہ کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ان کے مرید ہو گئے تھے۔ یوں تو

یہ پیر صاحب جھاڑ پھونک میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور یہ مشہور تھا کہ "شاہِ جنات" سے ان کی دوستی ہے، لیکن اُن کی جانب عوام کا رجوع زیادہ تر "کشائشِ رزق" کے اس وظیفہ کے باعث تھا، کیونکہ عام اعتقاد کے مطابق اُن کے مریدوں کو رشوت خوب ملتی تھی۔ ایک پٹواری اکثر کہا کرتا تھا کہ پیر صاحب کا مرید ہونے سے پہلے بالائی آمدنی بہت کم ہوتی تھی۔ ان کی ہدایت کے مطابق وظیفہ پڑھنا شروع کیا کہ روپے پیسے کا مینہ برسنے لگا۔ غرض مجھے جو فراغت اور خوش حالی نصیب ہوئی ہے، سب حضرت پیر صاحب کی توجہ کا نتیجہ ہے۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے جو پیری مریدی کا زور تھا اب نہیں رہا۔ "کشائشِ رزق" کا وظیفہ کرنے والے بھی بہت کم رہ گئے ہیں۔ پھر بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو رشوت کو نذرانہ سمجھ کے وصول کرتے ہیں اور شیرِ مادر کی طرح ڈکار جاتے ہیں۔ پہلے لوگوں کو صرف "رشوت" ہی کا سہارا تھا۔ اب بلیک مارکیٹ بھی ایجاد ہو گئی ہے۔ بار لوگ بلیک مارکٹ سے ہدیہ وصول کرتے ہیں اور اس میں سے کچھ حصّہ رشوت میں دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح کسی تعویذ یا وظیفہ کے بغیر دونوں کاروبار چل رہے ہیں۔ رشوت نے بلیک مارکیٹ کو فروغ بخشا ہے۔ بلیک مارکٹ نے رشوت کا ستارا چمکایا ہے۔ فنانشل کمشنر صاحب وعظ کرتے رہیں الاٹمنٹ اور بلیک مارکٹ کے اس دور میں کون سنتا ہے؟

---

۲۲ نومبر

نئی وزارت کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اب کے وزارت نہ پھیلی نہ سمٹی بلکہ جتنی تھی اتنی ہی رہی۔ خان ممدوٹ بہتیرا چاہتے ہیں کہ وزارت کو کھینچ کھانچ کے اتنا پھیلائیں کہ چودھری محمد حسن بھی اس میں آ جائیں، لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی پیچ ایسا آ پڑتا ہے کہ چودھری صاحب وزارت سے باہر رہ جاتے ہیں۔

خان ممدوٹ نے اکتوبر کے مہینے میں جو اعلان کیا تھا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کام زیادہ ہے اور وزیر کم۔ اس لئے وہ کچھ اور لوگوں کو وزارت میں شامل کر لینا چاہتے ہیں تاکہ ہر وزیر کے حصے میں اتنا کام آئے جسے وہ اچھی طرح انجام دے سکے۔ لیکن نئی وزارت میں بھی پانچ ہی وزیر ہیں۔ اس لئے توسیع کی گنجائش موجود ہے اور بظاہر چودھری محمد حسن کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اللہ نے چودھری فضل الٰہی کی سُن لی تو چودھری محمد حسن کی بھی ضرور سنے گا ؎

اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار

وزیر عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی بوجھ اٹھانے والے کے ہیں۔ وزرا صرف پانچ ہیں اور انہوں نے جتنا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ اس کے لئے سات یا آٹھ وزیروں کی ضرورت ہے۔ گویا ایک وزیر کو کوئی ڈیڑھ وزیر کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ شیخ کرامت علی غالباً اس لئے گئے کہ وہ ڈیوڑھا یا دگنا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہ رکھتے تھے اور چودھری فضل الٰہی اس لئے تشریف لے آئے کہ وہ زیادہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ بہرحال شیخ صاحب ان دنوں غالب کا یہ مصرع پڑھ رہے ہیں۔ ع

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے

لیکن وزارت اس قسم کا بوجھ نہیں جو ریلوے قلیوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس بوجھ میں کچھ ایسی دلآویزی اور دل کشی ہے کہ ہر شخص اسے اٹھانے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ دوسرے لوگ بھی یہ بارِ گراں اٹھانے میں اس کے شریک ہو جائیں۔ وزارت بھی ایک قسم کی حمالی اور قلی گری ہے۔ لیکن ایسی محبوب حمالی جس کے تصور نے اکثر لوگوں کی رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔

آج کل لفظ وزیر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک زمانے میں قُلی جو وزیر کا ہم معنی ہے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مثلاً نورجہاں کے پہلے خاوند شیر افگن کا اصل نام علی قُلی خان تھا۔ اکبری اُمرا میں

ایک اور شخص شاہ قلی بھی بہت مشہور ہو گذرا ہے۔ ہم نے ایک مرتبہ عرض کیا تھا کہ اگر وزیر تعلیم کو "تعلیم قلی خان" اور وزیر صنعت کو "صنعت قلی خان" کہا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن ہماری یہ تجویز کسی کو پسند نہ آئی۔ بہر حال لوگوں کو وزیر کے لغوی معنی پر نظر رکھنی چاہئے۔ اس سے اور کچھ نہ سہی، یہ فائدہ تو ہو گا کہ وزیروں کے جھگڑوں کی اصل وجہ سمجھ میں آتی رہے گی۔

آپ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ پانچ وزیروں نے مل کے کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ یہ بات نہیں کہ سر پہ بستر ہے، اس پر ایک سوٹ کیس ہے ہاتھ میں ہلکی سی ٹوکری ہے اور اسے لئے ہوئے چلے جا رہے ہیں یا پھر کندھے پر آٹے کی بوری ہے اور ہاتھ میں گھی کا چھوٹا سا کنستر۔ دو قدم چلے اور سستائے۔ یہ پورے صوبے کا بوجھ ہے۔ مہاجرین کا بوجھ، الاٹمنٹوں کا بوجھ، فائلوں کا بوجھ، پھر بھی ان لوگوں کی ہمت دیکھئے کہ ہر شخص بوجھ بٹانے پر تیار نظر آتا ہے اور جو لوگ بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی کو زحمت نہ دیں۔ بوجھ اٹھانے والوں اور بوجھ بٹانے کے تمنائیوں میں اگر کبھی کبھار بدمزگی ہو جائے تو انھیں معذور سمجھنا چاہئے۔

---

۲۴ نومبر

قاآنی سے کسی نے کہا، "نہ جانے کیا بات ہے کہ فلاں شاعر جب کسی امیر کی شان میں قصیدہ لکھتا ہے تو ساتھ مٹھائی کا ایک طبق ضرور لے جاتا ہے۔"

قاآنی نے جواب دیا "تا شعرش شیریں نماید۔"

ممدوح قصیدہ سننے کے ساتھ ساتھ مٹھائی ٹھونگتا جاتا ہے۔ اس لئے شاعر کے پھیکے سیٹھے اشعار بھی اسے شیریں معلوم ہوتے ہیں۔

نہ جانے حکومت نے "بیان بازی کی مہم" کے بعد چینی کا راشن کیوں آدھا کر دیا۔ قاعدے کی رو سے تو اس زمانے میں چینی کا راشن دگنا ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ بیان پہلے ہی پھیکے تھے۔ اب

لوگوں کو اور زیادہ پھیکے معلوم ہو رہے ہیں۔

کہیں وزراء اس وہم میں تو نہیں کہ ان بیانوں کی حلاوت سے لذت آشنا ہونے کے بعد چینی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لوگ ایک مرتبہ بیان پڑھ لیا کریں گے اور چائے چینی کے بغیر بھی میٹھی معلوم ہوگی۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ ایران کے ایک شاعر نے کسی دوسرے شاعر کے کلام پر رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے اشعار بے نمک ہیں۔ شاعر مذکور کو "بے نمکی" کا طعنہ برا معلوم ہوا۔ ذیل کا قطعہ لکھ کے معترض کے پاس بھجوا دیا ؎

عسل و شکر است گفتۂ من ۔۔۔ اندریں دو نمک نکو ناید

شلغم و باقلہ است گفتۂ تو ۔۔۔ نمک اے قلتباں ترا باید

یعنی میرے اشعار تو شہد و شکر ہیں اور ان دونوں میں نمک نہیں پڑتا لیکن تیرا کلام شلغم اور باقلہ ہے۔ اس لئے تجھے ضرور نمک کی حاجت ہے ۔۔۔ جو لوگ لیڈروں کے بیانوں کو بے نمک کہتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں۔ لیڈروں کے بیان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تلخ یا شیریں۔ اور تلخی یا شیرینی دونوں کو نمک سے کوئی سروکار نہیں۔

چودھری فضل الٰہی صاحب نے وزیر بننے کے بعد جو بیان دیا ہے۔ وہ بھی پہلی قسم کے بیانوں کے ذیل میں آتا ہے۔ یعنی انھوں نے فرمایا ہے کہ مغربی پنجاب میں ملیریا کا زور ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب انتظام نہیں ہو سکا۔ اس بیان میں انہوں نے جو حقائق بیان فرمائے ہیں۔ وہ تلخی کے لحاظ سے کونین کو مات کرتے ہیں اور سچ پوچھئے تو اس موقع پر اس قسم کے بیان کی ضرورت بھی تھی۔ اس سے اور کچھ نہیں ہوا، ایک حد تک کونین کی کمی کی تلافی تو ہو گئی ہے۔

اس بیان میں چودھری صاحب نے فرمایا ہے کہ:۔

"دراصل ملیریا موسم کی تبدیلی اور بارشوں کی وجہ سے اتنا زور پکڑ گیا ہے"۔

جی ہاں! یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ وزارت کی تبدیلی کی وجہ سے ملیریا نہیں پھیلا، بلکہ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے پھیلا ہے۔ اس لئے مطمئن رہئے کہ ہم بارش اور موسم ہی کے خلاف احتجاج کریں گے یا ملیریا پھیلانے والے مچھروں اور ملیریا کے جراثیم کو بُرا بھلا کہہ کے چُپکے ہو رہیں گے۔

۲۶ر نومبر

پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے راولپنڈی کے اجتماعِ عام میں مغربی پنجاب کی وزارت کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ اس کی روئداد پڑھ کے یار لوگوں پہ پانی کے سیکڑوں گھڑے پڑ جانے چاہئیں۔ لیکن لیگ کے صدارتی انتخاب کی گرما گرمی میں کسی کو خیال تک نہیں آیا کہ کہنے والا کیا کہہ گیا اور کس انداز میں کہہ گیا؟ اور پانی کے گھڑوں کا کیا ذکر ہے۔ دریا بھی اُمڈ پڑتا تو یہ لوگ خبردار تک نہ ہوتے ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
اپنا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جن لوگوں نے مغربی پنجاب کو اپنی گاڈ زوریوں کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے، انھیں تو شاید احساس نہ ہوا ہو لیکن عوام کو ضرور خیال آیا ہو گا کہ شہر میں اونٹ بدنام اور پاکستان ہیں مغربی پنجاب۔ وزیروں میں بدمزگیاں اور شکر رنجیاں بھی ہوتی ہیں، اندر ہی اندر ہلکی ہلکی چوٹیں بھی چلتی رہتی ہیں لیکن ان شکر رنجیوں نے کہیں یہ صورت اختیار نہیں کی کہ گورنر جنرل کو کسی خاص صحبت میں نہیں بلکہ جلسۂ عام میں یوں دلوں کی کدورتوں کا ذکر کرنا پڑے۔

ملیریا پھیلے، ہیضہ پھوٹے، طوفان آئے، سیلاب اُمڈے، صوبے کا نظم و نسق تہ و بالا ہو جائے، یار لوگ بِگڑم ضرور لڑائیں گے، اکھاڑ پچھاڑ سے باز نہیں آئیں گے۔

اصل میں کرکٹ میچ لڑانا، اکھاڑ پچھاڑ کرنا طبعی ضرورت سے ہے۔ اس کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا، طبیعت اداس رہتی ہے، دن بھر جمائیاں آتی ہیں، کام کاج میں جی نہیں لگتا۔ اعتراض کرنے والوں کا کیا ہے، وہ تو جھٹ اعتراض کر بیٹھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ مریض کے لئے دوا کے طور پر بڑی بڑی حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اس مریض کے نسخے میں اور اجزا کے ساتھ ایک جزو "سازش" بھی ہے تو کون سی آفت آگئی۔ ذرا یہ تو ملاحظہ فرمائیے کہ مریض کا حال کیا ہے؟ کھل کے بھوک لگتی ہے، طبیعت چونچال رہتی ہے، کھیلنے کودنے لمبے لمبے دورے کرنے کو جی چاہتا ہے، چہرے پر سرخی جھلکتی ہے۔ اب کوئی اس نسخے کو چھوڑ کے اور کوئی دوا استعمال کرے تو کیوں کرے؟ لوگوں کو تو یہ کہنا چاہئے کہ اس نسخے کا جزو اعظم سازش ہے تو سازش ہی کیجئے اور خوش رہئے۔ "خوش باش دمے کہ زندگانی این است" خدا نہ کرے کہ آپ کی طبیعت کی چونچالی میں کوئی فرق آئے۔ ہم پر جو گزرے گی سہ لیں گے ع

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

غرض یہ نسخہ یعنی "مطبوخ سازش" جو ہوالشافی سے شروع ہوتا ہے اور "جوشاندہ، مالیدہ، صاف کردہ بخور رندیر" ختم ہو جاتا ہے۔ مقوی معدہ مفرح قلب اور کاسر ریاح ہے اور جو لوگ اس کی مداومت کرتے ہیں انہیں منافع کثیرہ حاصل ہوتے ہیں۔ اب لوگ اگر طب کے مخالف ہو جائیں اور خواجہ ناظم الدین جیسے جلیل القدر شخص بھی یہ کہہ دیں کہ اس نسخے کو "قرابادین وزارت" ہی سے خارج کر دینا چاہئے تو کوئی کیا کرے!

---

۲۸ نومبر

اخباروں میں "پنٹ بہرا پن۔ چار نکاح کیجئے۔ مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا۔ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" اور اس قسم کے اشتہار آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے۔ لیکن ذرا خدا لگتی کہئے گا، کبھی آپ نے اس قسم کا اشتہار بھی دیکھا ہے:۔

دولت اور خلوص کی جنگ میں

عوام اپنی تنظیم، اپنے اتحاد اور اپنی آبرو کا خیال رکھیں

مسلم لیگ کے انتخابات میں

ان لوگوں کو ووٹ دیں جو عوام میں سے ہیں اور اس طرح قومی عہدوں کو خواص کی خاندانی جاگیر بننے سے بچا کر عوام کی فلاح و بہبود کی راہ ہموار کریں۔

عوام کی ترقی خواص کے بتوں کی شکست پر منحصر ہے (نقل مطابق اصل)

یہ سندری سہاگ تیل، روغن گیسو دراز، سرمۂ مقوی البصر یا جوارشِ معدی کا اشتہار نہیں، بلکہ مسلم لیگ کے صدر کا اشتہار ہے۔ کانگریس کے صدر کا انتخاب ابھی پچھلے دنوں ہوا ہے، لیکن ٹنڈن اور سیتا رامیہ میں سے کسی کو یہ ترکیب نہ سوجھی۔

کچھ عرصہ ہوا، ایک دوا کا اشتہار بالکل اسی انداز میں ہماری نظر سے گزرا۔ کچھ اس قسم کا مضمون تھا:۔

ملک و ملت کی ترقی کے لئے

یہ ضروری ہے کہ عوام اپنی صحت کی حفاظت کا خیال رکھیں

صحت کی حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے

کہ اکسیرِ معدہ جسے طبی کمپنی بھنڈی بازار بمبئی نے ایجاد کیا ہے، باقاعدگی سے استعمال کی جائے اور معدے کو ضعیف ہونے سے بچا کے اعضائے رئیسہ کی حفاظت کا سامان مہیا کیا جائے۔

اعضائے رئیسہ کی حفاظت اکسیرِ معدہ کے استعمال پر منحصر ہے۔

دونوں اشتہاروں میں فرق صرف اتنا ہے کہ صدارت کے اشتہار میں نہ دوا کا نام بتایا گیا ہے نہ دوا کے موجد کا نام۔ حالانکہ اگر "نواب اینڈ کمپنی" کمہ کے موجد کا نام بتا دیا جاتا تو لوگوں کو دوا کے تیر بہدف ہونے کا یقین ہو جاتا۔ لوگ ابھی تک دواخانے یا دوا کے موجد کے نام سے

بہت مرعوب ہوتے ہیں۔ اگر دوا کے ساتھ ہندوستانی دواخانے کا نام آجائے یا یہ بتا دیا جائے کہ یہ دوا حکیم محمود خاں کی بیاضِ خاص کے نسخے کے مطابق تیار کی گئی ہے تو لوگ بہت قدر کرتے ہیں۔ بعض اشتہار باز تو ایسے موقعوں پر یہ بھی لکھ دیا کرتے ہیں کہ دوا اگرچہ کم قیمت ہے، لیکن اس کی قیمت محض عوام کے فائدے کے لئے اتنی کم رکھی گئی ہے، ورنہ اس کے اجزا میں سونے کا کشتہ اور مروارید محلول دونوں شامل ہیں اور مرحوم نصیر الدین حیدر شاہ بھی اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ معلوم نہیں اشتہار میں یہ دونوں باتیں چھپانے کی کیوں کوشش کی گئی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ یہ دوا تو عوام کے لئے ہے لیکن اس کا نسخہ علاج الغربا مطبوعہ نول کشور سے نہیں بلکہ بیاض واجد علی شاہ کے ایک قلمی نسخہ سے لیا گیا ہے۔

لیکن صرف اخباروں میں اشتہار دینے سے کام نہیں چلے گا۔ پوسٹر بھی چھاپنے چاہئیں، سینما سلائڈ کا انتظام بھی ہو جائے تو اچھا ہے، کیونکہ لوگ صرف اخبار ہی نہیں پڑھتے سینما بھی دیکھتے ہیں بلکہ ہم تو کہیں گے کہ ڈھنڈورچی سے کچھ اس انداز سے ڈھنڈورا بھی پٹوا دیا جائے:۔

"کڑم دھم۔ کڑم دھم۔ خلقت خدا کی۔ حکم سرکار کا۔ اور حکم یہ ہے کہ مسلم لیگ کے انتخابات میں الخ"

لاہور والوں کو ڈھول کی آواز سنے مدتیں ہو گئیں۔ مسلم لیگ کے انتخابات کے طفیل یہ بچارے کڑم دھم ہی سن لیں گے۔

بہر حال چاہے ڈھنڈورا پٹوایا جائے یا صرف اخباروں میں اشتہار دینے پر اکتفا کیا جائے اس اشتہار کو کسی قدر زیادہ واضح ہونا چاہئے تھا۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا تھا کہ ایسے شخص کو ووٹ دیا جائے جس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہو، جسم اکہرا، چہرے پر مختصر سی داڑھی۔ قریش کی کسی شاخ سے تعلق رکھتا ہو تاکہ "الائمۃ من القریش" کے معیار پر پورا اتر سکے۔ صرف تقریر کرنا ہی نہ جانتا ہو، بلکہ ضرورت پڑ جائے تو وعظ بھی کر سکے۔ انگریزی پر عبور رکھنے کے علاوہ مشرقی علوم کی کوئی ڈگری بھی حاصل کر چکا ہو۔ اس تصریح کے بعد نام لینے کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی۔

پچھلے دنوں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ایک ایسا اشتہار شائع ہوا تھا جس میں امیدوار کی خوبیاں کچھ اسی انداز میں بتائی گئی تھیں۔ پبلک سروس کمیشن کے اشتہار میں یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے تو مسلم لیگ کے صدر کے لئے اس قسم کا اشتہار کیوں نہ دیا جائے۔ آخر یہ بھی تو ایک لحاظ سے پبلک سروس کمیشن کے اشتہار ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

۴ر دسمبر

راقم الحروف تین چار دن غیر حاضر رہا ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ جن میں سب سے بڑا ہنگامہ صدارت کا معرکہ تھا۔ میاں محمد ممتاز دولتانہ اگرچہ ہمیشہ کے شکست نصیب ہیں یعنی جب کبھی وزارت کے اکھاڑے میں اترے ہیں شکست ہی کھائی ہے، لیکن اب کے انھوں نے اپنے حریف علامہ پہلوان (گاماں پہلوان نہیں علامہ پہلوان) کو گرا ہی لیا۔ دراصل اکھاڑے اکھاڑے میں فرق ہے۔ دولتانہ صاحب وزارت کے اکھاڑے میں ہمیشہ پچھڑنا ہی جانتے ہیں لیکن صدارت کے اکھاڑے میں اترتے ہیں تو کبھی کبھی حریف کو پچھاڑ لیتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اس اکھاڑے سے قدم باہر نہ رکھیں، لیکن ہمیں یقین نہیں کہ وہ ہماری نصیحت پر عمل کریں۔ ایک نہ ایک دن "قوم کی خدمت" کے شوق میں وہ پھر وزارت کے اکھاڑے کی طرف رخ کریں گے اور چاروں شانے چت نظر آئیں گے۔

دولتانہ صاحب وزارت کر چکے اور ان دنوں صدارت کر رہے ہیں۔ اب لے دے کے قومی خدمت کا ایک ہی میدان باقی رہ گیا ہے یعنی ادارت۔ دو اقلیمیں فتح ہو چکیں صرف ایک باقی رہ گئی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ انہوں نے جس طرح صدارت پہ ہاتھ صاف کیا ہے۔ اسی طرح وہ ادارت پر بھی ہاتھ صاف نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ؎

اے برق ڈھونڈلے کوئی خرمن زمانے میں
رہنے دے چار تنکے مرے آشیانے میں

ادارت سے اچھا ہے کہ سفارت کیجئے اور یہ نہ بن پڑے تو تقویٰ اور طہارت کی جانب جھک

پڑ ٹیے۔ علامہ صدیقی بھی سکتری کے ساتھ ساتھ قرآن کا درس دیتے اور نماز بن پڑھاتے رہتے ہیں اور وہ صدر بھی ہو جاتے تو یہ سلسلہ جاری رہتا۔

پرانے زمانے میں یہ رسم تھی کہ جو پہلوان کسی دوسرے پہلوان سے شکست کھاتا تھا۔ فوراً اس کی اطاعت قبول کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ علامہ صاحب نے بھی یہی کیا۔ یعنی مغلوب ہوتے ہی اپنی خدمات دولتانہ صاحب کو پیش کر دیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ علامہ صاحب دولتانہ صاحب کی خدمت کریں گے اور دولتانہ صاحب قوم کی خدمت کریں گے لیکن یار لوگوں کو اس پر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ چنانچہ ان سے کہا جا رہا ہے کہ علامہ کے لقب سے بھی ہاتھ اٹھائیے۔ بیچارہ علامہ لیگ کی سکتری سے محروم، صدارت سے محروم، وزارت سے محروم۔ لے دے کے ایک اس لقب کا سہارا رہ گیا ہے، سو یار لوگ اس سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے علامہ کا لقب الاٹ نہیں ہوا بلکہ لوٹ کا مال ہے۔ ہمارے خیال میں صدیقی صاحب کو چاہئے کہ جہاں انہوں نے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں وہاں اس لقب کے جملہ حقوق بھی میاں محمد ممتاز دولتانہ کے نام منتقل کر دیں۔ جہاں صدارت گئی، سکتری گئی، وہاں علامہ کا لقب بھی گیا۔ چھوڑو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جی رہے گا۔

۵ر دسمبر

ہمارے ایک معاصر نے بعض بڑے لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ٹھیک ہے گھی کی گرانی کے اس زمانے میں چکنی چپڑی باتیں کرنا محض امیرانہ شغل بن کے رہ گیا ہے۔ غریب لوگوں کو تو تھوڑا سا بھی گھی میسر نہیں کہ روٹی ہی چپڑ لیں۔ اتنا گھی کہاں سے لائیں کہ باتیں بھی چپڑی جا سکیں۔

دراصل جہاں تک ہمارا آپ کا تعلق ہے، یہ محاورہ ٹکسال سے باہر ہو چکا ہے اور اسی ایک محاورہ پر موقوف نہیں، اس قسم کے کئی محاورے ختم ہو گئے۔ خاص طور پر "چپڑی اور دو دو" تو

اس قسم کا محاورہ ہے جو کسی ایسے ہی شخص کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے جسے نہ گھی پہ دام خرچ کرنے پڑیں نہ گیہوں پہ۔

خبر آئی ہے کہ آئندہ پاکستان میں کسی ایسی فرم کی رجسٹری نہیں ہو سکے گی جس نے "قائدِ اعظم" کا لقب اپنے نام کا جزو بنا رکھا ہو۔ بات تو اچھی ہے، لیکن یار لوگ فرم کے نام کی رجسٹری ہی کیوں کرائیں گے۔ کچھ ایسی ہی افتاد پڑے گی، یعنی کسی دوسرے نے نام پہ چھاپہ مارا تو فرم کا نام بدل لیں گے قائدِ اعظم بک ڈپو نہ سہی، محمد علی بک ڈپو سہی۔ جناح گھی سٹور نہ سہی، اقبال گھی سٹور سہی۔

اقبال گھی سٹور کا نام سن کے خیال ہوتا ہے کہ علامہ اسی دکان سے گھی خریدتے ہوں گے۔ اقبال رستوران کا نام سن کے اکثر لوگوں کو خیال آتا ہوگا کہ علامہ اسی چائے خانہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کے شعر کہتے ہوں گے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

گاندھی جی ننگے سر رہتے تھے لیکن گاندھی کیپ نے جتنی شہرت پائی ہے انہیں کے نام سے پائی ہے۔ خیر اس ٹوپی کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن گاندھی بیڑی کے لئے آپ کے پاس کیا سندِ جواز ہے؟ انھوں نے کبھی خود بیڑی پی، نہ لوگوں کو بیڑی پینے کی ہدایت کی۔ اور تو اور کبھی کسی الکشن میں لوگوں کو بیڑی نہیں پلوائی۔ حالانکہ یار لوگ الکشنوں میں ووٹروں کو شراب تک پلواتے ہیں۔

مولانا علاؤ الدین صدیقی جن دنوں صرف درس دیتے اور وعظ کہتے تھے بڑے مزے میں تھے یعنی کسی لڑائی میں نہ جھگڑے میں نہ خان میں نہ خان کے اونٹوں میں۔ لیکن جب سے وہ سیاست کے اکھاڑے میں اترے ہیں اور خان ممدوٹ سے تعلقات وابستہ کئے ہیں ان کا نام بھی "خان کے اونٹوں" میں شامل ہے۔ اب وہ چاہے دولتانہ صاحب کی بیعت کریں۔ چاہے خلافت پاکستان گروپ میں شامل ہو جائیں اس ٹیبل سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں یعنی ؎ تہمت ہے تیرے عشق کی ہم پہ لگی ہوئی۔

۷ر دسمبر

پُرانے زمانے میں منظوم رقعے لکھنے کا بڑا رواج تھا خصوصاً بیاہ شادی کی تقریبات پر جو رقعے بھیجے جاتے تھے وہ نظم ہی میں لکھے جاتے تھے اور سچ پوچھیے تو اس زمانے کی نثر بھی نظم سے کیا کم تھی۔ مسجع فقرے پھر لفظی رعائتوں کا التزام، بیچ میں جا بجا اساتذہ کے اشعار، اچھے اچھے انشا پردازوں کے قلم سے جو رقعے نکلتے تھے، انھیں لوگ سنبھال کے رکھتے تھے۔ ان کے مجموعے مرتب کیے جاتے تھے جو سارے مُلک میں پھیل جاتے تھے۔

حال ہی میں لاہور ریڈیو نے منظوم رقعے لکھنے کی رسم کو پھر تازہ کیا ہے۔ اس مہینے لاہور ریڈیو پر ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس مشاعرے کا جو دعوت نامہ شعرا کو بھیجا گیا ہے، وہ سرتاسر منظوم ہے۔ حتیٰ کہ داعی یعنی لاہور ریڈیو کے ڈائرکٹر صاحب کا نام بھی قافیہ اور وزن کی قید میں جکڑا ہوا ہے۔

اول تو ایسے شعرا کے نام جن کی شہرت کے جھنڈے سارے پاکستان میں گڑے ہیں منظوم رقعہ لکھنا ہی بڑے دل گردہ کا کام ہے۔ شیخ سعدی کو بھی اہلِ فارس کے سامنے گلستان و بوستان پیش کرتے وقت یہ کہنا پڑا تھا ؎

گل آورد سعدیؔ سوئے بوستاں
بشوخی چو فلفل بہ ہندوستاں

پھر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقعہ بڑی ہی رواروی میں لکھا گیا ہے اور اس میں ایک دو ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں، جن پر بعض شعرا ضرور ناک بھوں چڑھائیں گے۔

مثلاً اس رقعہ کا ایک مصرع ہے ؎ جناب حامد علی اور اثر بھی آئیں گے۔ عین حرفِ علت نہیں۔ بلکہ حرفِ صحیح ہے۔ لیکن یہاں اُسے حرفِ علت سمجھ کے گرا دیا گیا ہے۔ یعنی مصرع میں حامد علی "حامدلی" پڑھا جاتا ہے۔ اس غلطی کو اور لوگ تو شاید معاف کر دیں لیکن جناب حامد علی خاں جن کے

نام کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا گیا ہے، کیونکر معاف کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں وہ شاعر مشاعرے میں شامل ہونے سے انکار ہی نہ کر دیں اور اس دعوت کے جواب میں یہ نہ کہلا بھیجیں کہ ؎

لطف فرمودی ولے ایں پائے را رفتار نیست

بہر حال اس فروگذاشت سے قطع نظر کر لیا جائے تو لاہور ریڈیو کے کارپردازوں کے اس کارنامے پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ منظوم رقعے لکھنے کا رواج پھر چل نکلے گا جس شخص کو بیاہ شادی یا کسی ایسی تقریب پر رقعہ لکھوانے کی ضرورت پڑے گی اُسے کسی نہ کسی شاعر کی خدمات حاصل کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا، اور کوئی عجب نہیں کہ اب کے پاک پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو تو اس کا ایجنڈا نظم میں ہو۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ شعرا کے نام نظم میں دعوت نامہ بھیجنا ضروری سمجھا گیا ہے تو گویوں کو دعوت نامہ بھیجنے کے لئے کسی موسیقی دان کا انتظام کرنا پڑے گا۔ جو چپڑاسی کے ساتھ ایک ایک گویے کے ہاں جائے گا اور دعوت نامہ گا کے سنا آئے گا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کے یہ دعوت نامہ جلوس کی صورت اختیار نہ کر لے۔ یعنی جب کوئی گویا اپنے ہم پیشہ لوگوں کو ریڈیو پہ گانا سنانے کی دعوت دینے جائے تو ساتھ روشن چوکی بجتی جا رہی ہو۔ اور پیچھے پیچھے تماشائیوں کا ہجوم ہو۔

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو پاکستان کو منظوم دعوت نامے لکھنے کے لئے صرف اپنے کارپردازوں ہی پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے بلکہ شاعروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کر دینی چاہئے۔ جب کوئی دعوت نامہ لکھا جائے۔ پہلے اس سب کمیٹی کے سامنے آئے اور جب تک وہ اسے منظور نہ کر لے، ڈائریکٹر صاحب اس پر اپنے دستخط نہ کریں۔

اس کمیٹی میں ایک گویے کو شامل کر لینا چاہئے جس کا کام صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ دعوت نامہ کو کن کن دھنوں میں گایا جا سکتا ہے۔

---

۶ دسمبر

مدت ہوئی راقم الحروف نے جغرافیۂ پنجاب کے نام سے سیاسیات پنجاب کے متعلق بعض مضامین لکھے تھے جو بعد میں کتابی صورت میں چھپ گئے۔ ایک دیرینہ کرم فرما نے راقم الحروف کو لکھا ہے کہ جغرافیہ کی اصطلاحوں میں پنجاب کی سیاسی تاریخ لکھنا کچھ ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ ریاضی کی اصطلاحات میں اس موضوع پہ کچھ لکھو تو جانیں۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ حساب کی اصطلاحات میں بھی مغربی پنجاب کی سیاسی تاریخ لکھنا چنداں مشکل نہیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ پہلے پنجاب کے مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ پھر تفریق نے زور پکڑا۔ یعنی چار وزیروں میں سے دو نکل گئے۔ اس کے بعد ضرب کی باری آئی یعنی دنگل ہوئے اور ضَرَبَ۔ یَضرِبُ ضَرباً فَھُوَ ضَارِبٌ کی گردان ہونے لگی۔ اب کچھ عرصہ سے تقسیم کا دور دورہ ہے۔ غرض

نکلی نہ کسی سے وصل کی شکل
ہیں جمع بڑے بڑے حسابی

ابھی تو راقم الحروف نے صرف ریاضی کے چار ابتدائی قاعدوں یعنی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم سے کام لیا ہے۔ ورنہ کسرِ ملتف، کسرِ مسلسل، ذو اضعاف اقل، عادِ اعظم اور اعشاریہ کے قاعدوں کی مدد سے مغربی پنجاب کی سیاسی تاریخ کے اکثر واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں اور صرف ایک ریاضی پر کیا موقوف ہے، مغربی پنجاب کی سیاسیات عالیہ کی گرامر بھی لکھی جا سکتی ہے۔ وزارت اور صدارت دونوں کی تحلیلِ صرفی اور ترکیبِ نحوی ہو سکتی ہے بلکہ عروض کی مدد سے اس کی تقطیع تک کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس خیال سے آج تک اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اگر ہم نے خان ممدوٹ کو جار اور مولانا صدیقی کو مجرور کہہ دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ جار مجرور مل کے صرف متعلق فعل ہوتے ہیں تو کون سمجھے گا۔ ترکیبِ نحوی تو خیر مشکل چیز ہے، وزارت کی تقطیع کرتے وقت اگر یہ کہہ دیا جائے کہ شیخ کرامت علی کو حرفِ علت سمجھ کے گرا دیا گیا ہے تو بہت کم لوگ داد دے سکیں گے۔

سنا ہے کہ نئی دلّی کے بڑے دفتر میں جہاں وزیر بیٹھتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ حکومت نے بہتیری کوشش کی کہ شہد کی مکھیاں یہاں سے ہجرت کر جائیں اور اس کام پر کوئی بیالیس ہزار روپے بھی خرچ کر ڈالے۔ لیکن شہد کی مکھیاں برابر دندنا رہی ہیں۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ہندوستان کی حکومت کاروباری معاملات میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتی ہے لیکن تعجب ہے کہ اس موقع پر اس کی سوجھ بوجھ کو کیا ہو گیا یعنی اس نے ایک دو نہیں پورے بیالیس ہزار روپے شہد کی مکھیوں کو نکالنے پر صرف کر دیئے اور کسی کو خیال نہ آیا کہ مکھیاں ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں تو ان کے شہد ہی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ کیا عجب کہ لیکھا جوکھا برابر ہو جائے بلکہ کچھ رقم بچ ہی رہے اور سچ پوچھئے تو اگر ہندوستان کی حکومت شہد کی مکھیوں کو نکالنے کی بے سود کوششوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں پالنے کا کام شروع کر دیتی تو نفع میں رہتی۔ ایک تو اہنسا کے اصول کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جیو ہتیا نہ کی جائے۔ پھر چھتے یوں بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی غیر ملکی اخبار کا نامہ نگار سکریٹریٹ کے ہر کمرے میں مدھ مکھیوں کو بھنبھناتا دیکھ کے تعجب ظاہر کرتا تو اسے یہ کہہ کے ٹرخایا جا سکتا تھا کہ ہندوستان میں نقش و نگار بنانے یا تصویریں لٹکانے کے بجائے شہد کے چھتوں سے کمروں کی آرائش کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ مکھیاں جو بہت پوتر سمجھی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے خاص طور پر امرناتھ سے منگوائی گئی ہیں۔

اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ دوسرے ملکوں میں نئی دلّی کے سکریٹریٹ کی ان پالتو مکھیوں کو بڑی شہرت ہوتی۔ امریکہ کے اخباروں میں مضمون چھپتے کہ ہندوستان کی حکومت مدھ مکھیاں پالتی ہے لیکن افسوس ہے کہ حکومت ہند نے پروپگنڈے کا ایسا اچھا موقع ہاتھ سے کھو دیا اور یہ خبر چھپ گئی کہ نئی دلّی کے بڑے دفتر سے شہد کی مکھیوں کو نکالنے پر بیالیس ہزار روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔
ذرا لاہور کارپوریشن سے ہندوستان کی حکومت کا مقابلہ کیجئے۔ ہماری حکومت مچھروں کی آبادکاری کے کام پر بے شمار روپیہ خرچ کر چکی ہے اور ہندوستان کی حکومت شہد کی مکھیوں کو بے دخل

کرنے کی کوشش کر رہی ہے ع
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

۹ر دسمبر

اخباروں میں آئے دن اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ فلاں سینما کے رات کے شو میں جتنی آمدنی ہو گی، سب کی سب کشمیر فنڈ میں بھیج دی جائے گی۔ فلاں ڈرامیٹک سوسائٹی ایک ڈرامہ دکھا رہی ہے اس کی آمدنی بھی کشمیر فنڈ میں داخل ہو گی۔ اس لئے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھیل دیکھ کے ثواب دارین حاصل کریں۔ کھیل کا کھیل ثواب کا ثواب۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

ثواب حاصل کرنے کے لئے اس چلتے ہوئے نسخے کے تیر بہدف ہونے میں تو ہمیں کلام نہیں لیکن اگر لوگ سنیما یا ڈرامے دیکھنا ہی چھوڑ دیں اور جو روپیہ ان تفریحوں پر خرچ ہوتا ہے وہ کشمیر فنڈ میں بھیج دیا جائے تو دنوں میں کشمیر کی لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ جائے اور ثواب بھی زیادہ ہی ہاتھ آئے۔ لیکن صاحب نرے ثواب سے کام نہیں چلتا۔ تفریح بھی ضروری ہے۔ یا تو ثواب اور تفریح دونوں ہوں اور اگر تفریح کے ساتھ ساتھ ثواب حاصل نہیں ہوتا تو لوگ صرف تفریح پہ قناعت کریں گے۔

سنا ہے علمائے کرام سے کہا گیا ہے کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں جہاد کے فضائل بیان کریں۔ لیکن ہماری رائے میں اگر علمائے امت صرف جہاد پہ وعظ کر کے ثواب حاصل کرنے کے بجائے خود جہاد کرنے تشریف لے جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ لوگوں پر اس قسم کے وعظ کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ وہ مولوی صاحب کا وعظ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتے ہیں کہ جہاد کی فضیلت مسلّم، لیکن مولوی صاحب خود الاٹمنٹ کے پھیر میں کیوں پڑے ہیں؟ جہاد کرنے کیوں تشریف نہیں لے جاتے۔ گستاخی معاف۔ مولوی صاحب وعظ میں کہنے کو جو چاہیں کہیں۔ ان کے اپنے عمل سے تو الاٹمنٹ ہی کی فضیلت کا پہلو نکلتا ہے۔

اس گرانی کے زمانے میں جلسہ کرنا آسان نہیں۔ دریوں، کرسیوں اور گیس کے ہنڈوں پر اچھے خاصے دام خرچ ہو جاتے ہیں۔ پھر جو مقرر پانچ پانچ منٹ کے بعد زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں، ذرا ان کی محنت کا بھی تو خیال کیجئے اور ان جلسوں سے کشمیر اور مجاہدینِ کشمیر کو خالی خولی تقریر کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس سے تو بہتر ہے کہ جلسہ کرنے پر جو دام خرچ آتے ہیں، وہ کشمیر فنڈ میں داخل کر دیئے جائیں۔

کشمیر اور تقریر ہم قافیہ اور ہم وزن ضرور ہیں، لیکن نرے قافیے اور وزن سے کام نہیں چلتا۔ روپے لائیے یا محاذ پر جائیے اور توپوں اور بندوقوں کی تقریریں سُن کے ثوابِ دارین حاصل کیجئے۔

دولتانہ صاحب بقول شخصے "نقاط ہفت گانہ" لے کے اٹھے تھے، لیکن پچھلے دنوں یہ نقاط گھس پس کے صرف چار رہ گئے اور آج کل تو صرف ایک ہی نقطے پر زور ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہی عالم رہا تو کہیں جناب دولتانہ بالکل بے نقط ہی ہو کے نہ رہ جائیں۔ ہمارے ملک کے اردو اخبار لیتھو میں چھپتے ہیں اور لیتھو کی چھپائی ایسی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی صفحوں کے صفحے اڑ جاتے ہیں، ایک دو نقطوں کا کیا ذکر ہے؟

---

۱۶ دسمبر

کل مولانا عبدالمجید سالک کی سلور جوبلی تھی۔ سالک صاحب کی اخبار نویسی کی عمر کوئی ۴۳ برس ہے روزانہ اخبارات سے بھی ان کا تعلق کوئی ۲۸ برس سے چلا آتا ہے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ سلور جوبلی کس حساب سے ہوئی۔ آخر خود سالک صاحب ہی نے عقدہ کھولا۔ یعنی اس موقع پر انہوں نے جو تقریر کی، اس میں کہا کہ یوں تو یہ سلور جوبلی نہیں بلکہ ۱۶ کیرٹ (قیراط) گولڈن جوبلی ہے۔ البتہ مجھے "افکار و حوادث" لکھتے ہوئے پورے پچیس برس ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس تقریب کو "افکار و حوادث" کی سلور جوبلی سمجھنا چاہئے۔

چونکہ مدیر افکار وحوادث کی سلور جوبلی تھی، اس لیئے اس موقع پر شروع سے آخر تک لطیفے ہی ہوتے رہے۔ ان میں کچھ لطیفے ایسے تھے جو فوراً آسانی سے سمجھ میں آ گئے اور کچھ ایسے جو دوسرے دن سمجھ میں آئے۔ مثلاً تاثیر صاحب نے اس موقع پر ایک قطعہ تاریخ پڑھا جس میں انہوں نے "ملک عبدالمجید خاں سالک" سے سلور جوبلی کی تاریخ نکالی تھی۔ مصرع کا مصرع اور نام کا نام اور پھر تعمیہ تخرجہ کے بغیر سلور جوبلی کی تاریخ۔ اس لیئے بڑی واہ واہ ہوئی۔ لیکن آج صبح غور کیا تو معلوم ہوا۔ مادۂ تاریخ تو خوب ہے۔ لیکن اس کے اعداد صرف ۱۰۱۶ ہوتے ہیں۔

پہلے تو خیال ہوا کہ تاثیر صاحب نے تعمیہ فرمایا ہے یعنی پہلے مصرع کے ایک ٹکڑے کے اعداد دوسرے مصرع میں شامل کر دیئے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ پہلا مصرع یاد نہ سہی۔ لیکن اتنے تعداد کا تعمیہ ہوا تو تاریخ میں خوبی کیا رہی؟ ہو نہ ہو تاثیر صاحب افکار وحوادث کی رعایت سے محض لطیفہ کہہ گئے۔ اگرچہ اس محفل میں تاریخ گوئی کے فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے، لیکن سب غچا کھا گئے۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ اعداد جمع کر کے ہی دیکھ لیں۔ اب تاثیر صاحب سے پوچھئے تو وہ یہی کہیں گے کہ کہاں کا مادہ تاریخ وہ تو ایک لطیفہ تھا جس کی بدولت تھوڑی دیر کے لیئے محفل گرم ہو گئی۔ حفیظ ہوشیارپوری صاحب نے "افکار وحوادث مدظلہ العالی" سے افکار وحوادث کی سلور جوبلی کی تاریخ نکالی ہے جو ایک لحاظ سے اس قطعۂ تاریخ کی تاریخ تصنیف بھی ہے۔

اور سچ پوچھئے تو تاریخ نکالنا کوئی ایسا کمال بھی نہیں۔ جناب حفیظ ہوشیارپوری کا یہ حال ہے کہ ہر چھوٹے موٹے واقعہ پر بے تکان تاریخیں کہتے چلے جاتے ہیں۔ سالک صاحب کی سلور جوبلی پر ہی انہوں نے بیسیوں تاریخیں کہی ہوں گی۔ مثلاً صاحب دولت افکار وحوادث، زنگارنگ افکار و حوادث، نورعین صحافت مولانا عبدالمجید سالک، گنجینۂ افکار وحوادث مولانا عبدالمجید سالک، محرم رموز افکار وحوادث لیسے سالک صاحب کی سلور جوبلی کی ہجری تاریخیں نکلتی ہیں۔ آخری تین تاریخوں میں علامۂ روزگار شامل کر لیجئے تو عیسوی تاریخ ہو جاتی ہے۔ یعنی گنجینۂ افکار وحوادث مولانا عبدالمجید سالک کے عدد ۱۳۶۸ ہوتے ہیں اور گنجینۂ افکار وحوادث علامۂ روزگار مولانا عبدالمجید سالک کے

علاوہ ۱۹۴۸ - اسی طرح حفیظ صاحب نے شمع روشن صحافت مولانا عبدالمجید سالک اور "مولانا عبدالمجید سالک حقیقت میں افکار و حوادث ہیں" سے سلور جوبلی کی عیسوی تاریخیں نکالی ہیں - ابھی اور بھی بہت سی تاریخیں ہیں، جنہیں ہم نے صرف اس لئے قلم انداز کر دیا کہ کہیں قارئین "امروز" گھبرا نہ جائیں اور ابھی تو آپ نے حفیظ ہوشیارپوری صاحب کی ہی تاریخیں سنی ہیں - ان کے بڑے بھائی راحل ہوشیارپوری کو شاید اس واقعہ کی خبر نہیں ہوئی، ورنہ اتنی تاریخیں کہہ ڈالتے کہ کئی قسطوں میں بھی ختم نہ ہوتیں -

---

سالک صاحب کی سلور جوبلی کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنے حضرات نے اس موقع پر تقریریں کیں - ان سب نے کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور کہا - شوکت تھانوی صاحب نے جو مختصر سا مضمون پڑھا وہ مجموعۂ لطائف تھا - خود سالک صاحب نے جو تقریر کی، اس میں اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے کئی لطیفے کہہ گئے، لیکن میدان تاثیر صاحب کے ہاتھ رہا یعنی ان کی تقریر میں بھی لطیفے تھے اور تقریر کے خاتمہ پر قطعہ تاریخ پڑھا تو وہ بجائے خود لطیفہ تھا - یہ اور بات ہے کہ اس وقت سب خچا کھا گئے - اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مصرع تو اچھا ہے لیکن اس سے تاریخ نہیں نکلتی - بہر حال تاثیر صاحب کا مقصد تو پورا ہو گیا یعنی سب سے زیادہ داد انہی کو ملی اور محفل ختم ہوئی تو سب لوگوں کی زبان پر یہی مصرع تھا اور عجب نہیں ابھی اس کا چرچا چند روز اور رہے -

---

۳۰ دسمبر

کلکتہ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ ہندوستان تو بس ایک بہت بڑا اگالدان بن کے رہ گیا ہے، یعنی لوگ جابجا تھوکتے پھرتے ہیں - ہندوستانیوں کو تپ دق سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پان کھانے کی ممانعت کر دی جائے۔

سنا ہے، آل انڈیا پنواڑی کانفرنس کے آیندہ اجلاس میں یہ تجویز پیش ہونے والی ہے کہ اگر حکومت پان کو ممنوع قرار دینا چاہتی ہے تو کریان کو کیوں کھلا چھوڑ دیا جائے - پان خطرناک سہی، لیکن کریان سے تو زیادہ خطرناک نہیں - اگر یہ تجویز منظور ہو گئی تو سمجھ لیجئے کہ پنواڑی لوگ ماسٹر تارا سنگھ کو چونا لگا گئے -

---

پان کے تذکرہ میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ کچھ عرصہ ہُوا۔ ایک سکھ لکھنؤ کے ایک پنواڑی کی دکان پر گیا اور کہنے لگا۔ ایک پان بنا دو۔ لیکن چُونا ذرا کم ہو۔ پنواڑی نے پوچھا۔ سردار صاحب آپ زردہ کھاتے ہیں؟ جواب ملا کیوں نہیں۔ ہم نے زردہ بارہا کھایا ہے۔

سردار صاحب گلوری کلے میں دبائے ہوئے چند قدم ہی گئے تھے کہ سر چکرانے لگا۔ پہلے تو بھائی لہنا سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن جب انہیں معلوم ہُوا کہ یہ سب زردہ کا کرشمہ ہے اور زردہ تمباکو کو کہتے ہیں تو مارنے مرنے پر تُل گئے۔ وہ تو خیر گذری کہ پنواڑی ہندو تھا۔ ورنہ لکھنؤ سے زردہ اور زردہ کے ساتھ پان بھی غائب ہو جاتا اور صرف کرپان ہی باقی رہ جاتی۔

طب کی کتابوں میں پان کے بہت سے خواص لکھے ہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خاصیت جو صرف خان ممدوٹ کو معلوم ہو سکی، یہ ہے کہ پان "ممد السکوت" ہے۔ یعنی مُنہ بند رکھنے اور چُپ رہنے کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں۔ خان ممدوٹ نے اس نسخہ کو بارہا آزمایا اور ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ کلّہ میں گلوری دبائی اور بیٹھ گئے۔ اب جو کچھ کہئے وہ سنتے جائیں گے، مُنہ ہلتا رہے گا لیکن کھلے گا نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ سر بھی ہل جائے لیکن پان کی برکت سے سر ہلنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہوتا ہے جس کے معنی "نہیں" اور "ہاں" دونوں ہو سکتے ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ ؎

وہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
یاں ایک "پان" ہے مرا سب کے جواب میں

ماسٹر تارا سنگھ اور خان ممدوٹ کے درمیان جو معاملہ گزرا۔ اس کا حال لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اُدھر کرپان، اِدھر صرف پان۔ آخر کرپان کو خان کے پان سے ہار ماننی پڑی اور یہ تو پُرانا قصّہ ہے۔ لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں بھی یہی آزمودہ نسخہ کام آیا۔ کہتے ہیں، یہ معرکہ بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ یار لوگ تیغِ زبان کو سان پر چڑھا کے لائے تھے اور بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بنا رہے تھے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ ایسی تیز باتیں بھی کہہ ڈالیں، جن کی سرحد طنز و طعن سے گزر کے گالی کی سرحد پر جا ملتی تھی۔ لیکن یہ حربہ بھی بیکار ثابت ہُوا۔ یُوں کہئے کہ اُدھر "گالی" تھی اور اِدھر صرف "پان کی جگالی"

آخر یہ لوگ تھک ہار کے خاموش ہو رہے اور اُن سے "خان کے پان" کا کوئی جواب نہ ہو سکا۔

آج راقم الحروف کا ارادہ تھا کہ "حرف وحکایت" کو پان اور پان کے لوازم یعنی کتھّہ، چونہ اور چھالیہ کے تذکرے ہی تک محدود رکھا جائے اور اس پر سیاسیات خصوصاً مغربی پنجاب کی سیاسیات کی چھاؤں تک نہ پڑنے پائے، لیکن کیا کیا جائے چاہے پان کا ذکر ہو، چاہے جاپان کا، وزارت اور صدارت کے مخصوں سے مفر نصیب ہی نہیں۔ اصل بحث پان اور کرپان کی تھی لیکن پان سے خان اور خان سے وزارت اور صدارت تک اس طرح جا پہنچی کہ ہم خود حیران رہ گئے۔ ٹھیک ہے سے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بادہ و ساغر کو تو دیس نکالا مل چکا۔ ہمارے زمانے میں وزارت اور صدارت ہی ان کے قائم مقام رہ گئے ہیں۔

---

۱۷ دسمبر

محکمۂ مال کے پٹواریوں کی کانفرنس کی خبر سُن کے ایک صاحب نے جو پٹواریوں سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دو شعر لکھ بھیجے ہیں سے

مہاجرین کو انصاریوں نے لُوٹ لیا
جو بچ گئے انھیں پٹواریوں نے لُوٹ لیا
رجسٹروں کی غلط بخشیوں نے خوار کیا
کھتونیوں کی خطاکاریوں نے لُوٹ لیا

شاعر کو غصّہ تو پٹواریوں پہ تھا، انصاری صرف ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے لپیٹ میں آگئے اور بہت سے لوگ صرف اس لئے بچ گئے کہ وزن اور بحر کی مجبوریوں کی وجہ سے اُن کا ذکر شعر میں کسی طرح نہیں آسکتا تھا۔

دراصل ضرورت شعری کبھی کبھی شاعروں کو اس قسم کی حرکتوں پہ مجبور کر دیا کرتی ہے۔ مثال کے طور پہ یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہُوا زمانہ
وہ کانگریس کے چندے وہ سب کا مل کے کھانا

لوگوں نے چندہ تو زیادہ تر خلافت کمیٹی کا کھایا تھا، لیکن اس بحر میں خلافت کا لفظ کھپانا ناممکن تھا، اس لئے شاعر کو مجبوراً کانگریس کے تذکرہ پہ قناعت کرنی پڑی۔

چندہ کھانے کے ذکر میں ہمیں یاد آیا کہ مرزا غالبؔ کے زمانے میں لوگ غمِ الفت کھاتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ اسی لئے تو مرزا نے کہا ہے ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا رہیں دلّی میں پہ کھائیں گے کیا

پھر ایسا زمانہ آیا کہ لوگ چندہ کھانے لگے۔ اب اس کا رواج بھی اٹھتا جا رہا ہے یعنی لوگ اوّل تو چندہ دیتے ہی نہیں اور دیتے ہیں تو کھانے نہیں دیتے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ یار لوگوں کی قوّتِ ہضم میں فتور ہے۔ یعنی اُن سے چندہ ہضم نہیں ہوتا۔ توبہ کیجئے کہ اس زمانے میں تو لوگ "الاٹمنٹ" جیسی مقوّی غذا کھاتے ہیں۔ فیکٹریاں، دکانیں، مکان اور زمینیں ہضم کرتے چلے جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ پھر بیچارے چندہ کی کیا بساط ہے کہ ہضم ہونے سے انکار کرے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس زمانے میں چندہ سے زیادہ مقوّی اور سریع الہضم غذائیں نکل آئی ہیں جنہیں ہضم کرنے کے لئے تقریر کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"بعض لوگوں کو چیانگ کائی شیک کے نام سے یہ شبہ ہُوا ہے کہ یہ صاحب مسلمان ہیں میرے ایک دوست کو تو یقین ہے کہ اُن کے نام کا آخری جزو شیک دراصل "شیخ"

تھا۔ جو چینی تلفظ کی عجوبہ کاریوں کی بدولت شیک بن گیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس خیال میں کس حد تک صداقت ہے؟"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ کے دوست کا خیال بالکل درست ہے چیانگ کائی شیک صاحب اصل میں چیانگ کائی شیخ ہیں اور کشمیر کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ سے قرابت رکھتے ہیں۔ اسی لئے تو پنڈت نہرو کی ان سے اتنی محبت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ سر لوئی ڈین جو مدت تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے ہیں، بڑے پکّے مسلمان تھے اور ان کا اصل نام علاؤ الدین تھا۔ مشہور ادیب اور شاعر آسکر وائلڈ کے نام اور نسب کے متعلق بھی لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ یہ شخص بحرین کا رہنے والا تھا اور اس کا نام اصغر ولید تھا، جسے انگریزوں نے آسکر وائلڈ بنا دیا۔ یہی ماجرا بیچارے شیکسپیئر پہ گذرا۔ وہ مسقط کے ایک مشہور قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جوانی میں سلطان مسقط کے سفیر کی حیثیت سے انگلستان گیا۔ چونکہ اُس کے ساتھی اُسے شیخ سفیر کہتے تھے۔ اس لئے وہ اس نام سے مشہور ہو گیا اور انگریزوں نے اُس کے نام کو بگاڑ کے شیکسپیئر بنا لیا۔

نہ جانے مسلمانوں کو یہ شوق کیوں ہے کہ ہر نام کو عربی کے قالب میں ڈھال دیا جائے اور ہر ایسے شخص کو جس کے نام کا کوئی حصہ اس قالب میں ڈھل سکتا ہو، عرب ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ پچھلے دنوں بعض اخباروں نے عرب لیجن کے کمانڈر گلب پاشا کو غالب پاشا لکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ گلب صاحب انگریز ہیں اور مسلمانوں سے بجز اس کے اور کوئی تعلق نہیں رکھتے کہ برطانیہ نے انہیں شرق اردن کے حکمران شاہ عبداللہ پر مسلّط کر رکھا ہے۔

اگر یہ صاحب چیانگ کائی شیک کو چیانگ کائی شیخ بنا کے مسلمان ثابت کرنے پر ایسے ہی تُلے ہوئے ہیں تو یُونہی سہی۔ ہم انہیں کیوں روکیں۔ لیکن یہ بات انہیں بہت دیر میں یعنی اس وقت سُوجھی، جب "شیخ صاحب" صدارت سے استعفا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

۱۸ر دسمبر

تاثیر صاحب نے مولانا عبدالمجید سالک کی سلور جوبلی کے موقع پر جو تاریخ کہی ہے، اس کا ذکر کسی پچھلی اشاعت میں آچکا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں تاثیر صاحب نے ذیل کا خط لکھا ہے، جسے من وعن درج کر دیا جاتا ہے۔ تاثیر صاحب نے جو توجیہہ فرمائی ہے۔ اس کے بعد بھی ایک عدد کا فرق رہ جاتا ہے جسے انھوں نے اس طرح پورا کیا ہے کہ عبدالمجید کا الف شمار نہیں کیا۔ اس قسم کے تصرف کی سند تو شاید ایک آدھ ہی ملے، لیکن تاثیر صاحب کی خاطر سے ہم مان لیتے ہیں کہ ایک عدد کی کمی بیشی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ اے کاش پہلے مصرع میں کوئی لفظ ایسا موجود ہوتا جس سے اس تعمیہ کی جانب سننے والوں کا ذہن منتقل ہو جاتا۔ اس سے تو یہ شعر بہتر تھا ؂

آئی آواز "ہے دبیرالملک
ملک عبدالمجید خاں سالک"
۱۳ ۵ ۶۴

"واحسرتا کہ آپ جیسے مورخ نے میری تاریخ کی یہ قدر کی۔ لطیفۂ غیبی کو محض لطیفہ بنا دیا۔ سالک صاحب کے سنانے کے لئے جو تاریخ کہی تھی۔ وہ بلا تخرجہ و تعمیہ تھی۔ آپ نے اور انہوں نے بھی سن کر داد دی۔ لیکن وہ ناقابلِ طباعت ہے۔

عام محفل کے لئے میں نے ہجری اور عیسوی دونوں طرح کی تاریخیں ملک عبدالمجید خاں سالک کے نام سے تعمیہ کے ساتھ نکالیں۔ ایک سے زیادہ مثلاً"

گوہر درج جسم و جاں سالک
دلبر و یارِ مہرباں سالک
گشت تاریخ او بموقعِ جشن
ملک عبدالمجید خاں سالک

کیونکہ موقع جشن جوبلی کا تھا جس کا اضافہ برمحل تھا۔ عیسوی تاریخ کے لئے تیسرا مصرع گشت تاریخ بطریقۂ خوب بنا دیا تھا۔ اس طرح تعمیہ کا ذکر بھی آگیا۔ جشن کے موقع پر جو "تاریخ" میں نے

سرِعام پڑھی تھی - اس کا تعمیہ واضح تھا، کیونکہ تیسرے مصرع میں ہیں نے ہاتف کی بجائے دبیر فلک کہا اور اس کے ساتھ آہ ملا کے تین سو باون کی کمی پوری کردی تھی ؎

گفت تاریخ او دبیرِ فلک
ملک عبدالمجید خاں سالک!

یہ ایک غیر معمولی سیدھی سادی تاریخ تھی - نہ اس میں لطیفہ تھا نہ الہام، مگر اسے غلط کہنا سراسر غلط ہے - چنانچہ آپ نے یہ غلطی نہیں کی - لطیفہ سازی کی ہے، سو وہ آپ کا کام ہے!

یوں بڑے بڑے شاعروں نے تعمیہ برتا ہے اور اسے خوبی کے طور پر برتا ہے - سودا نے میرزا مظہر جانِ جاناں کی شہادت کی تاریخ تعمیہ سے نکالی - مومن نے کیا عمدہ تخرجہ کیا ہے - اپنی بیٹی کی نال کٹنے پر کہا ؎

نال کٹنے کے بعد ہاتف نے
کہی تاریخ "دخترِ مومن"

نال کے عدد دخترِ مومن کے عدد سے نکال کے تاریخِ ولادت پوری کی - البتہ لطیفہ یہ ہوا کہ بعض حضرات نے میرے تعمیہ کی طرف توجہ نہ فرمائی - بحمداللہ کہ نگہِ تنقید سے سکوتِ عین اوجھل ہوگیا - عبدالمجید کی عین کا گرنا نظر نہ آیا، گو میں سکوتِ عین کو ناجائز نہیں سمجھتا - اس لئے کہ اردو میں عین کا تلفظ الف کی طرح ہے اور الف حرفِ علت ہے، جس کا گرنا جائز ہے -

بہرصورت تاریخ گوئی محض ایک کرتب ہے - فرصت ہو تو تاریخ پہ تاریخ کہتے جاؤ - سالک صاحب کو قدرت نے دلکش لحن عطا کیا ہے - اسی سے تاریخ کہہ لو ع

لحنِ دلکش عبدالمجید خاں سالک

ان کے علم وفضل کا تذکرہ کرنا ہو تو "زبدۂ روزگار عبدالمجید خاں سالک" کہہ لو اور اگر خان کا لفظ ہٹا کر فقط عبدالمجید سالک کہنا ہو تو پھر ع مخزنِ شرافت عبدالمجید سالک" عیسوی تاریخ ہوجائے گی - غرض اس طرح کا الٹ پھیر کرنا کیا مشکل ہے - البتہ کبھی کبھی الہامی تاریخیں نکلتی ہیں - امرتسر مرحوم کی مسجد خیرالدین کی تاریخِ تعمیر شاید مولانا حالی نے کہی تھی ع

"جزاک اللہ فی الدارین خیرا"

اور ۱۳۶۹ھ میں جب نواب ہیبت علی خاں کے ہاں ایک بیٹا کوثر علی پیدا ہوا تو کسی نے تاریخ کہی۔ انا اعطیناک الکوثر! یہ الہامی تاریخیں ہیں۔ ورنہ حضرت علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ فنِ تاریخ کی کتاب پکڑی اور عدد شماری کر لی۔ چنانچہ بر اون کی تاریخ وفات انہوں نے کسی کتاب سے لی تھی۔

میں تو حساب میں کبھی بھی برق نہ تھا، اسی لئے یوم الحساب سے ڈرتا ہوں۔ تاریخ کے عدد غلط بھی گن لیتا تو کیا ہوتا۔ گو آپ کی دوست نوازی سے توقع ہے کہ آپ غلطی کو بھی خوبی بنا کر دکھائیں گے۔

اگر آپ اس سال اپنی سوانح عمری لکھیں تو "احوالِ چراغ حسن" کتنی مناسب تاریخ ہو اور میری غلطیاں نکالیں تو میں "چراغ حسن گزیدہ" ہو جاؤں۔ غالباً اس سال آپ کی جوبلی بھی منائی جائے گی۔ تاریخ ہو گی "سیرتِ حسرت" اور نہ منائی گئی تو تاریخ ہو گی "حسرتِ مسرت"۔ مدعا یہ کہ یہ ایک کھیل ہے۔ اس پہ داد کیا اور بے داد کیا! مگر خدا لگتی کہنا، جوبلی کے لئے "جشنِ ملک عبدالمجید خاں سالک" بری تاریخ نہیں۔ آخر تاریخ سالک کی نہیں۔ اس کے جشن کی چاہئے! اور جو داد نہ دو تو تم سے پیرِ تسمہ پا سمجھے۔

تاثیر "

---

۱۹ دسمبر

ہمارے ایک معاصر نے "مغربی پنجاب میں روسی گیہوں" کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ چھاپا ہے، جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :۔

پنجابیوں کے لئے یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ آج ہم روس سے گیہوں منگوا کے کھا رہے ہیں۔

بات ٹھیک بھی ہے۔ اگر باہر سے گیہوں منگوانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تو آسٹریلیا سے آئے، کناڈا سے آئے، چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن روس سے کیوں آئے؟

یہ روسی گیہوں آپ نے دیکھا ہوگا۔ سُرخ رنگ کے موٹے موٹے دانے ہوتے ہیں۔ پھر دانہ دانہ اشتراکیت کی چھاپ۔ جو لوگ اسے کھائیں گے، اُن پر کوئی آفت آ گئی تو اس کا ذمّہ دار کون ہوگا؟ اس سے تو اچھا ہے کہ جوار اور باجرا کھائیے۔ وہ بھی نہ ملے تو ہوا پھانکیے۔ یا معاصر مذکور کے مشورے پر عمل کیجیے اور شرم سے ڈوب مریئے۔ بہر حال شرم سے ڈوب مرنے کا "مقام" تو آگیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اور آپ شرم سے ڈوب مرنے کے بجائے بھی "مقام" سے کنّی کاٹ کے نکل جائیں۔

بعض فقرے گھس گھسا کے کچھ ایسے بے معنی ہو گئے ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ مثلاً اکثر تقریریں ہمیشہ اس فقرے سے شروع ہوتی ہیں۔

"بھائیو! وقت آگیا ہے کہ ہم سب متحد ہو جائیں"۔

لیکن اس معاملے میں تقریر کرنے والوں کو ہمیشہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ یعنی "وقت" ابھی کہیں لنڈن میں ہے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس لاہور پہنچ گیا، یا راستے میں اس کا ہوائی جہاز خراب ہو گیا لیکن یار لوگ ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "وقت" لاہور میں دندنا رہا ہے۔ اسی طرح یہ "شرم" سے ڈوب مرنے کا مقام ہے" بھی بے معنی فقرہ ہے یعنی کہنے کو تو کہہ دیتے ہیں کہ "ڈوب مرنے کا مقام" آگیا۔ لیکن ہم نے کسی کو اس مقام سے فائدہ اٹھاتے یعنی ڈوب مرتے نہیں دیکھا۔

"سول" کے رپورٹر نے لکھا ہے کہ مغربی پنجاب کی اسمبلی میں "اَن پڑھ" ممبروں کا جو گروپ ہے اس میں چودھری فضل الٰہی وزیر تعلیم بھی شامل ہیں۔ دراصل "سول" کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چودھری فضل الٰہی صاحب "ان پڑھ" ممبروں کے گروپ میں شامل نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ دن کو وزارت کرتے ہیں۔ رات کے وقت اس گروپ کے ارکان کو ایک جگہ جمع کر کے انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ گویا اس گروپ کے اجتماعوں میں وزیر تعلیم کی شرکت کا تعلق سیاسیات سے نہیں بلکہ تعلیم بالغاں کی تحریک سے ہے۔

چودھری صاحب کے تذکرہ میں ایک اور بات یاد آگئی۔ حال میں انھوں نے چکوال کے ایک

اجتماعِ عام میں تقریر کی جس میں انھوں نے ارشاد فرمایا:۔

"کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے موجودہ حملے کا اصل مقصد یہ ہے کہ منگلہ ہیڈ ورکس پر قبضہ کر لیا جائے اور نہر اپر چناب کے پانی کو بند کر کے پاکستان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔"

ہمیں جہاں تک معلوم ہے، منگلہ ہیڈ کا تعلق چناب سے نہیں بلکہ جہلم سے ہے۔ لیکن اگر "منگلہ ہیڈ" نے جہلم کے بجائے چناب سے رشتہ جوڑ لیا ہے تو وہ بالکل "ان پڑھ" ہے اور جغرافیہ ہرگز نہیں جانتا۔ وزیرِ تعلیم کو چاہیئے کہ اسے بھی اپنے نائٹ سکول میں داخل کر کے تھوڑا سا جغرافیہ سکھا دیں۔ رائے انور خاں کھرل کو ان پڑھ گروپ کے نائٹ سکول میں داخل کر لیا ہے تو بچارے منگلہ ہیڈ نے کیا قصور کیا ہے کہ اس سعادت سے محروم رہے اور زیادہ جغرافیہ سکھانے کی بھی ایسی کیا ضرورت ہے، جہلم اور چناب ہی کا فرق سمجھ میں آجائے تو غنیمت سمجھئے۔

۲۱ر دسمبر

پچھلے دنوں راقم الحروف نے ایک شعر نقل کیا تھا جس میں عین کو حرفِ علت سمجھ کے گرا دیا گیا ہے دو چار دن کے بعد تاثیر صاحب نے مولانا عبدالمجید سالک کی سلور جوبلی کی تاریخ کہی تو اس میں بھی یہی نقص موجود تھا۔ لیکن ان دنوں بعض نوجوان شعرا کا جو کلام راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حروفِ صحیح کو حروفِ علت پر قیاس کر کے ساقط کر دینا چنداں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً ایک مشہور ادبی رسالہ میں حکیم مجید امجد صاحب تاثیر کی ایک نظم چھپی ہے۔ جس میں اسی صنعت سے کام لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

آج آغاز۔ کل انجام۔ پھر عقبےٰ کیا ہے
ہم پہ کیا بیت رہی ہے یہ تماشا کیا ہے

پہلے مصرع میں عین ساقط ہے۔ یعنی پھر عقبےٰ "پھر قبا" بن کے رہ گیا ہے۔

اسی رسالے میں جناب جعفر شیرازی کی ایک غزل چھپی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

قفس میں کیا ذکر بجلیوں کا بس ہم کو اتنی خبر ملی ہے
کہ ساکنانِ چمن کو مر مر کے زیست بارِ دگر ملی ہے

پہلے مصرع میں ہائے ہوز پر آفت آئی، یعنی "بس ہم" "بسم" بن گیا ہے۔ جعفر شیرازی صاحب کو اگر شیراز سے آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے تو انہیں معذور سمجھنا چاہئے۔ تازہ وارد ایرانی "ہم" کو "ام" کہتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "ام" کے الف کو گرا دینا جائز ہے۔ لیکن اگر وہ اسی قسم کے "شیرازی" ہیں جس قسم کا "جہازی" راقم الحروف ہے، جب تو جواز کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا۔

نئے شعرا کے کمالات سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک صاحب ہزج میں نظم لکھنے بیٹھے ہیں اور بحرِ رجز میں جا پڑے ہیں اور وہاں سے طرآرہ جو بھرا ہے تو بحرِ رمل میں پہنچ کے دم لیا ہے۔ قافیہ نہیں تو نہ سہی، لیکن ان حضرات کو بحر و وزن کا تو خیال رکھنا چاہئے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں بحر و وزن کی پابندی پر بھی کوئی ایسا اصرار نہیں۔ اگر حضرات شعرائے کرام یہ بات طے کر لیں کہ آئندہ "صنعتِ بے بحری" میں شعر کہا کریں گے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن بحر و وزن کی پابندیاں اٹھانے سے پہلے ان پابندیوں سے واقف ہونا تو ضروری ہے۔

راقم الحروف نے ایک مرتبہ ایک نوجوان شاعر کا کلام سن کے بعض غلطیوں کی جانب اشارہ کیا اور کہا کہ اگر یہ نقائص نہ ہوتے تو نظم کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ انہوں نے یہ سن کے کسی قدر ناگواری سے فرمایا۔ "لیکن میں ان غلطیوں کو غلطیاں نہیں سمجھتا"۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ اگر آپ نے دیدہ دانستہ یہ غلطیاں کی ہیں تو آپ کے "مجتہد" ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن اگر آپ کو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے کلام میں یہ نقائص موجود ہیں تو یہ "اجتہاد" نہیں بے خبری ہے۔

یورپ میں جو لوگ نئی شاعری کے علم بردار ہیں، ان کا یہ حال نہیں۔ وہ شاعری کے اصولوں اور قاعدوں سے پوری طرح باخبر ہیں اور پرانے اصولوں سے دیدہ دانستہ انحراف کرتے ہیں لیکن

ہمارے یہاں "بے خبری" کو "اجتہاد" کہا جاتا ہے۔ گویا یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ ہے۔

۲۵ر دسمبر

سنا ہے کہ انڈمان اور نکوبار کے جزیرے جو پہلے "کالا پانی" کہلاتے تھے۔ اب شاید "سبھاش دیپ" کہلائیں۔ مسٹر سبھاش چندر بوس کو آپ جانتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی برطانوی حکومت ہی کے باغی نہیں تھے۔ کانگرس کے بھی باغی تھے اور کانگریسی لیڈروں کا بس چلتا تو انہیں کالے پانی ہی بھجوا کے دم لیتے۔ بہرحال ہندوستانی لیڈر انہیں جیتے جی کالے پانی نہ بھجوا سکے تو کیا ہوا، مرنے کے بعد تو بھجوا دیا۔ گویا اس طرح ان کی یادگار بھی قائم ہو گئی اور ایک پرانی خلش بھی مٹ گئی ؎

قربان میں اس سوگ نشینی کی ادا کے
رکھ دی ہے مرے نام کی اک شمع جلا کے

یادگاریں قائم کرنے کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ بعض یادگاریں ایسی ہوتی ہیں جن پہ بے شمار روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور بعض ایسی کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔ یہ یادگار بھی اسی قسم کی ہے۔ اب اگر ہندوستان کی حکومت دلی یا کلکتہ کا نام گاندھی پور یا گاندھی نگر رکھ دے تو گاندھی جی کی یادگار قائم کرنے کا مسئلہ بھی آسانی سے طے ہو تا ہے۔ پچھلے دنوں تو ایک صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ہندوستان کا نام گاندھستان رکھ دیا جائے۔ نہ جانے اس تجویز کا کیا حشر ہوا۔ بہرحال اگر ہندوستان کے لیڈر یہ تجویز منظور کر لیتے تو ایک بہت بڑے فرض سے باآسانی سبکدوش ہو جاتے۔

کچھ عرصہ ہوا ایک حلقے کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مال روڈ کا نام اقبال روڈ رکھ دیا جائے۔ کارپوریشن والے، مال روڈ کو ممدوٹ روڈ بنانے کی فکر میں تھے۔ اس تجویز کا چرچا ہوا تو انہوں نے پیش بندی کے طور پر میو روڈ کا نام اقبال روڈ رکھ دیا اور اس ترکیب سے مال روڈ کو صاف بچا لے گئے۔

اس پریشانی سے نجات ہوئی تو اب خیال تھا کہ صورت نکلوا کے خان ممدوٹ کو تکلیف دی جائے کہ وہ مال کو پامال کر کے اسے ممدوٹ روڈ بنا دیں لیکن عین کریال میں غلّہ لگا۔ یعنی میاں محمد ممتاز دولتانہ اور خان ممدوٹ کا جھگڑا شروع ہوا اور مال روڈ کی الاٹمنٹ کا قصہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔ دولتانہ صاحب مری تشریف لے گئے تو یار لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر لگن اور ممدوٹ کا قصہ چھڑا۔ ابھی یہ مرحلہ طے نہیں ہوا کہ صدارت کا معاملہ سامنے آیا۔ یعنی ؎

ستارہ اے بدرخشید و ماہ مجلس شد

اور مال روڈ کو ممدوٹ روڈ بنانے کا معاملہ پھر ملتوی کرنا پڑا۔ اب خدا جانے یہ سڑک ممدوٹ روڈ بنتی ہے یا اس کی قسمت میں دولتانہ روڈ بننا لکھا ہے لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ مال روڈ کو دولتانہ سے زیادہ مناسبت ہے کیونکہ مال اور دولت دونوں مرادف الفاظ ہیں۔

ہم اس معاملے میں کسی کے طرفدار نہیں۔ مال روڈ دولتانہ صاحب کے حصے میں آئے یا خان ممدوٹ کے پلّے پڑے ہر حالت میں سڑک ہی رہے گی لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس وقت دلائل کا پلّہ دولتانہ صاحب کی طرف جھکا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کے خان ممدوٹ کی طرف جھک جائے۔ کیونکہ دلیلیں آخر آسمان سے نہیں اترتیں بلکہ تراشی جاتی ہیں اور الاٹمنٹ کی "پنیری دلیل" قبضے میں ہو تو اس ایک دلیل سے بیسیوں دلیلیں نکلتی چلی جاتی ہیں اور ترازو کے پلڑے کو جھکانا کچھ مشکل نظر نہیں آتا۔ بہر حال اس وقت تو خان ممدوٹ کا یہ حال ہے کہ ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے

شعر داغ کا ہے لیکن اس موقع پر اس سے "مال روڈ" مراد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مال روڈ کا رُخ جس طرف ہوگا، مغربی پنجاب کی اسمبلی کا رُخ بھی اُسی طرف پلٹ جائے گا۔

---

۲۹ دسمبر

کھکھری گورکھوں کا مشہور ہتھیار ہے، راجپوت کھانڈے اور سروہی کے عاشق ہیں۔ عرب سیف کو جس کے دونوں طرف باڑھ ہوتی ہے، دوسرے ہتھیاروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ پنجاب کے لوگوں نے لٹھ کو تلوار کا قائم مقام سمجھ رکھا ہے، ملایا اور جاوا کے باشندوں کا خاص ہتھیار "کرس" ہے جس کا زخم مشکل ہی سے مندمل ہوتا ہے لیکن لیگ کونسل کے اجلاس میں پہلی دنیا پر یہ انکشاف ہوا کہ لیڈروں اور کونسلروں کا خاص ہتھیار "کرسی" ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ لڑائی "آفس اور کُرسی" کے لئے ہو تو کرسی سے زیادہ موزوں ہتھیار اور کیا ہوگا۔ ان لیڈروں اور کونسلروں نے بھی کیا شاعرانہ مذاق پایا ہے کہ لڑتے وقت بھی لفظی رعایتوں اور مناسبتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یعنی کرسی کے لئے لڑتے ہیں تو کرسی ہی کو حربہ بنا لیتے ہیں۔

رعایتِ لفظی کے تذکرہ میں راقم کو یاد آگیا کہ لکھنؤ کے نواح میں کُرسی نام ایک مقام ہے، جہاں کے احمق مشہور ہیں۔ لیکن کُرسی کے احمقوں کا تذکرہ محض جملۂ معترضہ ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ احمقوں کی کرسی سے وزارت اور صدارت کی کرسیوں کا کیا تعلق؟

سُنا ہے کہ جب گالیوں کی گولیوں کے ساتھ کرسی کا گُرز چلنے لگا تو دولتانہ صاحب ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اجلاس یا یوں کہنا چاہئے کہ لڑائی کو آدھ گھنٹے کے لئے ملتوی کر کے اور صدارت کی کرسی کو کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کے باہر نکل آئے۔ افسوس ہے کہ کشمیر کا میدانِ جنگ مسلم لیگ کے دفتر سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔ ورنہ دولتانہ صاحب اوڑی ہی کا رُخ کرتے۔ کیونکہ وہاں گولیاں تو چلتی ہیں، لیکن کرسیاں نہیں چلتیں۔

ادھر لیگ کونسل میں تو یہ ماجرا گزرا۔ ادھر لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں یہ کیفیت نظر آئی کہ مغربی پنجاب کی سیاست کے علی بابا یعنی ملک فیروز خاں نون وزارتِ عظمیٰ کے پھاٹک پر کھڑے "کھل سم سم" کے نعرے لگا رہے ہیں اور چالیس ممبر قطار باندھے ان کے پیچھے کھڑے ہیں۔ لیکن یہ بات

ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس برات کے دولھا دولتانہ صاحب ہیں یا نُون صاحب کیونکہ داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کی درگاہ میں دستار بندی تو دولتانہ صاحب کی ہوئی ہے اور وزارتِ عظمیٰ کا سہرا نون صاحب اپنے سر بندھوانا چاہتے ہیں۔

اس دستار بندی کا قصّہ آپ نے سُن لیا ہوگا۔ دولتانہ صاحب کو ان دنوں مذہب سے بڑا شغف ہے۔ تصوّف کی کتابیں بھی اکثر زیرِ نظر رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں وہ داتا گنج بخش کے مزار پر حاضر ہوئے اور درگاہ کے متولیوں نے ان کی دستار بندی کی رسم ادا کی۔ لیکن یہ راز ابھی تک نہیں کھُلا کہ یہ دستار بندی صدارت کے سلسلے میں تھی یا وزارت کے سلسلے میں۔ نون صاحب کو اس معاملے میں ذرا دلجمعی کر لینی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وزارت کے پھاٹک پر "کھل سم سم" ہی کے نعرے لگاتے رہ جائیں اور پھاٹک کھُلے تو دولتانہ صاحب سب سے پہلے جھپاک سے اندر جا پہنچیں۔

خان ممدوٹ کوئی خاص پیچ کھیل کے بچ جائیں تو بچ جائیں، ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ان پر بڑا کڑا وقت آ پڑا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ پہلے "الاٹ منٹ" کی ویل صرف ایک طرف تھی۔ اب دونوں طرف "الاٹ منٹ" ہی کا نورظہور ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو نئی وزارتیں الاٹ کریں گے۔ ادھر پندرہ وزارتیں الاٹ ہو جائیں گی۔ انہوں نے وزیروں کی تعداد سولہ تک پہنچائی۔ ادھر بیس تک جا پہنچے گی۔ غرض ے

حُورانِ خلد بولتی ہیں بڑھ کے بولیاں
نیلام ہو رہا ہے تمہارے شہید کا

---

۲۹ ر دسمبر

پچھلے دنوں ریڈیو پاکستان لاہور نے ایک محفلِ سرود کا انتظام کیا۔ گھنٹہ بھر کی محفل تھی

گانے والوں کے علاوہ سننے والے بھی خاصی تعداد میں موجود تھے، جنہیں خاص طور پر اس لئے دعوت دی گئی تھی تاکہ محفلِ سرود میں مشاعرہ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔

سب سے آخر میں موسیقی کے ایک مشہور استاد نے پکّا گانا شروع کیا۔ کچھ لوگوں نے سر ہلا ہلا کے داد دی۔ بعض جمائیاں لیتے اور اونگھتے رہے۔ محفل ختم ہو چکی تو کسی نے ایک معزز سرکاری عہدے دار سے جو شریکِ محفل تھے، پوچھا: آپ نے کیوں سر نہ ہلایا۔ جواب ملا اب گھر جا کے اطمینان سے سر ہلاؤں گا۔

فقرہ اچھا ہے اور جن لوگوں نے پکّا گانا یا اچھا شعر سُن کے کبھی سر نہیں ہلایا۔ وہ یہ فقرہ سُن کے ضرور سر ہلانے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگوں کو پکا گانا پسند نہیں تو ریڈیو والے کیوں اس مشغلہ پہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو گھر جا کے سر ہلانے کی زحمت سے بچانا ثواب کا کام ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ریڈیو والے اس مفت کے ثواب سے محروم رہے جاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں پہلے تو یہ طے ہو جانا چاہئے کہ پاکستان میں موسیقی، شاعری، مصوری وغیرہ کی گنجائش بھی ہے یا نہیں۔ اگر ان کے جواز کا کوئی پہلو نکل آئے تو پھر کہیں یہ بحث آئے گی کہ گانا کچّا ہو یا پکّا یا ادھ کچرا۔ شاعری صرف پند نامۂ شیخ عطار یا کریما کے انداز کی ہو یا اس دائرے سے باہر قدم رکھنے کی اجازت ہے۔ مصوّر شبیہ بھی بنا سکتے ہیں یا پاکستان کی مصوّری منظر کشی ہی تک محدود رہے گی۔ لیکن چاہے کسی قسم کے کچّے یا پکّے گانے کی اجازت ملے یا نہ ملے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ قوّالی پہ کوئی آنچ نہیں آنے پائے گی۔ "اے ہاں جی" کے نعرے ہمیشہ فردوسِ گوش بنے رہیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ جب یار لوگ "ارے ہاں جی" پہ سر ہلانا شروع کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر ہلانا ان کا پیشہ ہے یا بڑھاپے کی وجہ سے ان کا سر ہل رہا ہے۔

کچھ عرصہ سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ علامہ اقبال کے کلام کو قوّالوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

اور یہ قوال لوگ علامہ مرحوم کے کلام پر "ارے ہاں جی" کا اضافہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ یہ "ارے ہاں جی" مصرع کا جزو معلوم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ریڈیو پر قوال علامہ اقبال کی وہ مشہور غزل گا رہے تھے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مُرغِ چمن

قوال کو جوش جو آیا تو اس نے "لالہ - لالہ" کی تکرار اس طرح شروع کی، گویا اسے لالہ بھیم سین سچر کی یاد آگئی ہے، جواب تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یعنی ؏

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

یا پھر ریکارڈ خراب ہے اور گراموفون کی سُوئی ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے۔

ہمیں نہ تو قوالوں سے کوئی کد ہے۔ نہ قوالی پر کوئی اعتراض۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ علامہ اقبال کے کلام کو ان کی "دستبردِ تُرکانہ" اور "تکرارِ قوالانہ" سے بچانے کا کوئی انتظام ضرور ہونا چاہئے اور اکثر اوقات تو یہ بزرگوار کلامِ اقبال میں اصلاح بھی فرما دیتے ہیں یعنی اس بے تکلفی سے "ارے ہاں جی" کا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں گویا اس کے بغیر علامہ اقبال کا کلام نامکمل ہے۔

۱۹۵۰

جنگ نامۂ وزارت

بدہ[1] ساقی آں مے کہ تا دم زنیم
قلم بر سرِ ہر دو عالم زنیم

مجھے بادۂ مشکبو کر الاٹ
مئے ارغواں کا سبو کر الاٹ

پلا ساقیا آبِ آتش لباس
کہ ملّائے مسجد کے گم ہیں حواس

عسس سے نہ ڈر محتسب سے نہ ڈر
ہیں دونوں پڑے مست اور بیخبر

ہیں مفتی و شیخ اور میر و وزیر
کمندِ ہوا و ہوس کے اسیر

ہے واعظ امارت کے خوابوں میں گم
تموّل کے زرّیں سرابوں میں گم

فقیہوں کو ہے کارخانوں کی فکر
دوکانوں کی فکر اور مکانوں میں فکر

پلا ساقیا آبِ یاقوت رنگ
کہ اربابِ دولت ہیں مصروفِ جنگ

حجاباتِ مستی اٹھا کر پلا
نگاہوں کی مستی ملا کر پلا

ادھر اہلِ مسجد ادھر اہلِ دیر
سبھی دیکھتے ہیں لڑائی کی سیر

بیک[2] باش و رطل گرانم بدہ
اگر فاش نتواں بہانم بدہ

ہوس نے ہے چھیڑا تباہی کا راگ
گرجتی ہیں توپیں برستی ہے آگ

ادھر دولتانہ شہِ جم سپاہ
سپہدارِ گردانِ زرّیں کلاہ

لیے ساتھ حیلوں بہانوں کی فوج
وہ وعدوں کے لشکر فسانوں کی فوج

۲،۱؎ حافظ

غرورِ شہی سے نظر تابناک — مگر دامنِ آگہی چاک چاک
وہ فیروز خاں نون مردِ جری — نگاہوں میں ہے جس کی افسوں گری
جسے یاد ہیں سب لڑائی کے ڈھنگ — لڑائی کے جنگ آزمائی کے ڈھنگ
کرامت علی گردِ لشکر شکن — جسے مانتے ہیں سب اربابِ فن
سیال اور چھٹے بسال اور کھرل — چلے رزم گہہ کی طرف دَل کے دَل
لئے پلٹنیں اور رسالے چلے — کئی ساتھ اخبار والے چلے
چلے اور پرچم اڑاتے چلے — ستاروں سے آنکھیں لڑاتے چلے
کوئی ان میں لندھور کی یادگار — کوئی رستم اور کوئی اسفندیار
کوئی ان میں پوتا ہے کاؤس کا — بھتیجا سگا ہے کوئی طوس کا
ادھر خان ممدوٹ مردِ دلیر — وزارت کے بیشے کا غرّندہ شیر
شجاعت میں یکتا شہامت میں فرد — بڑھا جانبِ عرصہ گاہِ نبرد
چلا ساتھ اس کے وہ گرگِ کہن — پلِ نام آور محمد حسن
لئے ساتھ ملتان کے گھڑ چڑھے — مبارک علی اور دستی بڑھے
کسی سمت سے پاندانوں کی فوج — کسی سمت رنگیں بیانوں کی فوج
چلیں حرص کی پلٹنیں پیش و پس — ادھر بھی ہوس اور ادھر بھی ہوس
ہے کاندھے پہ ہر چند گرزِ گراں — دعاؤں میں مصروف لیکن زباں
جو مل جائے یارب کوئی فیکٹری — مری بھی ہو کشتِ تمنّا ہری
وزارت ملے یا صدارت ملے — کوئی مالِ بہرِ تجارت ملے
الٰہی مجھے بھی سکتّر بنا — کرمہا بہ بخشائے بر حالِ ما

ہُوا گرم ہنگامۂ کارزار نظر آئی دشوار راہِ فرار
وہ گالی کے چھرّے وہ طعنوں کے تیر گئے آن کی آن میں دل کو چیر
کمندِ اژدہائے مسلسل شکنج دہن باد کردہ بہ تاراج گنج
بڑا لطف اس ہاتھا پائی میں تھا مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا
لڑی بڑھ کے جاگیر جاگیر سے لیا کام نیزے کا تدبیر سے
اُدھر خوب کرسی سے کرسی لڑی مری سمت سے کس مپرسی لڑی
بڑھے دونوں جانب سے آتش بیاں بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں
بہت خوب اخبار والے[۱] لڑے مقالے سے بڑھ کر مقالے لڑے
نہ پانی گھڑے میں نہ چولھے میں آگ مگر خوب کھیلے لنگوٹی میں پھاگ

پلا ساقیا بادۂ لعل فام لنڈھا دے مئے ارغوانی کے جام
مئے احمریں سے کھلا دے چمن بیادِ شہیدانِ خونیں کفن
ہُوا ختم جاگیرداری کا دَور ٹوانے کا دَور اور لغاری کا دَور
اُٹھ اور ان سے تیغ و سناں چھین لے یہ ووٹوں کے گرزِ گراں چھین لے
مرا دَور ہے اور ترا دَور ہے
زمیں اور ہے آسماں اور ہے

---

۱ نظامی

یکم جنوری

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اس وقت دو بڑے بڑے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے جن میں ایک دولتانہ گروپ اور دوسرا ممدوٹ گروپ کے نام سے مشہور ہے، لیکن دولتانہ صاحب کو یہ نام پسند نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے کہ نہ لیگ کونسل میں ممدوٹ گروپ کا کوئی وجود ہے اور نہ لیگ اسمبلی پارٹی میں دولتانہ گروپ کے نام کی کوئی جماعت موجود ہے۔ ان کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن لیگ کونسل اور لیگ اسمبلی پارٹی میں جن دو حریف جماعتوں میں کشمکش ہو رہی ہے۔ ان کا کوئی نہ کوئی نام تو رکھنا ہی پڑے گا۔ دولتانہ صاحب کو لوگوں کا رکھا ہوا نام پسند نہیں تو وہ خود کوئی نام رکھ دیں۔ یہ ضروری نہیں کہ نام سے تاریخ بھی نکلے۔ یا نام رکھنے کے لئے جوتشیوں سے مہورت پوچھنی پڑے۔

اس سلسلے میں ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ چاہے دولتانہ صاحب اپنی جماعت کا نام "اللہ والے" رکھیں، چاہے اسے "مجاہدینِ کشمیر" یا "خدامِ مجاہدینِ کشمیر" کے نام سے پکاریں اور

چاہیے ازراہِ فیاضی اس بات کی اجازت دے دیں کہ اس جماعت کو ملک فیروز خاں نون کے نام پر "سلسلۂ عالیۂ نونیہ" کہا جائے، لوگ اسے دولتانہ گروپ ہی کہیں گے"۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں"۔ ہاں اگر وہ اس جماعت کو "بے نام" ہی رکھنے پر تلے ہوئے ہیں تو عجب نہیں کہ لوگ اسے "بے نامی گروپ" کہنا شروع کر دیں۔ اس "بے نامی" کی بدنامی سے تو یہی اچھا ہے کہ لوگ اس جماعت کو "دولتانہ گروپ" کہتے رہیں۔ اس لئے انہیں روکئے نہیں بلکہ چپکے ہو رہیے۔

پچھلے دنوں ایک محفل میں دولتانہ صاحب کی صلاحیتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اکثر لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے بارے میں شکوک تھے اور دبی دبی زبان سے اعتراض بھی ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک ایم۔ ایل۔ اے صاحب نے جو چپکے بیٹھے اعتراضات سُن رہے تھے، فرمایا "کچھ بھی ہو، ان کے خاندانی ہونے میں تو کوئی شک نہیں"۔ ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا اور محفل پر خاموشی چھا گئی۔ سچ پوچھئے تو شجرۂ نسب اور خاندان کی دلیل ایسی ہے۔ جس کے سامنے ساری دلیلیں بیکار معلوم ہوتی ہیں اور خاص طور پر جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں صاحب کے بزرگ لاٹ صاحب کے درباری تھے اور لارڈ لارنس نے ان کے پردادا سے ہاتھ ملا کے فرمایا تھا۔ "ویل، ہم بہت خوش"۔ بلکہ اس شجرۂ نسب پر انگریز بہادر کی مہر بھی ثبت ہے یعنی "سر لپیل گریفن" نے اپنی کتاب "پنجاب چیفس" میں ان کے خاندان کا ذکر کیا ہے تو گردنیں خود بخود جھک جاتی ہیں۔

خاندان ممدوٹ بھی "خاندانی" ہیں۔ لیکن وہ یو۔ پی والوں کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کیونکہ یو۔ پی میں طرۂ دستار کی لمبائی سے خاندان کو نہیں ناپا جاتا بلکہ پاندان کے وزن سے "خاندان" کے وزن کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ غرض یو۔ پی اور پنجاب کے معیار میں ناپ اور تول کا فرق ہے اور یہی فرق نون۔ دولتانہ اور خان ممدوٹ کے معیارِ نسب و خاندان میں نظر آتا ہے۔ ایک طرف وزن ہے اور دوسری طرف پھیلاؤ، جس نے قبیلہ کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ زیادہ اہمیت

حاصل کر لی ہے۔ ایک تلتا ہے اور دوسرا صرف ناپا جاتا ہے۔ ایک طرف گز ہے۔ دوسری طرف پنسیری۔ ایک کہتا ہے کہ "میری باتوں پہ نہ جا طرۂ دستار کو دیکھ"۔ دوسری طرف سے جواب ملتا ہے "اٹھا سکے تو میرا پاندان اٹھا"۔ یوں تو بزاز اور بنئیے میں بھی یہی ناپ اور تول کا فرق ہے۔ لیکن نہ بنیا "خاندانی" ہے نہ بزاز۔

پان اور خان۔ پاندان اور خاندان کے اس تذکرہ میں ایک بات اور یاد آگئی۔ خان ممدوٹ کہنے کو تو صرف وزیر اعظم ہیں، لیکن انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو "پان کے بادشاہ" بھی تو ہیں۔ ان سے وزارت چھنتی ہے تو چھن جائے لیکن پنجاب میں جہاں پان کھانے، پاندان رکھنے اور پاندان کے وزن سے خاندان کے وزن کا اندازہ لگانے کا رواج بہت کم ہے، یہ "بادشاہت" ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

۲ر جنوری

کریم بخش پہلوان پہلیہ انوالہ کہلاتا تھا۔ گونگا پہلوان جس کا اصل نام فیروز تھا، بالی والا کے لقب سے مشہور تھا۔ رستم زماں گاماں پہلوان جب رستم زماں نہیں بنے تھے تو لوگ انہیں گاماں کون والا کہتے تھے۔ میاں محمد ممتاز دولتانہ جو سیاسیات کے رستم زماں بننے کی فکر میں ہیں، ابھی تک تو دولتانہ "نون والا" بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کوئی عجب نہیں اگر وہ چند دنوں میں "نون" اور ارنون کے ساتھ "نون والا" کے لقب کو بھی دھتا بتائیں اور "دولتانہ بے نون" بن کے رہ جائیں۔

اور اس قسم کی خبریں تو ابھی سے مشہور ہو رہی ہیں کہ دولتانہ صاحب نون والا کے لقب سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ دو دن ہوئے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ راجہ غضنفر علی خاں مغربی پنجاب کی وزارت میں وزیر اعظم کی حیثیت سے تشریف لا رہے ہیں

اور چونکہ عربی میں غضنفر، شیر کو کہتے ہیں، اس لئے لاہور بھر میں شور مچ گیا ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

دولتانہ صاحب کے حامی کہتے ہیں کہ یہ آنا جانا سارا بے اصل افسانہ ہے۔ اس لئے اس "شیر آیا۔ شیر آیا۔ دوڑنا" کی طرف توجہ ہی نہ کیجئے۔ لیکن لوگوں کو یقین نہیں آتا اور وہ سر ہلا ہلا کے برابر کہے جا رہے ہیں کہ ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مسٹر غضنفر علی خاں کے وزیر اعظم بننے کی افواہ تو ممکن ہے کہ غلط ہو، لیکن نون صاحب کی خیر نظر نہیں آتی۔

ہمارے ایک معاصر نے پوچھا ہے کہ "خان ممدوٹ خاموش کیوں ہیں؟" یہ بات کچھ ایسی نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے اور اس کے لئے اخبار میں اشتہار دینا پڑے۔ دراصل دولتانہ صاحب نے کچھ اس طرح بولنا شروع کیا ہے کہ کسی دوسرے کے لئے بولنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی یا تو وہ ہر روز ایک آدھ تقریر جھاڑ دیتے ہیں۔ یا پھر اخباروں میں اُن کا بیان چھپ جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان کے ہاتھ جو بھان متی کا پٹارا آیا ہے۔ اس میں ہر قسم کی چھوٹی، موٹی، لمبی، پتلی، میٹھی، پھیکی، کڑوی، کسیلی تقریریں اور رنگا رنگ بیان موجود ہیں۔ خود ہی اعتراض کرتے ہیں۔ خود ہی جواب بھی دیئے جاتے ہیں۔ گویا وہ بیک وقت دولتانہ بھی ہیں اور خان ممدوٹ بھی۔ پھر خان ممدوٹ کیسے بولیں اور کیوں بولیں؟

انھوں نے مختلف موقعوں پر جو تقریریں کی ہیں اور بیان دیئے ہیں، ان کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:

۱۔ صدارت اور وزارت میں کوئی جھگڑا نہیں۔

۲۔ وزارت سے مجھے کوئی عناد نہیں

۳۔ میں صدارت کو چھوڑ کے وزیر بننا نہیں چاہتا۔

۴ - لیگ اسمبلی پارٹی میں کوئی دولتانہ گروپ نہیں۔

۵ - لیگ کونسل میں کوئی ممدوٹ گروپ نہیں۔

۶ - میں خان ممدوٹ کو وزارت سے ہٹانا نہیں چاہتا۔

۷ - میں خان ممدوٹ کی جگہ کسی خاص شخص کو ان کا جانشین بنانا نہیں چاہتا۔

گویا خان ممدوٹ اور دولتانہ صاحب میں کوئی جھگڑا نہیں، فساد نہیں، عناد نہیں، نہ دولتانہ صاحب کا کوئی رفیق ہے نہ حریف۔ نہ وہ ملک فیروز خاں کے دوست ہیں نہ خان ممدوٹ کے دشمن نہ نون کے حامی نہ تم کے مخالف اور کوئی دھڑے بازی نہ جتھے بندی۔ لوگ یونہی افسانے تراش کے ان قدسی نہاد بزرگوں کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ کچھ لوگوں نے جنھیں خان ممدوٹ پر اعتماد نہیں ایک محضر مرتب کیا اور اس پر دستخط کرانے شروع کر دیئے۔ چونکہ یہ لوگ بھی عارفان و صلحاء امت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے وہ حضرت قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین میاں محمد ممتاز خاں دولتانہ متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ اگر حضرت تھوڑی سی زحمت گوارا فرما کے اس محضر پر اپنے دستخط فرما دیں تو امید ہے کہ اللہ اس کام میں برکت عطا فرمائے چنانچہ حضرت خواجہ بزرگوار نے ازراہ تلطف اس محضر پہ دستخط کر دیئے اور پھر تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو گئے۔ اخبار والوں کو اس صائم اللیل اور قائم الدہر بزرگوار پر بہتان باندھنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ حضرت خواجہ مدظلہ العالی اہل لاہور سے ناراض ہو کے پھر کوہ مری تشریف نہ لے جائیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مئی کے مہینے میں جب حضرت میاں محمد ممتاز مدظلہ العالی نے ترک دنیا کا اعلان فرمایا تھا تو تمام علائق دنیوی سے قطع تعلق کر کے مری ہی تشریف لے گئے تھے۔ اب کے بھی انہیں غصہ آ گیا تو مری کے گرد و نواح کے کسی پہاڑ کی چوٹی کو اپنا مسکن بنائیں گے۔ اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ حضرت کے آئینۂ خاطر پہ گرد ملال نہ آنے پائے۔ ورنہ اگر وہ خدانخواستہ کہیں ناراض ہو کے چلے گئے تو ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے؟

۳ر جنوری

سُنا ہے۔ شرق اردن کے فرمانروا شاہ عبداللہ نے کرسمس پر شاہ جارج ششم اور پریزیڈنٹ ٹرومین کو مبارک باد کا پیغام بھیجا ہے۔ کرسمس میلادِ مسیح کا تیوہار ہے۔ مسیح فلسطین میں پیدا ہوئے تھے اور شاہ عبداللہ فلسطین کی بادشاہت کے امیدوار ہیں۔ اس لئے وہ شاہ جارج ششم اور پریزیڈنٹ ٹرومین کو اس موقع پر مبارک باد کا پیغام نہ بھیجیں تو اور کون بھیجے؟ اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کہیں سچ مچ فلسطین کے بادشاہ بن گئے تو اس قسم کے پیغام بڑی بھاری قیمتیں پائیں گے اور جس کرسمس کارڈ پر انہوں نے دستخط کر دیئے وہ تو قیمتی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا جائے گا۔

شاہ جارج ششم اور پریزیڈنٹ ٹرومین کو چاہئے کہ بچارے شاہ عبداللہ کو نرے شکریہ پر نہ ٹرخائیں۔ بلکہ مبارک باد کے جواب میں مبارک باد ہی کا پیغام بھیجیں۔ شاہ عبداللہ نے "کرسمس مبارک" کا پیغام بھیجا تو اس کا جواب "بادشاہت مبارک" ہی ہونا چاہئے اور سچ پوچھئے تو اس بچارے نے بھی اسی امید پر مبارک باد عرض کی ہے۔

ایک صاحب نے صدارت اور وزارت کے جھگڑے کے سلسلے میں ہمیں ایک لمبا خط لکھا ہے، جس کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

"وزارت اور صدارت کے اس جھگڑے کا اور کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، کم از کم یہ تو ہُوا ہے کہ دفتروں میں کام رُکا پڑا ہے۔ افسروں میں بعض لوگ جو خان ممدوٹ کے ساتھ ہیں۔ اُنہیں تو یہ اندیشہ ہے کہ وزارت بدلی تو ہماری خیر نہیں جو دولتانہ صاحب کے حامی ہیں، انہوں نے بڑی بڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ اس لئے انہیں بھی اپنے موجودہ کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور افسروں کا کیا ذکر ہے معمولی اہل کاروں کا بھی یہی حال ہے۔ کلرک سپرنٹنڈنٹ بننے کی فکر میں ہے۔ سپرنٹنڈنٹ محکمہ کا افسرِ اعلےٰ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ کسی دفتر میں جا کے دیکھئے۔ فائلوں کے انبار نظر آئیں گے۔ نہ کلرک کو دو فقرے لکھنے کی فرصت

نہ افسر کے پاس اتنا وقت کہ دستخط ہی کر ڈالے۔ فرمائیے اس کا کیا علاج ہے؟

اس کا علاج یہ ہے کہ دولتانہ صاحب اور خان ممدوٹ صدارت اور وزارت کی آڑ لے کے لڑنے کے بجائے سیدھی لڑ لیں۔ یعنی دولتانہ صاحب صدارت سے استعفا دیں۔ خان ممدوٹ وزارت سے مستعفی ہو جائیں اور پھر ایک دن لڑ کے جی کے حوصلے نکال لیں۔ اگر دونوں میں سے کسی کے زیادہ چوٹ آ گئی اور معاملہ پولیس کی دست اندازی کے قابل ہوا تو پولیس دونوں کو گرفتار کر کے خود عدالت میں پیش کر دے گی۔ ورنہ عدالت کا دروازہ تو ہر حالت میں کھلا ہے۔

لپاڈگی یا ہاتھا پائی، کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن وزارت اور صدارت کی آڑ لے کے لڑنے سے تو یہ طریقہ بہر حال زیادہ شریفانہ ہے۔ یہ لڑائی ذاتی ہے تو اسے ذاتی لڑائی سمجھ کے لڑیئے۔ اور سارے صوبے کو اس کی لپیٹ میں لانے کی کوشش نہ کیجئے اور اگر دولتانہ اور ممدوٹ کے علاوہ نون، شیخ کرامت علی، سردار شوکت حیات یا کوئی صاحب اس لڑائی میں حصہ لے کے اسے بلوہ کی صورت دے دینا چاہتے ہیں تو وہ بھی پیچھے نہ رہیں۔ اس لڑائی سے تو جو آج لڑی جا رہی ہے "کرسیوں کی لڑائی" ہی اچھی تھی۔ بشرطیکہ اس لڑائی میں حصہ لینے والے لیگ اور وزارت سے مستعفی ہو کے لڑتے۔ لیگ کے دفتر میں لڑنے کے بجائے میکلوڈ روڈ کے چوراہے پر، موچی دروازے کے باہر یا مال روڈ پر لڑتے۔ آج بھی یہ لوگ اگر لڑائی کا یہ طریقہ اختیار کر لیں تو ہم خوش، ہمارا خدا خوش، پولیس آئے گی۔ دونوں فریقوں کو گرفتار کر کے لے جائے گی۔ ہمارا "سٹاف رپورٹر" تھانہ تک ان کے ساتھ جائے گا اور ہم لڑائی کی خبر اس قسم کی سرخی سے چھاپ دیں گے۔

"مال روڈ پر سابق وزرا کے دو گروہوں میں لڑائی"
تین اشخاص زخمی ہو گئے۔

اور یہی نہیں۔ مقدمہ چلا تو اس کی خبر بھی چھاپیں گے اور اگر مقدمہ عدالت میں پیش ہونے

سے پہلے پولیس نے کسی فریق پر زیادتی کی تو ہم اس کے طرزِ عمل کی بھی مذمت کریں گے لیکن اس موضوع پر مقالۂ افتتاحیہ نہیں لکھیں گے۔ ہمارے معاصرین میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوگی کہ یہ لڑائی اسلام کی خاطر یا دفاعِ پاکستان کے لئے لڑی جارہی ہے۔ سرکاری افسر اور اہلکار ہاتھ پر ہاتھ دھرکے نہیں بیٹھے رہیں گے بلکہ کبھی کبھی اخبار میں اس مقدمہ کا حال بھی پڑھ لیا کریں گے۔

۴ر جنوری

سنا ہے آج صبح جب ایک ایم۔ایل۔اے صاحب کو جو وزارت کے امیدوار ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ کشمیر میں لڑائی بند کردی گئی تو وہ کہنے لگے۔ کیا ہوا۔ ہم نے جو لڑائی شروع کر رکھی ہے۔ وہ تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔

بات ٹھیک تو ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں سمجھوتہ ہوگیا تو کیا ہوا۔ مغربی پنجاب کے حالات میں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ صدر و وزیر کی لڑائی تو جاری ہے اور یہ لڑائی ایسی ہے۔ جس میں سکیورٹی کونسل بھی دخل نہیں دے سکتی۔ لیکن ہمیں اس موقع پر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کشمیر کی لڑائی سے مغربی پنجاب کی خانہ جنگی کو جو فائدہ پہنچ رہا تھا اور وہ اب نہیں پہنچ سکے گا۔ یعنی یار لوگ "دفاعِ کشمیر" کا نام لے کے آپس میں نہیں لڑ سکیں گے۔ دولتانہ صاحب سات نقاطے کے اُٹھے تھے۔ یعنی انہوں نے اوپر تلے سات چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ ان میں سے تین کو تو ہوا اڑا لے گئی۔ چوتھی یعنی "دفاعِ کشمیر" کو ہندوستان اور پاکستان کے سمجھوتے نے اتار لیا۔ اور پانچویں چادر یعنی "دفاعِ پاکستان" اسی میں لپٹ کے چلی گئی۔ اب صرف دو ہلکی سی چادریں رہ گئی ہیں جو بدن ڈھانپنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ بھی اتر گئیں تو وہ بچارے بالکل ہی ننگے ہو جائیں گے۔

سچ پوچھئے تو ایک دولتانہ صاحب ہی ننگے نہیں۔ وزارت اور صدارت کے اس حمام میں دونوں فریق ننگے نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں ابھی تک احساس نہیں ہوا کہ

وہ بالکل ننگے ہیں اور ان میں کسی کے جسم پر جو پتلی سی چادر نظر آتی ہے، زمانہ چند دن میں آنکھیں دکھا کے اسے بھی اُتروا لے گا۔

ہمارے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ خان ممدوٹ نے لیگ کا آئین پھاڑ دیا۔ ٹھیک ہے لیگ کا آئین کچھ خان ممدوٹ نے پھاڑا۔ کچھ ان کے حریفوں نے پھاڑ ڈالا اور جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی ہے۔ اسے یار لوگ چند دنوں میں پورا کر دیں گے اور یہ آڑ بھی جس کا سہارا آج لیا جا رہا ہے، باقی نہ رہے گی۔

سب سے پہلے آریہ سماج کے لیڈروں نے کہنا شروع کیا تھا کہ آریہ ہندو کسی دوسرے ملک سے نہیں آئے بلکہ ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں۔ مہا سبھائی لیڈروں کو تو اس تحقیق پر اضافہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ البتہ راشٹریہ سیوک سنگھ والوں نے ایسے ایسے تاریخی نکتے ڈھونڈ نکالے ہیں کہ بس سُنئے اور سر دھنئے۔ اس تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں ساری دُنیا کے ملک ہندوستان کے ماتحت تھے۔

پُرانے زمانے کے ہندو فلسفہ طب۔ جراحی۔ ریاضی وغیرہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے شاعری اور ڈرامہ میں بھی ان کا پایہ بہت اونچا تھا لیکن تاریخ اور جغرافیہ انہیں کبھی نہ آیا۔ ابوریحان بیرونی جب ہندوستان پہنچا اور ہندوؤں کو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ دنیا میں اور بھی ملک ہیں، تو ان میں سے اکثر کو یقین نہیں آتا تھا کہ ہندوستان کے علاوہ کوئی دوسرا مہذب ملک بھی ہو سکتا ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ والوں کا آج بھی یہی حال ہے اور صرف سیوک سنگھ والوں پر کیا موقوف ہے، پنڈت نہرو جیسے لوگ بھی جغرافیہ نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ کشمیر، الٰہ آباد ہی کے کسی محلّے کا نام ہے۔

---

۶ جنوری

پچھلے دنوں خبر مشہور ہوئی تھی کہ خان ممدوٹ کراچی جارہے ہیں۔ وہ تو نہ گئے، البتہ ان کی جگہ دو وزیر کراچی چلے گئے۔ دولتانہ صاحب بھی چاہتے تو ملک فیروز خان کو کراچی بھیج دیتے لیکن وہ رج بدل کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ چنانچہ انھوں نے ملک صاحب پر اعتبار نہ کیا اور انہیں کراچی بھیجنے کے بجائے خود تشریف لے گئے بلکہ اپنے ساتھ انہیں بھی لیتے گئے۔

اگرچہ یہ دونوں حضرات دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے کے لئے کراچی گئے ہیں لیکن آج کل کوئی شخص کپڑا یا صابن خریدنے کے لیے بھی کراچی جاتا ہے تو لوگوں کو طرح طرح کے شبہے ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں اس قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں کہ ان دونوں کے اکٹھے کراچی جانے میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ دولتانہ صاحب چاہتے تو اکیلے بھی کراچی جاسکتے تھے، لیکن دولتانہ صاحب کو ڈر تھا کہ کہیں وہ ادھر جائیں اور ملک صاحب لاہور میں لم ڈورے نہ پیچ لڑانا شروع کر دیں اور اس لئے ساتھ لے گئے تاکہ نظروں کے سامنے رہیں۔ واقعی زمانہ بڑا نازک ہے۔ کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

مغل بادشاہوں کا قاعدہ تھا کہ جس شاہزادے پر اعتبار نہیں ہوتا تھا اسے سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جہانگیر خسرو کو جو اس کا بڑا بیٹا تھا اور اپنے آپ کو اکبر کا جانشین سمجھتا تھا، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔ آخر جب دیکھا کہ شہزادے کی نیت میں فتور ہے تو قید کر دیا۔

اصل میں دولتانہ صاحب کو بھی یہی ڈر ہے کہ ملک فیروز خاں نون کو کراچی بھیجا تو کہیں اوپر ہی اوپر اپنی لیڈری کا راستہ ہموار نہ کرلیں اور لاہور میں اکیلے رہنے دیا تو اسمبلی کے ممبروں کی فوج کو اپنے ساتھ ملا کے وزارت پر مسلط نہ ہو جائیں۔ دولتانہ صاحب جہانگیر نہیں لیکن اُن کی چالیں عموماً شاہانہ ہوتی ہیں اور سچ پوچھئے تو صوبے کی مسلم لیگ کا صدر جہانگیر سے کیا کم ہے؟

ایک روایت ہے کہ ملک خضر حیات خاں بھی مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وہ آج سے بہت پہلے لیگ میں شامل ہو گئے ہوتے، لیکن یہ ڈر تھا کہ لوگ کہیں بدک نہ جائیں۔ اس لئے پاؤں توڑ کے گھر بیٹھے رہے۔ اب جو نواب مظفر علی قزلباش نے سمجھایا کہ دیکھئے میں دولتانہ گروپ میں شامل ہوں۔ دوسرے پرانے احباب بھی جنہوں نے آخری وقت میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا موجود ہیں اور میر امام تو وزارت کے امیدواروں میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ وہم نہ کیجئے اور جلد آئیے، تو ملک صاحب آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ چند دن کے اندر وہ بھی دولتانہ گروپ میں شامل ہو جائیں گے۔

ملک خضر حیات خاں کے لیگ میں شامل ہونے یا اپنے وسیع تجربہ سے دولتانہ گروپ کو فائدہ پہنچانے میں کوئی ہرج نہیں۔ پہلے ہی کئی پرانے یونینسٹ اور بڑے بڑے "خطرناک" قسم کے حضرات لیگ میں شامل ہیں۔ پھر مغربی پنجاب کی وزارت نے بھی ملک خضر حیات کو نیکنام بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ لوگ ابھی تک ملک صاحب کے نام سے ذرا بدکتے ضرور ہیں۔ ڈر ہے کہ ملک خضر حیات خاں کالرہ کے ظلمات سے دولتانہ گروپ کے لئے جو آب حیات لے کے آ رہے ہیں، وہ اس گروہ کے حق میں کہیں زہر ثابت نہ ہو جائے۔

اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اگر ملک خضر حیات سچ مچ لاہور آ رہے ہیں اور یہ سارے بکھیڑے اس لئے کئے جا رہے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کو پھر ہم پر مسلط کر دیا جائے تو بچارے گلینسی اور جنکنس نے کیا قصور کیا ہے؟ انھیں بھی لا کے ہمارے سروں پر مسلط کر دیجئے۔ لوگ پہلے پہل ذرا بدکیں گے اور کوئی عجب نہیں کہ کچھ دنوں خاصا ہنگامہ رہے لیکن تھوڑے عرصے میں رام ہو جائیں گے اور ہر طرف سے یہی آواز سنائی دے گی کہ ؎

جس طرح انہیں بہم ملایا ۔۔۔ بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

مرزا غالب سے کسی نے کہا: "آپ کو معلوم ہے۔ شرابی کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا شراب کے عادی تھے اور کھلے خزانے پیتے تھے۔ مسکرا کے کہنے لگے "جس شخص کو شراب پینے کے لئے مل جایا کرے اسے کوئی دُعا مانگنے کی حاجت ہی کہاں باقی رہتی ہے؟"

پاکستان کی مجلسِ دستور ساز میں خان لیاقت علی خاں نے ایک بل پیش کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن وزرا، پارلیمنٹری سکرٹریوں اور مجالسِ آئین ساز کے ممبروں پر رشوت ستانی، اقربا پروری اور اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام ثابت ہو جائے، انہیں قومی کاموں میں حصہ لینے سے محروم کر دیا جائے گا۔ لیکن صاحب جو وزیر، سکتر یا ایم۔ ایل۔ اے رشوت لے یا اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھائے، اسے قومی کاموں میں حصہ لینے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ سزا تو الزام ثابت ہونے پر ملے گی اور جب تک الزام ثابت ہوتا ہے، وہ لاکھوں روپیہ جمع کر چکا ہوگا۔ گھر بیٹھ کے عیش کرے گا۔ قومی کاموں میں حصّہ لینا کچھ لوگوں کے نزدیک مقصود بالذات ہو تو ہو، لیکن بعض لوگوں کے نزدیک منزل نہیں صرف راستہ ہے۔

۹ر جنوری

ہمارے ایک محترم معاصر نے کسی صاحب کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے:

"عوام کو اُلّو بنانے والے غور کریں"۔

مضمون کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ "اُلّو بنانا" کوئی خاص صنعت ہے جو آج کل مغربی پنجاب میں بڑی ترقی کر رہی ہے اور یہی نہیں اس عنوان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "اُلّو بنانے والوں" کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو "عوام کو اُلّو بنانے والے"۔ دوسرے "خواص کو اُلّو بنانے والے"۔ بالکل بناسپتی گھی کی سی کیفیت ہے۔ بناسپتی گھی مونگ پھلی سے بھی بنایا جاتا ہے اور بنولے سے بھی۔ معلوم نہیں "کاٹھ کا اُلّو" جو لکڑی سے بنایا جاتا ہے، ان دونوں قسموں میں شامل ہے یا ان سے الگ تیسری قسم ہے، جسے گھریلو دستکاری کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ

بات بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی کہ اُلّو بنانا زیادہ اہم صنعت ہے۔ یا اُلّو سیدھا کرنا؟

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ مدت ہوئی غالباً مہاشہ نانک چند ناز یا کسی دوسرے ہندو اخبار نویس نے مولانا عبدالمجید سالک کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ "آپ کا کیا ہے۔ آپ تو ہمیشہ اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ سالک صاحب نے جواب دیا۔ "ہمارے اُلّو تو آپ ہیں ہم تو آپ ہی کو سیدھا کریں گے"۔ اس فقرے سے جو یہاں ہم نے محض سند کے طور پر پیش کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ "اُلّو" پہلے کارخانے میں بنتا ہے۔ پھر اسے شوکیس میں رکھنے سے پہلے سیدھا کر لیا جاتا ہے۔

یہ جو اردو میں ریفرنڈم کا ترجمہ رائے شماری کیا جاتا ہے، اس سے لوگوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔ مثلاً رائے شماری کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں: رائے بہادر، رائے صاحب اور گلشن رائے، چمپت رائے، ایم۔ این رائے کی قسم کے لوگوں کی تعداد معلوم کی جائے۔ اس لحاظ سے تو مغربی پنجاب کی اسمبلی میں صرف ایک رائے ہے۔ یعنی رائے انور خاں کھرل۔ پھر بھی اسمبلی کے ارکان ایک رائے نہیں اور رائے انور خاں کھرل نے تو اپنی رائے کو اس طرح کھرل کیا ہے کہ وہ سینکڑوں آرا میں مبدل ہو چکی ہے۔

اصل میں رائے شماری بڑا مشکل کام ہے۔ ہر شخص کی رائے لمحہ لمحہ کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ گھڑی میں تولہ۔ گھڑی میں ماشہ۔ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ۔ رائے شماری کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص نے سال بھر میں جتنی رائیں بدلی ہیں۔ انہیں ایک جگہ جمع کر کے اوسط نکالنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اتنا بکھیڑا کون کرے؟ اوسط نکالنا آسان ہے، رائیں جمع کرنا مشکل ہے۔

اس سلسلے میں ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ ایک ووٹر انتخابات میں ایک امیدوار کو ووٹ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن جب ووٹ دینے کا وقت آیا تو اس نے حریف امیدوار کو ووٹ دیا۔ لوگوں

نے پوچھا "بھئی یہ تم نے کیا کیا؟ کل تمھاری رائے کچھ اور تھی، آج کچھ اور ہو گئی! جواب ملا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ جب میرے سامنے دس روپے کا نوٹ نکال کے رکھ دیا گیا تو رائے میرے قابو میں نہ رہی۔

اخباروں میں "پیش امام کی ضرورت" کے عنوان سے دو اشتہار چھپے ہیں۔ ایک تو مسجد النجم کے لئے دوسرا شاہی مسجد کے لئے۔ پہلے اشتہار کا مضمون ملاحظہ ہو:

"مسجد النجم کے لئے ایک صحیح حنفی عقیدہ، مؤثر وعظ، درس قرآن کا وسیع تجربہ اور قوم کی اصلاح کا درد رکھنے والے پیش امام کی ضرورت ہے۔ تنخواہ علاوہ خوراک و رہائش مکان و بجلی ساٹھ روپے ماہوار۔ جس میں حسن کارکردگی کے مطابق اضافہ بھی ہو سکے گا۔"

مسجد شاہی کے لئے پیش امام کا اشتہار سید محسن شاہ صاحب آنریری سکرٹری بادشاہی مسجد نے دیا ہے۔ پیش امام کی تنخواہ تیس روپے ماہوار مقرر ہوئی ہے۔ دو روپیہ سالانہ ترقی۔ عارضی ترقی پندرہ روپے اور گرانی کا الاؤنس چودہ روپے۔

آپ نے دونوں اشتہاروں کا فرق ملاحظہ فرمایا۔ مسجد النجم حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے متولّی صاحب کوئی ناتجربہ کار بزرگ ہیں۔ اس لئے انھوں نے "قوم کی اصلاح کے درد" کی شرط بھی لگا دی ہے۔ سیّد محسن شاہ کی عمر انہیں قصّوں میں گزری ہے۔ اس لئے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پچاس ساٹھ روپے میں پیش امام مل جائے تو مل جائے۔ "اصلاحِ قوم کا درد" نہیں ملتا اور ساٹھ روپے تو بہت تھوڑی رقم ہے۔ یہ جنس تو تین ہزار روپے ماہانہ میں بھی ہاتھ نہیں آتی۔

آج کل تیس روپے میں ان پڑھ چپراسی نہیں ملتا۔ انجمن اسلامیہ والوں نے شاہی مسجد کے امام کی تنخواہ تیس روپے مقرر کر رکھی ہے اور مسجد النجم کے متولی صاحب ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ میں علم کے ساتھ ساتھ درد کے بھی طلبگار ہیں۔ ہمارے ہاں دینی علوم کی جو حیثیت رہ گئی ہے اس کا

اندازہ ان دو اشتہاروں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۱۱ر جنوری

ہندوستان میں مسٹر آئنگر مدّت تک "وزیر بے محکمہ" رہ چکے ہیں۔ اب پاکستان میں نواب مشتاق احمد گورمانی کو "وزیر بے محکمہ" مقرر کیا گیا ہے۔ وزیر بے محکمہ تو نئی ترکیب ہے لیکن اردو میں اس سے پہلے اس قسم کی بہت سی ترکیبیں موجود ہیں۔ مثلاً نواب بے ملک — یوسف بے کارواں، شتر بے مہار وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر بے محکمہ یا وزیر بے قلمدان کانوں کو کچھ ایسا نامانوس معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ترکیب کچھ ایسی اچھی نہیں۔ یعنی اس سے سننے والوں کا ذہن اس قسم کی دوسری ترکیبوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ایسے وزراء کو جن کے سپرد کوئی خاص محکمہ نہیں کیا گیا۔ وزیر بے محکمہ کہنے کے بجائے کسی اور نام سے پکارا جائے۔ مثلاً وزیر خصوصی یا وزیر خاص۔ یا اگر اس ترکیب کا استعمال اس لئے گوارا نہ ہو کہ اس سے دوسرے وزیروں پر تفوّق کا پہلو نکلتا ہے تو وزیر عمومی کہہ لیجئے۔ وزیر بے محکمہ یا وزیر بے قلمدان سے تو ہر حالت میں اچھا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں "وزیر بے محکمہ" بننے کی عزّت اُنھیں لوگوں کے حصّے میں آئی ہے جو اس سے پہلے ریاستوں میں وزیر اعظم کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔ مسٹر گوپال سوامی آئنگر ریاست کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ ہندوستان کی حکومت نے انہیں وزیر بے محکمہ بنا دیا۔ نواب مشتاق احمد گورمانی بہاول پور کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز تھے۔ وہاں سے مستعفی ہوئے تو پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر بے محکمہ مقرر ہوئے۔ اگر یہ محض اتفاق ہے تو خیر اور بات ہے۔ لیکن اگر دونوں مملکتوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جو شخص کسی ریاست کا وزیر اعظم رہ چکا ہو، شروع شروع میں اُسے کوئی محکمہ نہ دیا جائے تو یہ سراسر زیادتی ہے۔

"وزیر بے محکمہ" کے عہدے کا نام سن کے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر زیادہ ہیں اور محکمے کم۔ حالانکہ مغربی پنجاب کا یہ حال ہے کہ وزیر کم ہیں اور محکمے زیادہ۔ اسی لئے خان ممدوٹ نے ارادہ کیا تھا کہ وزارت میں توسیع کی جائے۔ یعنی وزراء پانچ کی بجائے سات کر دئے جائیں اور محکموں کی الاٹمنٹ نئے سرے سے ہو لیکن نہ جانے کیا ایسا پیچ پڑا کہ ابھی تک وہی پانچ وزیر چلے آتے ہیں۔ سنا ہے، دولتانہ صاحب کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی۔ یعنی انہیں نئی وزارت مرتب کرنے کا موقع ملا، تو ایک روایت کے مطابق پندرہ اور دوسری روایت کے مطابق بیس اشخاص کو وزارت میں شامل کیا جائے گا۔ کم از کم اتنے لوگوں سے وزارت کا وعدہ ضرور ہو چکا ہے اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کی تعداد اس سے ڈیوڑھی یا دگنی نہیں تو اتنی ضرور ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض محکموں کے دو اور بعض کے تین ٹکڑے کئے جائیں گے اور یہ نہ ہو سکا تو آدھے وزرا کے حصے میں تو محکمے آئیں گے اور باقی "وزرائے بے محکمہ" ہوں گے جن سے وزیراعظم جو کام مناسب سمجھیں گے "وقتاً فوقتاً" لیتے رہیں گے اور ان کے لائق کوئی کام نکل نہ سکا تو کیا ہے۔ ان حضرات کو آم کھانے سے مطلب، ہے یا پیڑ گننے سے۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ نواب مشتاق احمد گورمانی بھی اسی قسم کے وزیر بے محکمہ ہیں۔ یعنی آم کھاتے ہیں، پیڑ نہیں گنتے۔ تنخواہ لے لیتے ہیں، کام نہیں کرتے۔ وہ جب سے وزیر مقرر ہوئے ہیں بہت سے مختلف قسم کے کام اُن کے ذمے ڈال دئے گئے ہیں۔ دو دن ہوئے وہ کراچی سے لاہور آئے تھے۔ یہاں پریس کانفرنس میں ایک تقریر کی۔ اب راولپنڈی جا رہے ہیں، جہاں کشمیر کے سلسلے میں انہیں بہت سے کام کرنے پڑیں گے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات یاد آ گئی۔ "وزیر بے محکمہ" یا "وزیر بے قلمدان" کو وزیر امور فروعی یا وزیر متفرقات کیوں نہ کہا جائے۔ ہمارے خیال میں یہ آخری اصطلاح بہتر ہے۔ کم از کم وزیر بے محکمہ سے تو ضرور بہتر ہے۔ نہ جانے مترجم حضرات کو کیا ہو گیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت انگریزی کے الفاظ سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ بس یہ بھی نہیں سوچتے کہ "بے" اردو زبان کے ایسے

سابقوں میں سب سے اچھے موقعوں پہ بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۴ر جنوری

نجومی صرف لاہور، جالندھر اور ہندوستان اور پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ملتے ہیں۔ پچھلے دنوں اٹلی کے ایک نجومی نے جو اُس سرزمین کا "منجم المملک حاجی محمد صادق باغبان پوری" ہے، زلزلہ کی پیش گوئی کی اور لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کے میدانوں میں ڈیرے ڈال دیئے۔

آپ جانتے ہیں کہ نجومی چاہے لاہور کا ہو یا جالندھر کا، روما کا ہو یا بنارس کا، اسے اس سے غرض نہیں کہ اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوتی ہے یا غلط۔ اس کا کام تو صرف پیش گوئی کرنا ہے۔ اب یہ پیش گوئی کا کام ہے کہ وہ چاہے غلط ثابت ہو یا درست۔ چنانچہ اٹلی کے یہ نجومی صاحب بھی پیش گوئی کر کے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ لیکن زلزلہ کے لیے انہوں نے جو تاریخ مقرر کی تھی وہ گزر گئی اور زلزلہ نہ آیا۔ معلوم نہیں یہ لوگ ابھی تک میدانوں ہی میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں یا زلزلہ کی جان کو روتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ بہر حال احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی یہ لوگ میدانوں ہی میں پڑے رہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ زلزلہ "لیٹ" ہو گیا ہو۔ مہینہ دو مہینہ یا سال دو سال کے بعد آئے اور لوگ اس پیش گوئی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

مدت ہوئی، ایک نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ فلاں تاریخ کو لاہور میں بڑے زور کا زلزلہ آئے گا۔ لوگوں نے اس پیش گوئی پر طرح طرح کے حاشیے چڑھائے۔ کسی نے کہا کہ ایک شاہ صاحب جو نہ جانے کہاں سے آتے ہیں، گیروے کپڑے ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے میں سوٹا بھنگ گھوٹا لئے شہر میں زلزلہ زلزلہ پکارتے پھر رہے ہیں۔ کوئی بولا، بنارس کے ایک جوتشی نے بھی کہا ہے کہ اب کے زلزلہ کا رُخ پنجاب کی جانب ہے۔ لوگ اس قسم کی افواہیں سُن کے ایسے

بدحواس ہوئے کہ گھر چھوڑ کے دریا کے کنارے اور شہر کے آس پاس کے باغوں میں ڈیرے ڈال دیئے۔ لاہور میں نہ تو زلزلہ آیا۔ البتہ اس واقعہ سے دو سال کے بعد خبر آئی کہ کوئٹہ کو زلزلہ نے تباہ کر دیا۔

دراصل نجومی کی پیش گوئی صحیح تھی۔ شاہ صاحب نے بھی درست کہا تھا غلطی زلزلہ کی تھی یعنی پہلے تو وہ لیٹ ہو گیا اور پھر راستہ بھول کے کوئٹہ جا نکلا۔ زلزلے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے لمبے پتلے۔ اُن میں انسانوں کی طرح اکثر خامیاں بھی پائی جاتی ہیں اور دو خامیاں تو سب میں مشترک ہیں۔ یعنی اول تو وہ وقت کے پابند نہیں ہوتے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں صبح کو بہت دیر میں اُٹھتے ہیں اور اسٹیشن پر اس وقت پہنچتے ہیں، جب گاڑی چھوٹ چکی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ بڑے بھلکڑ واقع ہوئے ہیں۔ منزلِ مقصود لاہور ہو تو راستہ بھول کے کوئٹہ جا نکلتے ہیں۔ ٹکٹ دلی کا لیا ہے اور غلطی سے بمبئی جانے والی گاڑی میں جا بیٹھے ہیں۔ اور وہ تو گاڑی میں بھی بہت کم بیٹھتے ہیں۔ اکثر اوقات پیدل ہی چل کھڑے ہوتے ہیں اس لئے وہ دو دو سال لیٹ ہو جاتے ہیں اور لیٹ ہی نہیں ہوتے مارا ستہ بھول کے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں؟ غرض زلزلے کاہل سست اور تن آسان ہیں اور یہ تو خدائی کارخانے کی باتیں ہیں، جن میں دخل نہیں دیا جا سکتا۔ ہم کاہل سست اور تن آسان افسروں کو اب تک فرض شناس اور مستعد نہیں بنا سکے تو زلزلوں پر ہمارا کیا زور چل سکتا ہے۔

اور آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا، ان کم بخت زلزلوں کو عادت سی ہو گئی ہے کہ منزلِ مقصود چاہے کوئی ہو، جاپان کا چکر ضرور لگا آتے ہیں۔ اب نہ جانے جاپان کی آب و ہوا اور فضا میں کوئی خاص کشش ہے یا زلزلوں کو جاپانیوں کی کوئی ادا بھا گئی ہے۔ اس سرزمین میں زلزلوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ یوں تو مغربی پنجاب کے بعض سرکاری اہلکاروں بلکہ حضرات وزرائے کرام کا بھی یہی حال ہے کہ دورہ چاہے ملتان کا ہو یا راولپنڈی کا، راستے میں ان کا وطن مالوف ضرور آتا ہے یا یوں کہئے کہ راستہ بھول کے اپنے گھر ضرور جا نکلتے ہیں۔ تاہم

ان لوگوں کی اور بات ہے۔ زلزلوں کو ان کی پیروی نہیں کرنی چاہئے لیکن ہم کسی کو سمجھانے والے کون؟ ہمارا زور نہ زلزلوں پر چلتا ہے اور نہ سرکاری افسروں پر۔

۱۷ر جنوری

دنیا بھر کے ملکوں میں یہ عام دستور ہے کہ جب حکومت کسی اہم متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق کوئی فیصلہ کرتی ہے تو اسے عوام تک پہنچانے کے لئے اخبارات کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کرلی جاتی ہے۔ اس محفل میں مسئلہ کے سارے پہلو اخبار نویسوں کے سامنے لائے جاتے ہیں کچھ باتیں اخباروں میں چھپنے کے لائق ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی جو اخباروں میں تو نہیں چھاپی جاتیں، البتہ اُن سے حکومت کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا صحیح نقشہ اخبار نویسوں کے سامنے آجاتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں تو پریس کانفرنس اچھا خاصا مذاق بن کے رہ گئی۔ سرگودھا سے کوئی صاحب محض سیر و تفریح کے لئے لاہور تشریف لائے اور اخبار نویسوں کے نام سمن جاری ہو گئے کہ حاضر ہو کے کورنش بجا لاؤ۔ کوئی چڑی مار کہیں سے مینا پکڑ لایا اور لاہور پہنچتے ہی ایک عدد پریس کانفرنس کر ڈالی۔ تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے اور مینا پکڑ لانا ہی کوئی بڑا کمال نہیں۔ چڑیمار اس قسم کا کارنامہ انجام دینے کے بغیر بھی پریس کانفرنس کرنا چاہے تو یہ کانفرنس ضرور کامیاب ہو گی اور ایک چڑیمار ہی پر کیا موقوف ہے، مداری، نٹ، بازیگر، بہروپئے، یعنی ہر پیشے کے ماہر پریس کانفرنس کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہوٹل کا بل چکانے کے لئے جیب میں دام موجود ہوں اور ہوٹل والوں کو ایک دن پہلے اطلاع دے دی جائے۔

شروع شروع میں یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جو بات پریس نوٹ یا مراسلہ میں

کہی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے پریس کانفرنس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ پریس کانفرنس، پریس نوٹ اور مراسلے ہی کی قائم مقام نہیں بلکہ اس سے اشتہار کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس اشتہار پر جو دام خرچ ہوتے ہیں، وہ ہوٹل والے کی جیب میں جاتے ہیں اور اخبار والوں کو بس چائے کی ایک پیالی یا کیک پیسٹری پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اخبار والوں کو بھی پریس کانفرنسوں کی کچھ ایسی چاٹ پڑ گئی ہے کہ کبھی کبھی تو دن بھر میں تین تین پریس کانفرنسیں بھگتا آتے ہیں اور جس دن کوئی پریس کانفرنس نہیں ہوتی، جی اداس رہتا ہے، جمائیاں آتی ہیں، کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن ان کی زندگی میں ایسے دن بہت کم آئے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی پریس کانفرنس میں شریک نہ ہونا پڑا ہو۔ کوئی سرکاری پریس کانفرنس نہ سہی غیر سرکاری قسم کی پریس کانفرنس ہی سہی۔ مقصود اصلی تو پریس کانفرنس ہے۔ چاہے ولایتی ہو یا دیسی، کیک اور پیسٹری کی پریس کانفرنس ہو یا گلاب جامن اور شکرپاروں کی۔

اگر آپ پنواڑی ہیں اور انارکلی کی کوئی دکان آپ کے نام الاٹ ہو چکی ہے تو اس کا افتتاح پریس کانفرنس سے کیجئے اور اگر آپ دوائیں بیچتے ہیں تو اپنے سرمۂ نورانی کا اشتہار اخباروں میں دینے سے پہلے ایک پریس کانفرنس کر ڈالیے اور اگر آپ نہ پنواڑی ہیں نہ دوا فروش، نہ تیلی نہ دھوبی، جب بھی گھبرائیے نہیں۔ آپ کے خاندان میں کبھی نہ کبھی ختنہ، سگائی، شادی بیاہ کی تقریب تو ضرور ہوگی۔ اس موقع پر پریس کانفرنس کر کے دل کے حوصلے نکال لیجئے گا۔

---

۱۸ جنوری

سنا ہے کسی شخص نے ایک راشن ڈپو والے سے کہا کہ تم ہمیشہ ہمیں آدھے راشن پر ٹرخا دیتے ہو۔ یا تو پورا راشن دو، نہیں تو لکھ دو کہ تم پورا راشن نہیں دے سکتے۔ راشن ڈپو والا یہ سن کے آگ بگولا ہو گیا اور کہنے لگا کہ جاؤ میاں جاؤ۔ میں نے راشن ڈپو مفت نہیں لیا، دام خرچ کئے ہیں۔ ۲۶ جنوری تک تو میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اس کے بعد یہ وزارت ہی نہیں رہے گی۔

ایک اس راشن ڈپو والے پر کیا موقوف ہے، جب سے اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ وزارت اور صدارت کا آخری معرکہ ہونے والا ہے، کہیں کہیں تو یہ تماشا بھی نظر آیا ہے، دفتر کے چپراسی سے لے کے اعلیٰ افسر تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، فائلوں کے انبار لگتے جا رہے ہیں اور کوئی انہیں ہاتھ نہیں لگاتا۔ سب لوگ یہی سوچ رہے ہیں کہ دیکھیں خان ممدوٹ رہتے ہیں یا جاتے ہیں۔ دولتانہ صاحب وزیر اعظم بنتے ہیں یا نون صاحب کے حصے میں یہ سعادت آتی ہے۔ پرانی الاٹمنٹیں بحال رہتی ہیں یا اُن میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے۔ پٹواری پٹواری اور تحصیلدار تحصیلدار رہتا ہے یا پٹواری تحصیل دار اور تحصیل دار پٹواری بنا دیا جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر انڈر سکرٹری بنتا ہے یا کمشنر کا عہدہ پاتا ہے۔ تھانہ دار کی قسمت میں تھانہ دار ہی رہنا لکھا ہے یا اس سے کوئی بڑا عہدہ بھی اُس کے ہاتھ آئے گا۔

ان سب قصّوں یعنی تنزّلیوں، ترقیوں اور تبدیلیوں کا سر رشتہ ممدوٹ اور دولتانہ کے سر رشتۂ تقدیر سے کچھ ایسا بندھا ہے کہ لوگ نجومیوں سے اپنی تقدیر کا حال پوچھنے کے بجائے خان ممدوٹ اور میاں محمد ممتاز خان دولتانہ کی تقدیر کا حال پوچھ رہے ہیں اور یہ معلوم کرنے پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ ۲۶ تاریخ کو ان دونوں کے ستارے کس کس برج میں ہوں گے اور اس معرکۂ کارزار پر ستاروں کی گردش کا کیا اثر پڑے گا؟ مشہور نجومیوں کا تو خیر کیا کہنا، چھوٹے موٹے جوتشی اور رمّال جو سڑکوں کے کنارے پوتھیاں کھولے بیٹھے رہتے تھے اور دن بھر مکھیاں مارا کرتے تھے آج کل کچھ نہ کچھ کما ہی لیتے ہیں۔ خدا بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ یہ جھگڑا نہ کھڑا ہو جاتا تو یہ بیچارے جن کی ہوا اگر چلتی بھی مری ہی مٹے ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ دینے والے کے ڈھنگ نیارے ہوتے ہیں۔ دینے پر آتا ہے تو چھپّر پھاڑ کے دیتا ہے۔

کہیں کہیں تو منّتیں مانی جا رہی ہیں، گنڈے تعویذ ہو رہے ہیں، ٹونے ٹوٹکے کئے جا رہے ہیں فالیں کھلوائی جا رہی ہیں اور بعض حضرات نے تو جنھیں نئی وزارت میں وزیر یا پارلیمنٹری سکرٹری بننے کی امید ہے نئی اچکنیں سلوا لی ہیں سوٹ بنوالیے ہیں، پشاور سے قراقلی کی ٹوپیاں منگوانے کا

انتظام کیا ہے۔ غرض صرف رمّال اور نجومی اور عامل حضرات ہی مصروف نہیں، درزیوں کو بھی خاصی مصروفیت ہے۔ کیونکہ اسمبلی کے آدھے ممبر تو وزارت اور سکتری کے پھیر میں پڑے ہیں اور ان کے قرابت داروں، دوستوں اور ملاقاتیوں کو یہ امید ہے کہ وزارت بدلی تو ہمیں بھی کوئی نہ کوئی عہدہ الاٹ کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ درزی ان دنوں سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے۔ دُگنے تگنے دام مانگتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! ۲۶ جنوری تک تو سر کھجلانے کی فرصت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خان ممدوٹ اور میاں محمد ممتاز دولتانہ میں مقابلہ آ پڑا ہے۔ اس تاریخ تک گاہکوں کو بھگتا لوں تو آپ کے کام کی باری آئے گی۔ آپ کو زیادہ جلدی ہے تو سوٹ اور کہیں سے سلوا لیجئے۔ لیکن اتنا کہے دیتا ہوں کہ مجھ سے بہتر سوٹ اور کوئی نہیں سی سکے گا۔ وزارت، سکتری، ڈپٹی کمشنری اور تحصیلداری کے سارے امیدواروں کے سوٹ اور اچکنیں یہیں سلنے آتی ہیں۔ کہیں آپ بھی کسی عہدے کے امیدوار تو نہیں؟

۱۹ر جنوری

وزارت کی جنگ چھڑے ہوئے قریب قریب دس مہینے ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں اخبار والوں نے اس لڑائی کے بارے میں اس کثرت سے خبریں شائع کی ہیں اور دونوں فریقوں کی عسکری قوّت، جنگی چالوں اور فوجی منصوبوں کے بارے میں اتنے مضامین لکھے ہیں کہ چین کی جنگ، فلسطین کے معرکے اور کشمیر کی لڑائیاں اس محاربۂ عظیم کے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن گستاخی معاف۔ اخبارات نے ان معرکوں کا ذکر کچھ ایسی "غیر عسکری" زبان میں کیا ہے کہ اس لڑائی پر بھٹیاریوں کی لڑائی کا گمان ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ لڑائی جسے اخبار نویس کبھی "ذاتی" اور کبھی "حصولی" کہہ کے ٹال دیتے ہیں، دنیا کی بڑی بڑی لڑائیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

اس جنگ میں فریقین نے جو چالیں چلی ہیں، جو نقشے باندھے ہیں، جس طرح بھیر و بنگاہ اور کمک و رسد کا انتظام کیا ہے، جس انداز سے فوجیں بڑھائی ہیں اور پھر جس ہوشیاری کے ساتھ

ایک دو رہے پر شب خون مارے، ہما سا آپ کا کیا مُنہ ہے کہ اس کی داد دے سکیں۔ آئزن ہاور اور منٹگمری جیسے بڑے بڑے جرنیل اس موقع پر مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ ہاں نپولین زندہ ہوتا تو ضرور داد دیتا اور داد کیا دیتا۔ یوں کہئے کہ بڑھ کر جنرل دولتانہ کے قدم لیتا۔

ہمارا جی تو چاہتا تھا کہ اس پوری لڑائی کا حال لکھ کے "جنگ نامۂ وزارت" کے نام سے علیحدہ کتابی صورت میں چھپوا دیتے تاکہ اس جنگ میں فریقین نے جو جنگی چالیں چلی ہیں وہ آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آجائیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ آخری معرکہ کہیں ہفتہ عشرہ میں ہوگا۔ فی الحال محاذِ جنگ پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ صرف گشتی کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ اس لئے پورے جنگ نامہ کے لئے کچھ مدت انتظار کیجئے۔ ذیل میں اس لڑائی کے چند اہم واقعات صرف اس لئے بیان کر دیئے جاتے ہیں تاکہ آپ کو دونوں جرنیلوں کی جنگی قابلیت کا اندازہ ہو جائے۔

اپریل ۱۹۴۸ء کے شروع میں اس قسم کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں کہ جنرل ممدوٹ کی فوج کا ایک حصہ ان سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ لفٹنٹ جنرل دولتانہ جنرل ممدوٹ کو الگ کر کے اُن کی جگہ اپنی فوجی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور میجر جنرل شوکت حیات اُن کے ساتھ مل گئے ہیں۔ مئی میں ایک مختصر سی لڑائی کے بعد جس میں فریقین کا خاصا نقصان ہوا جنرل دولتانہ پسپا ہو کے مری کی پہاڑیوں میں چلے گئے اور چھاپہ مار دستوں کی تنظیم شروع کر دی۔ میجر جنرل شوکت حیات بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے، لیکن پنجاب نیشنل بنک میں پہنچ کے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنرل ممدوٹ کی فوجوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ پنجاب نیشنل بنک کی حفاظت کے لئے جو دستہ متعین تھا۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا اور اب وہ ایک حیثیت سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ادھر لفٹنٹ جنرل دولتانہ مری کے پہاڑوں میں چھاپہ مار دستوں کی تنظیم میں مصروف تھے۔ خزاں کے آغاز میں دفعتہً اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ فریقین میں صلح کی گفتگو شروع ہو گئی ہے اور جنرل ممدوٹ نے فیلڈ مارشل نون کو بھی جو تورہ چنگیزی کے حافظ ہیں اور پے در پے ناکامیوں کے بعد بوڑھے مارشل پیتاں کی طرح گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے بُلا بھیجا۔ اس وقت ہر شخص کو یقین ہو چلا تھا کہ جنرل ممدوٹ آدھا ملک ان لوگوں میں بانٹ دیں گے اور آپس میں صلح ہو جائے گی۔ لیکن صلح کی شرطیں طے نہ ہو سکیں اور آپس میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ بریگیڈیر کرامت علی جو جنرل ممدوٹ کے معتمد علیہ سرداروں میں سے تھے، سٹینڈرڈ ہوٹل کے سامنے توپ خانہ لئے پڑے تھے۔ یک بیک انہیں موقوفی کا حکم ملا اور وہ ٹوٹ کے دولتانہ سے جا ملے۔ فیلڈ مارشل نون کے پاس فوج تو نہیں تھی لیکن انہیں خانہ جنگیوں کا تجربہ ضرور تھا اور اصل میں خانہ جنگیوں ہی کی بدولت تو وہ فیلڈ مارشل کے عہدے پر پہنچے تھے۔ انہوں نے بھی جنرل دولتانہ کا ساتھ دیا اور بڑے زور کی جنگ چھڑ گئی۔ ؎

گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی

لوگ سمجھتے تھے کہ جنرل دولتانہ بخط مستقیم وزارت کے قلعہ کی طرف بڑھیں گے اور ایک دو معرکوں کے بعد انہیں یقیناً پسپا ہونا پڑے گا کیونکہ جنرل ممدوٹ قلعہ بند ہو کے خوب لڑتے ہیں۔ پھر رسد و کمک کا انتظام کرنے میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ لیکن جنرل دولتانہ نے وزارت کے قلعہ کا رُخ کرنے کے بجائے پہلے مسلم لیگ کی چوکیوں اور مورچہ بندیوں کی طرف توجہ کی۔ کیونکہ ان مورچہ بندیوں پر قبضہ کرنے کے بعد جنرل ممدوٹ کی "میجنو لائن" کو توڑنا آسان ہو جاتا تھا۔ ہر چوکی، ہر مورچے، ہر دھس اور ہر دمدمے پر بڑے زور کی لڑائیاں ہوئیں جن میں کہیں کہیں جنرل دولتانہ کو شکست بھی ہوئی۔ (نامکمل)

۲۰ر جنوری

انوری فارسی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ اس پر پے در پے مصیبتیں پڑیں تو یہ قطعہ کہا:

ہر بلائے کز آسماں آید　　گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می گوید　　خانۂ انوری کجا باشد

یعنی آسمان سے جو بلا نازل ہوتی ہے۔ چاہے اس کی منزل مقصود کوئی ہو، زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی انوری کے گھر کا پتہ پوچھنا شروع کر دیتی ہے۔

سندھ کی وزارت بھی "خانۂ انوری" بنی ہوئی ہے۔ عالمِ بالا سے تحقیقات کی برقِ عتاب کو چاہے مغربی پنجاب کی جانب رُخ کرنے کا حکم ہو۔ چاہے سرحد کی جانب، وہ سندھ کے کاخِ وزارت پر جا کے کوندنا شروع کر دیتی ہے۔ کھورو سندھ کے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے تھے۔ تحقیقات کی بجلی کی رَو میں آ گئے۔ وزارت سے الگ کر دیئے گئے۔ مقدمہ چلا اور اب عدالتوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پیر الٰہی بخش نے اُن کی جگہ قلمدانِ وزارت سنبھالا۔ لیکن چند دنوں میں طرح طرح کے الزام لگنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ گورنر نے تحقیقات کا حکم صادر کر دیا اور سندھ کی وزارت جنوری میں پھر "خانۂ انوری" بن گئی اور پیر الٰہی بخش نے "مجھ گنہگار کو الٰہی بخش" کا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔

لیکن سچ پوچھئے تو پیر الٰہی بخش نرے نام ہی کے پیر نہیں بلکہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ یہ انہیں کی بزرگی کا اثر ہے کہ مسٹر کھورو کی طرح انہیں معزولی کی مصیبت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ یعنی وہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر بھی مسلط ہیں اور ملزموں کے کٹہرے میں بھی کھڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وظیفے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ ورنہ یا تو وہ بخش دیئے جاتے اور تحقیقات تک نوبت ہی نہ پہنچتی یا اپنی بدعنوانیوں کی تحقیقات پر خود انھیں کو مقرر کیا جاتا۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر وہ اس مخمصے سے بچ نکلے تو ملک بھر میں ان کی بزرگی اور کرامت کی دھوم مچ جائے گی پھر جس نئے یا پرانے وزیر پر کوئی آفت آئے گی ۔وہ انہیں سے رجوع کرے گا۔ اور وہ نرے وزیرِ اعظم ہی نہیں بلکہ "وزیروں کے پیر" سمجھے جائیں گے ۔پیر الٰہی بخش صاحب کو چاہیئے کہ وہ جن اوراد و وظائف کے عامل ہوں ، دوسرے لوگوں کو ان کی اجازت دینے میں فراخ دلی سے کام لیں ۔ خاص طور پر "عمل وارفع تحقیقات" کو تو جتنا عام کر سکیں ، اتنا ہی بہتر ہے ۔کیونکہ تحقیقات کی آفت وزیروں ہی تک محدود نہیں ، بہت سے دوسرے اہل کار بھی اس کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔

راقم الحروف کو ایک مرتبہ ایک پیر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جو گھڑ دوڑ اور سٹے کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے یعنی لوگوں کو سٹے کا نمبر بھی بتا دیتے اور کبھی کبھی اپنے کسی خاص مرید پر مہربان ہو کر کہہ دیتے کہ فلاں گھوڑے پر روپیہ لگاؤ ، خدا نے چاہا تو روپے پیسے کی فکر سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائیگی ۔سٹہ اور گھڑ دوڑ کا تو اب پہلا سا زور نہیں رہا۔ ان دونوں کی جگہ الاٹمنٹ نے لے لی ہے ۔پیر الٰہی بخش صاحب کو اگر پرانی الاٹمنٹ محفوظ رکھنے یا نئی الاٹمنٹ کرانے کا کوئی ڈھب یاد ہو تو بڑے بڑے وہابی قسم کے منکر اُن کے مرید ہو جائیں کوئی وظیفہ نہ سہی نقش یا تعویذ ہی سہی ، فتیلہ یا گنڈا ہی سہی۔

پیر صاحب نے آج تک ، تو صرف اپنی ہی ذات کے لئے جلالی اور جمالی اعمال سے کام لیا ہے ۔ ذرا ان اعمال و وظائف سے جو ان کے خاندان میں سینہ بسینہ چلے آتے ہیں خلق اللہ کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع دیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ جب پیر الٰہی بخش صاحب کو پیری ، مریدی ، گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کی چاٹ پڑ گئی تو وزارت کو بھی بھول جائیں گے ۔ آخر وزارت میں رکھا ہی کیا ہے ۔ دن رات کی دانتا کل کل ۔ آج اس سے جھگڑا ۔کل اُس سے کبھی گورنر ناراض ہے کہیں اخبار نویس دم نہیں لینے دیتے ۔ آنریبل پیر الٰہی بخش وزیرِ اعظم صوبہ سندھ کے متعلق تو لوگ جو چاہیں کہہ لیں ۔لیکن عارف باللہ ، حق آگاہ ، پیر روشن ضمیر پیر الٰہی بخش شاہ صاحب کی طرف

کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہ دیکھے تو عقیدت مند تکا بوٹی کر ڈالیں۔

۲۲ر جنوری

آج کی خبروں میں ایک اہم خبر یہ بھی ہے کہ روس سے دس ہزار ٹن گندم کی ایک کھیپ کراچی پہنچ گئی ہے۔ ہمارے خیال میں اس گندم کا معائنہ کر کے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ کہیں روسیوں نے اس میں "آئیڈیالوجی" کی قسم کی کوئی خطرناک چیز بھر کے تو نہیں بھیج دی۔

اخباروں میں ایک اہم خبر یہ بھی چھپی ہے کہ آئندہ راشن میں کناڈا کا آٹا بھی ملا کرے گا یعنی یک نہ شد دو شد۔ کناڈا کے آٹے اور میدے پر تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ کامن ویلتھ کے رشتے سے کناڈا ہمارا "ہم زلف" ہے لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ کہیں کناڈا کا آٹا اور روس کا گیہوں پیٹ میں پہنچ کے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں اور ہمارا معدہ یو۔این۔او یا "برلن" بن کے نہ رہ جائے۔ نفر اقر معدہ کوئی ایسا خطرناک مرض تو نہیں۔ پھر کامن ویلتھ آخر کامن ویلتھ ہے۔ لیکن "کامن ہیلتھ" بھی تو کوئی چیز ہے۔

"ڈان" نے مسٹر لیاقت علی خاں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ گھر پہنچتے ہی اپنی خارجہ حکمت عملی بدل ڈالیں۔ خارجہ پالیسی کوئی قمیص یا پاجامہ تو نہیں کہ اسے بدلنے کے لئے گھر پہنچنا ضروری ہو۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ مسٹر لیاقت علی خاں گھر پہنچتے ہی نوکر کو آواز دے کے کہیں کہ بھئی میری "نئی خارجہ پالیسی" جو میں نے پچھلے دنوں سلوائی ہے اور جو بڑے ٹرنک میں پڑی ہے، ذرا نکال لانا۔ پرانی خارجہ پالیسی جو لندن سے پارسال سل کے آئی تھی میلی بھی ہو گئی ہے اور کہیں کہیں سے پھٹ بھی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں مسٹر لیاقت علی خاں چاہتے تو کامن ویلتھ کے اجلاس میں اپنی خارجہ پالیسی بدل سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ شرکائے اجلاس لمحہ بھر کے لئے مُنہ پھیر لیتے۔

خارجہ پالیسی کرتا پاجامہ ہی ہی۔ لیکن اسے بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے بھی دو جوڑے ہوں۔ ایک جوڑا پھٹ گیا تو دوسرا بدل لیا۔ یہاں تو ایک ہی جوڑا ہے۔ کہیں سے پھٹ گیا تو پیوند لگوا لیا میلا ہو گیا تو دھلوا لیا۔ اب بھی پیوند ہی لگیں گے یا بہت ہوا تو دھلوا لیا جائے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ رنگوا بھی لیا جائے۔ بعض رنگ کچھ ایسے میل خورے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کپڑا نیا معلوم ہوتا ہے اور آسانی سے پیوند بھی نظر نہیں آتے۔

۲۳ر جنوری

آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے دنوں کراچی کے رکشا والوں اور وکٹوریہ والوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ وکٹوریہ والے پہلے موجود تھے۔ رکشا والے دلّی سے ہجرت کر کے آئے اور لوگوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ اس پر وکٹوریہ والے بہت جھلّائے۔ دونوں طرف سے ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکلے، مظاہرے کئے گئے، پریس کانفرنسیں ہوئیں۔ بعض لیڈروں نے بیچ بچاؤ کرا کے دونوں کو گلے ملوا دینا چاہا، لیکن مہاجر اور انصار کا یہ جھگڑا نمٹنے میں نہ آیا چنانچہ ابھی تک وکٹوریہ والے اس ہٹ میں ہیں کہ ہماری سواری کا سلسلہ انگلستان کی شاہی سواری سے جا ملتا ہے۔ ادھر رکشا والے رستم سیستانی کی سواری کے گھوڑے رخش سے اپنا تعلق ثابت کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ رکشا اصل میں "رخشا" ہے۔ غرض یہ لڑائی انگلستان اور سیستان۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ شاہِ انگلستان کے داروغہ اصطبل اور سیستان کے میر آخور کی لڑائی بن کے رہ گئی ہے۔

کئی برس ہوئے، لاہور میں بھی دس پندرہ رکشا گاڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی کہ ایک انسان توند نکالے گاڑی پر بیٹھا ہو اور دوسرا اسے کھینچ رہا ہو۔ چنانچہ لاہور کے لوگوں نے متفق اللفظ ہو کے کہہ دیا کہ ہم سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ انسان آخر انسان ہے۔ کوئی گھوڑا یا بیل تو نہیں کہ گاڑیوں میں جتا پھرے۔ چنانچہ رکشا گاڑیاں بند ہو گئیں۔ اور

تانگہ والوں نے جنہیں اپنا تو نہیں۔ البتہ اپنے گھوڑوں کا خیال ضرور تھا۔ اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ عرصے سے لاہور میں پھر بناہ گیر قسم کی رکشا گاڑیاں نظر آرہی ہیں۔ جن میں عام طور پہ ایک سائیکل سوار جتا ہوتا ہے۔ لیکن ابھی لوگوں نے اس واقعہ پر کچھ ایسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایک تو رکشا والے مہاجر ہیں۔ دوسرے ہماری نظروں سے ایسے واقعات گزر چکے ہیں کہ اب انسان کا گھوڑا یا بیل بن جانا کوئی ایسی اچنبھے کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ پھر بھی ہمارے بعض لوگ ایسے موجود ہیں جو اس واقعہ پہ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ اگر تانگے والوں کی جانب سے رکشا کے رواج پہ اعتراض کیا جاتا۔ تو اور بات تھی۔ لیکن ان لوگوں کو تانگہ والوں سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ لیکن اعتراض برابر کئے جا رہے ہیں۔ گویا "نہ تانگہ نہ گھوڑا اور رکشا والے سے لٹھم لٹھا۔"

اعتراض وہی پرانا ہے کہ انسان بیل یا گھوڑا بن کے رکشا میں کیوں جتا جتا پھرے؟ لیکن غور کیا جائے تو یہ اعتراض ہی سرے سے بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ رکشا قلی لاہور میں آج نہیں آئے بلکہ وہ تو اس سرزمین کے اصلی باشندے ہیں اور وراوڑوں سے پہلے یہاں موجود تھے انسان پہلے بھی گھوڑا یا بیل بنا ہوا رکشا میں جتا ہوا تھا اور آج بھی جتا ہوا ہے۔ لوگ پہلے بھی رکشا میں سوار ہوتے تھے اور آج بھی سوار ہوتے ہیں۔ نہ رکشا میں کوئی بیٹھنا جرم تھا نہ رکشا کھینچنے پر کوئی قدغن۔ یہ عجب تماشا ہے کہ کسی کو رکشا کھینچتے دیکھا تو بھڑک اٹھے لیکن یہ خیال نہ آیا کہ آپ خود بھی یا تو رکشا میں بیٹھے ہیں اور یا کسی کو کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ تل اوٹ پہاڑ۔

جن لوگوں کو اس بات پہ اعتراض ہے کہ انسان یا گھوڑا بیل بن کے اپنے جیسے انسانوں کو کیوں کھینچے پھرے۔ وہ خود یا تو "رستم پہلین" بنے "رخشا" پر سوار ہیں یا کوئی دوسرا "رستم پہلین" بنا ہوا اُن پر سوار ہے اور سیاست کے ہفت خواں سے گزر کے مازندران کی سمت چلا جا رہا ہے اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے رکشا ہر جگہ ہیں۔ رکشا والے ہر جگہ ہیں اور شہروں

یا دیہات انسان ہر جگہ گھوڑا یا بیل بنا ہوا ہے لیکن کسی کو یہ حساب یاد نہیں کہ اس نے زندگی میں کتنی رکشا گاڑیاں کھینچی ہیں۔ کن کن کوچوں اور بازاروں سے گزرا ہے اور کیا کیا دکھ اٹھائے ہیں اور بچارے گھوڑے کو ان قصوں سے کیا سروکار۔ اسے تو اپنے دانے گھاس سے واسطہ ہے۔ بچارا تھان پر بندھا ہے تو کیا ہوا۔ یہی غنیمت ہے کہ دانے گھاس کا سہارا ہو جائے اور دانے گھاس کا سہارا نہ بھی ہو تو صبر و شکر کا سہارا تو کہیں نہیں گیا۔

۲۵ر جنوری

مغربی پنجاب کے وزیر مال میجر مبارک علی شاہ نے سرگودھا کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"کشمیر میں لڑائی بند ہو جانے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم خاموش ہو کے بیٹھ جائیں"

توبہ کیجیے۔ کس کافر کو آپ سے یہ بدگمانی ہے کہ کشمیر کی لڑائی کے ختم ہوتے ہی آپ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے اور کشمیر کی جنگ نہ بھی چھڑتی، جب بھی آپ معرکہ کارزار گرم رکھتے۔ یہ تو ہندوستان اور پاکستان کے لیڈر تھے جو اتحادی کمیشن کی باتوں میں آ گئے اور لڑائی بند کرنے پر رضامند ہو گئے۔ ذرا اتحادی قوموں کی انجمن وزارت اور صدارت کی حصولی وصولی اور ذاتی لڑائی جسے یار لوگ اصولی صفاتی بلکہ کائناتی کہہ رہے ہیں، بند کرانے کی کوشش تو کر دیکھے۔ صاف معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے؟ اے صاحب! آپکے تیوری صاف کہے دیتے ہیں کہ آپ لڑیں گے اور جب تک مغربی پنجاب میں ایک مسلمان بھی باقی ہے، برابر لڑتے چلے جائیں گے۔

ایک لڑکا ضرب زید اً عمرواً کی گردان کر رہا تھا۔ اس طرف سے شیخ سعدی کا گزر ہوا۔ مسکرا کے کہنے لگے "کیوں میاں خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی۔ لیکن زید و عمرو کا جھگڑا چلا جا رہا ہے؟" یہ لڑکا نہ دولتانہ تھا نہ نون نہ ممدوٹ۔ اور تو اور وہ تو میجر مبارک علی شاہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے چپکا ہو رہا۔ ورنہ جواب دیتا کہ قبلہ! خوارزم کی لڑائی ختم ہو گئی تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ زید و

عمرو بھی خاموش ہو کے بیٹھ جائیں۔ وہ تو ہمیشہ لڑیں گے۔ آپ ایسے ہی ثالث بالخیر ہیں تو ذرا ان میں صلح کی کوشش کر کے دیکھ لیجئے۔ حضرت! یہ گرامر کی لڑائی ہے۔ قاعدے اور قانون کی جنگ ہے۔ اس لئے اس کی گردان ہمیشہ یونہی ہوتی رہے گی۔ کبھی زید عمرو کو پیٹے گا۔ کبھی اس سے پٹ جائے گا۔ اس لئے آپ ان کے مقدمہ میں دخل نہ دیجئے اور خوارزم دخطا کی صلح پر بغلیں بجائیے۔

اور بات ٹھیک بھی ہے۔ یہ زید و عمرو کی لڑائی قاعدے اور قانون کی جنگ ہے۔ آئین و دستور کی جنگ ہے۔ ووٹ کی چوٹ کا کوئی علاج نہیں اور قرار داد کی بے داد کی نہ داد ہے نہ فریاد۔ کشمیر کی لڑائی کے ختم ہونے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آزاد کشمیر کے لشکر اور ہندوستان کی فوجیں ہاتھ روک لیں تو روک لیں۔ مغربی پنجاب کے جنگ جو قبائل یعنی صدری اور وزیری نہ ہاتھ روکیں گے نہ زبان۔ پھر یہ فن برائے فن کی طرح "جنگ برائے جنگ" بھی نہیں۔ یعنی اس کا افادی پہلو بھی ہے۔ جس کی لپیٹ میں آفس اور کرسی، عہدہ اور اقتدار، سکتری اور وزارت، نظامت اور نظارت، پٹوار اور گرداوری، دکان اور مکان، کارخانہ اور زمین، جننگ فیکٹری اور چھاپہ خانہ سبھی کچھ آ گئے ہیں۔

آپ کہیں گے میجر مبارک علی شاہ کا مقصد تو یہ تھا کہ کشمیر کی لڑائی تو ختم ہو چکی، ابھی رائے شماری کا مرحلہ باقی ہے۔ اس لئے خاموش نہیں بیٹھنا چاہئے۔ بس اتنی سی بات کو بڑھا چڑھا کے کچھ کا کچھ بنا دیا گیا۔ لیکن آپ نے غور نہیں فرمایا کہ دولتانہ صاحب کے حامی ہوں، چاہے خان ممدوٹ کے طرفدار سب کشمیر کی لڑائی کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا اس کے سوا انہیں دنیا بھر کے کسی قصے سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں صرف برائے وزن بیت کہی جاتی ہیں۔ ذرا دولتانہ صاحب ہی کو دیکھئے۔ لیگ کی صدارت پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد انہوں نے کشمیر کی لڑائی کا تذکرہ اس انداز سے چھیڑا تھا جیسے اب وہ اپنے "افریدیوں" کا لشکر لے کے بڑھیں گے تو بس اوڑی کے محاذ جنگ ہی پر پہنچ کے دم لیں گے۔ لیکن رات کو ان کا رخ اوڑی کی طرف تھا اور

صبح ہوتے ہوتے ڈیوس روڈ کی طرف پلٹ گیا۔ چنانچہ اب وہ خان ممدوٹ کی وزارت پر اس طرح تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں جیسے یہ فساد نہیں جہاد ہے اور جہاد بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ خالص جہادِ کشمیر۔ ہم تین میں نہ تیرہ میں، نہ خان ہیں نہ خان کے اونٹوں ہیں یعنی نہ وزیری نہ آفریدی، نہ حاسد نہ محسود، اس لئے جو کہتے ہیں لگی لپٹی رکھے بغیر کہتے ہیں۔ مولوی مودودی صاحب نے جہادِ کشمیر کو جہاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لوگ پنجے جھاڑ کے ان کے پیچھے پڑ گئے اور جیل پہنچا ہی کے چھوڑا۔ دولتانہ صاحب فساد کو جہادِ کشمیر کہہ رہے ہیں اور علما کو یہ کہنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ لکھشمی بلڈنگ اور ممدوٹ وِلا، آم اور اخروٹ، تہمد اور لنگوٹ، دولتانہ اور ممدوٹ کی لڑائی فساد تو ضرور ہے۔ لیکن جہاد ہرگز نہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ لکھشمی جسے سری بھی کہتے ہیں دولت کی دیوی ہے۔ اس لحاظ سے لکھشمی بلڈنگ کو جہاں آج کل لیگ کا دفتر ہے سری نگر کہہ لیجئے اور لکھشمی، دولت اور دولتانہ میں جو نسبت ہے۔ اسے مدِ نظر رکھ کر یہ تسلیم کر لیجئے کہ لکھشمی بلڈنگ کے دولت آباد یا سری نگر پر دولتانہ صاحب ہی کا قبضہ ہونا چاہئے تھا تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس سری نگر پر دولتانہ صاحب کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے یہ لڑائی جہاد تو نہیں بن سکتی۔

۲۹ر جنوری

سُنا ہے۔ پچھلے دنوں ایم۔ اے۔ او کالج میں جو مشاعرہ ہوا اسے لیگ کونسل کے اجلاس سے "توارد" ہو گیا۔ یعنی کرسیاں چلیں، ہاتھ ٹوٹے، سر پھوٹے اور میدانِ کارزار کا نقشہ کھنچ کے رہ گیا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی ۱۵۲۶ء اور دوسری اس سے تیس سال بعد یعنی ۱۵۵۶ء میں ہوئی تھی۔ کرسیوں کی پہلی جنگ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ہوئی اور دوسری اس سے ڈیڑھ مہینے بعد یعنی ۱۹۴۹ء کے آغاز میں۔ اس لئے اکثر لوگ یہی کہیں گے کہ یہ توارد نہیں سرقہ ہے اور سرقہ بھی بہت بھونڈے قسم کا۔ یعنی مشاعرہ نے کسی مشاعرہ سے نہیں بلکہ لیگ کونسل سے مضمون چرایا اور مفت کی داد وصول کر لی۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس میں نہ مشاعرہ کا کوئی قصور ہے، نہ مشاعرے کے منتظمین کا۔ صدر جلسہ ایک ایم۔ ایل۔ اے بزرگوار تھے جو کرسیوں کی لڑائی میں شریک تھے۔ لڑنے والوں میں نہ سہی، آیۃ الکرسی پڑھنے والوں ہی میں سہی۔ میر مشاعرہ لیگ کونسل کا ممبر اور ایم۔ ایل۔ اے ہو تو مضمون ضرور لڑے گا۔ لیگ کونسل سے مشاعرہ کا نوارد ضرور ہو گا۔ ایم۔ ایل۔ اے کہیں جائے۔ کرسی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی ؏

ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است

اور ایم۔ اے۔ او کالج والوں نے تو ایم۔ ایل۔ اے کو صدارت کی کرسی پر بٹھایا تھا۔ پھر کرسیوں کی جنگ کیوں نہ ہوتی؟

---

۳۰ جنوری

پچھلے دنوں اخبار "پرتاپ" دہلی نے لکھا تھا کہ علامہ مشرقی بیمار ہیں۔ آج مشرقی صاحب کی طرف سے لاہور کے اخباروں میں ایک بیان چھپا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں۔ تعجب ہے کہ "پرتاپ" نے یہ خبر کیونکر چھاپ دی؟

ہمارے خیال میں "پرتاپ" بھی راستی پر ہے اور علامہ مشرقی بھی حق بجانب ہیں۔ علامہ مشرقی بظاہر تو بھلے چنگے نظر آتے ہیں۔ ان کے معدہ میں کوئی نقص نہیں۔ گردہ، جگر اور دل بھی اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ انہیں نہ زلہ ہے نہ بخار نہ سعال نہ نقرس نہ وجع المفاصل۔ تاہم اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مدت سے "ضعفِ قیادت" کے مرض میں مبتلا ہیں یعنی ان کی لیڈری پر ورم آ گیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مرض ورمِ جگر سے زیادہ خطرناک ہے۔

مرض نیا نیا ہو تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے لیکن علامہ مشرقی کا مرض پرانا ہے۔ کئی برس ہوئے انہیں "دردِ قوم" ہوا تھا۔ جو وجع الکلیہ کی قسم کا ایک مرض ہے۔ اس مرض سے مواد فاسد

کی تحریک ہوئی۔ ایسے موقعوں پر طبیعت خود معالج بن جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے مٹی کھانی شروع کر دی۔ طبی اصطلاح میں اسے "تحریک خاکساراں" کہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض بچے مٹی کھانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح انہیں جگر کے اکثر امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اکثر اوقات حاملہ عورتوں کی طبیعت بھی خود بخود مٹی اور کوئلے کھانے کی جانب راغب ہو جاتی ہے تاکہ جسم کو کیلشیم مناسب مقدار میں بہم پہنچتا رہے۔ لیکن علامہ مشرقی پر اس عادت کا یہ اثر ہوا کہ شروع شروع میں جب تک وہ حدِ اعتدال میں رہے "قیادت" کو تقویت ہوتی رہی اور لیڈری کے فعل میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب وہ حدودِ اعتدال سے تجاوز کر گئے تو "قیادت" پر مواد فاسد کا "انصباب" ہونے لگا اور آہستہ آہستہ لیڈری متورم ہو گئی۔

اس سے پہلے وہ ویدک علاج بھی کر چکے تھے۔ چنانچہ کویراج نہرو مہاراج کا "ملاپ گنگا" جسے ہمارے طبیب "حبِ اتحاد" کہتے ہیں، وہ مدت تک باقاعدگی سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے مرض میں کوئی فرق نہ آیا۔ دراصل اس مرض میں علاج سے زیادہ پرہیز ضروری ہے اور علامہ مشرقی دوا تو پی لیتے ہیں، لیکن پرہیز نہیں کر سکتے۔

لاہور پہنچ کے انہوں نے پھر آپریشن کرایا اور ڈاکٹروں نے ان کی خاکسار قسم کی قیادت پر اسلام لیگ کی لیڈری کا خول چڑھا دیا۔ لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لیڈری زیادہ متورم ہو گئی۔ ابخرات کے صعود میں اضافہ ہوا۔ قیادت پر مواد فاسدہ پہلے سے زیادہ گرنے لگا۔ چنانچہ اسلام لیگ کی لیڈری کا خول گل کے خود بخود اتر گیا اور علامہ مشرقی کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔

ہمارے خیال میں علامہ مشرقی جن امراض مزمنہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی

علاج ہے۔ یعنی وہ مقام ورم پر "فیروطی جلوس" کا لیپ کریں۔ لبوب جلسہ ہاتھ آجائے تو اسے ہفتہ میں ایک بار استعمال کریں اور "نوشدارو ئے زندہ باد" کی مدامت فرمائیں۔ لیکن آخر الذکر دوا بالکل نایاب ہے اور میاں محمد ممتاز خاں دولتانہ جیسے بزرگوار کو بھی میسر نہیں۔

۳۱ر جنوری

مغربی پنجاب کی اسمبلی کے آئندہ انتخاب کے سلسلے میں مختلف حلقوں کی طرف سے دو باتوں پر بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ انتخاب کی بنیاد ایڈلٹ فرنچائز ہو یعنی ہر عاقل و بالغ کو ووٹ کا حق دیا جائے اور دوسری یہ کہ انتخاب "بے ٹکٹ" ہو۔ ایڈلٹ فرنچائز پر تو قریب قریب سارے اخبار متفق ہیں، البتہ "ٹکٹ" کے معاملہ پر جھگڑا آپڑا ہے۔

ٹکٹ کی حمایت میں بڑی بڑی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پوسٹ کارڈ اور لفافے پر ٹکٹ لگتا ہے، ریلوے کا سفر ٹکٹ کے بغیر نہیں ہو سکتا، پھر سنما ہو یا تھیٹر، پہلوان کا دنگل ہو یا پتلیوں کا تماشا، ٹکٹ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یار لوگ بے ٹکٹ اسمبلی میں جا پہنچیں۔ لیکن دوسری طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ٹکٹ ایسا ہی ضروری ہے تو مرحوم اسمبلی کو رہنے دیا جاتا۔ آخر قریب قریب تمام ایم۔ ایل۔ اے حضرات ٹکٹ ہی تو لے کے آئے تھے۔ لیکن ان سے کچھ اس قسم کا سلوک کیا گیا ہے جیسے وہ بے ٹکٹ ہی اسمبلی میں گھس آئے ہوں۔

ایک اور بات بھی غور کے قابل ہے۔ اگر انتخاب کے لئے ٹکٹ اور وہ بھی مسلم لیگ کا ٹکٹ ضروری ہے تو ایڈلٹ فرنچائز کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ ہمارے خیال میں تو ووٹ اور انتخاب کا جھگڑا ہی سرے سے اڑا دینا چاہئے۔ جسے دولتانہ صاحب ٹکٹ کاٹ دیں، وہ جھپاک سے اسمبلی میں جا پہنچے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ٹکٹ تو نہیں ہوگا، اچھا خاصا "فری پاس" ہوگا۔ لیکن اسے فری پاس کہئے یا ٹکٹ کہہ لیجئے، اس کی موجودگی میں انتخاب تو نرا سوانگ معلوم ہوتا ہے۔

اصل میں ٹکٹ پر انتخاب لڑناوہیں اچھا معلوم ہوتا ہے۔جہاں کئی سیاسی جماعتیں ہوں۔ہمارے ہاں لے دے کے صرف ایک سیاسی جماعت ہے جسے دولتانہ صاحب نے لڈّن سمجھ کے اپنی جاگیر بنا رکھا ہے۔ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولتانہ صاحب لڈّن کو لنڈن بنانا چاہتے ہیں صرف نون کی کمی کی وجہ سے اب تک یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔اب تو لیگ کی صدارت کی بدولت نُون بھی ہاتھ آگیا۔اس لئے لڈّن لنڈن ضرور بنے گا اور دولتانہ صاحب اس نئے لنڈن میں بیٹھ کے ہم پر حکومت کیا کریں گے۔

انتخاب ٹکٹ پر ہو یا بے ٹکٹ یہ تو لمبی بحث ہے۔لیکن اگر ٹکٹ اسی کا نام ہے کہ مسلم لیگ میں جو لوگ نمایاں نظر آتے ہیں وہ جسے چاہیں اسمبلی کا ممبر نامزد کردیں تو ہم اس ٹکٹ سے باز آئے۔اس سے تو اچھا ہے کہ انتخاب کا بکھیڑا ہی سرے سے نہ کیا جائے بلکہ سچ پوچھئے تو اسمبلی کی بھی ایسی کیا ضرورت ہے۔مغربی پنجاب کو میاں ممتاز دولتانہ کی جاگیر میں شامل کردیا جائے۔وہ جس طرح اپنے کارندوں کی مدد سے اپنی زمینداری کا انتظام کرتے ہیں، اسی طرح مغربی پنجاب کی حکومت کا بھی انتظام کرلیں گے۔یہ منظور نہ ہو تو مغربی پنجاب کو چودھری خلیق الزماں کے حوالے کردیا جائے۔وہ چاہیں تو خود اس ریاست کے بادشاہ بن بیٹھیں، چاہے تو اُسے بہاولپور میں شامل کردیں اور یہ مناسب معلوم نہ ہو تو نواب صاحب بھوپال کو بلاکے اُن کے سر پر تاج رکھ دیں اور سچ پوچھئے تو ممدوٹ کیا بُرا تھا۔آخر شریف کی ہڈی ہے۔نواب ہے۔نواب زادہ ہے۔دولتانہ صاحب چاہتے تو اسے "ٹکٹ" دے کے بادشاہ بنادیتے اور خود وزارت کے پردے میں بادشاہت کرتے۔

یکم فروری

میاں محمد ممتاز دولتانہ نے فرمایا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو لوگ وزارت کے عہدے پر رہے ہیں۔اُن کے اعمال کی تحقیقات کی جائے۔ہمارے خیال میں تحقیقات کی نعمت

کو صرف وزرا ہی تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ ایم۔ ایل۔ اے حضرات، ڈپٹی کمشنروں تحصیلداروں، بڑے چھوٹے اہل کاروں اور مسلم لیگ کے عہدہ داروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا چاہیئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر نیچے سے اوپر تک مغربی پنجاب کے سارے اہل کاروں اور تمام لیڈروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے تو یہ کام کون سرانجام دے گا۔

پچھلے دنوں ایک مولوی صاحب ایک محفل میں کہہ رہے تھے کہ حکومت نے شراب کی ممانعت تو کر دی۔ اب اسے چاہیئے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا بھی نافذ کر دے۔ ایک صاحب نے ان کی باتیں سننے کے بعد فرمایا کہ حضرت مولانا! کہ اگر چوروں کے ہاتھ کٹنے لگے تو ہم میں سے بہت سے لوگ لنجے ہو کے رہ جائیں گے اور کیا عجب ہے کہ آپ بھی نہ بچیں۔ پھر ذرا یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ گئی تو یہ لنجوں کی فوج کیا کرے گی؟

راقم الحروف کے ایک کرم فرما نے یہ واقعہ سنا تو کہنے لگے۔ مولوی صاحب کو کیا معلوم کہ گورنر کا نام مودودی نہیں، موڈی[1] ہے۔ ورنہ وہ اس قسم کی بات نہ کہتے۔

سنا ہے ان دنوں بہاول پور کے زمیندار کثرت سے ریاستی مسلم لیگ کے ممبر بن رہے ہیں۔ یہاں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حضرات یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ کی لیڈری صرف انہیں لوگوں تک محدود ہو کے رہ جائے جنہیں اپنا شجرۂ نسب یاد ہے اور اگر بدقسمتی سے شجرۂ نسب کھو گیا ہے اور یاد بھی نہیں رہا تو کم از کم ان میں اتنی مقدرت ضرور ہے کہ نیا شجرۂ نسب بنوا لیں۔ ان لوگوں کو اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو ریاستی مسلم لیگ بس "نسب نامۂ دولت کیقباد" بن کے رہ جائے گی۔ اس میں عوام

---

[1] ان دنوں پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی تھے۔

کے حقوق پر بحث ہونے کے بجائے صرف یہ بحث ہوا کرے گی کہ کس کا نسب نامہ نوشیرواں سے جا ملتا ہے اور کون رستم کی اولاد میں سے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تقسیم کے بعد بہاول پور کے ایک صاحب صرف نسب کے بل بوتے پر سپیشل مجسٹریٹ بن گئے تھے۔ یہ صاحب اس ریاست کے رائے انور خاں کھرل ہیں یعنی بچارے پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے اور کاغذات پہ دستخط کرنے کے بجائے انگوٹھا لگاتے ہیں۔ لیکن صاحبزادہ صاحب تعلیم سے بے بہرہ ہیں تو کیا ہوا شجرۂ نسب سے تو بے نصیب نہیں چنانچہ وہ پندرہ سولہ مہینے مجسٹریٹی کرنے یا یوں کہئے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کاغذات پر انگوٹھا لگانے کے بعد پچھلے دنوں اس عہدے سے برطرف کر دیئے گئے۔ اصل میں ان کی اسامی ہی تخفیف میں آگئی تھی۔ ورنہ ان کے انگوٹھا لگانے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

---

۲ ار فروری

ایک صاحب لکھتے ہیں؛

"افسوس ہے کہ ہمارے صوبہ میں لیڈروں کا سخت قحط ہے یعنی اچھے لیڈر بالکل کمیاب ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ مغربی پنجاب میں اچھے لیڈر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔"

گھبرائیے نہیں یہ پنجاب ہیں لمبے ریشے والی کپاس، اعلیٰ قسم کا گیہوں، نفیس چاول پیدا ہو سکتے ہیں تو اعلیٰ درجے کا لیڈر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ لیڈری کی فصل خریف مدت ہوئی کٹ چکی۔ جنس منڈیوں میں پہنچ کے بک گئی زمینداروں اور جاگیرداروں نے کھتے اور ذخیرے بھر لیے۔ اسمبلی جہاں کنٹرول کے نرخ پہ لیڈر مل جاتا تھا، ختم ہو گئی۔ یوں تو بازاروں میں گلی سڑی جنس کے ڈھیر لگے ہیں۔ لیکن کوئی اسے آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ لیڈری کی راشن بندی کے زمانے میں جو جنس گندم کے بھاؤ بکتی رہی ہے اسے جو کہنا

بھی غلط ہے۔ بہر حال لیڈری جو یا باجرہ ہی ہوتی، جب بھی غنیمت تھی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ الاٹمنٹ کا کیڑا اسے کھا گیا۔

لیڈری کی پچھلی فصل ہونے کو تو خوب ہوئی۔ بیج بظاہر اچھا خاصا تھا۔ زمین بھی ناقص نہیں تھی اور پھر کھاد ولایتی بھی تھی اور دیسی بھی۔ لیکن جنس کچھ اس قسم کی تھی کہ کھیتوں میں پنپی اور نہ پھپھوندی لگنی شروع ہو گئی۔ جب تک اسمبلی رہی، لیڈری کی جنس کا راشن رہا۔ کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ جس جنس کو ہم گندم سمجھتے ہیں، وہ اصل میں جو ہے، یا باجرا۔ اسمبلی ٹوٹی، تجارت کا پنڈ چھوٹا۔ لیڈری کی راشن بندی ختم ہوئی تو آنکھوں سے پٹی سی اتر گئی اور سب کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ پھپھوندی لگی ہوئی جنس لیڈری چھوڑ ملم ٹیری بھی نہیں۔

بہر حال مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں فصل ربیع یعنی الکشن کی اگلی فصل کا انتظار کرنا چاہیئے۔ زمین کی جتائی تو چند دنوں میں شروع ہو جائے گی۔ پھر نلائی اور کٹائی وغیرہ کے مرحلے آئیں گے۔ یعنی کسان "جلسے کے ہل" میں "جلوس کے بیل" جوت کے زمین میں ہل چلائیں گے۔ پھر اس میں بیج ڈالیں گے اور "زندہ باد" کی کھاد کی مدد سے فصل اگائیں گے اور خدا نے چاہا تو چند مہینوں کے اندر لیڈروں کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن اس بات کی احتیاط کر لیجئے کہ کہیں بیج وہی پرانا تو نہیں جو جاگیرداروں کے کھتوں میں مدت سے پڑا تھا اور اب مسلم لیگ کی طرف سے "تقاوی" کے نام پر تقسیم کیا جا رہا ہے۔

ابھی ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ کن کن علاقوں میں زمینیں تیار کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ پرانے یونینسٹوں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی نہری زمینوں کا کیا حال ہے۔ احرار کے خانہ بدوش قبائل جو پہلے چارہ کی تلاش میں بھیڑ بکریوں کے گلے لئے گھوما کرتے تھے اور اب زراعت پیشہ بن گئے ہیں، اپنی چاہی زمینوں میں جو انہیں پچھلے دنوں الاٹ ہوئی ہیں، دھان بوئیں گے یا نہری زمینوں کے لئے صرف پنیری اگانے ہی پر اکتفا کریں گے۔ البتہ یہ خبر ضرور آئی ہے کہ خلافت

پاکستان گروپ والوں نے اپنی بارانی زمینوں میں چھوٹے اور لمبے ریشے والے لیڈر کی کاشت شروع کر دی ہے۔ وقت پر بارش ہو گئی تو شاید اچھی خاصی فصل ہو جائے۔

۳ر فروری

آغا شوکت علی کشمیر مسلم کانفرنس کے جنرل سکرٹری ہیں۔ لیکن آج ہمارے ایک معاصر نے انہیں مسلم کانفرنس کا "کبڈّی جنرل" لکھ کے انگریزی زبان کی ایک عام اصطلاح کا صحیح بدل فراہم کر دیا ہے۔ بظاہر تو یہ کاتب کی اصلاح ہے۔ لیکن یہ غور کیا جائے تو یہ اصلاح کچھ ایسی بُری نہیں۔ سکرٹری پر اپنے عہدے کے لحاظ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان پر غور کیا جائے "کبڈی جنرل" کی اصطلاح اس پر ایسی ٹھیک بیٹھتی ہے جیسے انگشتری میں نگینہ۔ ہمیں اس اصطلاح سے جو کاتب سے غیر ارادی طور پر "سرزد" ہو گئی ہے۔ فائدہ اٹھانا چاہیئے یعنی آئندہ سکرٹری کو "کبڈی جنرل" اور جائنٹ سکرٹری کو "کبڈی کرنل" کہنا چاہیئے۔

ہاں اس سلسلے میں ایک بات ایسی ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ سیاسی جماعتوں میں ہم نے یہی دیکھا ہے کہ صدر چپکا بیٹھا رہتا ہے اور سکرٹری یا یوں کہئے کہ "کبڈی جنرل" سیاسیات کی کبڈی کھیلتا رہتا ہے لیکن مغربی پنجاب کی مسلم لیگ کا یہ حال ہے کہ اس کے "کبڈی جنرل" نواب زادہ ولایت علی چُپ چاپ بیٹھے ہیں اور صدر صاحب سیاسیات کی کبڈی کھیل رہے ہیں۔

اخباروں میں "شامی بلاک میکرز" نام ایک فرم کا اشتہار چھپا ہے جو تصویروں کے بلاک بناتی ہے۔ کہیں یہ پورا اشتہار کتابت ہی کی بدحواسی کا نتیجہ تو نہیں یعنی کاتب نے کہیں شامی کباب کو شامی بلاک تو نہیں لکھ دیا۔ ممکن ہے کہ آپ اخباروں میں اشتہار پڑھ کے بلاک بنوانے جائیں اور اُدھر سے جواب ملے کہ یہاں بلاک تو نہیں بنتے البتہ تر تراتے شامی کباب اور گرم گرم نان حاضر ہیں اور یہ تو ناممکن ہے کہ آپ شامی کباب خرید لائیں اور کاتب یا سنگساز کا قلم اصلاح

کر کے انہیں "شامی بلاک" بنا دے۔

۴ر فروری

"انقلاب"[1] میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے، جس میں لکھا ہے کہ پنجاب کی طرف سے مولانا علاؤ الدین صدیقی، علامہ محمد اسد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا احمد علی اور مولانا داؤد غزنوی کو دستور ساز اسمبلی میں بھیجا جائے تاکہ یہ حضرات شریعت کے نفاذ کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ تجویز تو بہت خوب ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان "پنج تن" میں ایک شیعی مولوی صاحب کو بھی شامل کر لینا چاہیئے تاکہ دستور ساز اسمبلی میں حضرات علمائے کرام لڑیں تو لڑائی ذرا ٹھکانے کی ہو۔

ان پانچ حضرات میں جن کے نام اسمبلی کی ممبری کے لیے پیش کئے گئے ہیں، دو یعنی مولانا اسد اور مولانا داؤد غزنوی اہل حدیث ہیں جنہیں عام طور پر لوگ وہابی کہتے ہیں۔ مولانا احمد علی دیوبندی ہیں جو گلابی وہابی کہلاتے ہیں۔ مودودی صاحب نہ اہل حدیث نہ دیوبندی نہ مقلد نہ غیر مقلد۔ اور مقلد بھی ہیں تو آپ اپنے مقلد ہیں۔ باقی رہے مولانا (سابق علامہ) علاؤ الدین صدیقی تو وہ بھی حنفی ہیں نہ وہابی بلکہ نئے قسم کے مولوی ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر علماء کو دستور ساز اسمبلی میں بھیجنا ضروری ہے تو ہمیں ہر فرقہ کی نمائندگی کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ممکن ہے۔ اس موقع پر بعض حضرات کہیں کہ مولانا صدیقی "شیعان ممدوٹ" میں شامل رہ چکے ہیں اور "ولائے ممدوٹ" (یا ممدوٹ ولا[2]) میں اکثر سرشار پائے گئے ہیں لیکن صاحب اتنی سی بات میں کوئی شخص شیعہ ہو سکے تو مولانا داؤد غزنوی، اہل حدیث ہونے کے باوجود "شیعان دولتانہ"

---

[1] روزنامہ انقلاب لاہور۔ [2] ممدوٹ ولا۔

ہیں شامل رہے ہیں۔ چنانچہ بیالیس برائیوں کی فہرست میں اُن کا نام بھی موجود تھا۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ کے استقلال کا یہی حال رہا تو آپ کرسیوں کی لڑائی کو اس عہد کی جنگِ صفین یا "جنگ نہروان" نہ کہہ دیں۔

ممکن ہے کوئی صاحب کہہ دیں کہ شیعی علماء میں سے کسی صاحب کو ضرور لینا ہے تو مولانا مظہر علی اظہر موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تو ضرورت ہے کہ شیعی حضرات کو ان پر اعتماد ہو۔ مولانا مظہر علی اظہر بڑے لائق بزرگوار سہی لیکن شیعی حضرات تو انہیں مولانا "اِدھر علی اُدھر" کہتے ہیں اور ایک حیثیت سے یہ لوگ حق بجانب بھی ہیں۔ اگر انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں پہنچ کے مدحِ صحابہ شروع کر دی تو کون ان کو روک سکتا ہے؟ بہر حال اگر آپ کو علما کا دنگل کرانا ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیجئے۔ ہم نے پہلے بھی علما کے دنگل دیکھے ہیں۔ صدر و وزیر کی معرکہ آرائی بھی دیکھ چکے جیتے جی دستور ساز اسمبلی کے اندر علماء کا دنگل بھی دیکھ لیں تو کیا حرج ہے؟ بہر حال اس ترکیب سے دستور ساز اسمبلی اسمبلی نہیں رہے گی اکھاڑہ و شاہ کا تکیہ بن جائے گی۔

پچھلے دنوں اتحادی قوموں کی انجمن کی تولیتی کونسل میں ایک افریقی سردار کی بیویوں کی نسبت کہا گیا تھا کہ اس کی بیویوں کی تعداد چھ سو کے قریب ہے۔ حال میں اس سردار نے جس کی عمر ۸۰ برس کے قریب ہے۔ ایک بیان چھپوایا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ لوگو! خدا سے ڈرو۔ مجھ پر بہتان نہ باندھو۔ میں اسّی برس کا بڈھا۔ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ میرے پاس چھ سو بیویاں کہاں سے آئیں۔ لے دے کے کل ایک سو دس بیویاں ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں۔ جن کی جوانی ڈھل چکی ہے۔

ہمیں اس افریقی سے دلی ہمدردی ہے۔ ہمارے ہاں بھی اکثر لوگوں کے متعلق اس قسم کی مبالغہ آمیز خبریں مشہور ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً آئے دن ہم اس قسم کی خبریں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں صاحب کو پانچ کارخانے اور زمین کوٹھیاں الاٹ کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ تحقیق کی جائے تو نہیں

صرف دو کوٹھیاں اور زمین کارخانے الاٹ ہوئے ہیں۔ اور کوٹھیوں میں تو سامان بھی پورا نہیں تھا۔ اس لئے کچھ فرنیچر خریدنا پڑا اور وہ تو خیر گذری کہ یہ صاحب مہاجر نہیں تھے۔ ورنہ لوگ ان کے متعلق خدا جانے کیسی کیسی خبریں مشہور کرتے۔

---

۵ فروری

ہمارے ایک کرم فرما جن کا وطنِ مالوف دہلی ہے اور خاصے خوش حال بزرگوار ہیں کھانا پکانے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ پچھلے دن انہوں نے بعض دوستوں کے اصرار پر پسندے پکائے جو بہت لذیذ تھے۔ ایک صاحب نے جو اس محفل میں شریک تھے، پوچھا "حضرت! پسندے پکانے کی ترکیب آپ نے کس سے سیکھی"؟ کہنے لگے۔ ترکیب تو وہی پرانی ہے۔ البتہ مسالہ میں کچھ کمی بیشی ضرور کی ہے۔ بلکہ ایک دو چیزوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ سب لوگ یک زبان ہو کے بول اُٹھے۔ پھر یہ پسندے تو نہ ہوئے "ترقی پسند" ہوئے۔

"لارڈ" انگریزی زبان کا لفظ ہے جو اُمرا کے ناموں کے ساتھ آتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں نے اسے "لاٹ" بنا لیا اور اس کا محلِ استعمال بھی بدل دیا۔ چنانچہ صوبہ کے گورنر کو لوگ لاٹ کہتے ہیں۔ وائسرائے بڑے لاٹ صاحب کہلاتے رہے ہیں اور کمانڈر انچیف بہادر کو جنگی لاٹ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں گورنر جنرل نے اسمبلی اور وزارت کو توڑ کے صوبہ کا نظم و نسق گورنر کے حوالے کر دیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ پہلے خان ممدوٹ کا راج تھا اور لاٹ صاحب صرف نگرانی کرتے تھے۔ اب خان ممدوٹ الگ ہو گئے اور راج پاٹ پوری طرح لاٹ صاحب کے قبضے میں آ گیا۔ ہمارے خیال میں جہاں اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وہاں اس پرانے لفظ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیے۔ یعنی لوگوں کو چاہیئے کہ لاٹ صاحب کو آئندہ "الاٹ صاحب" کہا کریں۔ آخر دفعہ ۹۲ کے الف کا بھی تو کچھ خیال کیجیئے جس نے لاٹ صاحب کو اختیارات دلوائے۔

سٹالین اور ٹرومین کی ملاقات تو طے ہوگئی۔ لیکن یہ بات طے ہونے میں نہیں آتی کہ ملاقات کہاں ہو۔ نہ ٹرومین ماسکو جانے پر تیار۔ نہ مارشل سٹالین واشنگٹن جانے پر آمادہ۔ اس پر ہمیں ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ وسط ہند کے دو والیانِ ریاست میں مدت سے لاگ ڈانٹ چلی آتی تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کی کوششوں سے وہ ملاقات کر لے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ملاقات کیسے ہو۔ دونوں مہاراجے کوئی ایسی بات کرنے پر تیار نہیں تھے جس سے اُن کا پہلو ذرا دبتا نظر آئے۔ آخر پولیٹیکل ایجنٹ نے سوچتے سوچتے ایک ترکیب نکالی۔ یعنی ایسی جگہ اُن کی ملاقات کا انتظام کیا۔ جو دونوں ریاستوں کی راج دھانیوں سے ایک جیسے فاصلہ پر برطانوی علاقے میں تھی۔ دونوں ایک وقت میں ہاتھیوں پر سوار ہو کر اپنی اپنی راج دھانی سے چلے اور مقررہ مقام پر جہاں شامیانے تنے ہوئے تھے اور دو مسندیں آمنے سامنے بچھی تھیں۔ ایک ہی وقت میں پہنچے۔ دونوں بیک وقت ہاتھیوں سے اُترے۔ اور پانچ قدم چل کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت بھی یہی انداز ملحوظ رکھا گیا۔

۶ر فروری

ایک صاحب نے جن کا نام احمد سعید ہے۔ منیجر "امروز" کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ خداوند کریم کو حاضر و ناظر جان کر اپنے اخبار میں اس بات کا مطالبہ کریں کہ حضرت علامہ مشرقی کو مغربی پنجاب کا گورنر بنا دیا جائے"۔

بات تو معقول ہے۔ علامہ مشرقی کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ انہیں کسی صوبے کا گورنر بنا دیا جائے۔ البتہ ہم اس مطالبہ میں اتنی ترمیم کر دینا چاہتے ہیں کہ علامہ مشرقی کو مغربی پنجاب کا نہیں بلکہ مشرقی پنجاب کا گورنر بنایا جائے۔

جناب احمد سعید صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق ہم نے خدا کو "حاضر و ناظر" جان کے کہا ہے اور مطالبہ میں جو معمولی سی ترمیم ہوئی ہے، وہ صرف اس لئے کی گئی ہے کہ علامہ مشرقی کے لئے مشرقی پنجاب زیادہ موزوں ہے۔ وہاں ماسٹر تارا سنگھ سے اُن کی خوب گھٹے گی۔ وہ بھی لڑکے پڑھاتے پڑھاتے لیڈر بن بیٹھے اور مشرقی صاحب بھی ہیڈ ماسٹری کی گدی سے اُچک کے لیڈری کی گدی پر جا بیٹھے ہیں۔ اس لئے مشرقی پنجاب میں ان دونوں کا اجتماع "قرن السّعدین" سے کم نہیں ہو گا۔

ہم نے اِس مطالبہ میں جو معمولی سی ترمیم کر دی ہے، اس پر ناراض نہ ہو جائیے گا۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ علامہ مشرقی کو ڈپٹی کمشنر یا تحصیلدار بنا دیا جائے بلکہ اُن کے لئے گورنری ہی کی سفارش کی ہے۔ آپ بھی انہیں گورنر ہی بنوانا چاہتے تھے نا۔ اس سے آپ کو کیا غرض کہ وہ مغربی پنجاب کے گورنر بنتے ہیں یا مشرقی پنجاب کے۔ بہر حال تعمیلِ ارشاد ہو گئی۔ اب فرمائیے آپ کیا کہتے ہیں؟

احمد سعید صاحب نے منیجر "امروز" کے نام خط لکھا ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ معاملہ انتظامی امور سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اخبارات کے عام قاعدہ کے مطابق ایسے خط ایڈیٹر ہی کے پاس آتے ہیں۔ کیونکہ خط چھاپنا ایڈیٹر کا کام ہے۔ اس سے آگے جو انتظامی مرحلے آتے ہیں، انہیں منیجر طے کرتا ہے۔ خط تو چھپ گیا اور ہم نے یہ بھی نہیں کہا کہ مکتوب نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق الرائے ہونا ضروری نہیں۔ منیجر صاحب اخبار کی چھپائی اور کاغذ کا انتظام کریں گے تو گورنری کے عہدے پر علامہ مشرقی کے تقرر کا انتظام بھی کر دیں گے۔ بہر حال ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

۷ر فروری

نیا سال وزارتوں کے لئے بہت منحوس ثابت ہوا ہے۔ ممدوٹ وزارت تو گئی ہی تھی۔

"بخش وزارت" بھی نو مہینے سے زیادہ نہ چل سکی۔ اصل میں پیر الٰہی بخش بھی کیا کریں؟ یار لوگ مدت سے "الٰہی! بھیج چھپن کروڑ کی چوتھائی" "الٰہی! بخش وزارت" کے نعرے لگا رہے تھے۔ آخر اُن کی دعائیں سُن لی گئیں اور سندھ کی وزارت ختم ہو گئی۔ اب دیکھئے، اللہ تعالیٰ کسے وزارت بخشتا ہے۔

سُنا ہے۔ فی الحال تو میر غلام علی تالپور نے عارضی طور پر وزارت بنالی ہے۔ کچھ دنوں میں مستقل وزارت مرتب کی جائے گی اور کیا عجب ہے کہ میر صاحب ایسے تال کے پورے ثابت ہوں کہ اگلے انتخابات تک وزارت کا ٹھیکہ انہیں کو مل جائے۔ بچارے پیر الٰہی بخش تو تال کے کچے نکلے یعنی وزارت تو وزارت رہی۔ چھ سال کے لئے اسمبلی کی ممبری سے بھی جواب مل گیا۔ "پیری" و صد عیب چنیں گفتہ اند۔

پیر صاحب کے کامل ہونے میں تو کلام نہیں۔ بڑے بڑے پڑھے جن یعنی کراچی کے پانچ اخبار والے اُن کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑے تھے۔ لیکن پیر صاحب نے پانچ پیروں کی مدد سے ایک نہ چلنے دی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوا کہ گورنر نے تحقیقات کا حکم دے دیا۔ لیکن وزیر جب تک وزیر ہے، اس کے خلاف کوئی تحقیقاتی کارروائی کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پیر صاحب وزارت کی کرسی پر متمکن رہے تحقیقات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اتنے میں ایک "از غیبی گولہ" ایسا آکے پڑا کہ اڑا ہی اُڑ گیا۔ یعنی پیر صاحب وزارت کی خیر منا رہے تھے کہ ممبری سے بھی جواب مل گیا۔ نہ کوئی نقش کام آیا، نہ فتیلہ۔ نہ عمل سفلی نے اپنا کمال دکھایا نہ عمل علوی سے ہی کام نکلا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ پیر الٰہی بخش تو پیر تھے ہی۔ جی۔ ایم سیّد بھی تو آخر سیّد ہیں۔

سندھ اور پنجاب میں جس طرح وزارتیں آئے دن بنتی اور بگڑتی رہی ہیں، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وزارت کی عمارت میں جو مسالہ خرچ ہوا ہے وہ ناقص تھا۔ پھر ٹھیکہ داروں نے بھی کام کی طرف کچھ ایسی توجہ نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رائے عامہ کی "بادِ مخالف"

چلنے لگی تو ساری عمارت نے اس طرح ڈولنا شروع کر دیا، گویا بھونچال آ گیا۔ یار لوگوں نے اڈوا اڑدے کچھ دیر تک سنبھالے رکھا لیکن آخر کب تک۔ ایک زور کا جھونکا آیا اور ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اب جو اسمبلی بنے۔ مضبوط بنے۔ وزارت قائم ہو تو اسے ایسا مسالہ لگایا جائے کہ چاہے آندھی آئے یا طوفان۔ وزارت کی عمارت اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے۔ وزارت نہ ہوئی بتیسی ہو گئی۔ ایک دانت میں درد ہونے لگا، نکلوا کے مصنوعی دانت لگوا لیا۔ دوسرے دانت ہلنے لگے "دردِ دندان، اخراجِ دندان" کہہ کے سارے دانت نکلوا دیئے۔

کچھ دنوں سے اخباروں میں اس مضمون کے خط چھپ رہے ہیں کہ فلاں فلاں مولوی صاحبان کو دستور ساز اسمبلی میں بھیجا جائے۔ فلاں علّامہ فہامہ کو جنہیں قدوری حفظ ہے، اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑا کر کے وزیر بنوانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن جو لوگ آئے دن اس قسم کی تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں آتا کہ وزارت اور ممبری نے جاگیرداروں اور پیروں سے وفا نہیں کی تو حضرات علمائے کرام کو ان سے کیونکر وفا کی امید ہو سکتی ہے اور خدانخواستہ اگر ممبری ایک مرتبہ قبضے میں آ کے نکل گئی۔ یا کچھ دیر وزیر رہنے کے بعد وزارت سے جواب مل گیا تو ان دنوں مولوی حضرات نے پیٹ بھرنے کے لئے جو چھوٹے موٹے دھندے اختیار کر رکھے ہیں، پھر ان کی طرف طبیعت رجوع نہیں کرے گی۔ دکان یا کارخانہ چلانا تو الگ رہا، پیش امام یا موذن بننے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہے گی۔ دُرِّ مختار پڑھانا تو بڑی چیز ہے، قاعدۂ بغدادی کا پڑھانا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ہم اس فکر میں ہیں کہ معزول وزیروں اور ممبروں کی بستیاں الگ بسائی جائیں اور بستیاں نہ بسائی جا سکیں تو انہیں کیمپوں ہی میں رکھا جائے اور یہ حضرات اس فکر میں ہیں کہ علمائے کرام کو ممبر اور وزیر بنائیں۔ انہیں معزول کرائیں اور قوم کے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دیں۔ بچاری قوم ابھی تک مہاجرین کی آبادکاری کے معاملہ سے پوری طرح عہدہ برآ

نہیں ہو سکی۔ بچارے علماء نے بھی "منبر" کو چھوڑ کے "ممبر" اور وزیر بننا چاہا اور اس شوق میں بالکل "بے وطن" ہو کے رہ گئے تو فرمائیے، آپ ان کے لئے کیا انتظام کریں گے۔

۸ر فروری

اسمبلی ختم کیا ہوئی۔ ایم۔ ایل۔ اے حضرات بلکہ حضرات وزرائے کرام بالکل بے مصرف ہو کے رہ گئے۔ البتہ شیخ صادق حسن اپنا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایم۔ اے او کالج میں مشاعرہ ہوا تو شیخ صاحب اس کے صدر تھے۔ حال میں طبّی کانفرنس ہوئی۔ اس کی صدارت کا قرعۂ فال بھی شیخ صاحب ہی کے نام پڑا اور کل کلاں اگر لاہور میں دندان سازوں، کھٹ بنوں یا پارچہ بافوں کی کوئی کانفرنس ہوئی تو یقین رکھئے کہ اس کے صدر بھی شیخ صاحب ہی ہوں گے۔ شیخ صاحب ایم۔ ایل۔ اے نہیں رہے تو نہ سہی "صدارت" سے انہیں کون محروم کر سکتا ہے اور وہ صدر بھی کچھ اس قسم کے ہیں کہ ہر جلسے، کانفرنس اور مشاعرہ میں آسانی سے "فِٹ" ہو جاتے ہیں۔

شیخ صاحب کو صدارت کے فن میں جو کامیابی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صدارت کے فرائض انجام دیتے وقت بہت کم باتیں کرتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے مشاعرہ میں انہوں نے اس عام طریقہ سے کسی قدر انحراف کیا تھا کہ "کرسیاں" چلنے لگیں اور شیخ صاحب بالکل "حشو" بن کر رہ گئے۔ طبّی کانفرنس میں جن طبیبوں سے انہیں سابقہ پڑا وہ زیادہ تجربہ کار تھے۔ اس لئے انہوں نے شیخ صاحب کو مناسب بدرقہ کے ساتھ کانفرنس میں خاص خاص موقعوں پر استعمال کیا اور نافع پایا۔

معلوم نہیں۔ ترقی پسند مصنفین نے یومِ حسین مناتے وقت اس مجرب قسم کے صدر کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ وہ جلسے، کانفرنس اور مشاعرے کی طرح ہر قسم کے "یوم" میں بھی آسانی سے

"فٹ" ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ یومِ چین ہو یا یومِ فلسطین۔ ترقی پسند مصنفین انہیں بلاتے تو وہ ضرور آتے اور اطلبو العلم ولو کان بالصین پڑھتے ہوئے آتے اور کانفرنس میں اس طرح "فٹ" ہو جاتے۔ گویا اللہ نے اُنہیں اسی کانفرنس کی صدارت کے لئے بنایا ہے۔ یوں تو اسمبلی کے کئی پرانے ممبران دنوں اُن کی دیکھا دیکھی "صدارت کرو" کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں، لیکن کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

---

۴ ارفروری

مغربی پنجاب کی یونیورسٹی نے ایم۔ اے اردو کی کلاس تو کھول دی اور اس میں طالب علم بھی داخل ہو گئے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ پڑھانے والے نہیں ملتے اور جو لوگ اُردو پڑھانے پر مقرر کئے گئے ہیں، اُنہیں اُردو نہیں آتی۔ کیونکہ ایک آدھ کتاب لکھ کے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کر لینا اور چیز ہے، اور اُردو پڑھانا اور چیز۔

دراصل جو لوگ اُردو پڑھانے کے کام پر مقرر ہیں، انہوں نے اُردو چھوڑ فارسی تک پڑھی ہے لیکن انھوں نے یہ زبانیں انگریزی میں پڑھی ہیں۔ گارساں دی تاسی کے خطبات یا گراہم بیلی اور سکسینہ نے ادب اردو کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی ہیں، انہیں پڑھ کے اردو تو نہیں آجاتی۔ کسی نے بہت بڑا تیر مارا تو انڈیا آفس کی لائبریری میں اُردو کے جو مخطوطات ہیں، ان میں سے چار پانچ کے نام یاد کر لئے اور اردو کے معاملہ میں سند الوقت بن بیٹھا۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہی لوگ اردو پڑھاتے رہے تو طلبہ کو جو تھوڑی بہت اردو آتی ہے، وہ بھی بھول جائیں گے۔

زبان اور محاورہ کے نکتوں کو سمجھنا تو بڑی چیز ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جو حضرات یونیورسٹی میں اردو پڑھا رہے ہیں، انہیں اردو نثر اور شاعری کی تاریخ بھی نہیں آتی۔ مثلاً پچھلے دنوں ایک پرانے شاعر

وجہی کا ذکر آیا تو پروفیسر صاحب گھبرا گئے۔ پہلے کہا وجہی نہیں وجی کہو۔ پھر فرمانے لگے کہ وجہی بھی غلط ہے۔ صحیح لفظ وہبی ہے۔ گویا ؎

داغ کا نام سُن کے فرمایا
آدمی کا یہ نام ہوتا ہے!

ہمیں ڈر ہے کہ یہ "وہبی" آگے چل کے "وہابی" نہ بن جائے۔ کیونکہ آج کل دفعہ ۹۲ الف کا زمانہ ہے۔ یہ الف وزارت کو تو زیر و زبر کر چکا ہے۔ اگر اب اس نے یونیورسٹی کا رُخ کیا اور وہبی پر "وارد" ہو کے اسے "وہابی" بنا دیا تو کوئی اس کا کیا کرے گا؟

خبر آئی ہے کہ نواب صاحب بہاولپور جو ان دنوں لندن میں ہیں "نواب صاحب امب" بنے ہوئے ہیں۔ یعنی ہر روز آم کھاتے ہیں۔ انہوں نے بہاولپور سے روانہ ہوتے وقت ہدایت کر دی تھی کہ دوسرے ہفتے تیس سیر آم لندن پہنچ جایا کریں۔ چنانچہ انہیں آم باقاعدگی سے مل رہے ہیں اور دونوں وقت دسترخوان پر موجود ہوتے ہیں۔

۵ار فروری

ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ چیانگ کائی شیک اب کیا کرے گا؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ مضمون لکھے گا اور ممکن ہے کہ وہ بھی ملک فیروز خان نون کی طرح قانونِ انتقالِ اراضی کے خلاف ہی مضمون لکھے اور یہ نہ ہو سکے تو اپنے سفرِ ہندوستان کا روزنامچہ امریکہ کے اخباروں میں چھپوا دے۔ کم از کم ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ جو لوگ سیاسیات میں ناکام رہتے ہیں یا وزیر نہیں بن سکتے وہ مضمون نگاری کر کے جی بہلاتے ہیں۔

مولانا عبدالستار نیازی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ میری اور دولتانہ صاحب کی سانٹھ گانٹھ ہو چکی تھی اور یہ طے تھا کہ صدارت اُن کی اور سکتری میری۔ وہ دولتانہ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھتے

ہیں کہ نا صاحب۔ میری اور نیازی صاحب کی سانٹھ گانٹھ کیسی اور ایک ہی سیاسی جماعت کے دو افراد میں اس قسم کا سمجھوتہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ نیازی صاحب نے یونہی جوش میں آ کے یہ بات کہہ دی۔

ہم نہ نیازی صاحب کے طرفدار نہ دولتانہ صاحب کے حامی۔ لیکن دولتانہ صاحب کے جتنے بیان ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے اللہ والے بزرگ ہیں۔ نہ کسی سے دوستی نہ دشمنی۔ نہ جھگڑا نہ فساد۔ صدارت انہیں اللہ نے دلائی۔ نیازی صاحب کو سکتری نہیں ملی تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ اللہ جسے چاہتا ہے عزّت و رتبہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس سے محروم رکھتا ہے۔

تعجب ہے کہ خلافت پاکستان گروپ تو نیازی صاحب نے قائم کر رکھا ہے اور خلافت کے مستحق دولتانہ صاحب معلوم ہوتے ہیں۔

سُنا ہے کہ لاہور کارپوریشن کے ماتحت جتنے سکول ہیں اُن کے اساتذہ نے کارپوریشن کو نوٹس دے دیا ہے کہ یا تو کارپوریشن کی منظور شدہ قرارداد کے مطابق ہماری تنخواہیں بڑھاؤ ورنہ ہم ہڑتال کر دیں گے۔ اس وقت ان لوگوں کو پینتالیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ دو روپے سالانہ ترقی ہے۔ اس حساب سے پندرہ سال میں کہیں پچھتر روپے ماہانہ تنخواہ ملنے لگتی ہے۔ اب کیا ہے۔ مزے ہو گئے۔ دو کی جگہ تین روپے سالانہ ترقی ملنے لگتی ہے۔ پانچ سال میں نوّے روپے تک پہنچے تو ترقی بند۔ چند برس اسی تنخواہ میں گزارے اور رغفرلہٗ ہو گئے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہ پینتالیس کے بجائے پچاس کر دیجئے۔ پہلے دس سال تین روپے سالانہ ترقی ملے۔ پھر پانچ سال چار روپے۔ سو روپے ماہانہ تنخواہ تک پہنچیں تو پانچ روپیہ سالانہ ترقی دی جائے۔ یعنی بیس سال ملازمت کرنے کے بعد ہر اُستاد کی تنخواہ سوا سو روپے تو ہو۔ لیکن کارپوریشن کو یہ منظور نہیں کہ بڑے آدمیوں کا بیرا جتنی تنخواہ پاتا ہے ٹیچروں کو بھی اتنی تنخواہ

ملنے لگے۔ نائی دن بھر بیس آدمیوں کو مونڈتا ہے اور پانچ سات روپے روزانہ کما لیتا ہے۔ تانگہ والا بھی آٹھ دس روپے روزانہ کھرے کر لیتا ہے۔ چالیس پینتالیس تو چپراسی کی تنخواہ ہے۔ ٹیچروں کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ ملنے لگے تو یہ لوگ مغرور ہو جائیں گے اور طلبہ سے سیدھے مُنہ بات نہیں کریں گے؟۔

ٹیچر کہتے ہیں کہ ہم قوم کے معمار ہیں۔ کارپوریشن کو جواب میں کہنا چاہیئے کہ قوم کا معمار ہونا کونسی فخر کی بات ہے۔ یہ جنس ہمیشہ اس ملک میں ارزاں رہی ہے معمار معمار ہے جاگیردار نہیں۔ زمیندار نہیں سکتر نہیں، ٹوانہ نہیں، دولتانہ نہیں، چب نہیں، کھٹڑ نہیں، نون نہیں، بسال نہیں، سیال نہیں، کھرل نہیں، پھر اتنا غرور کس بات کا۔ اپنا شجرہ نسب دکھاؤ۔ یہ بتاؤ کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب سرکار انگلشیہ پر مصیبت کا وقت آیا تھا تو تمہارے بزرگ کہاں تھے؟ لارنس کی کوئی سند تمہارے پاس ہے تو نکالو اور سند ہوتی تو ٹیچری کیوں کرتے؟ گلچھرے نہ اڑاتے تمہیں شہر میں کوئی جانتا بھی ہے۔ کسی وزیر سکتر، ایم۔ ایل۔ اے سے بھی شناسائی ہے؟ ایسے ہی عزت دار ہوتے تو کوئی دکان یا فیکٹری نہ الاٹ کرا لیتے۔ آخر تمہارے پاس رکھا کیا ہے۔ صرف "دولتِ علم"۔ دولتِ علم ایسی ہی شاخِ زعفران ہے تو پانچ روپے ماہانہ ترقی کے لیے کیوں مرے جا رہے ہو۔

---

۱۷ فروری

سُنا ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے شیخ حسن البنا کی شہادت کی خبر سُنی تو فرمایا "معلوم ہوتا ہے۔ مصر میں بھی پارٹی بازی ہے"۔ اس پر ہمیں بے اختیار لکھنؤ کے وہ بزرگ یاد آگئے جنہوں نے چوری کی واردات کی خبر سُن کے فرمایا تھا "مقرر یہ کسی چور کا کام ہے"۔ مصر کے سیاسی معاملات کے متعلق چودھری صاحب کی معلومات یقیناً حیرت انگیز ہیں۔

سُنا ہے۔ کارپوریشن نے فیصلہ کیا ہے کہ نواح لاہور کی بعض بستیوں کے نام بدل دیئے جائیں۔ چنانچہ مصری شاہ کا نام شاد باغ، اور پونچھ روڈ کے آس پاس کی بستیوں کا نام ثمن برج کی رعایت سے ثمن آباد تجویز ہوا ہے۔ ہمارے ایک معاصر نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ مصری شاہ کا نام جو چاہے رکھئے، ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن پونچھ روڈ کا نام بدلنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ نام کشمیر سے ہمارے تعلقات کی یادگار ہے ـــــ لیکن ہمارے معاصر کو یہ یاد نہیں رہا کہ مصری شاہ کا نام بھی تو مصر سے ہمارے تعلقات کی یادگار ہے۔ بلکہ اگر آپ مصر کے ساتھ ساتھ قندھار سے بھی تعلق قائم کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مصری "شاہ" قندھار کا ترجمہ ہے۔

کارپوریشن نے شہر کی حدود میں "شور" مچانے کی ممانعت کر دی ہے۔ کچھ عرصہ سے آتشبازی کے خلاف جو پروپگنڈا کیا جا رہا ہے یہ شاید اس کا اثر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نئے میئر صاحب کو شور و غل سے نفرت ہو اور انھوں نے یہ حکم صادر فرما دیا ہو۔ آخر شاعر نے بھی تو کہا ہے کہ ؎

سرہانے میئر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

۱۹ر فروری

ہمارے ایک کرم فرما نے اپنے ایک خط میں ہمیں چودھری خلیق الزماں کی ایک تقریر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "بھئی میرا تو گوشت پوست ہی جاگیرداری سے بنا ہے۔"

ہمارے خیال میں اس فقرے میں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں چودھری صاحب نے محض ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ان کے سوانحِ حیات کے ایک حصے پر روشنی پڑتی ہے۔ زبان

کے لحاظ سے یہ فقرہ بالکل صحیح ہے اور خیال کے اعتبار سے "استادانہ" ہے۔

لیکن اگر کوئی صاحب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ چودھری خلیق الزماں کے بس اس ایک فقرے کی وجہ سے لوگ جاگیرداری کی مخالفت کرنا چھوڑ دیں گے تو وہ غلطی پر ہیں۔ چودھری صاحب آل پاکستان مسلم لیگ کے ناظم اور بہت بڑے لیڈر سہی لیکن انہیں جاگیرداری سے جو نسبت ہے۔ اس کی وجہ سے جاگیرداری مقدس تو نہیں ہو گئی۔

بہر حال یہ تذکرہ تو بیچ میں یونہی آگیا۔ ورنہ جہاں تک چودھری خلیق الزماں کا تعلق ہے وہ بے چارے بے قصور ہیں۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ اپنا گوشت پوست ہی بدل ڈالیں کہ یہ کوئی لباس تو نہیں کہ جب چاہا بدل ڈالا۔

پچھلے دنوں یونیورسٹی کے فیلو حضرات کا انتخاب ہوا۔ اس کا انداز لاہور میونسپلٹی کے انداز سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یعنی جلوس بھی نکلے۔ زندہ باد کے نعرے لگے۔ ہم حیران تھے کہ کہاں یونیورسٹی کہاں میونسپلٹی۔ یہ راز اب کھلا کہ یونیورسٹی پر بعض ایسے حضرات مسلط ہیں جو لاہور کارپوریشن کے ممبر بھی ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ یونیورسٹی کو میونسپلٹی بنا دینا چاہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

۲۱ر فروری

آج ایک مشاعرہ کا اعلان اخباروں میں چھپا ہے جو اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی مخیر بزرگوار دو ڈھائی لاکھ روپے کی رقم بنک میں رکھا دیں اور وصیت کر جائیں کہ اس روپے کے سود سے اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے پروپگنڈا کیا جائے تو رہی سہی کسر پوری ہو جائے۔

گویا "مشاعرہ" تو خالص اسلامی چیز ہے۔ بعض ملحد قسم کے شعرا نے اسے غیر اسلامی بنا رکھا تھا۔ اب جماعت اسلامی، انجمن مجاہدینِ اسلام، حزب اسلامی اور اس قسم کی دوسری مجالس نے "تطہیرِ مشاعرہ" کی جانب توجہ فرمائی ہے تو چند دنوں کے اندر اسے خالص اسلامی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ معلوم نہیں بیچارے تھیٹر اور فلم نے کیا قصور کیا ہے۔ لگے ہاتھوں ذرا ان کی تطہیر بھی ہو جائے تاکہ لوگ اتنا تو کہہ سکیں کہ ؎

کن نعمتوں کو حکم ملا ہے جواز کا

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں مشاعرہ موجود تھا۔ عکاظ کے میلے میں شعرا جمع ہو کے اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ خنسا، زہیر، نابغہ، امراء القیس، عمرو ابن کلثوم وغیرہ مشہور شعرا نے اسی اجتماع میں اپنے مشہور قصیدے کہے ہیں۔ لیکن عہدِ رسالت یا خلافتِ راشدہ میں کسی کو خیال نہ آیا کہ عکاظ کے میلہ کو زندہ کر کے اس سے پروپگنڈے کا کام لینا چاہئے۔

اصل بات یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی میں کچھ شاعر حضرات شامل ہو گئے ہیں جو اپنا کلام سنانے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ پچھلے دنوں کشمیر ریلیف فنڈ کے سلسلے میں مشاعروں کا سلسلہ جو شروع ہوا تو ان بزرگوں نے بھی سوچا کہ آؤ لگے ہاتھوں ایک مشاعرہ ہی کر لیں۔ کلام سنانے کا موقع بھی ہاتھ آجائے گا۔ داد بھی ملے گی اور ثواب بھی حاصل ہوگا۔ اور اس ترکیب سے اسلامی حکومت بھی قائم ہو جائے گی اور شعر سنانے کے شوق میں کسی کو خیال نہ آیا کہ اسلامی حکومت قائم کرنا شاعروں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے حیدر و فاروق اور بوذر و سلمان رضی اللہ عنہم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

۲۲ر فروری

اگرچہ مسلم لیگ میں سب سے زیادہ ممبر مغربی پنجاب نے بھرتی کرائے لیکن مرکزی لیگ کے عہدہ دارون

کا انتخاب ہُوا تو پنجاب کے حصے میں ایک بھی عہدہ نہ آیا۔ چودھری خلیق الزماں صدر منتخب ہوئے۔ یوسف خٹک صاحب سکرٹری۔ مولانا عبدالباقی نائب صدر۔ قریشی صاحب (کراچی) خزانچی۔ غیاث الدین پٹھان (مشرقی بنگال) اور مسٹر بنی بخش (بلوچستان) جائنٹ سکرٹری۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی پنجابی کو ضرور صدر یا جنرل سکرٹری منتخب کیا جاتا۔ لیکن اگر کسی پنجابی کو جائنٹ سکرٹری ہی بنا دیا جاتا تو پنجاب والوں کے آنسو پنچھ جاتے۔ وہ تو بڑی خیر گزری کہ مس جون براؤن جو لاہور کی رہنے والی ہیں۔ کراچی کے مقابلۂ حسن میں بازی لے گئیں اور اب مس پاکستان یعنی پاکستان کی ملکۂ حُسن کہلاتی ہیں، ورنہ کراچی میں ان دنوں جو ہنگامے ہوئے ہیں ان میں بچارا مغربی پنجاب صرف تماشائی بن کے رہ گیا تھا۔

لیگ جیسی اہم سیاسی جماعت کے تذکرہ میں اس مقابلۂ حُسن کا ذکر بظاہر بے موقع سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو کچھ بے موقع بھی نہیں۔ لیگ اسمبلی پارٹی کی لیڈری کے قضیے میں یوسف ہارون صاحب کا مقابلہ میر غلام علی تالپور سے تھا۔ لیکن میدان یوسف ہارون صاحب ہی کے ہاتھ رہا۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لئے پنجاب سے میاں عبدالباری امیدوار تھے۔ اور سرحد سے یوسف خٹک صاحب۔ یہاں بھی یوسف صاحب نے معرکہ مار کے سرحد کا نام روشن کر دیا۔ گویا اس وقت یوسف سندھی کے پرتوِ حسن سے سندھ کی وزارت بقعۂ نور ہے اور یوسف سرحدی کے شعشعۂ جمال سے مرکزی لیگ مطلع انوار۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس موقع پر ہم مس براؤن کا نام لے کے دل کو تسلّی نہ دیں تو اور کیا کریں؟

مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد چھبیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جن میں پونے بارہ لاکھ یعنی نصف سے کچھ کم پنجاب سے بھرتی ہوئے۔ لیکن عہدہ داروں کا انتخاب ہُوا تو لوگوں نے دیکھا کہ سندھ، بلوچستان، مشرقی بنگال، سرحد بلکہ یوپی تک کے نمائندے موجود ہیں۔ صرف پنجاب ہی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اب اس فروگزاشت کی تلافی کی صرف ایک صورت رہ گئی ہے کہ کراچی میں مرکزی لیگ کا دفتر قائم ہو تو اس میں ایک آدھ پنجابی کلرک یا چپراسی کو نوکر رکھ لیا جائے یہ ہو جائے تو بس سمجھ لیجئے کہ لکھا جوکھا برابر۔

ہندو حجام "راجہ" کہلاتے تھے اور مسلمان حجام "خلیفہ جی" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک زمانے میں ہندو حجاموں نے راجہ کانفرنس کے نام سے ایک مجلس بھی قائم کر رکھی تھی۔ جس میں بعض مسلمان حجام بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے آل انڈیا راجہ کانفرنس کے نام سے اس مجلس کا ایک اجلاس بھی منعقد کیا تھا، جس میں بڑے بڑے جغادری حجام شریک تھے۔ یہ تو خیر پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد حجاموں نے اپنی تنظیم کے مسئلے سے غفلت نہیں برتی۔ سیالکوٹ میں حجام کمیٹی قائم ہو گئی ہے۔ کوئی دن میں دیکھ لیجئے گا کہ جگہ جگہ حجام کمیٹیاں قائم ہو جائیں گی اور یہ تحریک "آل پاکستان حجام کانفرنس" کی صورت اختیار کر کے "آل پاکستان" قسم کے مشاعرے کرایا کرے گی۔ بہر حال شعر و شاعری تک تو مضائقہ نہیں لیکن اگر حجام کمیٹی نے اپنے استروں اور قینچیوں کو سیاسیات کی سان پر چڑھانے کا ارادہ کیا تو خدا جانے کیا معرکہ پیش آئے ؂

اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

۲۳ر فروری

پنجاب یونیورسٹی ایک زمانے میں اہل علم کا ادارہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب سے سنڈیکیٹ اور سینٹ دونوں میں کتاب فروش قسم کے لوگ آ گھسے ہیں۔ یونیورسٹی "اہل کتاب" کی جماعت بن کے رہ گئی ہے اور یہ لوگ اہل کتاب ہی نہیں "صاحب نصاب" بھی ہیں۔ یعنی پہلے بھی انہیں کے ہاں کی درسی کتابیں یونیورسٹی کے "نصاب تعلیم" میں شامل تھیں اور آگے چل کے بھی یہ میدان انہیں کے ہاتھ رہے گا۔ آپ جانتے ہیں "صاحب نصاب" لوگوں پر "زکوٰۃ" فرض ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر "ڈنڑ" کا ہنگامہ نظر آ جائے تو "زکوٰۃ علم" سمجھئے اور چپکے ہو رہئے۔

پنجاب سیاسی دھڑے بندیوں کی وجہ سے انگشت نما ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس معاملہ

میں "اہلِ علم" اور "اہلِ کتاب" حضرات بھی اہلِ سیاست سے پیچھے نہیں۔ الاٹمنٹیں وہاں بھی ہیں، دنگل وہاں بھی ہو رہے ہیں، اکھاڑ پچھاڑ کا سلسلہ وہاں بھی جاری ہے۔ شکر ہے کہ ابھی تک دھول دھپے کی نوبت نہیں آئی، لیکن کوئی عجب نہیں کہ اسے بھی "داخلِ نصاب" کر لیا جائے۔ لازمی مضمون کی حیثیت سے نہ سہی، اختیاری مضمون کی حیثیت ہی سے سہی۔

"اہلِ علم" آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں تو ان کا انداز عالمانہ ہوتا ہے یعنی کسی علمی مسئلہ پر بحث ہو گئی۔ دونوں طرف سے دلائل دیئے گئے۔ حوالے پیش ہوئے۔ آخر ایک نے دوسرے کی بات مان لی یا دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے اور فیصلہ ہو گیا ؏

تم اپنا منہ ادھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں

لیکن آج کل یونیورسٹی میں جن معاملات پر جھگڑے ہو رہے ہیں۔ وہ قطعاً غیر علمی یا یوں کہئے کہ بالکل "جلبی" ہیں۔ علم چلا رہا ہے کہ خدا کے لئے مجھے ان دکانداروں سے چھڑاؤ، چنگڑ محلّہ بھیج دو، موچی دروازے بھیج دو، مجھے بھاٹی دروازے میں زیادہ اطمینان میسّر ہوگا، اس یونیورسٹی میں نہیں رہ سکتا۔ یہاں تو "اہلِ کتاب" سے واسطہ ہے جو کتاب کے وزن سے میرے وزن کا اندازہ لگاتے ہیں اور بھینس کو عقل سے بڑا سمجھتے ہیں، لیکن کسی کو بچارے علم کی حالت پر ترس نہیں آتا۔

کئی برس ہوئے راقم الحروف کو ایک کتب فروش سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے اپنا کتب خانہ دکھایا جس میں کتابوں کے انبار لگے تھے۔ پھر کہنے لگا:-

"ہمارے ہاں تو کتابیں تُل کے بکتی ہیں۔"

میں نے کہا "کتابیں تُل کے بکتی ہیں؟!"

"جی ہاں۔ آج دلّی سے ایک تاجر آیا تھا۔ ڈیڑھ من مرغی خانہ لے گیا ہے۔ مرغی خانہ ہمارے کتب خانے کی خاص کتابوں میں سے ہے۔ آج تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں من بیچ چکا ہوں۔"

میں نے پوچھا "اور آپ قیمت نقد وصول کرتے ہیں؟"

"نقد بھی وصول کرتے ہیں کبھی کبھی کسی کتاب سے تبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً بیس سیر 'مرغی خانہ' کے عوض تیس سیر دودھاری تلوار عرف پیالہ بھر خون ہاتھ آجائے تو مجھے تبادلہ میں کوئی عذر نہیں ہوگا اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ تاجر نے اصرار کیا اور من بھر مرغی خانہ کے ساتھ پانچ سیر 'بانگِ درا' گھاتے میں لے گیا۔ کہئے تو بیس پچیس سیر مرغی خانہ آپ کو بھی تول دوں؟"

یونیورسٹی میں کتابیں تُل کے نہیں بکتیں۔ البتہ کتابوں کے وزن سے "اہل کتاب" اور صاحب نصاب لوگوں کے وزن کا اندازہ لگایا جاتا ہے بلکہ ہمیں تو شبہ ہے کہ اس ادارہ میں علم و عقل دونوں بھینس سے بھی کمتر سمجھے جاتے ہیں۔

اس سے زیادہ عرض کیا تو شور مچ جائے گا کہ "میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا"۔ حالانکہ ہم نے بھینس کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی، بلکہ اس کے آگے صرف بین بجانے کی کوشش کی ہے۔

۲۴ر فروری

سنا ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ میں ایک "چندہ بل" پیش کیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آئندہ کوئی سرکاری ملازم چندہ جمع نہیں کر سکے گا۔ الاٹمنٹ کا دَور ختم ہونے کے بعد سرکاری ملازمین کو صرف چندہ کا سہارا رہ گیا تھا۔ افسوس ہے کہ یار لوگوں نے یہ اڈا بھی اڑا دیا۔ خیر صاحب سرکاری ملازم بھی ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ چندہ وصول کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال ہی لیں گے۔ سرکار نے چندہ جمع کرنے سے روک دیا تو لوگ کسی ریلیف فنڈ کے لئے مشاعرہ کرایا کریں گے۔ مشاعرہ ممنوع قرار پایا تو تھیٹر یا سرکس سہی۔

چندے کا دھندا یوں تو بہت پُرانا ہے۔ لیکن اسے باقاعدہ فن کی حیثیت سے انگریزی

عہد حکومت ہی میں حاصل ہوئی ہے۔ پہلے قومی انجمنیں اور خیراتی ادارے چندہ جمع کرتے تھے۔ پھر سرکاری افسروں نے بھی یہی دھندا شروع کر دیا اور کچھ عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ وزیر سے ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر سے پٹواری تک جسے دیکھو "لا چندہ" کے نعرے لگا رہا ہے۔ چندہ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں بھی وصول کیا جاتا تھا۔

لیکن وہ چندہ اور تھا اور یہ چندہ اور ہے۔ وہ بھیک کی طرح مانگا جاتا تھا، یہ مالگزاری کی طرح وصول کیا جاتا ہے۔

چندہ بل کے سلسلے میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں بڑی بڑی دلچسپ باتیں کہی گئی ہیں مثلاً "ملک فیروز خاں نون نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر لوگوں پر دباؤ ڈال کے چندہ وصول کرتے ہیں اور پھر خود اسے ہضم کر جاتے ہیں اور سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ اس رقم میں وزراء کے بھی حصے لگائے۔ کچھ روپیہ ڈپٹی کمشنر نے کھایا، کچھ کسی وزیر کے حصے میں آیا۔ نون صاحب خود وزیر رہے ہیں۔ اُن سے زیادہ وزیروں اور اُن کے ماتحت اہل کاروں کے طور طریقوں سے کون واقف ہوگا۔ "رموزِ سلطنتِ خویش خسرواں دانند"۔ ہاں ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ چندہ کھانے کی چیز ہے۔ اس لئے اگر وزیر اور ڈپٹی کمشنر مل کے چندہ کھا جائیں تو یہ کونسی اچنبھے کی بات ہے۔ اگر سرکاری عہدہ دار چندہ جمع کر کے خزانے میں داخل کرا دیتے اور جس مقصد کے لئے جمع ہوا ہے، اسی پر صرف ہوتا تو یہ ضرور اچنبھے کی بات تھی۔

ہمارے خیال میں یہ اعتراض ہی سرے سے غلط ہے کہ سرکاری ملازمین نے چندہ کیوں جمع کیا ؟ اور جمع کیا تھا تو کھایا کیوں ؟ جو شخص چندہ جمع کرے گا، کھائے گا۔ البتہ غیر سرکاری قسم کے لیڈروں کی شکایت درست ہے کہ سرکاری ملازمین کے پاس کھانے کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً اگر وہ چاہیں تو رشوت کھا سکتے ہیں، الاٹمنٹ پر گزر اوقات کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس لے دے کے ایک "چندہ" رہ گیا تھا۔ اس پر بھی سرکار نے قبضہ کر لیا تو ہم کیا کھائیں گے ؟ ہمارے خیال میں بہتر ہوگا کہ چندہ کو "غیر سرکاری" ہی رہنے دیا جائے۔ یعنی لیڈر لوگ جو نہ آفس میں ہیں نہ کرسی

میں چندہ کھائیں اور سرکاری ملازمین رشوت۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ کوئی سرکاری ملازم "چندہ" کے کھیت میں مُنہ مارے تو اسے پکڑ کے کانجی ہاؤس بھیج دیا جائے اور کوئی غیر سرکاری قسم کا لیڈر کسی بہانے رشوت وصول کرنا چاہے تو اس پر "چندہ" بند کر دیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ بعض سرکاری افسر رشوت کے بجائے چندہ وصول کرتے رہے ہیں مثلاً ایک تاجر نے لائسنس کی درخواست دی۔ اُس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ فلاں فنڈ میں پانچ سو روپیہ چندہ دو۔ لائسنس مل جائے گا۔" پانچ سو روپیہ رشوت مانگتے تو اسے ہضم کرنے میں بڑی دقت پیش آتی۔ نہ یوں کھلے بندوں مانگ سکتے۔ نہ دینے والا دے سکتا، لیکن رشوت پر جب چندے کا غلاف چڑھ جاتا ہے تو آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے، بلکہ دوسری ثقیل سے ثقیل غذا کو ہضم کرتی چلی ہے۔ پھر نیک نامی مفت میں۔ لوگ تو تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ "صاحب! کیا افسر ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے بس قوم ہی کا خیال رہتا ہے۔ اب اس لائسنس کے قصے میں چاہتے تو ہزار دو ہزار وصول کر لیتے لیکن انہوں نے صرف پانسو روپیہ چندہ لیا بہت سے غیر سرکاری قسم کے لوگ سرد آہیں بھر کے کہتے ہیں۔ اے کاش خدا ہمیں بھی یونہی قوم کی خدمت کرنے کی توفیق بخشتا۔

۲۶ر فروری

ہمارا ایک معاصر پنجاب یونیورسٹی کے فیلوشپ کے تذکرہ میں لکھتا ہے:

"فیلوشپ کے ۲۰ امیدوار ہیں۔ ان میں سے صرف ایک ایڈووکیٹ ہیں۔ اور وہ ہیں شیخ کرامت علی۔ یہ وہ شیخ کرامت علی نہیں ہیں جو پنجاب کی وزارت کے رکن تھے۔ بلکہ ایک قابل و مخلص قانون دان ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ رجسٹرڈ گریجویٹ شیخ صاحب کو ووٹ دیتے ہوئے فرحت محسوس کریں گے۔"

گویا شیخ کرامت علی ایڈووکیٹ کیا ہوئے، کراماتی قسم کے دوائے مفرح ہوئے کہ ووٹ

دیا اور فرحت حاصل کر لی۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے "مفرح القلوب" بزرگوار کو یونیورسٹی کا فیلو بنوا کے ہمیشہ کے لئے داخل دفتر کر دینے سے تو بہتر ہے کہ انہیں لارنس گارڈن یا حضوری باغ میں رکھوا دیا جائے تاکہ صرف رجسٹرڈ گریجویٹ ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی اس پیٹنٹ قسم کی کراماتی "دواالمسک" سے فرحت حاصل کر سکیں۔

شیخ کرامت علی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک "یہ شیخ کرامت علی" دوسرے "وہ شیخ کرامت علی" "یہ شیخ کرامت علی" فرحت بخش ہیں۔ وہ شیخ کرامت علی وزارت پناہ تھے اور اب ان کا شمار "رفت گیا۔ اور بود تھا" کی قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اپنے زمانے میں وہ بھی بڑے فرحت بخش بزرگ مشہور تھے۔ چنانچہ پچھلے انتخابات میں ہزاروں آدمیوں نے انہیں ووٹ دیئے اور فرحت محسوس کی۔ یہ کرامت علی تو صرف یونیورسٹی کے فیلو بننا چاہتے ہیں اور وہ کرامت علی اس سے بہت اونچا اعزاز حاصل کر کے کھو بھی چکے ہیں۔ یعنی ایم۔ ایل۔ اے ہوئے وزیر تعلیم بنے اور پھر شیخوپورہ چلے گئے۔ کسی نوجوان شاعر نے یہ مصرع انہیں کے متعلق کہا ہے ؎

کرامت بہ تعلیم است و من طفل زباندانش

"یہ کرامت علی" سے تو ہم ناواقف ہیں۔ البتہ "وہ کرامت علی" کو ضرور جانتے ہیں۔ وکالت کے زمانے میں انہوں نے شیخوپورہ بسایا اور وزارت کے زمانے میں وزیر آباد — اس "یہ" اور "وہ" کی تکرار سے آپ گھبرا گئے ہوں گے لیکن "یہ" اور "وہ" اصل میں دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'یہ' اشارۂ قریب ہے اور 'وہ' اشارۂ بعید۔ شیخ کرامت علی لاہور میں ہوں تو "یہ شیخ کرامت علی" ہیں اور شیخوپورہ میں ہوں "تو" وہ شیخ کرامت علی"۔ یعنی آب ز دیدہ دور از دل دور۔

اس موقع پر ایک بنگالی بابو یاد آ گئے جو اردو بہت تھوڑی جانتے تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح کام چلا لیا کرتے تھے۔ مثلاً انہیں جب دفتری سے کہنا ہوتا تھا کہ دوات میں روشنائی ڈال دو تو چلا کے کہا کرتے تھے کہ "دپھتری دپھتری" یہ' میں "وہ" کر دو۔ اور دفتری ان کا مطلب

سمجھا جاتا تھا اور "یہ" بیں "وہ" کردیتا تھا یعنی دوات میں روشنائی ڈال دیتا تھا۔

بہرحال شیخ کرامت علی چاہے "یہ کرامت علی" یا "وہ کرامت علی" ہوں۔ دونوں ایک ہیں۔ کیونکہ دونوں "مفرح القلوب" واقع ہوئے ہیں اور دونوں کو ووٹ دینے سے لوگوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

سندھ کے سابق وزیراعظم پیر الٰہی بخش پر جو ماجرا گزرا ہے اس کا حال آپ سن چکے ہیں۔ میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر الٰہی بخش پر بھی پچھلے دنوں اس سے ملتا جلتا ایک سانحہ گذرا، یعنی پیر الٰہی بخش تو "قلمدانِ وزارت" کو رو رہے ہیں اور ڈاکٹر الٰہی بخش اپنے "پاندان" کا ماتم کر رہے ہیں۔ دونوں الٰہی بخش ہیں۔ لیکن اللہ ہمیشہ بخشتا ہی نہیں چھینتا بھی ہے۔ چنانچہ پیر کی وزارتِ عظمیٰ کا "قلمدان" اور اس کے ساتھ اسمبلی کی ممبری چھن گئی اور ڈاکٹر صاحب چاندی کے پاندان اور چاندی کی طشتری سے محروم ہو گئے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پیر الٰہی بخش کو "قلمدان" اور "ممبری" اپنی بیگم صاحبہ کے جہیز میں نہیں ملی تھی اور ڈاکٹر الٰہی بخش کو "پاندان اور طشتری" دونوں بیگم کے جہیز میں ہاتھ آئی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ایک مریض آیا۔ ڈاکٹر صاحب اندر تھے۔ مریض کو ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا۔ لیکن جب تک وہ سٹیتھسکوپ سنبھالے ہوئے ڈرائینگ روم میں پہنچیں، مریض چاندی کا پاندان اور چاندی کی طشتری لے کے غائب ہو چکا تھا۔ بعض لوگ ڈاکٹر سے ہمدردی ظاہر کر رہے ہیں۔ بعض مریض کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس کی چابکدستی پر تعجب ظاہر کر رہے ہیں لیکن نہ کوئی مرض کا نام لیتا ہے، نہ ڈاکٹر صاحب کی حذاقت اور ان کے طریق علاج کا ذکر کرتا ہے۔ مریض کے ہاتھ کی صفائی قابلِ داد سہی۔ لیکن ذرا یہ بھی تو کہیئے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں شفا ضرور ہے۔

دراصل یہ مریض افلاس کے مرض میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش کے ڈرائنگ روم تک ہی پہنچا تھا کہ مرض دور ہو گیا۔ گویا شیخ کرامت علی ہی نہیں۔ ڈاکٹر الٰہی بخش بھی "مفرح القلوب" ہیں۔

۲۷ر فروری

نواب صاحب امب ان دنوں کراچی میں تشریف فرما ہیں۔ کسی اخبار نویس نے ان سے پُوچھا۔ کیوں نواب صاحب آپ کی ریاست میں مسلم لیگ بھی ہے؟

نواب صاحب نے جواب دیا "جی ہاں۔ میں خود مسلم لیگ ہوں"۔ شکر ہے، کسی نے اس موقع پر یہ نہیں کہہ دیا کہ آپ مسلم لیگ امب ہیں تو نواب صاحب امب کہاں گئے؟

پچھلے دنوں فیصلہ ہوا تھا کہ ریاستی مسلم لیگ کو پاکستان مسلم لیگ میں شامل کر لیا جائے۔ اگر نواب صاحب امب۔ مسلم لیگ امب ہیں تو انہیں سے اس نیک کام کی بسم اللہ کرنی چاہیئے۔ یعنی انہیں مرکزی مسلم لیگ سے منسلک ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ حسنِ اتفاق سے وہ ان دنوں کراچی میں موجود ہیں۔ خدا جانے پھر ایسا موقع ہاتھ آئے یا نہ آئے۔

دراصل نواب صاحب امب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسلم لیگ کی ضرورت اور اہمیت ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اگر نواب صاحب امب مسلم لیگ امب ہیں تو نواب صاحب بہاولپور مسلم لیگ بہاولپور، مہتر صاحب چترال مسلم لیگ چترال اور میر صاحب خیرپور مسلم لیگ خیرپور ہوئے۔ یعنی ریاستوں میں عوام کی کوئی جماعت قائم کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ اگر مسلم لیگ کو مختصر کرنے یا یوں کہئے کہ ان کا جوہر اڑانے کا یہ طریقہ کامیاب ثابت ہوا تو سر فرانسس موڈی مسلم لیگ مغربی پنجاب کہلائیں گے۔

نہ جانے کراچی کے اخبار نویسوں نے نواب صاحب امب کی باتیں سن کے کیا کہا؟ لیکن ہمیں تو وہ وحدتِ وجود کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ آج انہوں نے یہ کہا ہے کہ میں نواب امب ہوں۔ میں مسلم لیگ امب ہوں۔ کل کہیں یہ نہ کہنا شروع کر دیں کہ میں امب ہوں، میں امب کا نواب ہوں، میں امب کی رعایا ہوں، میں سپہ سالار ہوں، میں فوج ہوں، میں مسلم لیگ ہوں،

میں صدر ہوں، میں لیگ کی مجلس عاملہ ہوں، میں اسمبلی ہوں، میں ممبر ہوں ؎
خود کوزہ وخود کوزہ گرو خود گلِ کوزہ

نواب صاحب اب کسی خاص محفل میں اس قسم کی باتیں کہہ کے اپنا جی خوش کر لیتے تو اور بات تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انہوں نے "انا موجود ولا غیری" کا یہ نعرہ اخبار نویسوں کے ایک اجتماع میں لگایا ہے۔ چنانچہ اخباروں کی وساطت سے نواب صاحب کا یہ بیان پاکستان کے ہر گوشے میں پہنچ چکا ہے۔ اگر دوسرے لوگوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی اس قسم کی باتیں کہنی شروع کر دیں تو بڑی گڑبڑ مچ جائے گی۔ مثلاً تانگے والا کہے گا، میں تانگے والا ہوں، میں تانگہ ہوں، میں گھوڑا ہوں، میں دانہ ہوں، میں گھاس ہوں۔ میں میکلوڈ روڈ ہوں، میں ٹھنڈی سڑک ہوں، دھوبی کہے گا، میں دھوبی ہوں، میں کپڑا ہوں، میں صابن ہوں، میں پانی ہوں، میں چھُوا چھو ہوں، چھُوا چھُو چھُو۔ وقس علیٰ ہذا۔

یکم مارچ

مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ یورپ بھر میں ایک حکومت ہونی چاہئے۔ چودھری خلیق الزماں فرماتے ہیں کہ سارے اسلامی ملکوں کو ملا کے ایک متحدہ حکومت قائم کی جائے اور سیٹھ ڈالمیا جنہیں بعض لوگ "دال میاں" کہتے ہیں، اس فکر میں ہیں کہ ساری دنیا کے ملکوں کی ایک حکومت بنا دی جائے۔ گویا اس مقابلہ میں گوشت سے دال بازی لے گئی۔

سچ پوچھئے تو چودھری خلیق الزماں صرف "خلیق الاسلام" ہیں۔ اصل خلیق الزماں تو سیٹھ دال میاں ہیں جو ساری دنیا کو ایک کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ دراصل اُن کے پاس دُنیا کو متحد کرنے کا سامان بھی موجود ہے۔ سیمنٹ کے کئی کارخانے ان کے قبضے میں ہیں۔ جب چاہیں گے ساری دُنیا کو سیمنٹ سے جوڑ کے اچھی خاصی حکومت کھڑی کر لیں گے۔ چودھری خلیق الزماں کے

پاس کیا رکھا ہے جس کے بل پر وہ اسلامی ملکوں کی وفاقی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

سردار شوکت حیات کہنے کو تو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے الگ ہو گئے، لیکن مسلم لیگ سے اُن کا رشتہ اتنا پرانا ہے کہ چاہے وہ نیشنل بنک میں رہیں یا کہیں اور، مسلم لیگ سے اُن کا نام بدستور نتھی رہے گا۔ یہ مانا کہ سردار صاحب ایک ہی "رقم" ہیں لیکن لیگ کی چھاپ ان پر اس طرح لگی ہوئی ہے کہ وہ جہاں رہیں قوم کا "مال" ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ سردار شوکت حیات کو نیشنل بنک میں "ڈیپازٹ" کرا دیا گیا ہے۔ لیگ کو تا حیات اس رقم کا "سود" ملتا رہے گا۔

گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے جتھے دار پریتم سنگھ گوجراں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک ماسٹر تارا سنگھ رہا نہیں ہوتے وہ زمین پر سوئیں گے۔ ماسٹر جی کے فراق میں جتھے دار صاحب کو پہلے بھی نیند نہیں آتی ہو گی۔ اب تو انہوں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ جب تک ماسٹر جی نہ آئیں نیند بالکل ہی نہ آئے۔ ماسٹر تارا سنگھ کا دعویٰ ہے کہ وہ سکھ قوم کو جگا رہے ہیں اور جتھے دار پریتم سنگھ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ ماسٹر جی سے نیند کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ جیل میں ہوتے ہیں تو سکھ جاگتے رہتے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو نیند کو ساتھ لے کے آتے ہیں اور ساری سکھ قوم سو جاتی ہے۔

کہتے ہیں میواڑ کے حکمران رانا پرتاپ نے عہد کیا تھا کہ جب تک چتوڑ ہاتھ نہیں آتا زمین پر سوؤں گا۔ چتوڑ کا قلعہ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ آج تک میواڑ کے رانا زمین پر ہی سوتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ماسٹر تارا سنگھ جنہیں پریتم سنگھ جی اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں۔ کنوئیں کی تہ کا تارا بنے رہے یعنی یونہی جیل میں پڑے رہے تو جتھے دار جی اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ زمین پر ہی سونا پڑے گا۔ اور فراق کی راتیں جو اکالیوں کی پگڑی سے بھی زیادہ کالی ہوتی ہیں۔ آنکھوں ہی میں کٹ جایا کریں گی۔

حکومت اعلان کر چکی ہے کہ پیتل کی دونی "چالو سکہ" ہے، لیکن دکانداروں پر اس اعلان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ پیتل کی دونی شہر میں اونٹ اور ایم۔ ایل۔ اے دونوں سے زیادہ بدنام ہے۔ تانگہ والا، تنبولی، بنیا، بساطی، بزاز وغیرہ یہ دونی دیکھتے ہی آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور اگر غلطی سے لے لیں تو فوراً پھیر دیتے ہیں۔ حالانکہ سیاست اور ادب کے ہاٹ بازار میں پرانا ایم۔ ایل۔ اے اب بھی چل جاتا ہے۔

تعجب ہے کہ پرانا ایم۔ ایل۔ اے اگرچہ ایم۔ ایل۔ اے نہیں رہا۔ پھر ایم۔ ایل۔ اے یا زیادہ سے زیادہ سابق ایم۔ ایل۔ اے کے نام سے اکثر منڈیوں میں چل رہا ہے اور پیتل کی دونی اگرچہ "سابق دونی" نہیں بلکہ آج بھی دونی ہے اور دفعہ ۹۲ کا الف پیتل کی دونی پر نہیں، بلکہ اسمبلی اور وزارت پر وارد ہے لیکن دکانداروں کے انداز سے یہ معلوم ہے کہ اسمبلی اور وزارت پیتل کی دونیوں ہی نے قائم کر رکھی ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ ایک پریس نوٹ کے ذریعہ دونی اور ایم۔ ایل۔ اے کا فرق واضح کر دے۔ کیونکہ اکثر دکاندار ایم۔ ایل۔ اے سے وہ سلوک کر رہے ہیں جو پیتل کی دونی سے ہونا چاہیئے اور پیتل کی دونی سے کچھ اس قسم کا سلوک ہو رہا ہے جس کا مستحق صرف سابق ایم۔ ایل۔ اے ہے۔

---

۲ مارچ

پنجاب میں شراب بند ہوئی۔ اور واہ واہ سبحان اللہ کے ڈونگرے برسنے لگے۔ کراچی میں عصمت فروشی ممنوع کر دی گئی ہے اور ہر طرف سے مرحبا، جزاک اللہ کی صدائیں آنے لگیں۔ لیکن زمینداری اور جاگیرداری کی حرمت و حلت کا ذکر آتا ہے تو مفتیانِ دین و حامیانِ شرعِ متین خاموش ہو جاتے ہیں۔ گویا اس حیثیت سے آغا تقی کا باغ، پشاور اور لاہور بھی اسی باغ کے احاطے میں شامل ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ع

آغا تقی کے باغ میں کوا حلال ہے

پچھلے دنوں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اس مسئلہ پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی کہ کوا حلال ہے یا حرام یعنی جاگیرداری رہنے دی جائے یا اسے ختم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو قرارداد منظور ہوئی، اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ موجودہ زرعی نظام فرسودہ ہے۔ اس لئے مسلم ورکنگ کمیٹی کو چاہئے کہ کاشتکاروں کے حقوق کی ایک دستاویز تیار کرے۔ یہ واضح ہے کہ ورکنگ کمیٹی میں بھی جاگیردار ہی جاگیردار بھرے پڑے ہیں۔ مزارعین کا نمائندہ ایک بھی نہیں۔ اس لئے یقین رکھئے کہ جاگیرداری قائم رہے گی۔ یعنی آفاقی کے باغ میں کوا بدستور حلال سمجھا جائے گا۔ لیکن آپنے شراب خانے اور بازارِ حسن بند ہونے پر سر ہلا ہلا کے داد دی ہے تو اس واقعہ پر بھی سر ہلائیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

پچھلے دنوں اخباروں میں ایک اطلاع چھپی تھی کہ عمر حیات ملک یونیورسٹی میں اطالوی زبان کی تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس پر ہم نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے اردو اور فارسی کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو نہیں سکا اور چلے ہیں اطالوی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنے۔ پھر اطالوی زبان کو پاکستان سے کوئی ایسی مناسبت بھی تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس نئے شوق کی کوئی تک سمجھ میں آسکے۔ لیکن سالک صاحب نے ڈاکٹر عمر حیات ملک کے اس شوق کی وجہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

> "ایک تو ملک صاحب کی شکل مسولینی سے ملتی ہے۔ دوسرے وہ پنجاب یونیورسٹی کے ڈکٹیٹر واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اطالوی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنا ان کے تحت الشعور میں فاشیت کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔"

ملک صاحب کا ڈکٹیٹر ہونا تو مسلّم۔ لیکن گستاخی معاف ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی شکل وصورت صرف مسولینی سے ملتی ہے۔ وہ افریقہ چلے جائیں تو زولو انھیں زولو اور ہاٹنٹاٹ انہیں ہاٹنٹاٹ سمجھیں گے۔ حبشہ میں قدم رنجہ فرمائیں تو ہیل سلاسی پکار اُٹھے کہ ابی سینیا کے تخت و تاج کا اصل مالک تو میں ہوں۔ یہ نیا دعوے دار کہاں سے پیدا ہو گیا؟!

۳ر مارچ

پچھلے دنوں دلی کی ایک مشہور درگاہ کے مجاور لاہور آئے اور آتے ہی عرضی داغ دی کہ مہاجر ہوں، پیر ہوں، سجادہ نشین ہوں، ایک بہت بڑی درگاہ کی مجاوری چھوڑ کے آیا ہوں۔ لاہور یا کراچی کی کسی درگاہ کی مجاوری الاٹ ہو جائے تاکہ اطمینان سے نذریں اور چڑھاوے وصول کروں اور سرکار کو دعائیں دوں۔ جواب ملا کہ ہندو اور سکھ دکانیں اور مکان تو چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن کوئی درگاہ نہیں چھوڑ گئے جس کی مجاوری آپ کو الاٹ کی جا سکے۔ لیکن اس جواب سے سجادہ نشین صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ لوگوں سے کہتے پھرتے تھے، یارو۔ یہ عجب ظلم ہے۔ میں نے مجاوری الاٹ کرانے کے لئے درخواست دی تھی۔ ادھر سے صاف جواب مل گیا، کوئی مجاوری خالی نہیں۔ میں کیا کروں۔ مجھے تو ہر حال میں مجاوری کرنا ہے۔ سنا ہے کہ چند روز ہوئے۔ یہ بزرگوار مایوس ہو کے دلی واپس چلے گئے اور پاکستان ایک تجربہ کار مجاور کی خدمات سے محروم رہ گیا۔

کراچی میں ایک مسجد زیر تعمیر ہے۔ لوگوں نے اس کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ قوالی کی محفل کا اعلان کر دیا۔ ٹکٹ کی قیمت آٹھ آنے، ایک روپیہ، دو روپے مقرر ہوئی ہے۔ ۵ر مارچ کو قوالی ہوگی۔ اہل ذوق آئیں گے، قوالی بھی سنیں گے مسجد کی تعمیر کے کارِ ثواب میں بھی حصّہ لیں گے۔ ہم خرما و ہم ثواب اسی کا نام ہے۔

بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ مسجد کی تعمیر کا معاملہ تھا تو قوالی کے بجائے کسی مولوی صاحب کا وعظ کیوں نہ کرا دیا۔ لیکن مولوی صاحب کا وعظ ہوتا تو اس پر ٹکٹ کیسے لگ سکتا۔ قوالی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر ٹکٹ لگے جب بھی اس کا تقدس قائم رہتا ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ ہی جمع کرنا تھا تو قوالی کیوں کرائی مشاعرہ کیوں نہ کرایا۔ آج کل چندہ جمع کرنے کا سب سے آسان طریقہ مشاعرہ ہے۔ پھر اس میں آمدنی بھی خاصی ہو جاتی

ہے۔لیکن مشاعرہ غیر شرعی چیز ہے۔کراچی کے لوگ مسجد کی تعمیر کے لئے مشاعرہ کراتے تو سارے پاکستان میں بدنام ہو جاتے۔تعجب ہے کہ پچھلے دنوں لاہور کے بزرگوں نے اسلامی نظام حکومت کے قیام کے سلسلے میں مشاعرہ کیوں کرایا۔قوالی کی جانب کیوں توجہ نہ کی۔بہرحال اب اگر سجدۂ سہو کے طور پر قوالی کی ایک مجلس بھی ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

پچھلے سال مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے یوم اقبال اپنے نام الاٹ کرالیا تھا اور قریب قریب تمام وزرا نے اس تقریب میں شرکت کی تھی۔اس موقع پر راقم الحروف نے لکھا تھا کہ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے یوم اقبال اپنے نام الاٹ کرالیا ہے۔اس لئے وہ اور کچھ کرے نہ کرے، یوم اقبال ضرور منائے گی۔یہ بات صحیح ثابت ہوئی۔چنانچہ اخباروں میں اس مضمون کی ایک اطلاع چھپی ہے کہ اب کے پھر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن "یوم اقبال" منا رہی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ "یوم اقبال" کی الاٹمنٹ ممدوٹ وزارت کے عہد میں ہوئی تھی ممدوٹ وزارت ختم ہو چکی ہے۔اس لئے یہ الاٹمنٹ بھی منسوخ ہو جانی چاہیئے۔لیکن ممدوٹ وزارت کے عہد میں جتنی الاٹمنٹیں ہوئی ہیں وہ سب منسوخ تو نہیں کی گئیں۔پھر لوگ "یوم اقبال" کی الاٹمنٹ کرانے پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟ دوسروں کو الاٹمنٹ کی لوٹ میں دکانیں، زمینیں، مکانات اور فیکٹریاں ہاتھ آئیں۔بچارے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن والوں کو صرف "یوم اقبال" الاٹ ہوا۔اس پر بھی یار لوگ چین نہیں لینے دیتے۔آخر سٹوڈنٹس فیڈریشن والوں کو جاگیر تو ہاتھ نہیں آگئی۔صرف مجاوری ہی ملی ہے۔یہ اور بات ہے کہ مجاوری بھی جاگیرداری سے کم نہیں۔

۴ر مارچ

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ کمیونسٹ ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیلانا چاہتے ہیں۔

بہر حال ہمیں اس طرف سے مطمئن رہنا چاہئے۔ کراچی میں بھی مدت سے "طوائف الملوکی" چلی آتی تھی۔ حکومت نے ایسا قانون منظور کیا ہے کہ وسطِ مارچ تک "طوائف الملوکی" بالکل ختم ہو جائے گی۔ یعنی نہ طوائفیں رہیں گی نہ ان کے درباری یعنی طبلچی، پکھاوجی، سارنگیئے وغیرہ کہیں نظر آئیں گے۔ البتہ ملوک الطوائف، یعنی طوائفوں کے پیروں سے جو "شاہ جی" کہلاتے ہیں، انجات ناممکن ہے۔ بہر حال ان لوگوں کو بھی اپنی "ملوکیت" قائم رکھنے کے لئے یا تو لاہور کا رُخ اختیار کرنا پڑے گا یا کوئی اور شغل اختیار کریں گے۔

پچھلے دنوں کراچی پولیس نے اس جرم میں عصرِ جدید پریس کے مالک محمود شوکت عثمانی کا چالان کر دیا کہ انہوں نے اپنی موٹر کار پر نمبر کی جو تختی لگا رکھی تھی، اس میں ہندسے انگریزی کے بجائے اردو میں تھے۔ ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ وکیل صفائی نے اردو کی حمایت میں بڑے زور کی تقریر کی۔ لیکن قانون آخر قانون ہے۔ وکیل صفائی کی زباں آوری کام نہ آئی اور مجسٹریٹ نے ملزم پر بیس روپے جرمانہ کر دیا۔ ہمارے خیال میں یہ جُرمانہ مسٹر عثمانی پر نہیں بلکہ "اردو" پر ہُوا ہے۔ اس لئے انجمن ترقی اُردو کو جرمانہ کی رقم ادا کرنی چاہیئے۔

پولیس کو چاہئے کہ اعانتِ جرم میں انجمن ترقی اُردو کے ہفت روزہ اخبار "قومی زبان" کے ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر کا بھی چالان کر دے۔ اس اخبار نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ اردو قومی زبان ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے رسالے اور اخبار ایسے ہیں جو "اردو پڑھو، اردو بولو اور اُردو لکھو" کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ان سب پر مقدمے چلنے چاہئیں۔ ورنہ اگر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "اردو کھاؤ، اردو اوڑھو، اردو بچھاؤ اور اردو پہنو" تو سرکار کو اردو کا راشن مقرر کرنا پڑے گا۔

سُنا ہے۔ کراچی میں ان دنوں "اردو" کی اس توہین پر بڑا شور مچا ہُوا ہے اور محمود شوکت عثمانی مجسٹریٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل کر رہے ہیں۔ بہر حال عثمانی صاحب کو یہ بات پیشِ نظر

رکھنی چاہیئے کہ توہین اردو کی نہیں ہوئی بلکہ اُردو کے ہندسوں کی ہوئی ہے اور ہندسے چاہے انگریزی کے ہوں چاہے اُردو کے، آخر ہندسے ہی تو ہیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ انگریزی کے ہندسے بھی رومن اردو کے ہندسے ہیں۔ اس نکتے پر غور فرمائیے۔ تو بحث کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بہر حال اب کے تختی نسخ میں لکھوائیے۔ پھر پکڑے گئے تو ہم کہیں گے کہ عربی رسم الخط کی توہین ہوئی ہے۔

---

۵ مارچ

معلوم ہوا ہے کہ ہماری حکومت نے پاکستان سے اسلامی ملکوں میں گڑ بھیجنے کی اجازت دے دی ہے۔ شروع شروع میں "مصری" مصر سے آئی ہوگی۔ اسی لئے تو مصری کہلاتی ہے۔ قندھار اگر گندھار کا معرب نہیں تو کسی زمانے میں وہاں گڑ اور شکر کے کارخانے بھی ضرور ہوں گے۔ لیکن زمانے کا انقلاب دیکھئے کہ اب مصر اور قندھار میں پاکستان سے گڑ بھیجا جا رہا ہے۔ گویا ع

گل آوردہ سعدی سوئے بوستاں
بہ شوخی چو فلفل بہ ہندوستاں

بہر حال قند اور شکر سے ہمارا تعلق بھی تو پرانا ہے۔ شکر گڑھ ہمارے ملک میں ہے حضرت خواجہ گنج شکر جیسے بزرگ بھی پاکستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور مصری شاہ تو لاہور کا مشہور محلہ ہے۔ اسی لئے اردو کا ایک پرانا شاعر کہہ گیا ہے کہ ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارے ہیں باوا فرید

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ہاں سے اسلامی ملکوں میں صرف گڑ ہی بھیجا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں سندھ سے دو سو طوطے بھی مصر کے ایک چڑیا گھر کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ طوطے کو

گڑ اور شکر سے خاص مناسبت ہے۔ اسی لئے تو فارسی میں "طوطیِ شکر خا" کی ترکیب صدیوں سے چلی آتی ہے۔ حافظ نے سلطان غیاث الدین والیٔ بنگالہ کو اپنی غزل بھیجی تھی تو اسی مناسبت سے یہ شعر کہہ کے اس میں شامل کر دیا تھا کہ ع

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ مے رود

ہم نے پاکستان سے طوطے مصر بھیجے تو ساتھ ساتھ گڑ بھجوانے کا بھی انتظام کر دیا۔ تاکہ مصر کے چڑیا گھر میں پاکستان کے "طوطیانِ شکر خا" کو تکلیف نہ ہو اور "چوری" برابر ملتی رہے۔

معلوم نہیں ہماری سرکار نے صرف سندھ ہی سے کیوں طوطے بھیجے۔ مغربی پنجاب کے طوطوں کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ اگر اس معاملہ میں آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھا جاتا تو دو سو طوطوں میں پنجاب کے طوطوں کی اکثریت ہونی چاہئے تھی۔ تعجب ہے کہ پنجاب کے میاں مٹھو "بنی جی روزی بھیجو" کے نعرے لگاتے رہ گئے اور "چوری" صرف سندھ کے طوطوں کے حصے میں آئی اور ہمارے نزدیک تو اس معاملہ میں بنگال کے طوطوں کا حق مقدم ہے، جن کا ذکر حافظ جیسے بلند مرتبہ شاعر نے بھی کیا ہے۔

طوطے پنجاب کے ہوں یا بنگال کے، سندھ کے ہوں یا سرحد کے، سب ایک جیسے ہیں۔ سبز لباس، لال لال خم دار چونچ۔ جہاں گرمی کا موسم آیا، باغوں پر ہلّہ بول دیا۔ لیکن یہ تھوڑی جتنا پھل کھاتے ہیں، اس سے زیادہ کتر کے ڈال دیتے ہیں، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جو کچھ سکھاؤ بڑی آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ فقروں کے فقرے رٹ لیتے ہیں اور انہیں اس طرح دہراتے ہیں کہ جو سنتا ہے حیران رہ جاتا ہے۔

خدا جانے پاکستان کی حکومت کو سندھ کے طوطوں میں ایسی کیا خوبی نظر آئی کہ اکٹھے دو سو طوطے مصر بھیج دیئے۔ ورنہ پنجاب کے طوطے سندھ کے طوطوں سے کسی طرح کم نہیں۔ سندھ

کے طوطوں کو تو چند ادھر اُدھر کے فقرے یاد ہوں گے، پنجاب کے طوطوں نے تقریروں کی تقریریں رٹ رکھی ہیں۔ انہیں مصر بھیجنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تو نہیں کہیں پاکستان میں ایک آدھ چڑیا گھر انہیں بھی الاٹ ہو جائے۔

---

۷ مارچ

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ یونیورسٹی میں ان دنوں جو رنگ اچھل رہا ہے، آپ نے "حرف و حکایت" میں اس کا ذکر دو تین مرتبہ کیا ہے، لیکن کوئی علاج نہیں بتایا۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ یونیورسٹی کے لئے بھی دفعہ ۱۹۲ الف یا اس سے ملتی جلتی کسی چیز کی ضرورت ہے۔ بلھے شاہ نے یہ شعر ہماری یونیورسٹی ہی کے لئے تو کہا تھا ؎

علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار

یہ اور بات ہے کہ یہ الف جس نے وزارت اور اسمبلی دونوں کو ختم کر دیا، یونیورسٹی میں بالکل بیکار رہے۔ یعنی اسے حرفِ علّت سمجھ کے گرا دیا جاتا ہے۔

وزارت اور اسمبلی میں دنگل ہوتے تھے تو لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ وزارت ہے یا گھڑدوڑ کا تکیہ۔ اب یونیورسٹی میں یہی کیفیت نظر آ رہی ہے اور "اہل کتاب" اور "صاحب نصاب" لوگ خم ٹھونک ٹھونک کے اس طرح اہلِ علم کو للکار رہے ہیں۔ گویا یونیورسٹی میں ٹلھڑ، گونگا اور زبکو بھرے پڑے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہی کیفیت رہی تو یونیورسٹی سے علم تو غائب ہو جائے گا، دھینگا مشتی رہ جائے گی۔ یار لوگ جسے چاہیں گے مار مار کے یونیورسٹی کا فیلو، سنڈیکیٹ کا ممبر یا پروفیسر بنا دیں گے اور ڈگریاں خطابوں کی طرح بخشی جائیں گی یعنی پہلے لوگوں کو جن خدمت کے عوض سی آئی ای، ایم۔ بی۔ ای، خان بہادر، خان صاحب وغیرہ خطابات ملتے تھے، اب ایم۔ اے، بی۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، منشی فاضل، مولوی فاضل وغیرہ خطابات دیئے جائیں گے۔ درباری اور کرسی نشین

اڑ جائیں گے اور پروفیسر لوگ۔ اہلِ دربار بن کے رہ جائیں گے۔

---

۹ مارچ

پچھلے دنوں لاہور کارپوریشن کے دو کونسلروں خواجہ دل محمد اور ڈاکٹر عبدالوحید پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ یہ لوگ خود ہی نصاب مرتب کرتے ہیں، خود ہی اسے چھپواتے ہیں اور پھر خود ہی جھپاک سے اسے کارپوریشن کے سکولوں میں لگوا بھی دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں ان دونوں حضرات کا ایک مشترکہ بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ کارپوریشن کی ماتحتی میں جو سکول ہیں، دراصل ان کے ہیڈ ماسٹروں نے ان کتابوں کی منظوری کی سفارش کی تھی۔ اس لیے ہم دونوں کو اس معاملہ میں بالکل بری الذمہ سمجھنا چاہئے۔

یہ اگر صحیح ہے تو ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب دونوں بے قصور ہیں اور سچ پوچھئے تو کارپوریشن کے ہیڈ ماسٹروں کا کوئی قصور نہیں۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ کارپوریشن کے ممبروں میں کون کون بزرگ "صاحبِ نصاب" اور "اہلِ کتاب" ہیں۔ اس لیئے اگر وہ ان دونوں حضرات کی کتابوں کی منظوری کی سفارش نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟

خواجہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ کارپوریشن کے سکولوں میں جو کتابیں رائج ہیں، وہ سب کی سب ہمیں دونوں کی نہیں۔ جغرافیہ کا نصاب تو انجمن حمایت اسلام کا ہے لیکن گستاخی معاف، یہ کوئی بڑا کمال نہیں۔ دین دار مسلمان جمعرات کے جمعرات مسجدوں میں چراغ جلاتے ہیں، کھانا بھجواتے ہیں اور کبھی کبھی تو خاصا پُر تکلف کھانا بھیجا جاتا ہے۔ مثلاً پلاؤ، قورمہ زردہ، فطیری روٹیاں، حلوا وغیرہ۔ انجمن حمایت اسلام کی ایک آدھ کتاب منظور کر لینا بھی مسجد میں چراغ جلانے یا کھانا بھجوانے کی قسم کی چیز ہے۔ معلوم نہیں اس "خیراتی کارنامے" کا سہرا بھی انہی ہیڈ ماسٹروں کے سر ہے یا ہمیں خواجہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی طرف رُخ کر کے مرحبا، جزاک اللہ کا نعرہ لگانا چاہئے۔

۱۳ مارچ

مغربی پنجاب کی حکومت نے "تعمیرِ ملت" کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا تھا جو وزارت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب سُنا ہے جناب ماہر القادری "تعمیر پسند مصنفین" کے نام سے ایک نئی انجمن قائم کر رہے ہیں۔ ابھی تو اس مجلس کا اعلان ہی ہُوا ہے۔ کچھ دنوں میں دیکھ لیجئے گا کہ جناب ماہر القادری جنہیں اب معمار القادری کہنا چاہئے، ادبی راج مزدوروں اور بڑھیوں کا اچھا خاصا لشکر فراہم کر لیں گے اور ادب و شعر کے ایک عالیشان محل کی تعمیر شروع ہو جائے گی جس میں رسالوں کے صفحے اینٹ پتھر، مضامین کے عنوان سرخی چونے اور اشعار گارے کا کام دیں گے۔

ماہر القادری صاحب کی تعمیری سرگرمیوں کا تذکرہ آیا تو ایک صاحب کہنے لگے کہ کچھ عرصہ ہُوا ماہر صاحب نے بحرِ منسرح میں ایک غزل کہی تھی۔ اس پر اطہر ہاپوڑی نے جو عروض کے "ماہر القادری" ہیں، بڑے اعتراضات کئے اور لکھا کہ کئی مصرعے بحر سے نکل گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا، ماہر القادری صاحب بڑے پابندِ شریعت بزرگ ہیں۔ اس لئے ان کے کلام پر بھی ان کی پابندیٔ شرع کا اثر پڑا ہے۔ مصرعے غلط تو کیا ہوں گے، البتہ پاجامہ کہیں کہیں ٹخنوں سے ذرا اونچا ہو گیا ہو گا۔

ابنِ انشا صاحب نے جن کے مضامین اکثر "امروز" میں چھپتے رہتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں "سرمایۂ اردو" نام ایک کتاب کے تازہ ایڈیشن کا ذکر کیا ہے۔ جو ۱۹۴۷ء میں چھپا ہے اور میٹرک کے نصابِ اردو میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور ان کی تازہ تصنیف "بالِ جبریل" ہے، سیّد عبدالقادر انڈیا کونسل کے ممبر ہیں، مولوی عبدالحق پنشن لینے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے ہیں، جوش ملیح آبادی حیدر آباد سے پنشن لے کے دہلی آ گئے ہیں اور وہاں سے "کلیم" نام ایک رسالہ نکالنا شروع کر دیا ہے، حفیظ جالندھری آج کل شاہ نامۂ اسلام لکھ رہے ہیں، اب سرکارِ عالیہ نے اُن کی قدردانی کرتے ہوئے انہیں خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا ہے۔

یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ "سرمایۂ اردو" کا یہ تازہ ایڈیشن کسی کتب فروش نے نہیں بلکہ یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔ اس لیئے اس میں جو معلومات ہیں، مستند ہیں۔ اگر کوئی طالب علم امتحان دیتے وقت پرچہ میں یہ لکھ دے کہ علامہ اقبال کا انتقال ہو چکا ہے، ان کی آخری تصنیف "بالِ جبریل" نہیں "ارمغانِ حجاز" ہے، مولوی عبدالحق ان دنوں کراچی میں ہیں اور جوش ملیح آبادی دلی میں رسالہ "آج کل" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں تو اس کا فیل ہونا یقینی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ یونیورسٹی نے ابھی تک علامہ اقبال کے انتقال، مولوی عبدالحق کی ہجرت اور جوش ملیح آبادی کی ادارت کو رسمی طور پر تسلیم نہیں کیا اور ممکن ہے کبھی تسلیم نہ کرے۔

"شاہدہ" ایک نئی فلم ہے جو تھوڑے دنوں میں ریلیز ہو جائے گی۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے حکیم احمد شجاع صاحب نے لکھے ہیں لیکن اشتہار انھوں نے نہیں لکھا۔ اشتہار کی عبارت ملاحظہ ہو:-

"حکیم خلیفہ احمد شجاع کے نامِ نامی سے کون بیخبر ہے جن کے قلم میں وہ جادو کا اثر ہے کہ فصیح الابیان بھی عاجز آجاتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کے قلم کے دل دہلا دینے والے مکالمے اور پُرسوز و پُرلطف گانے اور بے حد متاثر کرنے والی کہانی، سریلی طرزیں، جگر پارہ دھنیں، ڈائریکشن لقمان صاحب کے مصورِ خیال کا نتیجہ"۔

جس شخص نے یہ اشتہار لکھا ہے۔ وہ حکیم احمد شجاع کے نامِ نامی سے یقیناً بے خبر ہے۔ کیونکہ حکیم خلیفہ احمد شجاع ایک شخص کا نام نہیں بلکہ دو شخصوں کا نام ہے۔

دراصل اشتہار لکھنے والے نے حکیم احمد شجاع میں خلیفہ شجاع الدین کو جمع کر کے "دین" کو اس خیال سے منہا کر دیا کہ فلم سے دین کو کیا سروکار۔ اب ریاضی کا یہ سوال اور اس کا حل اپنی شکل میں ملاحظہ ہو:-

حکیم احمد شجاع + خلیفہ شجاع الدین - دین = حکیم خلیفہ احمد شجاع۔ "فصیح الابیان" اور "جگر پارہ دھنیں" کو تو خیر جانے دیجئے۔ لیکن یہ جو آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ "فلم کی ڈائریکشن لقمان صاحب کے مصورِ خیال کا نتیجہ ہے"، اس کا جواب پاکستان تو پاکستان ہندوستان میں بھی ڈھونڈھے سے نہیں مل سکتا۔

۱۳ر مارچ

چودھری خلیق الزماں نے پچھلے دنوں فرمایا تھا کہ پنجاب کے مسلم لیگیوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔ اب سنا ہے کہ چودھری صاحب ان لوگوں کو گلے ملوانے کے لئے لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں انہیں کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ پیغام و سلام کا سلسلہ شروع ہو چکا۔ صرف صلح کی شرطیں باقی ہیں۔ چودھری صاحب کے لاہور پہنچتے پہنچتے وہ بھی طے ہو جائیں گی۔

چودھری خلیق الزماں صرف لیگ ہی کے چودھری نہیں، جاگیرداری اور زمینداری کی "سبزی منڈی" کے بھی چودھری ہیں۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، ان کی اپنی زمینداری تو ایسی بڑی نہیں، لیکن وہ بڑے بڑے تعلقہ داروں میں رہے ہیں، ریاستیں دیکھی ہیں، راجاؤں مہاراجوں اور نوابوں سے ملے ہیں، ان کے ادب آداب اور طور طریقوں سے واقف ہیں، اس نازک وقت میں پنجاب کے زمینداروں کی مدد وہ نہ کریں تو اور کون کرے گا؟ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں ایسے لوگ اسمبلی میں نہ جا گھسیں جنہیں اپنا شجرۂ نسب تک یاد نہیں۔

حکومت برابر اعلان کئے جا رہی ہے کہ بیلی دونی چالو سکہ ہے لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہ بیلی دونی کو ہاتھ تک لگانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وزیروں اور ایم۔ ایل۔ اے قسم کے بزرگوں کو تو یہ مرتبہ بھی نصیب نہیں۔ یعنی حکومت کہہ چکی ہے کہ یہ کھوٹے سکے ہیں اور چالو سکہ صرف گورنر ہے اور لوگوں کے نزدیک ان بزرگوں کی وہ حیثیت بھی نہیں جو بیلی دونی کو حاصل ہے۔ لیکن چودھری خلیق الزماں ان کھوٹی دونیوں کو جنہیں حکومت اور عوام دونوں ٹکسال باہر قرار دے چکے ہیں۔ چلانے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ دراصل ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے پاس غلطی سے جو بیلی دونیاں آگئی ہیں، وہ کسی طرح چل جائیں اور چودھری صاحب اس فکر میں ہیں کہ ان کی جیب میں جو کھوٹے سکے پڑے ہیں۔ لوگ کسی طرح انہیں قبول کرلیں۔

چتوڑ کے معرکہ میں راجہ مان سنگھ کو لڑتے دیکھ کر ایک شاعر نے کہا تھا کہ "ہندو مے زند شمشیرِ اسلام" دو تین دن ہوئے۔ حزبِ مخالف کے لیڈر مسٹر چٹو پادھیائے نے کہا کہ وزراء کی تنخواہیں تین ہزار روپے مقرر کی گئی ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔ وزراء کو چاہئے کہ پہلے خود اسلامی اصولوں پر عمل کریں اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چلنا سیکھیں۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ حالات بدل گئے ہیں اور لوگ چپ ہو گئے۔

افسوس کہ اس محفل میں مسٹر چٹو پادھیائے کی تقریر کی داد کسی نے بھی نہ دی اور "حالات بدل گئے ہیں" جیسا جامع و مانع فقرہ سن کے سب کی زبانوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔ لوگ مسٹر چٹو پادھیائے کی تقریر کی حمایت نہ کرتے، کم از کم اتنا ہی کہہ دیا ہوتا ؏

کہ ہندو مے زند شمشیرِ اسلام

۱۴ر مارچ

نواب صاحب بہاول پور نے پچھلے دنوں اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ پاکستان بہاول پور کا بڑا بھائی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نواب صاحب نے بہاول پور اور پاکستان میں برادری کا رشتہ کیسے نکال لیا؟ پاکستان کی تاریخِ ولادت تو ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء ہے اور بہاول پور کی عمر پونے دو سو سال سے زیادہ ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ہم خدانخواستہ بہاول پور کو پاکستان کا بڑا بھائی یا چچا یا ماموں سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان اور بہاول پور میں کوئی رشتہ نہیں۔ پاکستان ایک مملکت کا نام ہے اور بہاول پور اس کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کل کلاں قسمتِ راولپنڈی کے کمشنر صاحب بھی کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ پاکستان راولپنڈی کا بڑا بھائی ہے۔

دراصل نواب بہاول پور نے اپنی ریاست کی اہمیت جتلانے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بہاول پور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، پاکستان سے یہ عجیب و غریب رشتہ نکال لیا ہے۔ ورنہ ایک علاقہ دوسرے علاقے کا نہ بھائی ہوتا ہے نہ بھتیجا۔ نہ بیٹا، نہ چچا، نہ ماموں۔ لوگ اس طرح رشتے نکالنا شروع کر دیں تو آفت برپا ہو جائے۔ ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم کا رشتہ تو مسلم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ستلج اور بیاس "مرتد" ہو گئے ہیں اور لوگ کہنے کو یہ ابھی کہہ سکتے ہیں کہ راولپنڈی لاہور کی بیوی ہے۔ گوجرانوالہ بھتیجا ہے۔ ملتان بھائی ہے اور منٹگمری کا بیا، تو ابھی پچھلے دنوں لائل پور سے ہوا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ غریب کا رشتہ دار کوئی نہیں بنتا۔ دولت مندوں اور طاقتوروں کو بھائی بھتیجا بنانے پر سب تیار ہو جاتے ہیں۔ جب تک پاکستان نہیں بنا تھا اور مسلم لیگ بیچاری کس مپرسی کی حالت میں تھی، نواب صاحب بہاول پور نے کبھی نہیں کہا کہ مسلم لیگ سے بہاول پور کا کوئی رشتہ ہے اور مسلم لیگ سے تو وہ اب تک رشتہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ البتہ پاکستان کو اپنا بڑا بھائی ثابت کرنے کی کوشش میں برابر مصروف ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ آسان سی بات نہیں آتی کہ مسلم لیگ سے بہاول پور کا کوئی رشتہ نہیں تو پاکستان سے کیسے رشتہ نکل آیا؟ سنا ہے کہ پچھلے دنوں نواب صاحب بہاول پور ریاست کا دورہ کرنے نکلے تو ریاستی حکام نے عمارتوں کے اوپر سے پاکستانی جھنڈے اتروا دیئے۔ بہاول پور پاکستان کا چھوٹا بھائی ہے تو بڑے بھائی کے جھنڈے سے اسے اتنی پرخاش کیوں ہے؟ ہمارے خیال میں نواب صاحب بہاول پور نے لوگوں کا دل خوش کرنے اور اس کے ساتھ بہاول پور کی اہمیت کو جتانے کے لئے ایک بات کہہ دی، ورنہ وہ پاکستان کو بہاول پور کا بڑا بھائی بھی نہیں سمجھتے۔

---

۱۷ مارچ

لیجئے چودھری خلیق الزّماں نے پنجاب مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں کے خلاف فتوے

دے دیا۔ یعنی صاف صاف کہہ دیا کہ صوبائی مسلم لیگ کی لیڈری باطل، لیڈر باطل، موجودہ لیڈروں کو چاہئے کونسل کا جلسہ منعقد کرکے از سرِ نو لیڈروں کا انتخاب کرائیں۔

لاہور والوں نے چودھری صاحب کو کالی جھنڈی دکھائی۔ چودھری صاحب نے صوبائی لیگ کے لیڈروں کو کالی جھنڈی دکھادی اور اب یہ اندیشہ ہے کہ سب لوگ مل کے چودھری صاحب کی صدارت ہی کو کالی جھنڈی دکھانا نہ شروع کردیں۔

اب تک چودھری صاحب اور دولتانہ صاحب میں بڑا اتحاد رہا ہے۔ دولتانہ صاحب نے ڈیڑھ سو کونسلر نامزد کردیئے۔ لوگوں نے کہا، صدر کو نامزدگی کا اختیار نہیں۔ باقاعدہ انتخاب ہونا چاہئے تھا، لیکن چودھری صاحب نے منظوری کی سند دے کے معترضین کی زبانیں بند کردیں اور آخر انہیں ڈیڑھ سو کونسلروں کی حمایت کے بل بوتے پر صدارت حاصل کرلی۔ یوں کہئے کہ چودھری صاحب نے دولتانہ صاحب کی حمایت کی۔ دولتانہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے چودھری صاحب کی رفاقت کا حق ادا کیا اور اس طرح دونوں حضرات بلکہ میر امنؔ کی زبان میں یوں کہئے کہ آزاد بخت اور سارے درویش اپنی اپنی مراد کو پہنچے۔ لیکن اب جو چودھری صاحب نے لیگ کے عہدہ داروں کے از سرِ نو انتخاب کا قصہ چھیڑا ہے تو ہمیں اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں اور کوئی آفت نہ آجائے۔ دولتانہ صاحب کا اس قصے میں کیا جائے گا۔ وہ پہلے وزیر تھے، اب صدر ہیں۔ صدارت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو وزیر یا سفیر بن جائیں گے یا پھر لنڈن جا بیٹھیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ چودھری صاحب کی صدارت پر آفت آئی تو وہ کیا کریں گے؟ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں چودھری صاحب کی صدارت منا جان کی بادشاہت ثابت نہ ہو۔

سُنا ہے۔ چودھری صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے خلاف لاہور ریلوے اسٹیشن پر جو مظاہرہ ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ تو چودھری صاحب نے مسکرا کے فرمایا، ہم پر ایسے ایسے کئی معرکے گذرے ہیں اور انصاف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے غلط نہیں کہا۔ صدارت کا عہدہ

انہیں پہلی مرتبہ نصیب نہیں ہوا۔ کالی جھنڈیاں انہوں نے آج نہیں دیکھیں بلکہ ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ہاں یہ اور بات ہے کہ پہلے انہوں نے لکھنؤ میونسپلٹی کی صدارت کے زمانے میں کالی جھنڈیاں دیکھی تھیں۔ اب مرکزی لیگ کے صدر کی حیثیت سے ان کالی بلاؤں سے واسطہ پڑا ہے۔ پہلے لکھنؤ میں یہ کیفیت گزری تھی، اب لاہور میں یہ قصہ پیش آیا ہے۔

بہرحال چودھری صاحب کو ہمارا مشورہ یہی ہے کہ نئے انتخابات کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ کالی جھنڈیوں سے بچنے کا یہ طریقہ نہیں۔ صدارت جسے مل گئی، مل گئی۔ سکتری جسے ہاتھ آ گئی، آ گئی۔ جو بندھ گیا سو موتی۔ ہاں اگر ہو سکے تو ممدوٹ اور دولتانہ کو گلے ملوا دیجئے۔ مغربی پنجاب میں جاگیرداری کی حالت نازک ہے۔ آپ کے سوا اور کون ہے جو اس کے سر پہ دستِ شفقت رکھے۔ آخر آپ جانِ عالم واجد علی شاہ مرحوم کی نگری کے باشندے ہیں۔ جاگیرداری کی رہس منڈلی کو آپ نہ سنبھالیں تو اور کون سنبھالے گا؟!

---

۱۸ مارچ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب نے فرمایا ہے کہ "یونیورسٹی میں عنقریب اطالوی زبان کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے گا۔" ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کا انتظام تو کر لیں۔ پھر کسی دوسری طرف توجہ کریں۔ ابھی اردو کی معقول تعلیم کا انتظام تو ہو نہیں سکا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام بھی مخدوش نظر آتا ہے اور وائس چانسلر صاحب ہیں کہ اطالوی کی تعلیم کا بندوبست کرنے کی فکر میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں ع

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ڈاکٹر صاحب کو اطالوی زبان سے اتنا شغف کیوں ہے، اطالوی سے تو ہم پر چینی اور ملائی کا زیادہ حق ہے۔ ملائی سات کروڑ مسلمانوں کی زبان ہے۔ چینی بولنے والوں میں چار پانچ کروڑ مسلمان بھی تو شامل ہیں اور پھر حدیث نبوی بھی تو ہے کہ: اطلبو العلم ولو کان بالصین۔ وائس چانسلر صاحب کو ہماری بات پر یقین نہیں آتا تو یونیورسٹی میں جو مولوی موجود ہیں، ذرا ان میں سے کسی سے پوچھ دیکھیں کہ چینی اور ملائی اچھی ہیں یا اطالوی؟ چینی اور ملائی کا نام سُن کے مولوی صاحب کی باچھیں نہ کھل جائیں تو ہمارا ذمہ۔ مرحوم مولوی بلیغ العلیٰ کو ہم نے دیکھا ہے۔ نہ چینی زبان جانتے تھے نہ ملائی۔ اور تو اور انہیں عربی بھی واجبی ہی آتی تھی۔ لیکن صبح کے ناشتے میں آدھ پاؤ ملائی ضرور ہوتی تھی۔ اس میں چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک چینی ملا لیتے تھے۔

شیرینی کے ذکر میں قاآنی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کسی نے اُس سے کہا کہ فلاں شاعر جب کسی امیر کی شان میں قصیدہ کہتا ہے تو قصیدے کے ساتھ ساتھ شیرینی کا ایک طبق بھی لے جاتا ہے۔ خدا جانے اس میں کیا مصلحت ہے۔ قاآنی نے جواب دیا "تا شعرش شیریں نماید"۔

یہ جو اکثر پریس کانفرنسیں کرتے ہیں یعنی اخبار نویسوں کو بلاتے ہیں، انہیں چائے پلاتے ہیں، کیک پیسٹری کھلاتے ہیں اور پھر ایک آدھ بیان بھی ان کے حوالے کر دیتے ہیں، اس میں یہی مصلحت ہے۔ بعض موقعوں پر ہم نے دیکھا ہے، بیان بڑا پھیکا سیٹھا ہے۔ لیکن اخبار نویس اس طرح سر ہلا رہے ہیں۔ گویا بیان دینے والے کی شیریں زبانی پر غش ہیں۔ ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شیرینی بیانوں میں نہیں بلکہ کیک پیسٹری میں ہے۔ گویا یہ پیسٹری کا کمال ہے کہ پھیکا سیٹھا بیان بھی ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔

---

۱۹ مارچ

کل لاہور ریلوے سٹیشن پر چودھری خلیق الزماں کے خلاف جو مظاہرہ ہوا ہے۔ اس کے

سلسلے میں ایک اخبار کے نمائندے نے میاں محمد ممتاز دولتانہ کی رائے پوچھی تو انہوں نے فرمایا، مظاہرہ اس قدر معمولی درجے کا تھا کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ گویا میاں صاحب ہر مظاہرہ کو "کرسیوں کی پہلی جنگ" کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ دونوں طرف سے کرسیاں چلیں، پانچ دس آدمی زخمی ہو جائیں تو بیان دینے یا مذمت کی قرارداد منظور کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اگر صرف کالی جھنڈیاں لہرائی جائیں، واپس جاؤ کے نعرے لگائے جائیں تو یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ کے پایہ کا شخص اس کی مذمت کرنے کی زحمت اٹھائے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس چنیں وچناں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میاں محمد ممتاز دولتانہ اگر صرف اتنا کہہ دیتے کہ ہاں صاحب چودھری خلیق الزماں کو کالی جھنڈی دکھانا بڑی بے جا حرکت ہے، تو کون سی آفت آجاتی لیکن وہ اور ہی قصہ لے بیٹھے۔ "اجی صاحب! یہ مظاہرہ اتنا اہم ہی کب تھا کہ میں اب اس کے متعلق بیان دیتا پھروں"۔ اے صاحب تو یہ کیجئے۔ یہ بھی کوئی مظاہرہ تھا!

ڈر ہے کہ کہیں لوگ میاں صاحب کی باتوں سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ انہیں دراصل مظاہرہ کرنے والوں سے ہمدردی ہے۔ زمانے کی احسان ناشناسی کو کیا کہئے کہ چودھری صاحب نے تو میاں صاحب کے نامزد کئے ہوئے ڈیڑھ سو کونسلروں کو منظور کر لیا یا بقول شخصے ڈیڑھ سو بیلی دونیاں قبول کر لیں، لیکن میاں صاحب سے ان کی حمایت میں ذرا سی زبان بھی نہ ہلائی گئی۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

دولتانہ صاحب سیاہ جھنڈیاں لہرانے اور مردہ باد کے نعرے لگانے کو برا نہ سمجھیں، ہم تو اس قسم کی حرکات کو برا سمجھتے ہیں۔ چودھری صاحب سے لوگوں کو ہزار اختلافات سہی، آخر وہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور لاہور والوں کے مہمان ہیں۔

کوئی گیارہ بارہ برس ہوئے۔ لاہور میں حُقّہ کانفرنس، جسے بعض لوگ "انجمن حقوقیتین" بھی کہتے تھے، قائم ہوئی تھی اور دیکھتے دیکھتے پنجاب کے کئی شہروں میں اُس کی شاخیں کُھل گئی تھیں۔ اُن دنوں شہید گنج کی تحریک زوروں پر تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے سمجھے کہ شاید سکھوں کو چڑانے کے لئے حقّوں کو منظم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حقّہ کانفرنس کے کارکنوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ نتیجہ تو کچھ نہ نکلا۔ البتہ یہ تحریک کچھ مدّھم ضرور پڑ گئی۔

نئے بجٹ نے سگریٹ مہنگے کر دیئے ہیں۔ کچھ ٹیکس بڑھا، کچھ سگریٹ والوں کا منافع بڑھا۔ چنانچہ بعض لوگ یہ کیفیت دیکھ کے پھر حقّہ گڑگڑا رہے ہیں۔ حقّہ کانفرنس کے پرانے کارکنوں کو چاہیے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کے حقّہ کانفرنس کی گڑگڑی کو تازہ کرنے کی کوشش کریں۔ اب تو سکھ بھی نہیں رہے۔ جن کے پاس خاطر سے پولیس والے "حقّہ کُش" اور "چلم پھوڑ" قسم کی حرکات پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس لئے حقہ پسند لوگوں کو چاہیئے کہ جلد ایک حقوقی قسم کی کانفرنس منعقد کر ڈالیں جس میں "پناہ گیر" اور "غیر پناہ گیر" دونوں قسم کے پندرہ بیس ہزار حقّے جمع کر دیئے جائیں۔ اس کانفرنس کے انتظامات اور حقہ یونین کے قواعد و ضوابط کے سلسلے میں بہت سی باتیں ہمارے ذہن میں ہیں جنہیں کسی آیندہ اشاعت میں بیان کیا جائے گا۔

۲۰ر مارچ

لوگ کہتے ہیں کہ دولتانہ صاحب نے چودھری خلیق الزّماں کے کہنے پر استعفا دیا ہے اور چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ نا بابا میرا اس قصّے سے کوئی تعلق نہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ چودھری صاحب اس قسم کی باتیں کیوں کہے جا رہے ہیں۔ مفت کی داد ہاتھ آتی ہے تو آنے دیجئے اور چپکے بیٹھے رہئے۔ کالی جھنڈیوں اور گو بیک کے نعروں سے تو اچھا ہے کہ لوگ آپ ہی کو اس برات کا دولھا سمجھ کے زندہ باد کے نعرے لگاتے رہیں۔

ایک معاصر نے لکھا ہے کہ دولتانہ صاحب گئے تو لیگ کی کونسل بھی گئی۔ وہ کونسلر بھی گئے جنہیں میاں محمد ممتاز دولتانہ نے نامزد کیا تھا۔ یہ اگر درست ہے تو چودھری خلیق الزمان کو صدارت، یوسف خٹک صاحب کو سکتری اور مرکزی لیگ کے دوسرے عہدہ داروں کو اپنے اپنے عہدوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ آخر ان کا انتخاب کرنے میں یہ ڈیڑھ سو کونسلر بھی تو شامل تھے۔

سچ پوچھئے تو ایک صدر کے استعفا دینے اور دوسرے کے اس کی جگہ لے لینے سے کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا۔ دولتانہ صاحب صدر نہ رہے اور نون صاحب صدر ہو گئے یا عبدالباری صاحب کی باری آئی اور یا پھر خلیل الرحمٰن صاحب کو فاختہ اڑانے کا موقع مل گیا تو کیا ہو گیا۔ یہاں نوآوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ یعنی پرائمری لیگوں سے لے کے صوبائی کونسل اور مرکزی لیگ تک ایک ہی رنگ اچھل رہا ہے۔ لیگ کی مسندِ شہر یاری پر شہزادہ رفیع الدرجات کو بٹھا دیجئے یا شہزادہ روشن اختر کو۔ جو للّے تللّے اب ہیں، وہی رہیں گے۔

ادھر چودھری خلیق الزّمان پنجاب کے لیڈروں میں اتحاد کرانے لاہور تشریف لائے، ادھر کراچی سٹی مسلم لیگ میں دنگا ہو گیا۔ بیچارے چودھری صاحب بھی کیا کریں۔ کراچی بیٹھے رہتے ہیں تو لاہور کے مسلم لیگی گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ لاہور آ کے ان میں بیچ بچاؤ کرا لیتے ہیں، تو کراچی والے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کا حال تو بالکل شریر لڑکوں کا سا ہے کہ ذرا ماسٹر کی توجہ ادھر اُدھر ہوئی اور انہوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر سے تو یہ ممکن نہیں کہ مختلف مقامات میں بیک وقت کئی اسکولوں کی نگرانی کرے اور ان شریر لڑکوں کو آپس میں لڑنے نہ دے۔ چودھری صاحب لاہور آتے ہیں تو قاسم ہوت اور قریشی میں لپاڈگی شروع ہو جاتی ہے۔ کراچی جاتے ہیں تو دولتانہ اور ممدوٹ لڑ پڑتے ہیں۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ چودھری صاحب سارے مسلم لیگیوں کو ساتھ ساتھ لئے پھریں۔ یعنی جہاں جائیں لیگ کے عہدہ داروں کا ایک پورا لشکر ان کے ساتھ ہو۔ ذرا کسی نے شرارت کی اور چودھری صاحب نے اسے بنچ پر کھڑا کر دیا۔

۲۲ / مارچ

جب سے پاکستان کی مرکزی حکومت نے کراچی کو مستقل طور پر اپنا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا ہے حکومتِ سندھ کسی نئے اڈے کی تلاش میں ہے۔ پچھلے دنوں سندھ اسمبلی میں یہ سوال پیش ہوا تو اکثر لوگوں نے محسوس کیا جیسے وہ سنما دیکھ کے نکلے ہیں اور اب تانگے والوں میں گھرے کھڑے ہیں۔ ایک کہتا ہے "مزنگ"، دوسرا پکار اٹھتا ہے "بھاٹی"۔ تیسری طرف سے آواز آتی ہے "گڑھی شاہو"۔ چوتھے کی صدا آئی "دلی دروازہ" اور پھر سارے تانگے والے اس طرح یکبارگی چلا اٹھتے ہیں کہ یہ ساری آوازیں یعنی گڑھی شاہو، مزنگ، موچی، بھاٹی، دلی دروازہ ایک دوسری میں "کھچڑی" ہو کے رہ جاتی ہیں۔

سندھ اسمبلی میں بالکل یہی ہوا۔ یعنی کراچی کے نئے دارالحکومت کا ذکر آتے ہی بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اسمبلی کے ایک ممبر نے کہا "سکھر"۔ دوسرا بولا "حیدرآباد"۔ تیسرا چلا اٹھا "روہڑی"۔ چوتھے نے ہانک لگائی "لاڑکانہ"۔ ایک صاحب پہلے خاصی دیر تک چپ چاپ ایک گوشے میں بیٹھے یہ "بولیاں" سنتے رہے۔ آخر اُن سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بے اختیار ہیچ اُٹھے "جیکب آباد"۔

اس موقع پر لاڑکانہ کے ممبر نے لاڑکانہ اور حیدرآباد کے ممبر نے حیدرآباد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملائے، لفظوں کے طوطا مینا بھی بنائے گئے۔ شاعرانہ مبالغہ آرائیاں بھی کی گئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ گرمی کی شدت کے لحاظ سے ملتان بھی جیکب آباد کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ لیکن ایک صاحب نے جیکب آباد کا نام کچھ اس انداز میں لیا گویا انہوں نے بہشت کا جواب ڈھونڈ نکالا ہے۔ لاڑکانہ کے ایک بزرگ اُٹھے اور کہنے لگے "آپ کراچی نہیں رہنا چاہتے تو لاڑکانہ تشریف لائیے ع

غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لئے

غرض اس بحث کو سُن کے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سندھ اسمبلی کا ہر ممبر حکومتِ سندھ کو اپنے گھر ڈال لینے کی فکر میں ہے۔

اُدھر کراچی میں سندھ کے صدر مقام کا نیلام ہو رہا ہے، اِدھر لاہور میں لیگ کی صدارت کے نیلام کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابھی تاریخ تو مقرر نہیں ہوئی۔ البتہ "نیلامی" کا تقرر ہو گیا ہے۔ یعنی شیخ صادق حسن صاحب امرتسری۔ ثم لاہوری۔ جو کرسیوں کی دو لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ "نیلامی" مقرر ہوئے ہیں۔ بولی دینے والوں میں بڑے بڑے "سیٹھ" شامل ہیں۔ جن کی ہمیانیاں نیک نامی کے چمکیلے سکوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں میاں عبدالباری اور مسٹر خلیل الرحمٰن پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ علّامہ علاؤ الدین صدیقی کا نام بھی لے رہے ہیں۔ یہ تو کہنا مشکل ہے کہ بولی کس کے نام ختم ہوتی ہے۔ لیکن اگر مسٹر خلیل الرحمٰن اس معرکہ میں بازی لے گئے تو یہ پرانی ضرب المثل غلط ثابت ہو جائے گی کہ "وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے"۔

ہماری سیاسیات سے نیلام کا بڑا گہرا تعلق ہے اور "الاٹمنٹ" کی ایجاد کے باوجود نہ نیلام کی رسم مٹی ہے، نہ نیلام گھر ہی ختم ہوئے ہیں۔ سیاسی نیلام گھروں میں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں، میزوں تپائیوں، چارپائیوں اور کرم خوردہ دریوں کی طرح لیڈری کی لٹی پٹی ہوئی ساکھ اب نیلام ہو رہی ہے۔ وزیروں، ممبروں، قرآن کا نام لے کے ووٹوں کی بھیک مانگنے والے لیڈروں کا سامانِ قیادت کباڑیوں کی دکانوں پر اب بھی سستے داموں بک رہا ہے۔ صدارت کے بڑے نیلام گھر کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے نیلام گھر ہیں۔ جہاں "دستارِ فضیلت" سے لے کے "لیڈری کی کرسی" تک نیلام ہو رہی ہے۔ لوگ بولیاں دے رہے ہیں اور یہ کباڑ خانہ سمیٹے جا رہے ہیں۔ نیلامی چلّا رہے ہیں "یہ سستا جا رہا ہے۔ ایک، دو۔ ایک۔ دو، دو۔ دو، تین۔ لیجئے بولی ختم ہو گئی"۔

---

۲۴ مارچ

"زمیندار" کو لفظ "دارالخلافہ" کے استعمال پر اعتراض ہے اور دلیل یہ ہے کہ دارالخلافہ خلافت کے ساتھ تھا۔ خلافت ختم ہوئی اور دارالخلافہ بھی ختم ہو گیا۔ سالک صاحب فرماتے ہیں کہ دارالخلافہ غلط العام ہے اور دارالحکومت کے معنوں میں مدت سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس لئے کراچی کو پاکستان کا دارالخلافہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں اور بات ٹھیک بھی ہے۔ رواجِ عام کی سند، لغت کی سند سے کہیں زیادہ معتبر ہے۔

سچ پوچھئے تو یہ بات کچھ کراچی پر ہی موقوف نہیں۔ ہر شہر جہاں "خلیفے" موجود ہیں، دارالخلافہ ہے۔ مکتبوں میں مانیٹر کو "خلیفہ" کہتے تھے۔ اب بھی اکثر اہلِ فن جنہوں نے استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، "خلیفہ" کہلاتے ہیں اور سب سے عجیب بات ہے کہ ہر نائی چاہے وہ ہیئر کٹنگ سیلون کا مالک ہو، چاہے فٹ پاتھ پر بیٹھ کے خط بناتا اور داڑھیاں مونڈتا ہو، خلیفہ کہلاتا ہے اور خط بنانے کو "اصلاح" کہتا ہے۔ چنانچہ نائیوں نے اگر کوئی اخبار نکالا تو اس کا نام "اصلاح" ہوگا۔

نواب صاحب بہاول پور اپنے مرکزِ حکومت کو "بغداد الجدید" کہتے ہیں۔ اس لئے اگر "بغداد الجدید" کو بہاول پور کا دارالخلافہ اور نواب صاحب کو "خلیفہ بغداد الجدید" کہہ دیا جائے تو اس میں بھی ہمارے نزدیک کوئی حرج نہیں۔ بمبئی مدت تک تحریکِ خلافت کا مرکز رہا ہے اور اب تک وہاں مرکزی کمیٹی کا دفتر موجود ہے بلکہ خلافت کے نام سے ایک اخبار بھی نکل رہا ہے، اس لئے اگر بمبئی کو دارالخلافہ کہہ دیا جائے تو ہمیں اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ہر انسان خلیفہ ہے اور ہر گھر دارالخلافہ، کیونکہ باوا آدم خلیفۃ اللہ تھے۔ چنانچہ اِنّی جَاعِلٌ فِی الاَرضِ خَلِیفَۃً انہیں کے حق میں آیا ہے۔ گویا خلافت صرف خلیفہ شجاع الدین ہی کو ورثہ میں نہیں ملی، باوا آدم کی نسبت سے خلافت پر ہم سب کا حق ہے۔

راقم الحروف کو اکثر تعجب ہوتا تھا کہ علامہ مشرقی نے اپنے اخبار کا نام "اصلاح" کیوں رکھا۔ آج دفعتہً خیال آیا کہ علامہ مشرقی ایک زمانے تک سارے عالمِ اسلام کا خلیفہ بننے کا خواب دیکھتے رہے ہیں ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مُو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ہمارے مُلک میں اکثر الفاظ کا محلِ استعمال کچھ اس طرح بدلا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ "خلیفہ" کا خطاب سب سے پہلے آدمؑ کو ملا۔ اب زیادہ تر حجّام خلیفہ بلکہ "خلیفہ جی" کہلاتے ہیں۔ گویا آدمؑ کے پوتے اور جانشین بلکہ صحیح معنوں میں آدمی یہی لوگ ہیں۔ ہم اور آپ کسی شمار و قطار میں نہیں حجّام مسلمان ہو تو "خلیفہ جی"۔ ہندو ہو تو "راجاجی"۔ خاکروب کو بعض علاقوں میں لوگ مہتر کہتے ہیں بعض علاقوں میں جمعدار۔ حالانکہ مہتر کے معنی "سردار" کے ہیں۔ چنانچہ چترال کے حکمران کا لقب بھی مہتر ہے، جمعدار یا جماعہ دار مغلوں کے زمانے میں ایک معزز عہدہ تھا۔ اب بھی فوج میں جمعدار کا عہدہ موجود ہے۔ سقّا بہشتی کہلاتا ہے۔ گویا جس شخص نے مشک اٹھائی اور پانی بھرنا شروع کر دیا۔ اسے جیتے جی بہشت کا پروانہ مل گیا۔

غور کیا جائے تو یہ بھی بڑے بڑے جاگیرداروں اور دولت مند لوگوں کی شعبدہ بازیاں ہیں۔ ایک طرف تو یہ حال کہ نائی، دُھنیے، سقے، جلاہے، درزی وغیرہ کو "چھوٹی امت" کے لوگ اور "اچھوت بھیّے" کہتے ہیں۔ انہیں پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ دوسری طرف انہیں خلیفہ جی، راجاجی، مہتر، جمعدار اور بہشتی وغیرہ کہہ کے خوش بھی کر دیتے ہیں۔ "خلیفہ جی" بغل میں کسوت دابے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور بس اتنی بات میں خوش ہیں کہ لوگ انہیں "خلیفہ جی" کہتے ہیں۔ بچارا خاکروب صبح سے شام تک دُکھ بھرتا ہے۔ لیکن جب کوئی اسے جمعدار کہہ کر پکارتا ہے، دن بھر کی کلفت دُور ہو جاتی ہے۔ سقّا مشک اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے، بوجھ کے مارے پیٹھ دوہری ہو گئی ہے۔ لیکن لوگ اسے جب بہشتی کہتے ہیں تو جنّت کا نقشہ آنکھوں تلے پھر جاتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کو چاہے کسی نام سے پکاریئے، ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ سقا سقا اور نائی نائی ہی رہے گا۔ نائی کو خلیفہ کہئے یا اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر اس کے ہیئر کٹنگ سیلون کو "دارالخلافہ" کہہ دیجئے۔ ہیئر کٹنگ سیلون قصر شاہی تو نہیں بن جائے گا۔ سقے کو بہشتی کہہ دینے سے اس کے ہاں دودھ اور شہد کی نہریں تو نہیں بہنے لگیں گی۔ خاکروب کو مہتر اور جمعدار کہئے۔ لیکن اتنی بات سے وہ اعلیٰ حضرت مہتر چترال تو نہیں بن جاتا۔ ہاں لوگوں کو خالی خولی باتوں سے مطمئن کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ لوگ برطانوی حکومت کے دیئے ہوئے خطابات "خان صاحب"، "خان بہادر"، "شمس العلما" وغیرہ واپس کر چکے۔ امیروں اور جاگیرداروں کے بخشے ہوئے یہ خطابات بھی ایک نہ ایک دن "عطائے شما، بلقائے شما" کہہ کے واپس کر دیئے جائیں گے۔

---

۲۶ مارچ

پچھلے دنوں ہم نے سرکاری قسم کے مشاعروں کا ذکر کیا تھا۔ جن کا مہتمم عام طور پر ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کے پایہ کا کوئی دوسرا سرکاری افسر ہوتا ہے۔ ایک صاحب اس سلسلے میں پوچھتے ہیں کہ اگر سرکاری مشاعروں میں واقعی شاعروں کو ذلیل کیا جاتا ہے تو شعرائے کرام ان میں شریک ہی کیوں ہوتے ہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ وہ شاعر ہی کیا۔ جسے شعر سنانے کا موقع ہاتھ آئے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ وہ تو شکر کیجئے کہ کسی نہ کسی بہانے ہفتہ عشرہ میں نہ سہی مہینے دو مہینے میں ایک آدھ مشاعرہ ہو جاتا ہے اور حضرات شعراء کو دل کا غبار نکالنے اور جی ہلکا کرنے کا موقع مل جاتا ہے، ورنہ یہ حضرات بغل میں بیاض دابے ہوٹلوں، قہوہ خانوں، کالجوں اور سرکاری دفتروں پر یلغار بول دیتے ہیں۔ تانگوں اور موٹروں کو روک لیتے۔ تانگے والا داد نہ دیتا تو گھوڑے سے داد طلب کرتے اور کوئی تعجب نہیں کہ ٹریفک کے قانون میں سرکار کو ایک اور دفعہ کا اضافہ کرنا پڑتا۔

باقی رہا عزت اور ذلت کا معاملہ تو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بعض شاعروں کی عزت ڈپٹی کمشنر بھی کرتا ہے، اور بعض کو تانگے والا بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ہم نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جن کا کلام آج تک اہلِ مشاعرہ نے کبھی غور سے نہیں سنا۔ جہاں وہ شعر سنانے کھڑے ہوئے "بیٹھ جاؤ۔ ہم نہیں سنتے" کا شور مچ گیا۔ لیکن انہوں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ ہر مشاعرہ میں ضرور شریک ہوتے ہیں اور کوئی سُنے نہ سُنے۔ اپنا کلام ضرور سناتے ہیں۔ آخر کبھی نہ کبھی انہیں ضرور کامیابی ہوگی۔ یعنی اہلِ مشاعرہ ضرور اُن کا کلام سنیں گے اور کیا عجب ہے کہ داد بھی دے نکلیں۔ یہ لوگ گالیاں سن کے بھی شعر سنانے سے باز نہیں آئے تو سرکاری مشاعروں میں جانے اور پولیس کے پہرے میں شعر پڑھنے سے کیوں ہچکچائیں؟

مشاعروں کی اس کثرت کے باوجود بعض شاعروں کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ یعنی بیاض بغل میں دبائے شعر سنانے کے موقع کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ جہاں کسی نے شعر سنانے کی فرمائش کی، انہوں نے بیاض نکالی اور مارے شعروں کے اُتّو کر دیا۔

شاعر تو خیر شاعر ٹھہرے، بعض افسانہ نگاروں کا بھی یہ حال ہے کہ افسانوں کا پشتارہ اٹھائے "سامعین" کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ شاعر کے پنجے سے تو چھوٹنا آسان ہے۔ ایک دو نظموں یا غزلوں کے بعد گلو خلاصی کا کوئی نہ کوئی موقع نکل آتا ہے، لیکن افسانہ آخر افسانہ ہے جب تک ختم نہ ہو، نجات ناممکن ہے۔

۳ر اپریل

ہم سمجھتے تھے کہ امتحانوں کے دنوں میں پرچوں کے متعلق جو شکایتیں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان میں اصلیت بہت کم ہوتی ہے۔ طلبہ کو عادت سی ہو گئی ہے کہ جہاں پرچہ ذرا مشکل نظر آیا چلّانا شروع کر دیا۔ لیکن اب کے میٹرک کے امتحان میں اردو کے جو پرچے آئے ہیں، انہیں دیکھ کے ہم اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے اور ایک اردو پر کیا موقوف ہے، فارسی اور انگریزی کا بھی قریب

قریب یہی حال ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض ممتحن تو خاص طور پر آرڈر دے کے بنوائے گئے ہیں۔

مثال کے طور پر اُردو کے پرچہ ب کے بعض سوالات ملاحظہ ہوں:۔

مندرجہ ذیل عبارت کے مطالب سے استعارہ کا پردہ اُٹھا کر اصل مطلب کو سادگی اور صفائی سے بیان کیجئے۔

میٹرک کے طلبہ کیا جانیں کہ "استعارہ کا پردہ" کیا بلا ہے؟ اُن میں سے اکثر یہی سمجھے ہوں گے کہ ممتحن بے پردگی کا حامی ہے۔ حالانکہ بیچارے ممتحن نے استعارہ کے تذکرہ میں محض استعارہ صرف کیا ہے۔ یہ سوال سیدھی سادی زبان میں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن ممتحن استعارہ کے تذکرہ میں استعارہ صرف نہ کرے تو لوگوں کو اُس کے عالم و فاضل ہونے کا یقین کیسے آئے؟

ایک اور سوال ملاحظہ ہو:۔

"مندرجہ ذیل عبارتوں میں سے صرف دو کے مطالب کو اپنی سادہ اور دلکش نثر میں بیان کیجئے۔ عبارت کے مصنّف کا نام اور اس کا محل و مقام بھی بتائیے۔

یہ بات تو سمجھ میں آ گئی کہ نذیر اور آزاد کی نثر دلکش اور پھیکی اور ثقیل ہے اور میٹرک کے طلبہ کی نثر دلکش اور سادہ ہے لیکن ہم یہ سمجھ نہیں سکتے کہ مصنف کا "محل و مقام" کس بلا کا نام ہے۔ ممتحن صاحب کا کرم ہے کہ انہوں نے "محل و مقام" پر اکتفا کیا ورنہ اگر وہ طلبہ کو حکم دے دیتے کہ مصنف کا محل وقوع یا حدود اربعہ بتاؤ اُس کا طول و عرض بلکہ رقبہ بیان کرو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاؤ کہ اُس کا عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل کیا ہوتا ہے؟ تو کوئی اُن کا کیا کر لیتا؟

ایک اور سوال ہے:۔

مندرجہ ذیل اشعار کے معانی و مطالب کی وضاحت فرمائیے۔ شاعر کا نام یا تخلّص اور نظم کا عنوان بھی بتائیے۔

اس کے بعد میر کی اُس مشہور غزل کے تین اشعار نقل کردئیے گئے ہیں جس کا مطلع یہ ہے:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ہم سمجھتے تھے کہ "غزل" کا کوئی عنوان نہیں ہُوا کرتا۔ لیکن ممتحن صاحب کو اصرار ہے کہ غزل کا بھی کوئی نہ کوئی عنوان ہونا چاہیئے اور آپ جانتے ہیں ممتحن آخر ممتحن ہے۔ پھانسی نہیں دے سکتا تو کیا ہُوا فیل تو کر سکتا ہے۔

اس پرچہ کا آخری سوال "نادیدہ" ہے یعنی اس میں ایک ایسی عبارت کا مطلب پوچھا گیا ہے جو کورس کی کتابوں میں موجود نہیں اور غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تحریر سے لی گئی ہے۔ اس عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:

حقیقت یہ ہے کہ صرف اس عہد میں نہیں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحبِ قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراضِ قلوب و عللِ ارواح کا کوئی علاج نہیں۔ محالِ مطلق ہے کہ ایک صاحبِ استعداد سیرۃِ نبویہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیشِ نظر رکھتا ہو اور ہمہ تنک و اضطرابِ نفس کا افسونِ ہلاکت اس پر کارگر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جا بجا انبیاء کرام علیہم السلام کی نفسِ زندگی اور وجود کو بطور ایک محبت و برہان کے پیش کیا ہے نہ کہ محض بطور قصص و اظہارِ علمِ ماسبق اور اخبارِ غیب جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

افسوس کہ ہمیں ممتحن صاحب کا نام اور محل و مقام معلوم نہیں، ورنہ خود اُن کی خدمت میں حاضر ہو کے اس "کارِ نمایاں" پر مبارکباد عرض کرتے۔

---

۱۲ اپریل

اب کے جمادی الثانی کا اسلامی مہینہ اپریل کے ساتھ شروع ہُوا ہے۔ چنانچہ آج اپریل کی بھی

دسویں ہے اور جمادی الثانی کی بھی دسویں۔ یوں کہئے کہ اپریل اور جمادی الثانی گلے مل رہے ہیں۔ اور ہر روز گلے ملتے رہیں گے، کیونکہ اپریل بھی تیس دن کا مہینہ ہے اور قمری سال کا تو ہر مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے۔ نہ جانے اُن نجومیوں کا کیا ہوا، جن کے لمبے چوڑے بیان آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے تھے۔ نجوم "لڑانے" کا ایسا "اینگلو محمڈن" موقع پھر کب ہاتھ آئے گا۔ افسوس ہم نجومی نہیں کہ اپریل اور جمادی الثانی کے یوں گلے ملنے پر کچھ عرض کر سکیں۔ رہ رہ کے صرف غالبؔ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بُتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گلے ملنے کے تذکرہ میں حزبِ اسلامی یاد آگئی، جو ان دنوں افغانستان اور پاکستان کو گلے ملوانے کی فکر میں دُبلی ہوئی جا رہی ہے۔ حزب اسلامی ایک نئی جماعت ہے جو جماعت اسلامی کے توڑ پر "تصنیف" کی گئی ہے۔ اور اس کے مصنف، مولف یا موجد، غرض جو کچھ کہہ لیجئے، جنابِ عزیز ہندی ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ جہاں دو اشخاص میں کوئی اختلاف یا شکر رنجی نظر آئی، اختلاف کی وجہ معلوم کئے بغیر انہیں گلے ملوا دیا۔ اس قسم کے ایک مولوی صاحب سے ہماری بھی یاد اللہ تھی۔ ایک دفعہ دو دوست کسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے، مولوی صاحب انہیں دیکھ کے لپکے اور پکڑ کے گلے ملوا دیا۔ وہ بہتیرا کہتے رہے کہ اجی مولوی صاحب ہم تو یوں ہی وقت گزارنے کے لئے بحث کر رہے تھے، لیکن مولوی صاحب کب کسی کی سنتے تھے۔ انہیں جبراً گلے ملوایا اور لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی جھاڑ دی۔

جناب عزیز ہندی کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے مولوی صاحب سے بڑھ کے ہاتھ مارا ہے۔ یعنی دو سلطنتوں کو گلے ملوا رہے ہیں اور چونکہ وہ افغانستان میں مدت تک رہے ہیں، ان دنوں پاکستان میں تشریف فرما ہیں اور ہندوستان سے بھی ان کا تعلق ہے، یعنی "ہندی" ان کے نام کا جزو ہے۔ اس لئے ایسا ثالث بالخیر کہاں ملے گا؟

لیکن بہتر ہوتا کہ وہ عیدالفطر تک انتظار کر لیتے۔ گلے ملنے کے خاص خاص موسم ہیں اور مسلمان تو کہیں رمضان کے بعد گلے ملا کرتے ہیں۔

لاہور میں دو جگہ یومِ اقبال منایا جا رہا ہے۔ حبیبیہ ہال میں مجلسِ مرکزیۂ اقبال یومِ اقبال کا انتظار کر رہے ہیں۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن والوں نے ٹاؤن ہال میں یوم اقبال منانے کا بندوبست کیا ہے۔ ایک جگہ وزیروں اور سفیروں کا ہجوم ہوگا۔ دوسری جگہ صرف مقالے پڑھے جائیں گے۔ یار لوگوں نے ایک زمانے میں مسلم لیگ کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ لیکن یہ خیال کسے تھا کہ ایک دن یومِ اقبال سے بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ حزبِ اسلامی یا عزیز ہندی صاحب اگر مجلسِ مرکزیۂ اقبال اور سٹوڈنٹس فیڈریشن کو گلے ملوا دیں اور یومِ اقبال ایک ہی جگہ منایا جائے۔ تو ہم سمجھیں گے انہوں نے بڑا کام کیا۔ دو حکومتوں کو گلے ملوانے سے دو مجاوروں کو گلے ملوانا زیادہ آسان کام ہے۔ کیونکہ "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند و دہ درویش در گلیمے بخسپند"۔

۱۴ر اپریل

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا کہ "میں تو کشمیر کو الہ آباد ہی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں"۔ شیخ محمد عبداللہ نے پچھلے دنوں جو تقریریں کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کو سچ مچ الہ آباد کا جزو بنانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور شیخ صاحب بھی کیا کریں۔ اُنہیں ہندوستان سے اسی شرط پر کروڑوں روپے اُدھار ملے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ کشمیر الہ آباد کے شہر سے بہت بڑا ہے اور اس کا محلّہ نہیں بن سکتا۔ لیکن شیخ صاحب اپنی طرف سے کُلھیا میں ہاتھی کو بند کرنے کی کوشش تو کئے جا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں جب کابل میں مدرسہ حبیبیہ قائم ہوا اور دوسرے مضامین کے ساتھ جغرافیہ بھی پڑھایا جانے لگا تو طلبہ یہ دیکھ کے

بڑے حیران ہوئے کہ ہندوستان کے مقابلہ میں افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ بعض پڑھے لکھے افغانوں کو چھوڑ کے باقی سب لوگ یہی سمجھتے تھے۔ کہ افغانستان دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور دُنیا کا کوئی حکمران امیر کابل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ان دنوں امیر کابل کو ہندوستان کے خزانے سے اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ ملتے تھے۔ انگریز یہ رقم وظیفہ کے طور پر دیتے تھے اور افغان خراج سمجھ کے وصول کرتے تھے۔ اس لئے طلبہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہندوستان جو ہمارا باج گزار ہے، ہمارے ملک سے بڑا کیونکر ہو سکتا ہے؟ آخر یہی فیصلہ ہُوا کہ نقشہ "فرنگی" کا بنایا ہُوا ہے، اس لئے غلط ہے۔ چنانچہ آن کی آن میں نقشہ پھاڑ کے پھینک دیا گیا اور طلبہ استاد کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بیچارا پنجاب کا رہنے والا مولوی ایک کونے میں سہما کھڑا تھا۔ وہ تو خیر گزری کہ کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے اسے چھڑا دیا، ورنہ افغان لڑکوں کے ہاتھوں اس کی بھی درگت بن جاتی۔

جغرافیہ کے سلسلے میں ایک اور واقعہ سُن لیجئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خاں افغانستان کے شاہی خاندان میں پہلے شخص تھے جنہیں یورپ کی سیر کرنے کا موقع ملا۔ جب ان کا جہاز بحیرۂ روم میں پہنچا تو اتفاق سے سمندر میں تلاطم برپا تھا اور موجیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں۔ جہاز کے کپتان نے جو سردار نصر اللہ خاں کے ساتھ عرشہ پر کھڑا تھا، انہیں مخاطب کر کے کہا "دیکھئے سردار صاحب! کتنا بڑا سمندر ہے"۔ سردار نصر اللہ خان اس موقع پر چپکے کیونکر رہ سکتے تھے۔ کہنے لگے "کپتان صاحب ہمارے ملک میں ایسے ایسے کئی سمندر پڑے ہیں"۔

پنڈت نہرو نے تو کہہ دیا کہ میں کشمیر کو الہ آباد ہی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں اور کشمیر کو الہ آباد کا محکمہ ثابت کرنے کا مشکل کام شیخ عبداللہ کے ذمے آ پڑا ہے۔ اُن کا بس چلا تو وہ یہ کوشش کریں گے کہ پورا کشمیر، نانگا پربت، ولر، ڈل، جہلم، سندھ، چناب اور سندھ سمیت

سوراج بھون کے ایک گوشے میں سما جائے اور پنڈت جی بھی یہ کہہ سکیں کہ ایک کشمیر کیا ہے الہ آباد میں تو کئی کشمیر پڑے ہیں۔

۱۵/اپریل

مغربی پنجاب مسلم لیگ کے قائم مقام صدر شیخ صادق حسن نے چودھری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم کو پیغام بھیجا ہے کہ کشمیر کی رائے شماری کے سلسلے میں میری خدمات حاضر ہیں۔

شیخ صاحب کے کمالات سے تو انکار نہیں لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مضمون بہت پرانا ہے جسے دولتانہ صاحب زیادہ بہتر طریقے پر باندھ چکے ہیں۔ شیخ صاحب نے یہی فرسودہ اور پامال مضمون تھوڑے سے الٹ پھیر کے ساتھ باندھ دیا تو کونسا بڑا تیر مارا؟

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے یہ شاعرانہ خیال صرف فنِ شاعری میں اپنی مہارت ثابت کرنے کے لئے نظم نما نثر میں ادا فرمایا ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ یہ مضمون ذرا سلیقے سے بندھ جائے تو کبھی کبھی پورے دیوانوں پر بھاری نظر آتا ہے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کے سامنے کشمیر کی رائے شماری سے زیادہ اہم مسائل بھی ہیں یعنی ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

دور کیوں جایئے۔ لیگ کی صدارت، آئندہ انتخاب، لیگ کے ٹکٹ، عام حق رائے دہی، نئی حلقہ بندی وغیرہ مسائل ہی کو لیجیے جن کی وجہ سے بڑے بڑے جغادری لیڈر "چکنم" میں پڑے ہیں۔ بہر حال یہ خیال غلط ہے کہ "کشمیر" کے وظیفہ سے صدارت مستحکم ہوتی ہے۔ دولتانہ صاحب کے لئے تو یہ وظیفہ کچھ ایسا مفید ثابت نہیں ہوا۔

داغ کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

اے داغ اہل قلعہ کا لٹنا تو درکنار
تنخواہ بھی خزانۂ شاہی میں رہ گئی

یہ مقطع جب یاد آیا ہے، دل پر چوٹ لگی ہے کہ اللہ اللہ یہ شاعر لوگ بھی کتنے خود غرض ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دلّی بالکل اجڑ گئی۔ لیکن شاعر کو دلّی کے اجڑنے سے زیادہ اپنی بقایا تنخواہ کا خیال ستا رہا ہے۔ یہی حال ہمارے بعض مہاجر لیڈروں کا ہے۔ امرت سر، گورداسپور، جالندھر، لدھیانہ، ہوشیار پور، انبالہ وغیرہ اضلاع کے مسلمانوں پر جو مصیبت آئی، لیڈروں کو اس کا اتنا خیال نہیں۔ البتہ جب خیال آتا ہے کہ ان شہروں کے تباہ ہو جانے سے پرانے حلقہ ہائے انتخابات نہ رہے اور ان کے ساتھ ہماری لیڈری بھی ختم ہو گئی تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ لوگ مریں یا جئیں لیڈر کو صرف ووٹ سے سروکار ہے۔

لیڈروں کو تبادلۂ آبادی کی وجہ سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مغربی پنجاب میں نیا امرت سر، نیا جالندھر، نیا لدھیانہ وغیرہ نام کے شہر بسائے جائیں۔ ان شہروں اور ان کے آس پاس کے دیہات میں وہی لوگ آباد ہوں جو ان شہروں سے ہجرت کر کے آئے ہیں تاکہ لیڈروں کی لیڈری سلامت رہے جو شخص تبادلۂ آبادی کے زمانے میں اسمبلی کا ممبر تھا، اس کے خاندان میں ممبری پشت در پشت چلتی رہے۔ لیکن ہمیں ڈر ہے کہ یہ تجویز تسلیم نہیں کی جائے گی۔ گویا جس طرح داغ کی تنخواہ خزانۂ شاہی میں رہ گئی تھی۔ اسی طرح بعض لیڈروں کی لیڈری مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہے۔ جس کے ہاتھ آنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں۔

---

۱۶ اپریل

ڈاکٹر رضی الدین ریاضی کے ماہر ہیں (ذرا رضی اور ریاضی کی تجنیس ملاحظہ ہو۔ چنانچہ مغربی پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انہیں ریاضی کے شعبہ کی صدارت پیش کی گئی تھی اور انہوں نے یہ پیشکش قبول بھی کر لی تھی۔ لیکن ہندوستان کی حکومت نے انہیں آنے ہی نہ دیا اور شعبۂ ریاضی کی

صدارت کرنا الگ رہا، وہ سائنس کانفرنس میں بھی شریک ہو نہ سکے گویا کہ ع

نکلی نہ کسی سے وصل کی شکل

تھے جمع بڑے بڑے حسابی

معلوم نہیں ڈاکٹر رضی الدین اب کس فکر میں ہیں۔ بہرحال اس موقع پر اُن کے ایک ہم نام شاعر کا یہ مصرع گنگنانے میں تو کوئی حرج نہیں کہ ع

تری وہ مثل ہوئی اے رضی نہ اِلا الذی نہ الاالذی

بہرحال ہندوستان کی حکومت اس معاملہ میں حق بجانب ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین اگر اپنا سارا علم و فضل لاہور والوں کے حوالے نہ کر جاتے۔ جب بھی اس بات کا اندیشہ تو ضرور تھا کہ وہ پاکستان والوں کو ریاضی کا کوئی ایسا قاعدہ بتا جاتے جس کی مدد سے ہم کشمیر کو استصوابِ رائے کے بغیر پاکستان میں جمع کر لیتے اور تفریق و ضرب بلکہ تقسیم کی نوبت ہی نہ آنے پاتی۔

ہمارے خیال میں ہندوستان والوں کو چاہیئے کہ اچھے اچھے اہلِ علم کو ڈبیا میں بند کر کے رکھیں اور وہ ڈبیا میں بند نہ ہو سکیں تو پنجرے میں بند کر دیں تا کہ وہ نہ کسی سے مل سکیں، نہ بات کر سکیں، نہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکیں اور اس طرح اُن کا سارا علم "بحق ہند سرکار محفوظ" ہو کے رہ جائے۔ کیونکہ "ایٹم بم" کے اس زمانے میں تو علم جہالت سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔

---

۱۷ اپریل

گرمی کا موسم شروع ہو گیا۔ سچ پوچھئے تو گرمی کے موسم کا نام ہی نام ہے۔ اصل میں تو یہ مچھروں اور مکھیوں کا موسم ہے۔ درجہ حرارت بڑھتا ہے تو کہیں ۱۱۶ یا ۱۱۷ تک چلا جاتا ہے مکھیوں اور مچھروں کی نسل پھیلتی ہے تو کروڑوں اور اربوں تک جا پہنچتی ہے۔ کارپوریشن کے

وڈیروں کی فہرست موجود ہے لیکن مچھروں اور مکھیوں کی فہرست ابھی تک مرتب نہیں ہوسکی۔ کارپوریشن والے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ایک وڈیرے کو کتنے مچھر اور کتنی مکھیاں الاٹ ہوئی ہیں۔ بہرحال الاٹمنٹ کے معاملہ میں جہاں اور بے قاعدگیاں ہوئی ہیں، وہاں ایک بے قاعدگی یہ بھی سہی۔

کارپوریشن کے ممبروں سے اس سلسلے میں کچھ کہنا سننا عبث ہے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ لاہور میں جتنے مچھر ہیں، سب اس مچھر کی اولاد میں سے ہیں جو نمرود کی ناک میں گھس گیا تھا۔ اس لئے سب کے سب بڑی عزت و تکریم کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ "ہیں ہیں" کی راگنی سے لوگوں کو نمرود کا انجام یاد دلاتے رہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہمیں شکایت کرنے کے بجائے اُلٹا ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ لیکن صاحب یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ "خاندانی مچھر" شہر کے اندرونی حصے میں خاص طور پر غریب لوگوں کے جھونپڑوں کے آس پاس ڈیرے ڈالے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ مال روڈ اور آس پاس کے علاقے کا رُخ کیوں نہیں کرتے؟ نمرود اگر آج زندہ ہوتا اور لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لیتا تو مصری شاہ یا دلی دروازے میں تو نہ پڑا رہتا۔ ڈیوس روڈ یا ایمپرس روڈ پر بلکہ نہر کے کنارے عالی شان کوٹھی بنواتا۔ اس لئے غریب لوگوں کے سامنے دنیا کی بے ثباتی کا وعظ کرنا فضول ہے۔ ان خاندانی مچھروں کو جو کارپوریشن کے "بلاتنخواہ واعظ" ہیں، ذرا شہر کے بیرونی حصے کی طرف توجہ کرنی چاہئے اور سچ پوچھئے تو "ہیں ہیں" کے آسمانی نغمہ کی داد بھی لوگ دے سکتے ہیں۔

ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ شہر کی سڑکوں کے کنارے کوڑے کرکٹ کے جو انبار لگے ہیں اور جنہیں کارپوریشن والے لاہور کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں، ان کی حفاظت بھی ضروری ہے یا تو انہیں اٹھوا کے عجائب خانے میں رکھوا دیا جائے اور اگر عجائب خانے میں اتنی گنجائش نہ نکل سکے تو نیا عجائب خانہ بنوایا جائے۔

بدقسمتی سے بہت سے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کوڑے کرکٹ کے انباروں میں یورینیم کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یورینیم ایٹم کے سلسلے میں بہت کام آتی ہے۔ اس لئے سڑکوں کے

کنارے کوڑے کرکٹ کے یہ انبار دیکھ دیکھ کے کارپوریشن والے آوازے کستے ہیں۔ اگر کارپوریشن ملک کے اس قیمتی سرمایہ کی حفاظت کا مناسب انتظام کرے تو اُس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، کم از کم اتنا ضرور ہو گا کہ اسے لوگوں کے طعنوں سے نجات مل جائے گی۔

اعتراض کرنے والوں کا کیا ہے، وہ تو ہر بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں کارپوریشن کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا پورا پورا احساس ہے۔ انہوں نے مچھروں کی پرورش کا انتظام اس لئے کر رکھا ہے کہ لاہور کے مچھر بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی بابل کے اُس تاریخی مچھر کی اولاد میں سے ہیں جس نے نمرود سے دنیا کو نجات دلائی تھی۔ انہوں نے مکھیوں کی حفاظت کا بندوبست اس لئے کیا ہے کہ مکھیوں پر ہر دور میں ظلم ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ غمِ عشق کی الاٹ منٹ کے موقع پر بھی یہی ہوا کہ پروانوں نے سارا "سوزِ دل" اپنے نام الاٹ کرا لیا اور مکھیاں بے نصیب رہ گئیں۔ اسی لئے تو سرمد نے کہا ہے کہ ؎

سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

اگر کارپوریشن والے مکھیوں کو "سوزِ دل" الاٹ کرا کے اس تاریخی بے انصافی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قصوروار کیوں سمجھا جائے۔ اُن پر نکتہ چینی کیوں کی جائے؟!

باقی رہے کوڑے کرکٹ کے انبار تو انہیں جس مصلحت سے کارپوریشن نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ اس کا ذکر ہم وضاحت سے کر چکے ہیں۔ کارپوریشن نے اگر آج تک اس سلسلے میں کوئی اعلان نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق ایک بڑے اہم راز سے ہے۔ یورینیم اور ایٹم ایسی چیزیں نہیں، جن کا ذکر برملا کر دیا جائے اور سچ پوچھئے تو ہم بھی یہ فتنہ زبان پر نہ لاتے۔ لیکن کارپوریشن پر آئے دن جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، اُنہیں سُن سُن کے ہم سے نہ رہا گیا اور ہم یہ راز فاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پرانے زمانے کے بادشاہ بھی مچھروں کی حفاظت اور

پرورش کا انتظام کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کنشک سے پہلے جو بڑا مشہور راجہ ہو گزرا ہے، پشاور میں مچھروں کے لئے بڑے بڑے تالاب بنا رکھے تھے۔ اس زمانے میں اس شہر کو "پشہ پور" کہتے تھے۔ اور راجہ "پشہ پرور" (مچھر پال) کے لقب سے مشہور تھا۔ آگے چل کے یہی لفظ پشاور بن گیا۔ آج بڑے بڑے عالموں کو بھی معلوم نہیں کہ پشاور اصل میں "پشہ پرور" تھا۔

۱۸/ اپریل

یہ ناموں کا قصہ بھی بڑا بے ڈھب ہے۔ شاعروں کو نیا تخلص اور فلم والوں کو فلم کا نیا نام نہیں ملتا۔ شاہ جہاں، بابر، اکبر، ہمایوں وغیرہ فلمیں بن چکی ہیں۔ بیرم خاں کی کسر باقی رہ گئی تھی، وہ بھی پوری ہو گئی۔ ایک صاحب نے اس جھگڑے سے اکتا کے فلم کا نام "لال حویلی" رکھ دیا۔ دوسرے صاحب اٹھے اور انہوں نے اپنی فلم کا نام "ڈاک بنگلہ" تجویز کیا۔ اب دیکھ لیجئے گا کہ کچھ عرصہ میں حوض قاضی، کھاری باولی، لال کنواں، اگر کھی شاہو وغیرہ نام کی فلمیں بننی شروع ہو جائیں گی۔ بہتر ہو اگر "بدھو کا آوا" کے نام سے بھی ایک فلم بن جائے۔ فلم والوں نے "بدھو کے آوے" کو نظر انداز کر دیا تو لاہور کی تاریخ کو بہت نقصان پہنچے گا۔

ایک صاحب "گلزارِ نسیم" کہلاتے ہیں اور اخباروں اور رسالوں میں اپنی نظمیں چھپواتے ہیں۔ آپ کہتے ہوں گے کہ اگر گلزار نسیم کسی شخص کا نام ہو سکتا ہے تو لارنس گارڈن اور حضوری باغ وغیرہ کی قسم کے نام رکھنے میں کیا حرج ہے۔ لیکن گلزارِ نسیم اصل میں کسی باغ کا نام نہیں بلکہ اردو کی ایک مشہور مثنوی کا نام ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصنیف ہے۔ اس لئے ہم تو یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر گلزارِ نسیم کسی انسان کا نام ہو سکتا ہے تو آب حیات، دربارِ اکبری، احمق الذی، کرم دھرم، پی کہاں، نقش چغتائی، ہیر وارث شاہ بلکہ "اصلی تے وڈی ہیر وارث شاہ" جیسے نام رکھنے میں کیا حرج ہے۔ شوکت حیات، عمر حیات، خضر حیات وغیرہ عام نام ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے لڑکے کا نام آب حیات رکھ لے تو یہ نام بھی کانوں کو چنداں نامانوس معلوم نہیں

ہوگا۔ ہندوؤں کے ہاں امرت لال عام نام ہے۔ ملک آبِ حیات خاں اسی کا اردو ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض نام ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں مثلاً جھنڈا رام جھنڈا سنگھ جھنڈے خان میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اصل نام تو جھنڈا ہے اس کے ساتھ رام لگا دیجئے تو ہندو کا نام ہوگیا، سنگھ لگائیے تو سکھ کا نام ہوگیا اور خان لگا دیجئے تو خالص اسلامی نام ہوگیا۔ اس ضمن میں ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ "خان" کو اسلام سے کوئی خاص واسطہ نہیں۔ غیر مسلم تاتاری عام طور پر خان کہلاتے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ "خان" بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اسی لئے تو ایک موقع پر ملک فیروز خاں نون کو یہ شبہ ہوا تھا کہ ہلاکو خاں اور چنگیز خاں وغیرہ مسلمان تھے اور ملک صاحب کو تو اگر لالہ بیرا خاں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو وہ انہیں مسلمان ہی سمجھتے۔

جھنڈا خاں اور جھنڈا رام کی طرح اور بھی کئی نام ہندو مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً لال چند لال سنگھ اور لال خاں۔ سکندر لال اور سکندر خاں۔ گلزاری لال۔ گلزار سنگھ اور گلزار خاں۔ فوجا سنگھ۔ فوجا خاں اور فوجا رام۔ بوٹا رام۔ بوٹا سنگھ۔ بوٹا خاں وغیرہ۔ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے لڑکے کا نام بوٹا خاں کے بجائے محمد بوٹا رکھ دیتا ہے۔ بوٹا کی طرح گھسیٹا، جیون وغیرہ بھی ایسے نام ہیں جو ہندو مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

یہ نہ سمجھئے کہ گھسیٹا اور گھسیٹی قسم کے نام صرف پنجاب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ گھسیٹا اور گھسیٹی یو۔ پی اور بہار چھوڑ کر مشرقی بنگال میں موجود ہیں۔ مثلاً علی وردی خاں کی بڑی لڑکی اور سراج الدولہ کی پھوپھی گھسیٹی بیگم بنگال کی تاریخ میں بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس لئے یہ سطریں اگر کسی گھسیٹے خاں کی نظر سے گزریں تو انہیں اس خیال سے مطمئن ہوجانا چاہئے کہ یہ نام اونچے طبقے کے لوگوں میں بھی خاصا مقبول ہے۔

۲۰ اپریل

یہ لیجئے لیگ کی صدارت کا قصہ بھی طے ہو گیا، یعنی میاں عبد الباری صاحب جنہوں نے مرکزی لیگ کی سکتری کے معرکۂ امتحان میں یوسف خٹک صاحب سے شکست کھائی تھی، باتفاق رائے صدر منتخب کر لئے گئے۔ اس سلسلے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ دولتانہ اور ممدوٹ جن کے درمیان وزارت کے معاملے میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا، میاں عبد الباری کی صدارت کے معاملہ میں متفق الرائے ہیں۔ سچ ہے۔ دینے والے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ یا تو یہ حال تھا کہ سکتری نہ مل سکی۔ یا یہ حال ہے کہ رائے شماری کے چکر میں پڑے بغیر صدارت ہاتھ آ گئی اور اگرچہ امیدواروں میں سردار شوکت حیات خاں جیسا شخص بھی موجود تھا۔ لیکن وہ بھی ع

محفل کا رنگ دیکھ کے خاموش ہو گیا

شیخ صادق حسن صاحب نے لیگ کے قائم مقام صدر کی حیثیت سے جو بیان دیئے ہیں۔ انہیں پڑھ کے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کم از کم صدر کا انتخاب انہیں کی صدارت میں ہو گا اور اس طرح انہیں اپنی محنت کی داد مل جائے گی لیکن جب انتخاب کا موقع آیا تو دولتانہ صاحب اچک کے صدارت کی کرسی پر جا بیٹھے اور شیخ صاحب ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شیخ صاحب گھڑی دو گھڑی کے لئے اس اجلاس کی صدارت کر لیتے تو کونسی آفت آ جاتی۔

بہرحال دولتانہ صاحب کا دور ختم ہوا۔ اور باری صاحب کی باری آئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ع

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

یہ اور بات ہے کہ لائل پور کے لوگ اس مصرع کو یوں پڑھتے ہیں ع

اب جگر تھام کے بیٹھو مرا باری آیا

سردار شوکت حیات خاں نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ لیگ کا صدر ایسا شخص

ہونا چاہیئے جو لیگ کو صحیح معنوں میں جمہوری جماعت بنانے کا عہد کرے۔ میاں عبدالباری صاحب نے نہ کوئی عہد کیا، نہ حلف اٹھایا، نہ کسی نے اُن سے حلف اٹھانے کو کہا اور اس قسم کے کسی بکھیڑے میں پڑے بغیر صدارت کی کرسی پر جا بیٹھے۔ حالانکہ اگر ان کے بجائے سردار شوکت حیات کو صدر منتخب کیا جاتا تو وہ ہر قسم کا عہد کرنے کو تیار تھے۔

۲۱ر اپریل

مدت ہوئی، راقم الحروف نے جغرافیہ پنجاب لکھا تھا جو یوں تو خاصا مقبول ہوا مگر پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے اسے "جغرافیہ" تسلیم کرنے ہی سے صاف انکار کر دیا۔

اصل میں محکمۂ تعلیم کی بعض باتیں مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہیں یا تو "بے نمکی" کی یہ کیفیت کہ سندباد جہازی کے جدید جغرافیہ پنجاب جیسی مقبول عام کتاب کو اٹھا کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یا پھر "شوراخوری" کا یہ عالم کہ "منور جغرافیہ" کو نصاب تعلیم میں شامل کر لیا۔

"منور جغرافیہ" کوئی سُرمہ نہیں بلکہ سچ مچ جغرافیہ ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس جغرافیہ کا مؤلف تالیف و تصنیف کے قضیہ میں اُلجھنے کی بجائے سرمہ بیچتا تو خلقِ خُدا کو زیادہ فائدہ پہنچتا۔ خیر اب کیا کیا جائے اس نے جغرافیہ لکھ ڈالا اور محکمہ تعلیم نے اسے چھٹی جماعت کے نصاب میں بھی شامل کر لیا۔ اس لئے "سرمہ نورانی" کے بجائے "منور جغرافیہ" ہی پر قناعت کر لیجئے۔ یعنی "ہوالشافی" کہہ کے اسے آنکھوں سے لگایئے۔

یوں تو "منور جغرافیہ" کے مؤلف نے بڑی بڑی "غیر جغرافیائی" حرکتیں کی ہیں لیکن بعض مقامات پر تو حد کر دی ہے۔ مثلاً مشرقی پاکستان کا ذکر صرف دس سطروں میں کیا ہے۔ جس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان بھی ایک صوبہ ہے جس میں حسنِ اتفاق سے ڈھاکہ اور چاٹگام دو شہر بھی موجود ہیں اور ریاست بہاول پور کے تذکرہ میں پورا ایک صفحہ سیاہ کر ڈالا ہے اور بہاول پور

تو خیر بڑی چیز ہے "منور جغرافیہ" کے مؤلف نے مشرقی پاکستان کو قلات جتنی اہمیت بھی نہیں دی۔

اس جغرافیہ میں سرحد کی چار ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیر، سوات اور چترال کو صرف تین سطروں میں ٹرخا دیا گیا ہے۔ ٹانک کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے اور وہ اس انداز میں گویا "ٹانک ریاست" نہیں بلکہ کوئی بڑی سلطنت ہے۔ چنانچہ اس تذکرہ میں یہ فقرہ خاص طور پہ قابل غور ہے:۔

"ٹانک کا پایۂ تخت
ٹانک شہر ہے"

یہ پایۂ تخت کی بھی ایک ہی رہی۔ ٹانک اصل میں ریاست بھی نہیں صرف جاگیر ہے۔ لیکن جغرافیہ کے مؤلف نے جاگیر کو ریاست اور ریاست کو سلطنت بنا کے ٹانک میں اعلیٰ حضرت فرمانروائے ٹانک کا تخت عظمت بچھا دیا اور محکمۂ تعلیم سے اس کی منظوری بھی حاصل کر لی ہمارے خیال میں اگر کوئی جاگیردار بادشاہ بننا چاہے تو اُسے کسی دن جغرافیہ دان سے رجوع کرنا چاہئے محکمۂ تعلیم خود بخود اس کی بادشاہت منظور کر لے گا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، صوبۂ سرحد میں پانچ ریاستیں ہیں۔ سوات، دیر، چترال، امب اور پھلڑا۔ اس جغرافیہ میں امب اور پھلڑا کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ البتہ ٹانک کا نام موجود ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ امب اور پھلڑا کے والیانِ ریاست کو معزول کر کے ان کی ریاستیں اعلیٰ حضرت فرمانروائے ٹانک کے حوالے کر دی گئیں اور ٹانک کا شہر اس نئی حکومت کا "پایۂ تخت" قرار پایا ہے۔ ہم اخبار نویس بھی کتنے بے خبر لوگ ہیں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔

ہمیں "منور جغرافیہ" کے مؤلف کا حدودِ اربعہ اور محل وقوع بلکہ طول بلد اور عرض بلد تک معلوم نہیں۔ ورنہ ہم سفارش کرتے کہ ان بزرگوار کو پہلے بحر شمالی میں غوطے دیئے جائیں۔ پھر کچھ عرصہ تک منطقۂ بارده میں رکھنے کے بعد نیم استوائی خطّہ میں بھیج دیا جائے تاکہ انہیں کم از کم اپنا طول بلد اور عرض بلد تو معلوم ہو جائے۔

۲۲ر اپریل

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کوٹھی کے صحن میں وہ ململ کا کرتہ پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ سامنے کرسیاں بچھی تھیں۔ جو آتا، کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا۔ اہلِ محفل میں ہر قسم کے ہر لوگ تھے۔ شاعر، اخبار نویس، ادیب، کلرک، پہلوان۔ گفتگو سیاسیات سے شروع ہوئی۔ بیچ میں آپ نشدھوں کے فلسفے اور چھ درشنوں کا بھی ذکر آ گیا۔ لیکن یہ محفل بالآخر لطیفوں اور پھبتیوں پر ختم ہوئی اور دوسرے موضوعوں کی طرح ان میں بھی علامہ اقبال کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ یعنی انہوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کئے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی اور کبھی کبھی طبیعت لہراتی تو پھبتیوں پر پھبتیاں اور لطیفوں پر لطیفے کہتے چلے جاتے تھے۔ لیکن ان پھبتیوں سے محض خوش وقتی مقصود تھی۔ نہ ان کے دل میں کسی کے خلاف عناد یا دشمنی کا جذبہ تھا، نہ وہ دوسروں کا دل دکھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر پھبتیاں کہی جاتی تھیں۔ وہ خود بھی داد دیتے تھے۔ ایک صاحب پر جو علامہ کے خاص نیازمندوں میں تھے، سب سے زیادہ نظرِ عنایت تھی یعنی سب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کہی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے بعض اقربا نے اُن سے کہا "تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں سے سمجھتے ہو۔ لیکن ان کے ہاں جو تمہاری حیثیت ہے، وہ ہمیں معلوم ہوگئی ہے۔ یہ طعنہ سننے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے۔ علامہ اقبال کو معلوم ہوا تو انھیں منانے کے لئے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ انہیں جب خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے منانے کے لئے میرے ہاں آنا چاہتے ہیں تو وہ بیتاب ہو کے خود علامہ کے ہاں پہنچے۔ علامہ اقبال نے پہلے تو ان سے معافی مانگی اور کہا کہ افسوس میری زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس پر آپ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ پھر ایک آدھ پھبتی ایسی کہہ دی کہ وہ بے اختیار ہنس پڑے۔

ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے کچھ طلبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب پردے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ پردہ ترقی کے راستے میں حائل ہے۔
ان دنوں کالجوں کے طلبہ خاص طور پر گورنمنٹ کالج کے طالب علموں میں بننے سنورنے کا شوق حد سے زیادہ تھا اور بعض طلبہ تو لپ اسٹک تک استعمال کرتے تھے۔ اتفاق سے یہ طلبہ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال پہلے تو اُن کی باتیں سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ آپ تو چاہتے ہیں کہ عورتوں کو پردہ سے نکالا جائے اور میں اس فکر میں ہوں کہ لڑکوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔

علامہ اقبال کے پرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ جاؤ بازار سے بتاشوں کا مربہ لے آؤ۔ سارے شہر میں پھرا لیکن بتاشوں کا مربہ کہاں سے ملتا۔ دکاندار بتاشوں کے مربے کا نام سنتے تھے اور ہنستے تھے۔ علی بخش سے ان کا یہ معاملہ آخر تک رہا۔ ایک دن یہ سوال پیش ہوا کہ علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے۔ کسی نے کہا، اگری۔ کسی نے کہا، خاکستری۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، علی بخش کی مونچھیں مچھی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ "منادی" میں لکھا، "میں ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا شاعرِ اعظم نہیں سمجھتا۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پاس فاسفورس کا تیل بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھٹنے میں درد تھا۔ انہوں نے فاسفورس کا تیل استعمال کیا۔ درد کم ہو گیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا: "آپ نے جو تیل بھیجا تھا، میں نے اسے استعمال کیا اور مفید پایا۔ دوسرے دن "منادی" میں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط چھپ گیا۔ اس کے ساتھ جلی حروف میں چار کالمی عنوان تھا:۔
فاسفورس کے تیل کے متعلق ہندوستان کے شاعرِ اعظم کی رائے۔
ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی لیکن میں نے "منادی" کے یہ دونوں پرچے انہیں دکھائے تو ہنس کے کہنے لگے، خواجہ صاحب بھی بچے ہیں۔ فاسفورس کا تیل استعمال کرنے سے

پہلے میں کچھ نہیں تھا۔ اس تیل نے مجھے شاعر اعظم بنا دیا۔

---

۲۵ را پریل

ہم اب تک سمجھتے تھے کہ فلم سنسر بورڈ ایک سرکاری مجلس ہے، جس کا کام محض احتساب ہے۔ لیکن "ضدی" نام ایک نئے فلم کا جو اشتہار لاہور کے اخباروں میں چھپ رہا ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلم سنسر بورڈ کے فرائض میں بعض خاص خاص فلموں کی "پبلسٹی" بھی شامل ہے اور آپ جانتے ہیں کہ احتساب کو پبلسٹی سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں۔ محتسب اگر پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کر کے مئے ارغوانی کے ساغر لنڈھانا شروع کر دے تو حلقۂ رنداں میں چاہے اسے کتنا ہی اعتبار کیوں نہ حاصل ہو جائے، وہ محتسب تو نہ رہا۔

"ضدی" بمبے ٹاکیز کا نیا فلم ہے اور سنا ہے کہ اسے لاہور کے فلم دیکھنے والے حضرات نے بہت پسند کیا ہے لیکن اخباروں میں اس فلم کا جو نیا اشتہار چھپا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلم سنسر بورڈ کے دو ممبروں کی رائے بھی موجود ہے۔ بورڈ کے ایک ممبر میر نور احمد صاحب ناظم صیغۂ رابطۂ عامہ فرماتے ہیں: "میں نے اپنی زندگی میں جتنے فلم دیکھے ہیں، "ضدی" اُن سب سے اچھا ہے۔" ایک اور ممبر مسز سلمیٰ تصدق حسین کا ارشاد ہے کہ "آج تک جتنے فلم بنے ہیں "ضدی" سب سے بازی لے گیا۔" ضدی بازی لے گیا یا نہیں، یہ قصہ تو بحث طلب ہے۔ بہر حال مسز سلمیٰ تصدق حسین "ضدی" کی تعریف کرنے میں میر نور احمد سے ضرور بازی لے گئیں۔

"ضدی" کے سلسلے میں سنسر بورڈ کے دو ممبروں کی رائے چھپوا دینے کے بعد اور کسی رائے کی ضرورت تو باقی نہیں رہتی تھی، لیکن سنما والوں نے مناسب سمجھا کہ "علامہ" علاؤ الدین صدیقی رکن مجلس عاملہ مسلم لیگ کی رائے بھی چھپوا دی جائے، کیونکہ "علامہ" علم سے مبالغہ کا صیغہ ہے، اس لئے اُن کی رائے بھی ضرور مبالغہ آمیز ہو گی اور پروپیگنڈے میں مبالغہ ہی سبھی کچھ ہے۔ اس کے

علاوہ "علم" اور "فلم" میں بڑا تعلق ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب "علامہ" نے اس فلم کو دیکھنے کے بعد مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے جو رائے ظاہر کی ہے، اس میں علم اور فلم دونوں آ گئے۔ یعنی انہوں نے فرمایا ہے کہ پاکستان کے ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کو اس فلم سے علم حاصل کرنا چاہیئے۔

اب تک تو علاؤالدین صدیقی صاحب نرے "علاّمہ" تھے۔ لیکن اس اظہار رائے کے بعد انہیں "فلاّمہ" کہنا چاہیئے۔ وہ ہندوستان والوں کے علم کے تو چنداں قائل نہیں، لیکن ہندوستانی فلم کو دیکھ کے اُن کی بھی رال ٹپک پڑی ہے اور وہ "علم الفلم" کے حصول کے لئے پاکستان کو ہندوستان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ سنسر بورڈ کے دو ممبروں اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ایک رکن کو جو لیگ کا جنرل سیکرٹری اور لیگ کی صدارت کا امیدوار بھی رہ چکا ہے، ہندوستان کی اداؤں میں سے صرف ایک فلم ہی اتنا کیوں پسند آیا کہ وہ اپنا منصب اور مقام بھول کے "شامل اشتہار" ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

---

۲۶ / اپریل

شب برات کے سلسلے میں علمائے لاہور کا اعلان اخباروں میں چھپا ہے، جس میں آتشبازی کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، شب برات کے دو ارکان ہیں آتشبازی اور حلوا۔ علمائے کرام آتش بازی کی مخالفت تو کرتے ہیں، لیکن حلوے کا نام تک نہیں لیتے حالانکہ اگر آتش بازی پر دام خرچ کرنا اسراف ہے تو حلوے پر روپے صرف کرنا بھی اسراف ہے۔ اور ہماری اطلاع تو یہ ہے کہ شب برات کے موقع پر مسلمان حلوے پر جتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ آتش بازی پر اس سے آدھا بھی صرف نہیں ہوتا۔

علما کی طرف سے آتش بازی کے خلاف یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ شب برات کے موقع پر آتش بازی کی وجہ سے بعض حادثے بھی ہو جاتے ہیں اور مسلمان بچوں کی جانوں کو ہلاکت میں ڈالنا بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن یہی بات حلوے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ اکثر لوگوں کو جن میں علمائے کرام کی اکثریت ہے، زیادہ حلوا کھا جانے کی وجہ سے سوءِ ہضم اور رفراقِ معدہ وغیرہ امراض لاحق ہو جاتے ہیں بلکہ ہم نے تو بعض لوگوں کو بسیار خوری کی وجہ سے "غفر لہ" ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اگر شب برات سے دوسرے دن تحقیقات کیجئے تو آتشبازی کے "کشتگانِ ستم" سے "شہدائے جلوۂ حلوہ" کی تعداد زیادہ ہی نکلے گی۔ دراصل یہ بزرگوار حلوے کو "شیریں" اور اپنے آپ کو "فرہاد" سمجھتے ہیں اور فرہاد "عشقِ شیریں" میں جو کچھ کر گزرے اُسے معذور سمجھنا چاہیئے۔

۳۰ر اپریل

یومِ اقبال کے موقع پر لاہور میں مشاعرہ ہوا اور کراچی میں قوالی۔ دراصل کراچی والے بھی مشاعرہ ہی کرتے، لیکن شاعر میسر ہی نہ ہو سکے۔ اس لئے مجبوراً مشاعرے کی بجائے قوالی یعنی "مطلع عرض کیا ہے" کی جگہ "ارے ہاں جی" پر اکتفا کرنا پڑا۔

کراچی پاکستان کا سیاسی مرکز تو ضرور ہے لیکن شاعری اور مشاعرہ کے معاملہ میں بالکل پھسڈی رہ گیا ہے۔ اسے جب کبھی مشاعرہ کرنا ہوتا ہے، لاہور سے شاعر منگواتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ پورے کا پورا مشاعرہ میرِ مشاعرہ سمیت لاہور سے بھیجا گیا ہے۔ کراچی والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہاں "شاعری" کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کریں مشینیں موجود نہیں تو نہ سہی، گھریلو دستکاری کے طور پر تو اسے بآسانی رواج دیا جا سکتا ہے۔ آخر کراچی اس معاملہ میں کب تک لاہور کا دست نگر رہے گا!

ایک زمانے میں لاہور میں پنجابی کے مشاعروں کا عام رواج تھا۔ موچی دروازے سے

شاہ عالمی دروازے یا دلی دروازے کے باہر باغ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ شاعروں کے کئی جتھے تھے، جن میں ہمیشہ لاگ ڈانٹ رہتی تھی۔ اس لئے جو مشاعرے بیت بحثی سے شروع ہوتے تھے، اکثر لپا ڈگی پر ختم ہوتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک شاعر لہک لہک کے شعر پڑھ رہا ہے کہ کسی نے ٹانگ پکڑ کے کھینچ لیا۔ اس پر اس کے شاگرد بگڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے محفلِ مشاعرہ عرصۂ کارزار بن گئی۔ پولیس شاعروں کے جھگڑوں میں بہت کم دخل دیتی تھی، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پولیس نے موقع پر پہنچ کر پورے مشاعرہ کو گرفتار کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ مشاعرہ تھانے ہی میں ٹاپتا رہا اور عدالت تک کبھی نہیں پہنچا۔

کہتے ہیں کہ اب کے اتوار کو حلقۂ ارباب علم کا جو اجلاس ہوا ہے، وہ پنجابی کے ان مشاعروں سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا۔ یعنی پہلے دو بزرگواروں نے ایک دوسرے کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کئے جو غیاث اللغات چھوڑ صراح و قاموس تک میں نہیں ملتے اور جنہیں عام لوگ جو رموزِ علم سے نا آشنا ہیں "گالی" کہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں نے کشتی گیری اور پہلوانی کے کمالات دکھانے چاہے۔ لیکن شکر ہے کہ ہاتھا پائی تک نوبت نہیں پہنچی بلکہ یار لوگ صرف گندے تول تول کے رہ گئے۔ ورنہ موقع تو کچھ ایسا تھا کہ اگر معاملہ "مطلع عرض کیا ہے" سے "گھونسہ عرض کیا ہے" اور "ذرا یہ تھپڑ ملاحظہ ہو" تک پہنچ جاتا تو کسی کو ہرگز تعجب نہ ہوتا۔

بہر حال حلقۂ ارباب علم کے ارکان کی یہ "علمی خدمت" قابلِ داد ہے کہ انہوں نے بعض ایسے "لغات" کو رواج دینے کی جانب توجہ فرمائی ہے، جنہیں فرہنگ نگاروں اور لغت نویسوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ پھر یہ گھونسہ اور تھپڑ ہر چند "غیر علمی" چیزیں ہیں لیکن اگر "ارباب علم" انہیں اپنا لیں تو انہیں بھی علمی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ مرحوم غالب کو جب شعر نا فہموں سے واسطہ پڑا تھا تو اس نے بھی یہی کہا تھا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس شعر کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "مطلع عرض کیا ہے" پر ہمیں داد نہ ملی تو ہم "گھونسہ عرض کیا ہے" کہہ کے داد وصول کرلیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنایہ استاد ذوقؔ کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسی لئے انہیں پھر کبھی مرزا کے مُنہ آنے کی ہمت نہ پڑی۔

یکم مئی

آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ جنرل چیانگ کائی شیک تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد واپس آ گئے ہیں اور اب کمیونسٹوں سے مقابلہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ فیلڈ مارشل فیروز خاں نون بھی جو تین مہینے سے غائب تھے، پھر سیاسیات کے اکھاڑے میں ڈنٹر پیل رہے ہیں اور کسانوں کے مقابلے میں زمینداروں کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔

اسے "سرقہ" نہیں بلکہ "توارد" کہنا چاہیے یعنی ملک صاحب نے چیانگ کائی شیک سے مضمون نہیں اڑایا بلکہ یہ خیال انہیں خود سوجھا ہے۔ اصل میں بڑے آدمیوں کے اندازِ فکر میں بڑی یکسانی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی مضمون لڑ جاتا ہے۔ چیانگ کائی شیک صاحب چین میں بیٹھے ہیں اور ملک فیروز خاں نون پاکستان میں تشریف فرما ہیں۔ لیکن دونوں کے سوچنے کے ڈھنگ میں کچھ ایسی یکسانی ہے کہ جن لوگوں کو اصل بات معلوم نہیں، وہ یہی سمجھیں گے کہ یا تو نون صاحب نے مضمون چرایا ہے یا چیانگ کائی شیک سے اُن کا کوئی خفیہ سمجھوتہ ہو چکا ہے۔

فیلڈ مارشل فیروز خاں نون نے آخری مرتبہ جس سیاسی معرکہ میں حصہ لیا تھا، اُس کا حال تو آپ کو معلوم ہے۔ وہ وزارتی فرنٹ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ دفعہ ۹۲ الف کے ازغیبی گولہ نے پورے فرنٹ ہی کا صفایا کر دیا۔ چنانچہ نون صاحب اس طرح خانہ نشین ہوئے کہ کوئی "آرڈر آف دی ڈے" شائع کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرمائی۔

اب مغربی پنجاب کے زمیندار پھر اس بڈھے فیلڈ مارشل کو جس نے لاہور سے لندن، لندن سے سان فرانسسکو اور سان فرانسسکو سے استنبول تک گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہوٹل ہوٹل کی پُڈنگ چکھی ہے نکال لائے ہیں۔ بڑی بڑی قلعہ شکن توپیں جمع کی جا رہی ہیں اور تازہ اطلاعات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جاٹ مہا سبھا والے سردار حبیب اللہ بھی اپنا توپ خانہ لے کے نون صاحب کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں اور راجی کیا ہے۔ قزلباشوں، ٹوانوں، لغاریوں اور دولتانوں کو بھی اسی فوج میں بھرتی ہونا پڑے گا۔

زمیندار کے ہاں شادی بیاہ ہو تو کسانوں سے شادی کا خرچ وصول کیا جاتا ہے، جسے "شادیانہ" کہتے ہیں۔ زمیندار موٹر خریدے تو کسانوں کو "موٹرانہ" ادا کرنا پڑتا ہے۔ زمیندار کا منشی لگان کا حساب کرے تو کسان سے "منشیانہ" وصول کیا جاتا ہے۔ بٹائی کا غلّہ زمیندار کے ہاں پہنچانے پر جو خرچ اٹھتا ہے، وہ بھی کسان ہی ادا کرتا ہے اور اسے "کیانہ" کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ شادی بیاہ چاہے زمیندار کے ہاں ہو یا کسان کے ہاں، کسان کو ہر حالت میں ایک رقم زمیندار کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

ایران میں "عصرانہ" سہ پہر کی چائے کو کہتے ہیں اور اب یہ اصطلاح ہمارے ہاں بھی رائج ہو گئی ہے، حالانکہ پنجاب کی خاص مصطلحات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو "ا-ن-ہ" حرف انہیں الفاظ کے اخیر میں آتے ہیں، جن میں جرمانہ یا نذرانہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے عصرانہ صرف ایسی چائے کو کہنا چاہیئے جس کے اخراجات کسان سے وصول کئے جائیں اور سچ پوچھئے تو ہمیں دولتانہ، ٹوانہ اور ہوتیانہ بھی موٹرانہ اور منشیانہ قسم کے الفاظ یعنی زرعی ٹیکس معلوم ہوتے ہیں۔

---

۲ مئی

آج کل "گورنری راج" نے لاہور کے اخبار نویسوں کو دو گروہوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ ایک

گروہ "گورنر اور گورنری راج" کا حامی ہے، دوسرا مخالف۔ ایک تولائی ہے دوسرا تبرائی۔ ایک نصیبے کہتا ہے دوسرا ہجو لکھتا ہے۔ تولائیوں کا سرگروہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" ہے اور اس کی تولا کا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، کیونکہ وہ ایک حیثیت سے خود "اہل بیت" میں شامل ہے۔ البتہ بعض دوسرے اخباروں کو "تولا" کے معاملے میں جو غلو ہے، اسے سمجھنا کسی قدر مشکل کام ہے۔

"تبرائی حضرات" کا طرزِ عمل آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ لوگ گورنری راج کے صرف اس لئے مخالف ہیں کہ پنجاب کے موجودہ گورنر سر فرانسس موڈی انگریز ہیں۔ اگر ان کی جگہ کسی مسلمان کو گورنر بنا دیا جائے تو وہ قطعاً مخالفت نہیں کریں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات صرف انگریز گورنر سے بیزار ہیں۔ ورنہ دفعہ ۹۲ الف سے جسے بعض لوگ الف خاں اور بعض الف دین کہتے ہیں کوئی پرخاش نہیں۔ یعنی یہ بزرگوار اس "الف خانی روشنائی" سے "خضاب" کا کام لینے پر آمادہ ہیں۔ "الف خانی روشنائی" کا "خضاب" میسر ہو جائے تو چاہے انتخاب ہو نہ ہو، الکشن کی گاڑی چلے نہ چلے انہیں کوئی پروا نہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بحث چاہے کسی قسم کی ہو، یار لوگ دو جھٹکوں میں اسے "ذاتی" بنا لیتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے بارے میں بحث چھڑی تو تان مودودی صاحب پر ٹوٹی۔ "گورنری راج" کا قصہ سامنے آیا تو مودودی صاحب لپیٹ میں آگئے۔ حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ موڈی اور مودودی دونوں سے الگ رہ کے اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ "گورنری راج" برا ہے تو چاہے فرانسس موڈی وزیر ہوں یا خواجہ شہاب الدین گورنر ہوجائیں "گورنری راج" کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصل میں دفعہ ۹۲ الف ہی ایسی چیز ہے جسے چند دنوں کے لئے گوارا کیا جائے تو کر لیا جائے، زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اب چاہے کوئی صاحب ۹۲ الف کو الف خاں بلکہ الف دین کہہ کے اسے مسلمان ثابت کر دکھائیں، ہمارے لئے اس پر ایمان لانا مشکل ہے۔ گورنری راج چاہے سر فرانسس موڈی

کا ہو، چاہے شہاب الدین کا، چاہے غضنفر علی خاں کا، دفعہ ۹۲ الف کو چاہے الف خاں کہئے، چاہے الف دین بلکہ آپ چاہے اس کے منکروں کو بے دین ہی کہہ دیجئے ہم تو اس پر ایمان لانے سے رہے۔

ہمارے خیال میں اخبارات کو ان ذاتی بحثوں میں پڑنے اور ایک دوسرے کو طعنے دینے کے بجائے اس بات کا مطالبہ کرنا چاہیئے کہ نیا انتخاب جلد ہو اور ہر عاقل و بالغ مرد اور عورت کو رائے دینے کا حق دیا جائے۔ ہم اس بحث میں کیوں پڑیں کہ موجودہ گورنر "معصوم" ہے یا اس کا شمار صرف مجتہدین کے گروہ میں ہوتا ہے۔ خان ممدوٹ سے جو غلطیاں ہوئیں ان کی حیثیت محض اجتہادی غلطیوں کی ہے یا سابق وزرا کا حق اجتہاد بھی مشتبہ ہے۔ حجۃ الاسلام علامہ دولتانہ بڑے مجتہد ہیں۔ یا حجۃ الاعلام علامہ علاؤ الدین صدیقی اجتہاد میں زیادہ اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ نیا انتخاب اگر صحیح طریقے سے ہوا تو "گورنری راج" بھی ختم ہو جائے گا۔ ان بڑے بڑے "مجتہدوں" کو بھی کوئی نہ پوچھے گا۔ ہاں اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ "جمہوریت" کے لائق ہی نہیں تو جو انگریز پاکستان سے چلے گئے ہیں، انہیں بھی بلا لیجئے۔

سُنا ہے۔ ملک فیروز خاں نون فرما رہے ہیں کہ کسانوں کے مقابلہ میں زمینداروں کی جو تنظیم ہو رہی ہے۔ اس میں وہ شامل نہیں لیکن وہ شامل نہ ہوئے تو دُنیا کا کوئی کام تو نہیں رک جائے گا بلکہ خدا زمینداروں اور جاگیرداروں کی رہنمائی کے لئے کوئی اور لیڈر پیدا کر دے گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ زمیندار اور جاگیردار سب کے سب لیڈر ہیں۔ اس لئے کسی ایک شخص کو لیڈر ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے کوئی زمیندار سبھا قائم ہوئی تو اس لنکا میں سب باون گزے ہوں گے، یعنی اس جماعت میں سب لیڈر ہی لیڈر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس قسم کی کوئی جماعت قائم نہیں ہو سکی اور جو جماعتیں قائم بھی ہوئیں وہ زیادہ دنوں تک چل نہیں سکیں۔

کل کی اشاعت میں عرض کیا گیا تھا کہ دولتانہ، ہوتیانہ، ٹوانہ وغیرہ ناموں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی موٹرانہ، نذرانہ، ہرجانہ، منشیانہ قسم کے ٹیکس ہیں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے "ہوتیانہ" سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب ہوتی یا ہوتی مردان کے لوگوں پر کوئی ٹیکس لگا دیا گیا تھا جو ہوتیانہ کے نام سے مشہور ہو گیا اور دولتانہ تو انکم ٹیکس کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر آئندہ انکم ٹیکس کو دولتانہ کہا جائے تو کیا حرج ہے؟

---

۵ رمئی

مزدور کھلم کھلا یوم مئی مناتے ہیں اور کسان موجودہ زرعی نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو "صاحب ہیٹ و الپتلون" ملک فیروز خاں نون کے سوا اور کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ زمینداری کے موجودہ نظام کو کسانوں سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلاتا۔ سچ ہے ؎

کامل اس فرقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

ایک مولوی صاحب زمینداروں کی حمایت میں آگے آگئے تھے، لیکن ان سے صرف اتنا ہو سکا کہ ایک مضمون گھسیٹ ڈالا اور ایک اخبار نے اُسے اٹھا کے چھاپ دیا۔ ملک فیروز خان نون چاہتے تو وہ بھی ایک آدھ مضمون لکھ کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ لیکن ایثار اور قربانی کے اس پُتلے نے اس نازک وقت میں چُپ چاپ بیٹھے رہنا یا صرف لفظوں کے طوطا مینا بنانا اور کاغذ کے پھول کترنا مناسب نہ سمجھا بلکہ میدان میں اُتر آیا۔

ایوانِ تجارت کے وزن پر ایوانِ زراعت موجود تو تھا، لیکن مدت سے ویران پڑا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا بلکہ کہیں کہیں تو کائی بھی اُگ آئی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ خانۂ خالی را دیو مے گیرد۔

ملک صاحب نے اسی "خانۂ خالی" میں ڈیرا ڈالا۔ سردار حبیب اللہ نے جو مدت تک جاٹ سبھا کے "راجہ اندر" بنے رہے تھے، یہ خبر سنی تو وہ بھی سر پہ کھاٹ اٹھائے "تیلی رے تیلی! تیرے سر پہ کولھو" کہتے ہوئے یہیں اٹھ آئے بلکہ زمیندارہ لیگ والے پرانے یونینسٹوں نے بھی جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، انہیں کی پیروی کی۔ گویا ان دونوں ایوانِ زراعت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف جاٹ سبھا سمٹی سکڑی اکتارا بجا رہی ہے، دوسری طرف زمیندارہ لیگ ہریانہ کی بولی میں آلھا گا رہی ہے اور ملک فیروز خاں خوش ہیں کہ انھوں نے اینٹ روڑے ملا کے خاصا کنبہ جوڑ لیا اور ایوانِ زراعت کو بھان متی کا پٹارہ بنا دیا۔

نون صاحب کو کنبہ جوڑنے کا ڈھب بھی خوب آتا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے جوش میں آ کے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کا تذکرہ جو چھیڑا تو بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ چنگیز خاں بھی کوئی یونینسٹ قسم کا مسلمان تھا، جس کی تلوار ابھی ملک صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ کچھ عرصے کے بعد جب ملک صاحب کو پھر جوش آیا اور انہوں نے پکار کے کہہ دیا کہ اس ملک میں اسلامی نظامِ حکومت رائج ہونا چاہیے تا کہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں اور لوگوں کو ایسی عبرت ہو کہ پھر کسی کو چوری کرنے کی ہمت نہ پڑے تو اکثر لوگ یہی سمجھے کہ چنگیز خاں کے زمانے میں چور کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے اور ہلاکو خاں نے صرف اس لئے مستعصم باللہ کو قتل کرا ڈالا تھا کہ اس نے عشا کی نماز نہیں پڑھی تھی۔

---

۱۳ رمئی

سن ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک کی ستیہ گرہ شروع کی تو ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شور مچ گیا۔ "کھدر پہنو۔ نمک بناؤ" اس تحریک کا مرکز تو گجرات تھا لیکن لاہور کے کانگریسی بھی اس موقع پر پیچھے نہ رہے۔ یعنی پانی میں مٹی گھول کے نمک بنانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ نمک تو کیا بنتا، البتہ اس ترکیب سے ناقص قسم کا قلمی شورہ بن گیا۔ پولیس کے نزدیک

ثبوتِ جرم کے لئے اتنا کافی تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ جن میں کئی مشہور لیڈر بھی شامل تھے، "نمک سازی" کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ ملک فیروز خاں نون ان دنوں وزیرِ بلدیات تھے۔ یہ خبریں سنتے تھے اور ہنستے تھے کہ ان ناعاقبت اندیشوں نے نمک بنانا کتنا آسان سمجھ رکھا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ زمین میں بہت سے نمکیات بھی پائے جاتے ہیں جو مختلف قسم کے غلے اگانے میں بہت ممد ثابت ہوتے ہیں۔ ولایتی کھاد میں بھی اس قسم کے اجزا موجود ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں سردار حبیب اللہ نے جو نمکیات اور مختلف قسم کی کھادوں کے بہت بڑے ماہر ہیں، جب دیکھا کہ ایوانِ زراعت ولایتی کھاد سے محروم ہونے کے بعد بالکل خراب بن کے رہ گیا ہے تو انہوں نے نون صاحب کو ولایتی کھاد کا بدل سمجھ کے ان سے کام لینا چاہا۔ نون صاحب بھی مدت سے نہ آفس میں ہیں نہ کرسی میں، یعنی بالکل بے مصرف پڑے ہیں۔ اس لئے فوراً آمادہ ہو گئے۔

شروع شروع میں تو بڑی شورا شوری تھی۔ بڑے بڑے زمیندار ڈاڑھیوں کے لئے خضاب اور طرّوں کے لئے کلف مہیا کرنے میں مصروف تھے اور ہر طرف غل مچا ہوا تھا کہ جو کام ڈاڑھیوں سے نہ ہو سکا وہ نون نے کر دکھایا لیکن اس کا خاتمہ بھی بے نمکی پر ہوا۔ یعنی نون صاحب نے آخر کار ایوانِ زراعت کی کھاد بننے سے انکار کر دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نیم دیسی، نیم ولایتی کھاد کی مانگ ان دنوں بڑھ چلی ہے۔ کیونکہ سرحد کی وزارت کو بھی آج کل کھاد کی سخت ضرورت ہے اور حکومت اسے کنٹرول کے نرخ پر یہ جنس مہیا کرنا چاہتی ہے۔ سردار حبیب اللہ بلیک مارکٹ کرنا چاہتے تھے۔ نون صاحب نے بلیک مارکٹ کا مالِ تجارت بننا منظور نہ کیا۔

سُنا ہے کہ ملک خضر حیات خاں نے جب سنا کہ زمینداروں نے داڑھیوں کے لئے جو خضاب اور طرّوں کے لئے کلف منگوایا تھا وہ بالکل بے مصرف ہو کے رہ گیا تو گورنر کی خدمت میں

فی الحال زمینداروں کا وفد پیش ہونے کی کوئی اُمید نہیں تو انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگے، مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ نون سے یہ بھی نہیں ہو سکے گا۔ ع

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

---

۶ رمئی

سُنا ہے کہ کراچی کی سڑکیں بھی عنقریب مشرف بہ اسلام ہونے والی ہیں۔ چنانچہ کراچی کی مشہور سڑک نیپیئر روڈ کا نام سندھ کے موجودہ وزیر اعظم کے نام پر رکھا جائے گا اور ایک سڑک علامہ اقبال کے نام پر اقبال روڈ کہلائے گی۔ چودھری خلیق الزمّاں اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام بھی ایک ایک سڑک الاٹ ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں یہ خبر بھی ملی ہے کہ دو سڑکیں آغا خانی ہو جائیں گی۔ یعنی ایک سڑک آغا خان روڈ اور دوسری سڑک ان کے فرزندِ ارجمند کے نام پر پرنس علی خاں روڈ کہلائے گی۔ معلوم نہیں سر آغا خان اور ان کے صاحبزادے پرنس علی خاں کو کس استحقاق کی بنا پر سڑکیں الاٹ ہوئی ہیں۔ سر آغا خان اور پرنس علی خاں مہاجر ضرور ہیں، لیکن ان کی ہجرت کا رُخ ہمیشہ یورپ ہی کی طرف رہا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں وہ ان سڑکوں کا رُخ بھی یورپ کی طرف نہ پھیر دیں۔

ہمیں تو چودھری خلیق الزماں کی قسمت پر رشک آتا ہے۔ لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی آئے رہنے کے لئے کوٹھی مل گئی اور لیڈری کے لئے مرکزی مسلم لیگ کی صدارت۔ اب انہیں صبح و شام ٹہلنے کے لئے ایک سڑک بھی مل گئی ہے۔ مغربی پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری کو تو سڑک چھوڑ کوچہ اور کوچہ چھوڑ کوئی چھوٹا سا "دریچہ" بھی الاٹ نہیں ہوا۔

کچھ عرصہ سے پنجاب میں مےنوشی کے خلاف تحریک شروع ہے۔ چنانچہ کل لاہور میں "یومِ

امتناعِ شراب" منایا گیا اور جمعہ کی نماز کے بعد مختلف مسجدوں میں مےنوشی اور مے فروشی کے خلاف تقریریں کی گئیں۔ اس تحریک کا مقصد تو بہت نیک ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ آتشِ سیال تو برابر بکتی رہی اور برف بند ہو گئی۔ لوگ برف کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ہر طرف شور بلند تھا کہ ؎

نہ کنی چارہ لبِ خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مےِ ناب سبیل

اس موقع پر گلستانِ سعدی کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ ایک بھکاری بھیک مانگنے کسی بستی میں پہنچا۔ کتے اسے دیکھ کے لپکے۔ چاہا کہ زمین سے پتھر اٹھا کے مارے لیکن جاڑے کا موسم تھا۔ زمین یخ بستہ اور پتھر زمین سے اس طرح پیوست تھے گویا انہیں سریش سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس عالم میں زبان سے نکلا:

"عجب مردمانند کہ سگہا را بستہ و سنگ ہا را کشادہ۔"

یعنی عجب لوگ ہیں جنھوں نے کتوں کو کھول دیا ہے اور پتھروں کو باندھ رکھا ہے۔"

---

۸ مئی

سنا ہے۔ لنڈن کے ہائڈ پارک میں ایک ہندوستانی اور ایک انگریز کے درمیان کنکوے بازی کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ یہ انگریز ہندوستان میں برسوں رہا ہے اور اس نے پتنگ بازی کے شوق میں مدتوں دلی اور لکھنؤ کی خاک چھانی ہے۔ اس لئے مقابلہ بڑے زور کا ہوگا اور کوئی عجب نہیں کہ میدان انگریز ہی کے ہاتھ رہے اور بچارا ہندوستانی کنکوے بازی کے مقابلے میں پھسڈی نکلے لیکن لنڈن میں کنکوے بازی کا لطف کیا آئے گا۔ کنکوے بازی کے آداب سے واقف ہونا تو الگ رہا، لنڈن والوں کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ گڈی، پتنگ، تکل اور کنکوے میں کیا فرق ہے۔ جب "دے ڈھیل" اور "وہ کاٹا" کا شور نہ مچے، کنکوے بازی میں کیا خاک مزا آئے گا؟

دراصل کنکوّے بازی ہو یا مشاعرہ، دنگل ہو یا کبڈی، یہ سارے کھیل داد ہی سے چمکتے ہیں۔ مشاعرے میں جب تک کوئی "اے سبحان اللہ" اور "کیا خوب فرمایا ہے" کہنے والا نہ ہو، مشاعرہ کیا ہوا؟! کنکوّے بازی میں جب تک کوئی یہ نہ کہے کہ "واہ استاد جمّن! تمہارا کیا کہنا۔ سیروں ڈور پلاتے چلے جاتے ہو۔ پھر کمال یہ ہے کہ کنکوا بے قابو نہیں ہونے پاتا۔ ذرا دیکھو تو کیا تارے کاٹ رہا ہے"، اُستاد جمّن کی طبیعت کیا شگفتہ ہو گی اور وہ اپنے فن کا کمال کیا دکھائیں گے؟

پچھلے سال خبر آئی تھی کہ پاکستان کے وزیرِ خزانہ مسٹر غلام محمد کراچی میں پتنگ اڑاتے دیکھے گئے۔ ہمیں امید ہو چلی تھی کہ پاکستان کا پتنگ بازی کا فن ضرور ترقی کرے گا۔ لیکن نہ جانے کیا پیچ پڑا کہ مسٹر غلام محمد نے پھر کبھی پتنگ کو ہاتھ نہ لگایا اور کراچی والے "دے ڈھیل" اور "وہ کاٹا" کی صدائیں سننے کو ترس گئے۔ البتہ لندن ضرور پتنگ بازی کا مرکز بنتا جا رہا ہے اور سیاسی اور غیر سیاسی کنکوے باز وہیں جمع ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں پنڈت نہرو نے کامن ویلتھ کے میدان میں پتنگ بازی کا کمال دکھایا تھا۔ یوں تو "وہ کاٹا۔ وہ کاٹا" کا شور پاکستان اور ہندوستان دونوں مملکتوں میں بلند ہے، لیکن اب تک معلوم نہیں ہوا کہ کون جیتا کون ہارا۔ ڈور کس کی کٹی اور میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ان دنوں "ڈان" یا پنجاب کی زبان میں "ڈانگ" والے استاد الطاف حسین جو کراچی بیٹھ کے لاہور کے کنکوّے بازوں سے لمڈورے پیچ لڑاتے رہے ہیں، لاہور میں پتنگ بازی کے کمالات دکھا رہے ہیں اور "لاہور بلکہ پورے مغربی پنجاب" میں جتنے نامی گرامی کنکوے باز موجود ہیں، سب ان کے ساتھ ہیں۔ سُنا ہے "ایک جغادری کنکوے باز کے کنکوّے کی ڈور کٹ گئی یا کٹنے کو ہے۔ کنکوا الٹ گیا یا لُٹ جانے کو ہے"۔ "لگّے" سے ڈور کاٹ کے کنکوا اور کنکوّے کے ساتھ ڈور لوٹ لینا کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ خاص طور پر جب "لگّا" "ڈان" یا بقول شخصے "ڈانگ" کا ہو۔ بہرحال کنکوّے بازی کا فن اب لنڈن ہی میں ترقی کرے تو کرے، ہمارے ہاں سے یہ فن اٹھ گیا، اس کے قاعدے اور آداب بھی مٹ گئے۔ کہاں لمڈورے پیچ لڑانا اور کنکوے کو سیروں ڈور

پلاتے چلے جانا اور کہاں "لگے" سے کنکوے لوٹنا! سچ پوچھئے تو استاد جمّن کے ساتھ کنکوے بازی کا فن بھی ختم ہو گیا اور ہمارے پاس لے دے کے صرف "ڈانگ" کا "لگا" رہ گیا۔ اب اس سے کنکوے لٹتے دیکھئے اور مرحوم جمّن کے ملڈورے بیچوں کو یاد کیجئے۔

---

۹ رمئی

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر مسٹر لبسٹن کو بعض لوگوں نے لبستان خان کہنا شروع کر دیا ہے۔ گویا مسٹر لبسٹن خود تو عیسائی ہیں۔ لیکن ان کے نام نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اگر لبسٹن خاں، لبستان خاں ہو سکتے ہیں تو مسٹر گلیڈ سٹون آنجہانی کو بھی گلستاں خاں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر وہ بھی تو مسلمانوں کے بہت بڑے خیر خواہ تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے کہا ہے کہ ہندوستان میں اکثر بڑے بڑے افسر اور وزیر رشوت لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وزیر قسم کے لوگ جنہوں نے عمر کا ایک حصّہ جیل میں گزارا ہے، لوگوں سے جو کچھ وصول کر لیتے ہیں، اسے رشوت کہنا غلط ہے۔ دراصل یہ لوگ رشوت نہیں لیتے بلکہ حکومت کے مزے لیتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جن لوگوں نے اتنی مصیبتیں اٹھا کے حکومت حاصل کی ہے، وہ حکومت کے مزے بھی نہ لیں تو اور کیا کریں؟

کانگریس کی تحریک کے شروع میں بار لوگوں کو صرف چندے کا سہارا تھا۔ سوراج فنڈ میں ایک کروڑ روپے جمع ہوئے۔ یہ بھدر پُرش اسے بے ڈکار لئے ہضم کر گئے پھر "مندے" کا زمانہ آیا۔ یعنی چندہ بہت کم وصول ہونے لگا۔

شکر ہے کہ یہ "مندے" کا زمانہ بھی گزر گیا اور لیڈروں کے ہاں ہُن برسنے لگا۔ آپ اسے رشوت کہہ لیجئے۔ لیکن ہم اسے چندہ ہی کہیں گے۔ کیونکہ لیڈر جو کچھ وصول کرتا ہے، چندہ ہی

ہوتا ہے۔

اگر راجن بابو ان "فتوحات" کو رشوت کا نام دینے پر تُلے ہوئے ہیں تو یوں ہی سہی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ جو لیڈر چندہ ہضم کر لیتا ہے، وہ رشوت بھی ہضم کر سکتا ہے۔ اسے ہضم کرنے کے بعد ہر قسم کی غذا بڑی آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے اور ساری عمر کوئی مقوّیٔ معدہ دوا استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

---

۱۰ / مئی

گرمی کی شدت کی وجہ سے پریس کانفرنسوں کا بازار کسی قدر ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ پھر بھی ہفتے میں ایک دو پریس کانفرنسیں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اب کے جمعہ کو میاں بشیر احمد صاحب جو پاکستان کی طرف سے ترکی میں سفیر مقرر ہوئے ہیں، ایک دھوم دھام والی پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے علاوہ بھی اس ہفتے ایک آدھ پریس کانفرنس ضرور ہو گی۔

دراصل بہت سے لوگ تو اس لئے پریس کانفرنس نہیں کرتے کہ انہیں پریس کانفرنس کرنے کا طریقہ نہیں آتا اور کانفرنس کرنے کا طریقہ آ جائے تو آ جائے، اس کی ترکیب استعمال ذرا مشکل ہی سے آتی ہے جو ہمت والے کسی اخبار کے دفتر میں پہنچ گئے۔ ایڈیٹر یا رپورٹر سے مل کے پریس کانفرنس کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا۔ انہوں نے تو پریس کانفرنس کر لی۔ لیکن جن لوگوں کو اتنی بھی توفیق نہیں، اُن کی تو شاید ساری عمر اسی ہوس میں گزر جائے اور پریس کانفرنس کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ہمارے خیال میں اگر کوئی صاحب پریس کانفرنس کرنے کا مکمل طریقہ پرچۂ ترکیب استعمال سمیت اخباروں میں چھاپ دیں تو بہت سے لوگوں کو جو صرف پریس کانفرنس کے اجزائے نسخہ

سے بے خبر ہونے کے باعث اب تک پریس کانفرنس نہیں کر سکے، اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ واضح رہے کہ پریس کانفرنس کی کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کی پریس کانفرنس کا نرخ الگ الگ ہے۔ مثلاً اگر آپ مال روڈ کے کسی ریسٹوران یا ہوٹل میں پریس کانفرنس کرنا چاہیں تو اس پر خاصی رقم اٹھ جائے گی۔ لیکن اگر میکلوڈ روڈ کے کسی ریسٹوران میں انتظام کیا جائے تو بہت تھوڑے پیسوں میں کام چل جائے گا۔

ہماری رائے میں ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کو پریس کانفرنسوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے بلکہ یوں کہئے کہ اپنے "فیو" میں پریس کانفرنس بھی شامل کر لینی چاہئے۔ اگر بعض ریسٹوران والے اعلان کر دیں کہ ہمارے ہاں "ریڈی میڈ پریس کانفرنس" بھی واجبی نرخوں پر مہیا کی جاتی ہے تو کسی کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ پریس کانفرنس کرانے کے لئے اخبار نویسوں کی منتیں کرتا پھرے۔ بس ریستوران والے سے معاملہ طے کر لیا اور بجنت ہو کے بیٹھ رہے۔ اب چائے بسکٹ کے ساتھ ساتھ اخبار نویس مہیا کرنا بھی اس کا کام ہے اور معاملہ طے کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ بس سولہ اخبار نویسوں کی پریس کانفرنس کا آرڈر دے دیا اور وقت مقررہ پر بن ٹھن کے کانفرنس میں پہنچ گئے۔

اگر ہوٹلوں اور ریستورانوں والے اس قسم کی ریڈی میڈ پریس کانفرنسوں کی مانگ بہت بڑھے گی اور ہوٹلوں کا کاروبار بڑا ترقی کرے گا بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں کو صرف پریس کانفرنس کا بندوبست کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ کانفرنس کی "ترکیبِ استعمال" گاہک کے ذہن نشین کر دینی چاہئے، کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ پریس کانفرنس کا بندوبست تو کر لیتے ہیں لیکن ترکیبِ استعمال کے معاملے میں پھسڈی رہ جاتے ہیں یعنی جب یہ بتانے کا موقع آتا ہے کہ آخر یہ قصہ کیا ہے اور اخبار نویسوں کو کس تقریب میں چائے پلائی گئی ہے تو آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ پریس کانفرنس صحیح معنوں میں "ریڈی میڈ" جبھی کہلا سکتی ہے کہ یہ کام بھی ہوٹل والے اپنے ذمے لے لیں۔

۱۱ مئی

کل راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ اخبار نویسوں کو طبع آزمائی کے لئے موضوع نہیں ملتا اس لئے سپڑ یا چڑ ونٹے کی کہانی بھی ہاتھ آجائے تو اسے غنیمت سمجھتے ہیں اور نمک مرچ لگا کے اچھی خاصی "داستانِ پاستان" بنا دیتے ہیں اور ترقی پسندوں کا جلسہ اور مصلے کی چوری تو اچھے خاصے موضوع ہیں۔ اُن پر کوئی صاحب مقالۂ افتتاحیہ لکھ ماریں تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ آج ایک اخبار نویس بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے، تم سچ کہتے ہو، واقعی موضوع نہیں ملتا اور تم جانتے ہو۔ موضوع ملے نہ ملے کسی نہ کسی طرح کالم بھرنا ہی پڑتا ہے۔

دولتانہ اور ممدوٹ کی لڑائی، الاٹ منٹوں کا جھمیلہ، وزارتی اور صدارتی دنگل تو ابھی کل کی باتیں ہیں، اس سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جس کے سامنے یہ چھوٹے موٹے جھگڑے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اتحادِ ملت اور احرار کی جنگ کا زمانہ تو آپ کو یاد ہوگا۔ اخبار نویس قلم کا لٹھ سنبھالتا تھا تو اُسے بس معلوم ہوتا تھا کہ ؎

باندھے ہوئے ہاتھوں کو بایں اجابت
رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے

اخبار سے اخبار، ایڈیٹر سے ایڈیٹر، مقالہ سے مقالہ، نوٹ سے نوٹ، نظم سے نظم، پیرے سے پیرا، سطر سے سطر لڑتی تھی اور ایک اخبار نویسوں پر کیا موقوف ہے، ہر کوچہ و بازار میں ہنگامۂ کارزار گرم تھا۔

دکاندار آمنے سامنے اپنی اپنی دکانوں پر بیٹھے ہیں لیکن آپس میں برابر تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ ایک احراری لیڈروں کو صلواتیں سنا رہا ہے، دوسرا اتحادِ ملت کو آڑے ہاتھوں لے رہا ہے۔ بزاز نے گز اٹھایا۔ بقال نے پنسیری دکھائی۔ اتنے میں لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ ورنہ گز اور پنسیری میں جنگ ہو جاتی۔ لٹھا اور آٹا لڑ پڑتے، بوسکی اور چاول، گڑ اور کھدر، چینی اور وزین میں لڑائی ٹھنتی

ہو جاتی۔ پھر بھی دور دور سے برابر چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ یعنی زندہ باد کا جواب کبھی "مردہ باد" اور کبھی صرف "ہائے ہائے" سے دیا جاتا تھا۔

سچ مچ کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے۔ اس جھگڑے نے باپ بیٹے، بھائی بھائی، شوہر اور بیوی میں کھنڈت ڈال رکھی تھی۔ باپ احرار کا حامی، بیٹا اتحادِ ملت کا پرستار۔ بحث کرتے وقت نہ باپ کو بیٹے کی نوجوانی کا خیال آتا تھا نہ بیٹے کو باپ کی بزرگی" اعلائے کلمۃ الحق" سے روکتی تھی۔ کبھی کبھی جب بحث طول کھینچتی تھی اور دونوں بیک وقت چلانے لگتے تھے، نابکار! نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں نے تمہیں عاق کیا۔ دیکھئے ابّا! میں اب تک آپ کا لحاظ کرتا رہا۔ اب آپ نے مولانا . . . کی شان میں گستاخی کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ہائے مار ڈالا۔ اچھائیوں ہی بھی۔ دو ایک اور عورتیں چیختی تھیں۔ محلے والے بیٹے کو آ کے چھڑاتے تھے۔ بیوی دال پکاتی پکاتی کفگیر ہاتھ میں لئے شوہر پہ لپکتی تھی کہ ان مولوی صاحب کو جن کا وعظ ہم نے پار سال سنا تھا، تم نے بُرا کیوں کہا؟ بھائی بھائی سے بگڑا ہوا تھا کہ ارے تو احراری ہو گیا۔ عیسائی ہو جاتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ لیڈر لوگ یہ دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے تھے کہ قوم میں بیداری پیدا ہو چلی ہے۔ بیٹا باپ کی داڑھی نوچنے پہ تیار نظر آتا ہے۔ تحقیق یہی لوگ جنت میں جائیں گے۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ موضوع کی برکت سے اخبار بھی خوب بکتے تھے۔ لوگ دنگے فساد کی خبر سنتے تھے تو اخباروں پہ ٹوٹ پڑتے تھے۔ دونوں طرف کے اخبار بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے بلکہ ان کے خاص خاص مضامین تو زبانی یاد کر لئے جاتے تھے کہ شاید ان سے کام لینے کا کوئی موقع پڑ جائے۔ جب کوئی بحث چھڑتی تھی تو پہلے "اخباری قسم" کی دلیلیں دی جاتی تھیں، پھر "غیر اخباری" دلائل یعنی گھونسوں مکّوں تک نوبت پہنچتی تھی اور اخباروں کے بے رونق کالم اس تذکرے سے یکبارگی چمک اٹھتے تھے۔

---

۱۵ رمئی

سیّد احمد شاہ بخاری نے جو ان دنوں میکسیکو میں ہیں۔ خواجہ شہاب الدین کے نام ایک دلچسپ خط لکھا ہے جو بعض اخباروں میں چھپ گیا ہے۔ بخاری صاحب اس خط میں فرماتے ہیں کہ میکسیکو میں اکثر سڑکوں اور بازاروں کے نام بڑے بڑے اولوالعزم محبِّ وطن لوگوں کے ناموں پر رکھے جاتے ہیں۔ لاہور کی طرح یہ حال نہیں کہ جو شخص دو تین برس میونسپل کمشنر رہا، کسی کوچہ یا بازار کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔

لیکن لاہور لاہور رہے اور میکسیکو میکسیکو۔ ہمارے ہاں تو یہی طریقہ رائج ہے کہ جو شخص میونسپل کمشنر مقرر ہوا، کوئی سڑک یا گلی اس کے حوالے کر دی گئی۔ اب یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ چاہے سڑک کو سڑک رہنے دے یا گلی بنا دے، چاہے اوڑھے چاہے بچھائے اور چاہے گھر ڈال لے۔ کراچی والوں نے بہت بڑا تیر مارا تو میونسپل کمشنروں کے بجائے مرکزی حکومت کے وزیروں اور لیگ کے کارکنوں کو سڑکیں عطا کرنی شروع کر دیں۔ چنانچہ سنتے ہیں کہ اس قصے میں چودھری خلیق الزماں کو بھی ایک سڑک ہاتھ آگئی ہے۔ آخر لاہور لاہور ہے کراچی کراچی اور میکسیکو میکسیکو۔ اگر خدانخواستہ ہم بھی میکسیکو کی پیروی کرتے تو خواجہ دل محمد مصلے کی جگہ بغل میں سڑک دبائے کیوں نظر آتے۔

پرانے زمانے کے بادشاہ جب اپنے کسی درباری پر خوش ہو جاتے تھے تو اس کے منصب میں اضافہ کرتے۔ اسے فیروز جنگ، اعتماد الدولہ، خان خاناں، خانِ اعظم، خانِ دوراں وغیرہ کی قسم کے خطاب مرحمت فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ خلعت عطا کرتے تھے۔ اب خلعت کی جگہ سڑک ملتی ہے۔ خطاب کی طرح نام میں روڈ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً چودھری خلیق الزماں پہلے نرے خلیق الزماں تھے۔ اب خلیق الزماں روڈ بن جائیں گے گویا روڈ خطاب کا خطاب ہے، منصب کا منصب اور خلعت کا خلعت۔ اور بعض سڑکیں تو ایسی ہیں کہ مخمل کے سینکڑوں تھان بچھ سکتے ہیں۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو ایک سڑک بیسیوں خلعتوں پہ بھاری

نظر آتی ہے۔

جن لوگوں کو ان کی خدمات کے صلے میں سڑک مرحمت کی جائے، انہیں منصب دار کی بجائے "سڑک دار" یا "کوچہ دار" کہنا چاہیئے۔ پرانے زمانے میں ہفت ہزاری، پنج ہزاری، سہ ہزاری منصب ہوا کرتے تھے۔ اب سڑکوں کی لمبائی کے حساب سے منصب مقرر ہونے چاہئیں۔ مثلاً بعض منصب دار جن کی سڑک صرف دو میل لمبی ہو "دو میلی کوچہ دار" کہلائیں۔ بعض "سہ میلی" بعض "پنج میلی"۔ معلوم نہیں منصب کب عطا ہوں، لیکن سڑکوں کو ناپنے کا کام ابھی سے شروع ہو جانا چاہیئے۔

بخاری صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ مکسیکو کے بعض بازار اہم تاریخوں کے نام پر مشہور ہیں۔ مثلاً ۵ مئی کو مکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ اس لئے ایک بازار ۵ مئی کہلاتا ہے۔

یہ طریقہ اچھا ہے اور ہمارے ہاں اسے بڑی آسانی سے رائج کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی بازار کا نام ۳ جون رکھ دیجئے، کسی کا نام ۱۵ اگست۔ اور انارکلی کا نام تو ۱۵ اگست خاص طور پہ بہت موزوں ہو گا کیونکہ اس بازار کا حلیہ بدلنے میں ۱۵ اگست کا بڑا حصہ ہے۔ لکشمی بلڈنگ کے سامنے جو تراہا ہے، کرسیوں کی لڑائی کے یادگار کے طور پر اس کا نام بھی کچھ اسی قسم کا رکھا تھا ۔۔۔ افسوس کہ کرسیوں کی لڑائی کی تاریخ ذہن سے اتر گئی۔

بخاری صاحب نے آگے چل کے لکھا ہے کہ مکسیکو کے ایک بازار کا نام ۱۲۳ ہے، کیونکہ مکسیکو کے آئین کی دفعہ ۱۲۳ مزدوروں کے حقوق سے متعلق ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کا آئین ابھی بنا نہیں لیکن تعزیرات، ضابطہ فوجداری اور آئین حکومتِ ہند سے مدد لی جا سکتی ہے۔ بلکہ ایک کوچے کا نام ۴۲۰ رکھ دیجئے۔ دوسرے کا ۱۰۸، تیسرے کا ۱۴۴۔ اور مال روڈ کا جو حصہ گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے ہے، اس کا نام ۹۲۔ الف بھی ہو سکتا ہے۔

---

۱۸ مئی

کچھ دنوں سے اخباروں میں اس قسم کی خبریں چھپ رہی ہیں کہ ریاستوں کے جدید انتظام کی وجہ سے ہندوستان کے والیانِ ریاست اور ان کے خاندان کے لوگ بالکل "بے روزگار" ہو کے رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ان دنوں حکومتِ ہند ان لوگوں کے لئے روزگار مہیا کرنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔

جو والیانِ ریاست "راج پرمکھ" مقرر ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے تو روزگار مہیا کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن میں سے بعض کو چالیس پچاس لاکھ اور بعض کو بیس تیس لاکھ روپے سالانہ تنخواہ ملتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ آمدنی کچھ ایسی زیادہ تو نہیں کہ فراغت سے زندگی گزاری جا سکے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح بسر اوقات ہوتی چلی جاتی ہے۔ البتہ ان لوگوں کا حال پتلا ہے جو کسی یونین کے راج پرمکھ نہیں۔ اس لئے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان لوگوں کو وظیفے ضرور مل رہے ہیں۔ کسی کے لئے دس لاکھ کسی کے لئے پانچ لاکھ اور کسی کے لئے ڈھائی تین لاکھ مقرر ہوا ہے اور بعض کو تو اس سے بھی کم پر ٹرخا دیا گیا ہے لیکن اس گرانی کے زمانے میں پانچ لاکھ روپلی سے کیا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض والیانِ ریاست کو خرچ گھٹانا پڑا ہے۔ جہاں فیل خانہ میں تیس ہاتھی تھے وہاں دس رہ گئے ہیں۔ جہاد توں اور چیتوں کی تعداد بھی اسی تناسب سے کم کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں تو فیل خانہ ہی معرضِ تخفیف میں آ گیا ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کے جو متوسلین بیکار ہو کے رہ گئے ہیں مسٹر پٹیل نے انہیں روزگار مہیا کرنے کی جانب بالکل توجہ نہیں کی۔ البتہ وہ بے روزگار والیانِ ریاست اور ان کے کنبہ کے لوگوں کے لئے روزگار مہیا کرنے کی تدبیروں میں ضرور مصروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں

سے بعض کو سفارت خانوں میں اٹاشی، بعض کو سکتر، بعض کو قونصل اور بعض کو سفیر بنا کے باہر بھیج دیا جائے گا۔ پھر بھی ان لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ کوئی عجب نہیں کہ یہ لوگ مل کے ٹریڈ یونین کے قاعدے کے مطابق اپنی علیحدہ یونین بنالیں اور جلسے کرنے اور جلوس نکالنے شروع کر دیں۔ پہلے ہی شرنارتھیوں اور مزدوروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے، ان راجوں اور مہاراجوں نے بھی جلوس نکالنے شروع کر دیئے تو ہندوستان کی حکومت کیا کرے گی۔ ان کے جلوسوں پر گولی چلانا تو الگ رہا، لاٹھی چارج کرنا مشکل ہے۔ جب وہ چلا چلا کے کہیں گے کہ "پانچ لاکھ روپلی، میں ہمارا گزارہ نہیں ہوتا تو ممکن ہے کہ مسٹر پٹیل صرف تماشائی بنے رہنے کے بجائے خود بھی جلوس میں شامل ہو جائیں۔

شملہ کی پہاڑی ریاستوں میں جو اب ہماچل پردیش یونین میں شامل کر لی گئی ہے، بعض ریاستیں ایسی بھی ہیں جن کی آمدنی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن برطانوی عہد میں ان والیانِ ریاست کو بڑے بڑے راجاؤں جیسے حقوق حاصل تھے۔ مثلاً رتیش کے ٹھاکر صاحب کی سالانہ آمدنی سوا چھ سو روپے تھی۔ یعنی ریاست کے خزانے سے وہ کوئی پچاس روپے ماہانہ وصول کر لیتے تھے۔ بعض ٹھاکر اور رانا رتیش کے ٹھاکر سے بھی چھوٹے تھے۔ لیکن طاقت اور اختیار کا نشہ بری چیز ہے۔ یہ ٹھاکر راجہ اور رانا اسی میں مگن تھے۔ معلوم نہیں اختیارات سلب ہو جانے کے بعد ان پر کیا گزری۔ دس پانچ لاکھ روپے سالانہ وصول کرنے والے راجہ مہاراجہ کوئی یونین بنائیں یا نہ بنائیں، شملہ کے ان ٹھاکروں اور راناؤں کو مزدور یونین کے طرز پر کوئی ٹھاکر اور رانا یونین ضرور بنانی پڑے گی۔

---

۱۲ رمئی

نوکر نے آقا سے کہا "دیکھئے صاحب میری تنخواہ بڑھا دیجئے۔ ورنہ" آقا نے آنکھیں نکال کر کہا "ورنہ کیا ؟" نوکر بولا "حضور! ورنہ اسی تنخواہ پر کام کرتا رہوں گا!" حال ہی میں شیخ عبداللہ کو بھی اس سے ملتا جلتا حادثہ پیش آیا ہے۔ یعنی انہوں نے بھی "پرانی تنخواہ" ہی پر

کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا "لندن آبزرور" کے نامہ نگار سے شیخ صاحب نے کہا تھا کہ کشمیر کو ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کے بجائے خود مختار رہنا چاہئے۔ اس پر ڈانٹ پڑی۔ شیخ عبداللہ دوڑے دوڑے دلی پہنچے۔ پنڈت نہرو سے کچھ کھسر پھسر ہوئی اور ایک تازہ بیان شائع ہو گیا کہ کشمیر کی خود مختاری کا خیال تو بڑا دلکش ہے لیکن ہندوستان کے ساتھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ گویا شیخ صاحب نے خود مختاری کا صرف خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو پنڈت نہرو کے حضور میں پایا ع

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

---

۲۸ مئی

سُنا ہے۔ ان دنوں یونیورسٹی کے نصاب میں بڑی اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مثلاً ایم اے اردو کے نصاب میں مومن کا کلام شامل تھا۔ اسے نکال کے "صد پارۂ دل" کو جو خواجہ دل محمد کی رباعیات کا مجموعہ ہے، اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔

خواجہ دل محمد جو ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ مدتوں اسلامیہ کالج میں ریاضی پڑھاتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل بھی ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بھاری پتھر اُن سے اُٹھ نہ سکا۔ اس لئے چوم کے چھوڑ دیا۔ مرحوم لاہور میونسپلٹی سے بھی اُنہیں برسوں تعلق رہا ہے۔ چنانچہ لاہور کی ایک مشہور سڑک یعنی دل محمد روڈ اسی تعلق کی یادگار ہے۔ اب وہ کارپوریشن کے کونسلر ہیں۔ یونیورسٹی میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں اور فراغت اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر خواجہ دل محمد کا کلام ساتویں یا آٹھویں درجہ کے نصاب میں شامل کر لیا جائے تو مضائقہ نہیں ان کی بعض نظمیں اب بھی مڈل اور انٹرنس کے نصاب میں موجود ہیں اور اگر "صد پارۂ دل" کی چند رباعیاں بھی ان میں شامل کر دی جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایم۔ اے اُردو کے نصاب سے مومن کا کلام نکال کے خواجہ دل محمد کا کلام شامل کر دینا تو نری دھاندلی ہے۔ ہمیں تو اُردو کے پرانے نثر نگاروں اور شاعروں میں ایک کی خوبی بھی نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالوحید کل کلاں کوئی کتاب لکھ ماریں اور اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی یا آبِ حیات کی جگہ اسے نصاب میں شامل کر لیا جائے۔ یا علامہ علاؤ الدین صدیقی شعر کہنا شروع کر دیں اور میرؔ و غالبؔ کے کلام کی جگہ اُن کے کلامِ معجز نظام کو ان کی بارگاہ سے سندِ قبول عطا کر دی جائے۔

مومنؔ کے کلام پر خواجہ دل محمد کے کلام کو ترجیح دینے کی صرف ایک وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ معاملہ ایم۔ اے اُردو کے نصاب کا ہے اور وہ بچارا ایم۔ اے چھوڑ مڈل فیل بھی نہیں تھا۔ اس لیے کلامِ مومن کی جگہ ایک ایسے شاعر کا کلام داخلِ نصاب کر لیا گیا ہے جو نرا شاعر ہی نہیں بلکہ ایم اے بھی ہے۔ اگر ہمارا قیاس صحیح ہے۔ یعنی "کلامِ خواجہ" کو "کلامِ مومن" پر اسی لیے ترجیح دی گئی ہے، تو میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، سرسیدؔ، شبلیؔ، حالیؔ وغیرہ سب پر بالآخر یہی ماجرا گذرے گا۔ اور ایم۔ اے کے طلبہ کو مجبوراً ایسے لوگوں کے مضامینِ نظم و نثر پڑھنے پڑیں گے جو شاعر اور ادیب تو نہیں، البتہ ایم۔ اے ضرور ہیں۔

خواجہ دل محمد کے کلام کو کلامِ مومن پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مومن نجومی تھا اور خواجہ صاحب ریاضی کے ماہر ہیں اور نجوم پر ریاضی کی ترجیح مسلّم ہے اور ریاضی سے خواجہ صاحب کو جو شغف ہے، وہ اسی بات سے ثابت ہے کہ انہوں نے کتاب کا نام "صد پارۂ دل" رکھا ہے جو بجائے خود کسورِ اعشاریہ کا سوال معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال آپ خواجہ صاحب کو پنجاب کا "شاعرِ اعظم" مانیں یا نہ مانیں، وہ "حادِ اعظم" ضرور ہیں اور اب تو یونیورسٹی نے انہیں شاعرِ اعظم بھی تسلیم کر لیا ہے۔

یونیورسٹی نے خواجہ صاحب کے کلام کو ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کر کے ان کی شاعرانہ حیثیت تو تسلیم کر لی۔ اب دیکھیں، میراں بخش جلوہ مرحوم، اللہ یار جوگیؔ اور خان احمد حسین خان کی قدر شناسی کا کوئی موقع بھی ہاتھ آتا ہے یا نہیں اور خان احمد حسین خاں نرے شاعر ہی نہیں نثر نگار بھی ہیں اور ایک زمانے میں تو پنجاب کے "سر والٹر سکاٹ" سمجھے جاتے تھے۔

---

۲۹ مئی

خواجہ دل محمد صاحب کا ارشاد ہے کہ ان کی کتاب "صد پارۂ دل" ابھی ایم۔ اے اردو کے نصاب میں تو شامل نہیں ہوئی، البتہ ادیب عالم کے نصاب میں اسے ضرور شامل کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ خواجہ صاحب کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، تاہم ہم نے جن راویوں پر اعتماد کر کے لکھا تھا کہ "صد پارۂ دل" ایم۔ اے کے اُردو کے نصاب میں داخل کر لی گئی ہے وہ سب کے سب بھی ثقات کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ؏

روایت ارچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند

تاہم خواجہ صاحب کو اس معاملے میں مطمئن رہنا چاہئے۔ اُن کی کتاب ابھی ایم۔ اے اردو کے نصاب میں شامل نہیں ہوئی تو چند دنوں میں شامل کر لی جائے گی۔ بہر حال ان دنوں ایم۔ اے اُردو کے نصاب کے سلسلے میں "صد پارۂ دل" کا نام بعض لوگوں کی زبان پر بار بار آ رہا ہے اور یہ حضرات کوئی ادنےٰ درجے کے شاعر نہیں بلکہ بڑے بڑے اہلِ علم بزرگوار ہیں اور جہاں تک یونیورسٹی کے معاملات خصوصاً نصاب تعلیم کا تعلق ہے، یہ حضرات بلا مبالغہ ؏

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہند

ایک مرتبہ یونیورسٹی میں نصابِ تعلیم پر گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ کا معاملہ سامنے آیا۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ تذکرہ کو ایم۔ اے اُردو کے نصاب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن بہت سے لوگ صرف اس لئے اس تجویز کے مخالف تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد

ہمیشہ کانگریس سے وابستہ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب اُٹھے اور کہنے لگے "میں اب تذکرہ کی ادبی حیثیت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کرنے پر اتنا زور کیوں دیا جارہا ہے۔ آخر اس میں چینی۔ چائے کے تذکرے کے سوا اور کیا رکھا ہے۔" لوگوں نے کہا، صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ جس کتاب کو تذکرہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کا مجموعہ ہے اور اس کا نام "غبارِ خاطر" ہے۔ بس اسی ایک واقعہ سے اندازہ کر لیجئے کہ نصابِ تعلیم تجویز کرنے کا کام کن لوگوں کے سپرد ہے۔

۱۱ر جون

ایڈیٹر انگریزی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن کا کوئی صحیح ترجمہ نہ ہو سکا۔ بعض لوگ "ایڈیٹر" کے بجائے "مدیر" لکھتے ہیں اور یہ لفظ ایک حد تک چل بھی گیا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ مدیر ایڈیٹر کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ کیونکہ مصر اور عراق وغیرہ ممالک میں ہر ادارہ کے افسر کو مدیر کہتے ہیں۔ اب آپ چاہیں تو اخبار کے انچارج کو بھی مدیر اخبار کہہ لیجئے۔ لیکن یہ نرا تکلف ہے۔

ایک محترم صاحب نے اپنے آپ کو "محرر" کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن محرر تو چونگی کا بھی ہوتا ہے ہر تھانہ دار کی ماتحتی میں ایک چھوٹے کئی "محرر" موجود ہیں۔ چنانچہ جب ان سے بار بار کہا گیا کہ حضرت! آپ ایڈیٹر سے "محرر" کیوں بن گئے تو انھوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ "محرر" لکھنا ترک کر دیا۔ ایک اور بزرگوار "رئیس التحریر" کہلاتے ہیں، کیونکہ اس نام میں اخبار نویسی کی تمکنت کے ساتھ ساتھ ریاست کا طنطنہ بھی موجود ہے۔ لیکن نہ اخبار نویسوں نے انہیں مُنہ لگایا نہ رئیسوں نے انہیں اپنا ہمسر سمجھا۔ پھر بھی بیچارے وضعداری نبھائے چلے جاتے ہیں اور اسی میں خوش ہیں۔

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ایک زمانے میں ایڈیٹر کے بجائے اپنے نام کے ساتھ "مدیر و سردبیر" لکھا کرتے تھے لیکن تخلص کی طرح یہ "مدیر و سردبیر" بھی انہیں راس نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے

تخلّص کے ساتھ ساتھ "مدیر و سرو بر" کہلانے سے بھی ہاتھ اٹھایا۔ چنانچہ وہ نرے "مدیر اعلیٰ" ہیں، جو بجائے خود بہت پُرشکوہ سہی، لیکن مدیر و سرو بر کو نہیں پہنچتا۔

جن اخباروں کے ایک سے زیادہ ایڈیٹروں کا نام اخبار کی پیشانی پر چھپتا ہے۔ انہوں نے "ادارۂ تحریر" کے دامن میں پناہ لی ہے۔ یعنی وہ مدیر بھی ہیں، محرّر بھی، لیکن ایسے محرّر نہیں، جن پر چونگی کے محرّر کا شبہ ہو سکے۔

مولانا سیماب اکبر آبادی مدت تک آگرہ سے "پیمانہ" اور "شاعر" وغیرہ رسالے نکالتے رہے ہیں، مولانا چاہتے تو اپنے آپ کو "پرچم" کا ایڈیٹر یا مدیر یا رئیس التحریر کہہ سکتے تھے لیکن اس موقع پر بھی انہوں نے شاعرانہ رعایت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ وہ "پرچم" کی مناسبت سے ایڈیٹر یا مدیر کے بجائے "ناصب" کہلاتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ مولانا سیماب کے شاگرد جو اب تک "سیمابی" کہلاتے چلے آئے ہیں، کہیں عقیدت مندی کے جوش میں "ناصبی" کہلانا نہ شروع کر دیں۔

اس پر ہمیں خیال آیا کہ اگر پرچم کے ایڈیٹر کا نام ناصب ہے تو رسالہ دولت کے ایڈیٹر کا نام "غالب" یا کم از کم "محاسب" تو ضرور ہونا چاہئے اور سچ پوچھئے تو جب ہم مولانا سیماب کی اس اُپج پر غور کرتے ہیں تو ہمیں بعض رسالے دوسرے رسالوں کے ایڈیٹر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "ساقی" کا نام سُن کے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی رسالے کا نام نہیں بلکہ رسالہ "پیمانہ" کے ایڈیٹر کا نام ہے۔

---

۱۲ جون

کل کی اشاعت میں مولینا سیماب اکبر آبادی اور رسالہ "پرچم" کا ذکر آیا تھا۔ اس سلسلے میں مولینا سیماب لکھتے ہیں:۔

"معزز جریدہ امروز میں مجھے جس حیثیت سے بھی یاد فرمایا گیا میں اس کا گلہ مند نہیں ممنون ہوں ــــ "ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے" ــــ لیکن فاضل

مدیر "حرف و حکایت" کو لفظ ناصب کے متعلق جو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا ازالہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ پرچم کے سر صفحہ پر "ناصب" مدیر یا ایڈیٹر کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا، "ناصب" کے لغوی معنی ہیں نصب کرنے والا، موسس جسے انگریزی زبان میں فونڈر کہتے ہیں۔ "پرچم" کی بنیاد چونکہ میرے ہاتھ سے رکھی گئی تھی، اس لئے میرے نام کے ساتھ "ناصب" لکھ دیا گیا۔ "ناصب" کے نیچے لفظ "مدیر" بھی جلی حروف سے لکھا ہوا ہے اور اس کے بعد مدیر پرچم کا نام بھی۔ مگر فاضل مدیر "حرف و حکایت" کی نگاہ چونکہ بلند ہے، اس لئے وہ ذرا نیچے نہ دیکھ سکی، ورنہ یہ غلط فہمی کبھی پیدا نہ ہوتی۔"

ہم مولانا سیماب کی کرم فرمائی کے شکر گذار ہیں، تاہم ان کی اس توجیہہ کے بعد بھی بات جہاں تھی وہیں رہی۔ وہ ایڈیٹر نہ سہی موسس ہی سہی، لیکن اگر "پرچم" کا موسس "ناصب" ہے تو رسالہ دولت کا موسس "غاصب" یا کم از کم "مواصب" ضرور ٹھہرا، اخبار "احسان" کے موسس کو "محسن" کہئے، رسالہ "ساقی" کو رسالہ "پیمانہ" کا موسس فرض کر لیجئے اور اس قصے میں سب سے بڑا اندیشہ تو یہ ہے کہ کہیں مولینا سیماب کے شاگرد جن کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی ہے "سیمابی" کی بجائے "ناصبی" نہ کہلانا شروع کر دیں۔

---

۱۳ ر جون

ہم لاہور سے نہیں کراچی سے بول رہے ہیں۔ کراچی سے جہاں ہوا بندر ہے، منوڑہ ہے منگا پیر ہے، صاف ستھری سڑکیں ہیں، عالیشان عمارتیں ہیں، عمارتوں کے سائے میں گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ہیں پیکارڈ کاریں ہیں، گدھا گاڑیاں ہیں، میٹھے پانی کے علاقے ہیں، یہاں جناح باغ نہیں، شالامار نہیں، جہانگیر کا مقبرہ نہیں، قلعہ نہیں، موچی دروازہ نہیں، گھوڑے شاہ کا تکیہ نہیں، ستھروں کی باؤلی نہیں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں نہیں، تنگ گلیاں نہیں، جن سے گزرتے وقت ہوا کا دم گھٹتا ہے۔ پرانی طرز کی حویلیاں نہیں، جن کی دیواروں پر کائی جمی ہوئی ہے۔ جوہڑ اور

تالاب نہیں، جن میں نمرود کے وقت سے مچھر پرورش پاتے چلے آتے ہیں۔

کراچی بہت بڑا تجارتی مرکز ہے، لاہور کے تاجر یہیں سے مال تجارت لے جاتے ہیں پھر بھی کراچی کی تین سب سے بڑی صنعتیں یعنی مشاعرے قوالی کی محفلیں اور پہلوانوں کے دنگل لاہور ہی کے سہارے چل رہی ہیں۔ کراچی مشاعرہ کرانا چاہتا ہے تو لاہور کو آرڈر دے دیا جاتا ہے کہ پانچ اعلیٰ درجے کے، دو درمیانے درجے کے اور تین ذرا گھٹیا قسم کے شاعر بھیج دو، اور لاہور فوراً دس شاعر بھیج دیتا ہے۔ کراچی سے آرڈر جاتا ہے کہ پانچ قوالوں کی ضرورت ہے اور لاہور فوراً پانچ قوال بلکہ ان کے ساتھ ایک آدھ شاعر بھی نتھی کر کے بھیج دیتا ہے۔ کراچی کہتا ہے کہ اس مہینے دنگل نہ ہوا تو وقت بڑی بے لطفی سے کٹے گا اور لاہور سے پہلوانوں کی ایک پوری کھیپ بھیج دی جاتی ہے۔ لاہور میں خام اجناس کی فراوانی ہے، یعنی وہاں شاعر ہیں، پہلوان ہیں، قوال ہیں، یہ خام اجناس کراچی کے کارخانوں میں ڈھل کے مشاعروں، دنگلوں اور قوالی کی محفلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ لاہور میں "ہج موڑتوں" کی صدائیں تو روز سننے میں آتی ہیں، لیکن "مطلع عرض کیا ہے" اور "ارے ہاں جی" کا لطف اٹھانے کے لئے کراچی کا رُخ کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

مشاعرے قوالی کی محفلیں اور دنگل لاہور میں بھی ہیں، لیکن وہاں ان کی حیثیت محض گھریلو دستکاری کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ گھریلو دستکاری تو گھر کی مرغی دال برابر کی قسم کی چیز ہے لاہور اور کراچی کے مشاعروں اور دنگلوں میں وہی فرق ہے جو ہاتھ کے بنے ہوئے کھدر اور مشین کے بنے ہوئے لٹھے میں۔ وہاں قوالی ہے، قوال ہیں، لیکن ایسی قوالی کہاں جسے سررشتۂ تعلیم نے بھی منظور کر لیا ہو۔ مشاعرے ضرور ہیں لیکن لاہور کو ایسے مشاعرے کہاں نصیب ہیں، جن میں پانچ پانچ سو شاعر اپنا کلام سنائیں اور لوگ حصولِ ثواب کی نیت سے برابر سنتے چلے جائیں۔

ہم کراچی سے بول رہے ہیں، لیکن ہم قوالی سننے، دنگل دیکھنے یا حصولِ ثواب کی نیت سے کسی مشاعرے میں شریک ہونے کراچی نہیں آئے۔ ہم نے بزازی کا سامان بھی نہیں خریدا، نہ خریدنے کا ارادہ ہے، کیونکہ ہمیں بزازی کی کوئی دکان الاٹ نہیں ہوئی اور یہ بات بھی نہیں کہ ہم سیر کرنے آئے ہیں اور اب اکسپورٹ امپورٹ کا پرمٹ حاصل کرکے کراچی میں ڈیرے ڈال دینا چاہتے ہیں۔ ہم اخبار نویس ہیں، بزازی کی دکان، اکسپورٹ امپورٹ کے قصے سے ہمیں کیا واسطہ، اور نہ تو او رہمارا ارادہ یہ بھی تو نہیں کہ لگے ہاتھوں کسی نئے یا پرانے وزیر کی سفارش ہی کرتے جائیں، یا محض اس خیال سے ہم نے کراچی کے سفر کی زحمت اٹھائی ہو۔ ہم تو اخبار نکالنے آئے ہیں، اور آپ مانیں یا نہ مانیں، ہم تو سمجھتے ہیں کہ اخبار نکالنا بزازی کا سامان خریدنے یا پرمٹ حاصل کرنے سے زیادہ اچھا کام ہے بلکہ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو ہم عرض کریں گے، دنگل مشاعرے اور قوالی کی محفلیں اپنی اپنی جگہ خوب سہی، لیکن اخبار کوئی ایسی گئی گزری چیز بھی تو نہیں کہ اسے مشاعرہ یا قوالی سے بھی ہیٹا سمجھ لیا جائے۔ کراچی میں جہاں جگہ جگہ اونچی اونچی عمارتوں کے سائے تلے سینکڑوں بلکہ ہزاروں پھوس کے جھونپڑے موجود ہیں، ہمارا بھی ایک پھوس کا جھونپڑا سہی۔

۱۵ر جون

اکثر سرمایہ پرست ملکوں میں یہ مشہور ہے کہ روسی اشتراکی بڑے اخلاق باختہ لوگ ہیں، نہ اچھے بُرے کی تمیز نہ گناہ و ثواب کا خیال، نہ ماں بہن کا مرتبہ پہچانیں، نہ اخلاق کے قاعدے قانون کو مانیں۔ پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کے بارے میں جو کچھ مشہور کیا جا رہا ہے، وہ نرا پروپیگنڈا ہے، لیکن روس نے جس طرح کھلے بندوں پاکستان سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کی ہیں، اسے دیکھ کے تو ہمیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ روسیوں کی اخلاق باختگی کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ نرا پروپیگنڈا ہی نہیں بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔

ساری دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان کا بیاہ کامن ویلتھ سے ہو چکا ہے۔ دولھا مائیوں بیٹھا، سہرا بندھا، قاضی جی آئے، نکاح پڑھا، بھاری مہر باندھا گیا، شیرینی تقسیم ہوئی، اگرچہ دلھا دلھن کو بیاہ کے گھر نہیں لایا بلکہ بیچارے نے خانہ داماد بننے کو ہی غنیمت سمجھا۔ اس کے علاوہ یہ شادی بچپن کی شادی ہے، کیونکہ ابھی دولھا میاں کی مسیں بھی نہیں بھیگیں اور بی دلھن کا مارے بڑھاپے کے یہ حال ہے کہ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، لیکن ایک تو کوئی بین الاقوامی قانون ایسا موجود نہیں جو بچپن کی شادی کو روک سکے، پھر شادی چاہے بچپن کی ہو، چاہے بڑھاپے کی، آخر شادی ہے۔ اس لئے روس کا پاکستان سے گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کرنا اور یہ پیغام بھیجنا کہ ذرا ماسکو آیئے اور کھڑے کھڑے ایک آدھ بات سُن جایئے، اخلاق باختگی نہیں تو اور کیا ہے اور روس کو تو خیر جانے دیجئے۔ پاکستان کو کیا ہو گیا کہ اس دعوت کو فوراً قبول کر لیا، اور یہ بھی نہ سوچا کہ "منکوحہ" کو کیا جواب دوں گا۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں اتنی سی بات پہ خلع بلکہ طلاق تک نوبت نہ پہنچے۔ بہر حال اپنی "منکوحہ" کو معلّق تو نہیں رکھ سکتا، طلاق بھی ہوئی تو جب تک عدّت کی مدّت پوری نہیں ہوتی، اسے نان نفقہ کی ذمّہ داری ضرور اٹھانی پڑے گی۔

ہندوستان کی اور بات ہے، کامن ویلتھ سے اس کی شادی نہیں ہوئی، صرف ناجائز تعلّق ضرور ہے اور اس تعلّق کی ہزار شہادتیں موجود ہیں، تب بھی بڑے پنڈت جی یعنی پنڈت نہرو کو اس سے انکار ہے۔ ہاں "گندھرب بواہ" ہو گیا ہو تو اور بات ہے، لیکن دونوں فریق گندھرب بواہ کا نام لیتے بھی شرماتے ہیں، اس لئے ہندوستان چاہے جس سے تعلّق جوڑے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں اور کسی نے پوچھا بھی تو دُنیا کو کانوں کان خبر نہیں ہونے پائے گی، لیکن پاکستان کا تو معاملہ ہی اور ہے، کھلے خزانے، باجے گاجے کے ساتھ بیاہ ہوا۔ گواہوں کے سامنے قاضی جی نے نکاح پڑھا، اب وہ کُھل کھیلنا چاہے تو اور بات ہے مگر سچ پوچھئے تو یہ تاک جھانک۔ یہ پیام سلام کوئی اچھی چیز نہیں، بہرحال دلھن اس پیام سلام پر کچھ ایسی پریشان نظر نہیں آتی، جانتی ہے کہ مرد جوانی میں ایسی ہزار حرکتیں کرتے ہیں، لیکن جو

نکاحی بیوی کا مرتبہ ہے وہ کسی کا نہیں ہو سکتا، ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔

۱۶ر جون

آپ کو یاد ہوگا، کوئی دو ڈھائی مہینے ہوئے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں "ضدی" نام ایک فلم کا اشتہار چھپا تھا جس کے ساتھ پنجاب مسلم لیگ کے سابق جنرل سکرٹری اور خان ممدوٹ کے اکھاڑے کے مشہور پہلوان "علّامہ" علاؤالدین صدیقی کی سند بھی موجود تھی۔ ہم نے تو یہ اشتہار پڑھتے ہی کہہ دیا تھا کہ لیجئے فلم نے علم کا بازار سرد کر دیا اور "علّامہ" علاؤالدین صدیقی "فلّامہ" علاؤالدین صدیقی بن کر رہ گئے، لیکن اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ آسان سی بات نہ آئی، کہ جب علم میں فلم کا پیوند لگے تو علّامہ "مفلوم" ہو کے "فلّامہ" ہو جاتا ہے۔

فلم از بس بیا رکر دست و کند
لیڈراں را خوار کر دست و کند

چنانچہ علّامہ صدیقی کے نیاز مند انہیں "فلّامہ" کے بجائے "علّامہ" ہی کہتے رہے اور یونیورسٹی والے تو اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم پر فلم کی اس یلغار کے باوجود یونیورسٹی یونیورسٹی ہی رہے گی۔

فلّامہ علاؤالدین صدیقی پر جو گزری سو گزری، آج جو خبریں آئی ہیں، ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی پنجاب کی پوری مسلم لیگ "مفلوم" ہو کے رہ گئی ہے، مثلاً حال ہی پنجاب مسلم لیگ کے سفیر نشر و اشاعت نے اخبارات میں ایک اطلاع چھپنے کے لئے بھیجی ہے جس کا مضمون یہ ہے:۔

"ہندوستان اور پاکستان کی فلمی دنیا کے مایہ ناز سپوت مشہور ہدایت کار مسٹر ولی اور مشہور اداکارہ ممتاز شانتی گزشتہ دو ہفتہ اپنے وطن مالوف لاہور میں گذارنے کے بعد آج بذریعہ ہوائی جہاز عازمِ بمبئی ہو گئے، آپ کو الوداع کہنے والو

میں آپ کے رشتہ داروں کے علاوہ کئی دوست اور ملاقاتی والٹن کے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔

ہم تو علاّمہ علاؤالدین صدّیقی کی "مغلوبیت" کو رو رہے تھے، لیکن یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، یعنی پوری مسلم لیگ "مظلم" بن گئی ہے اور اس کے وابستگانِ دامن میں جو شخص ہے یا "ظالم" ہے یا "مظلوم" گویا ؎

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

پچھلے دنوں پنجاب مسلم لیگ نے ساری دنیا سے لڑائی باندھ رکھی تھی، ماو ڈالو، پکڑ لو، بچیو جانے نہ دیجیو کا شور بلند تھا، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میاں عبدالباری جو اس زور سے اٹھے ہیں، آسمان سے تارے توڑ لائیں گے۔ لیکن اس تمام شوراشوری کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ لیگ نے ولایت علی خاں کی جگہ ولی صاحب اور میاں ممتاز دولتانہ کے بجائے ممتاز شاننی کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ گویا علم پر تو قلم کے ہاتھوں آفت آئی ہوئی تھی، اب پنجاب مسلم لیگ اور پنجاب مسلم لیگ کے ساتھ لیڈری پر بھی آفت آئی۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ یار لوگ اب کہیں مسلم لیگ کے دفتر کو بند ہی نہ کر دیں اور لکشمی بلڈنگ میں کوئی فلم سٹوڈیو کھول کے نہ بیٹھ جائیں، آخر پنجاب کی وزارتی اور صدارتی لڑائیوں خاص طور پر کرسیوں کی لڑائی کا فلم بن جائے تو حرج ہی کیا ہے اور اگر فلم میں وہی لوگ پارٹ ادا کریں جو ان معرکوں میں شریک رہے ہیں تو مزا ہی آجائے، اس ترکیب سے بیروزگار وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے لئے روزگار بھی مہیا ہو جائے گا، اور پھر روپیہ بھی اتنا ہاتھ آئے گا کہ لیڈر لوگوں کو الکشن کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا، چندے کا دھندا نہ چل سکے تو فلم کیا برا ہے۔

۱۷ر جون

مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی پہلی کتاب میں بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں، مثلاً اس

کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پنہاریاں چکی کی گُھمر گُھمر کے ساتھ سُر ملا کے گاتی ہیں، باپ حقہ پیتا تھا اور ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی رہتی تھی، راجہ صاحب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے، زمانے نے مولوی صاحب کو گھوڑا اور پنڈت جی کو بہلی الاٹ کر رکھی تھی، لیکن یہ ساری الاٹمنٹیں منسوخ ہو گئیں۔ باپ نے حقہ پینا اور ماں نے بچے کو گود میں لے کر بیٹھنا ترک کر دیا، نہ راجہ صاحب کا ہاتھی رہا، نہ پنڈت جی کی بہلی اور نہ مولوی صاحب کا گھوڑا، سدا رہے نام اللہ کا۔

سُنا ہے، جاپان والوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا ہے کہ ہمارے چڑیا گھر میں ہاتھی نہیں، اس لئے ازراہِ کرم ایک ہاتھی بھجوا دیجئے۔

آپ نے زمانے کا انقلاب ملاحظہ فرمایا؟ یا تو یہ حال تھا کہ راجہ صاحب ہاتھی پر لدے پھرتے تھے اور پنڈت جی بہلی پر بیٹھے شاستر ارتھ کرتے تھے، یا یہ حال ہے کہ راجہ جی کو ہاتھی چھوڑ سائیکل تک میسر نہیں اور پنڈت جی ہاتھیوں کے بیوپاری بنے ہوئے ہیں یعنی جاپان تک سے برابر آرڈر چلے آ رہے ہیں۔

پرانا لطیفہ ہے کہ ایک میراثی کو ہاتھی انعام میں ملا۔ اس بیچارے کو دو وقت کا کھانا مشکل سے نصیب ہوتا تھا، ہاتھی کو کہاں سے کھلاتا؟ ہاتھی کے گلے میں ڈھول باندھ کے اسے چھوڑ دیا کہ میں بھی گا بجا کے پیٹ پالتا ہوں، تم بھی ایسا ہی کرو۔ ہندوستان میں ان دنوں قریب قریب یہی حال ہے، یعنی ہاتھی راجہ صاحب کے ہاتھی نہیں رہے بلکہ پنڈت جی کے ہو گئے ہیں، جب تک ریاستوں کا ٹھاٹھ باٹھ قائم تھا، فیل خانے بھی تھے، راجے مہاراجے ختم ہوئے تو فیل خانے بھی ختم ہو گئے، اس لئے ہاتھیوں کو بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ وہ تو شکر کیجئے کہ دساور کی منڈیوں میں ہاتھیوں کی کھپت کی صورت نکل آئی، آج جاپان سے آرڈر آیا، کل کلاں امریکہ سے آرڈر آنے شروع ہو جائیں گے، ورنہ پنڈت نہرو تو اس فکر میں تھے کہ مشک، سیندور کا ٹیکہ دے کے گلے میں رور اکش کی مالا ڈال کے ان ہاتھیوں کو کامن ویلتھ کے ملکوں میں بھیج دیں، تا کہ اُن کے لئے پیٹ پالنے کا سہارا ہو جائے۔

اور پنڈت جی اس الزام سے بھی بچ جائیں کہ ہندوستان کامن ویلتھ میں شامل نہیں۔

ہندوستان سے بہت کم خام اجناس باہر جاتی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی تجارت برآمد کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اگر وساور کی منڈیوں میں ہاتھیوں کی مانگ بڑھی تو اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ صرف ہاتھی ہی تو باہر نہیں بھیجے جائیں گے، ان کے ساتھ مہاوت اور چرکٹے بھی ہندوستان ہی سے بھیجے جائیں گے، بلکہ ممکن ہے کہ آنکس بھی ہندوستان ہی سے جائیں، ان کے لئے راتب بھی یہیں سے بھیجا جائے اور "پنڈت جی کے ہاتھیوں" کی وجہ سے ہندوستان کی ساری اقتصادی مشکلات ختم ہو جائیں۔

پاکستان کے پاس پٹ سن ہے، کپاس ہے، لیکن ہاتھی بہت کم ہیں اور جو تھوڑے بہت ہاتھی موجود ہیں، وہ پاکستان کے والیانِ ریاست کے فیل خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں ورنہ ہم بھی ایک آدھ مکنا ہاتھی باہر بھیج دیتے جو کامن ویلتھ کے سارے ملکوں کا چکر لگاتا، بلکہ امریکہ بھی ہو آتا۔ لیکن کیا کیا جائے، مجبوری ہے ؎

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

۱۸ر جون

پچھلے دنوں دراس کے فتح ہونے کی خبر آئی تو بعض اخباروں میں اس بستی کی اہمیت کے متعلق ایک مضمون چھپا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ دراس کے فتح ہو جانے سے آزاد کشمیر کی سرحد روس سے جا ملی ہے اور لداخ کے سارے علاقے پر آزاد کشمیر کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔

اب اس مضمون کے عجائبات ملاحظہ فرمائیے۔ دراس لداخ کے مغربی حصے میں یعنی وادیٔ کشمیر

اور لدّاخ کی سرحد پر ہے، چنانچہ سونا مرگ سے دراس تک ڈھائی تین دن کا سفر ہے، اور چین اور تبّت، ریاست کشمیر کے شمال میں ہیں، اس لئے دراس کے فتح ہو جانے سے آزاد کشمیر کی سرحد روس سے کہاں جا ملی؟ اور دراس لدّاخ کے شمالی سرے پر بھی ہوتا جب بھی روس سے سرحد نہ ملتی، کیونکہ لدّاخ کی سرحد روس سے نہیں بلکہ تبّت اور چین سے ملتی ہے۔

مضمون نگار کو شاید معلوم نہیں کہ آزاد کشمیر کی سرحد پہلے ہی روس سے ملی ہوئی ہے کشمیر کی لڑائی کے شروع ہی میں گلگت کے لوگوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ہمارا تعلق مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت سے نہیں بلکہ آزاد کشمیر گورنمنٹ سے ہے اور کوئی نقشہ اٹھا کے دیکھ لیجئے، آپکو معلوم ہو جائے گا کہ گلگت کے ڈانڈے روس سے جا ملتے ہیں۔

ہندوستان کے اخبار بھی کشمیر کی موجودہ جنگ کے بارے میں بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کر رہے ہیں، مثلاً ہندوستان کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ کیرن پر جو ٹیٹوال سے ۲۵ میل شمال مشرق کی جانب ہے، ہندوستانی فوج نے قبضہ کر لیا۔ "ملاپ" نے اس خبر کا یہ عنوان قائم کیا ہے کہ "ہندوستانی فوجیں ٹیٹوال سے ۲۵ میل آگے بڑھ گئیں" حالانکہ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ ہندوستانی فوجیں ٹیٹوال سے ۲۵ میل ہٹ گئیں، کیونکہ کیرن ٹیٹوال سے مغرب کی طرف نہیں بلکہ اس سے مشرق کی طرف ہندواڑہ کے علاقے میں ہے۔

ہندوستان کے اخباروں نے فرض کر لیا ہے کہ ہندوستانی فوج ہمیشہ پیش قدمی ہی کرتی ہے، چاہے اسے پسپائی کے سوا اور کسی چیز کی توفیق نہ ہو، لیکن یار لوگ اسے پیش قدمی ہی کہیں گے۔ اگر پیش قدمی اسی کا نام ہے تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہندوستانی فوج پیش قدمی کرتی کرتی سری نگر نہ پہنچ جائے۔ تعجب ہے کہ لوگ اخبار نویس بن جاتے ہیں، لمبے چوڑے مضامین بھی لکھ لیتے ہیں، لیکن نہ انہیں جغرافیہ آتا ہے، نہ وہ یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں کہ لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟ اور دونوں طرف کی فوجوں کے کیا کیا مقاصد ہیں؟ ایسے موقعوں کے

ہمیں بے اختیار وہ ایفوئی یاد آجاتا ہے جو تلاشِ معاش میں لکھنؤ سے چلا تھا اور دن بھر سفر کرنے کے بعد پھر لکھنؤ پہنچ گیا تھا۔

۲۲ر جون

مدت ہوئی، راقم الحروف نے کراچی اور لاہور کا مقابلہ کیا تھا، لیکن ان دنوں میں نے کراچی کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے میں اسے نرا صاحب بہادر سمجھتا تھا جو کوٹ پتلون ڈالے ہونٹوں میں سگار دبائے گٹ پٹ کر رہا ہے اور اپنی "صاحب بہادری" میں مگن ہے۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن نہیں سنی تھی، اس کے سینے کے زخم نہیں دیکھے تھے، میں اسے بنگلوں محلوں، کوٹھیوں، خوب صورت سڑکوں، تفریح گاہوں، پیکارڈ کاروں، سفیروں، وزیروں، سکتروں کا شہر ہی سمجھتا تھا، لیاقت علی خاں کا شہر، لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کے معاملہ میں مجھ سے بے انصافی ہوئی ہے۔ یہ صرف لیاقت علی خاں اور خلیق الزماں ہی کا شہر نہیں، یہاں خواجہ شہاب الدین اور مسٹر غلام محمد ہی نہیں رہتے، یہاں اور لوگ بھی بستے ہیں۔ جو خواجہ ہیں نہ راجہ، نہ نواب نہ چودھری، نہ مسٹر نہ مولانا، یہاں پیکارڈ کاریں ہی نہیں، جنہیں ہجوم میں سے دندانہ بڑھتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کی گردنیں خود بخود جھک جاتی ہیں۔ یہاں گدھا گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں، ہنتھ گاڑیاں اور انسان گاڑیاں یعنی رکشا بھی ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ کراچی میں انسان سے لے کر گدھے تک ہر جاندار گاڑی میں جتا ہوا ہے، اور سچ پوچھئے تو جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے انہیں گاڑی کھینچنے کی مصیبت سے بچا لیا ہے، وہ بھی دراصل کسی نہ کسی گاڑی میں جتے ہوئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ نہ گاڑی نظر آتی ہے نہ گاڑی بان، اور نہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ گاڑی میں کون بیٹھا ہوا ہے۔

کراچی میں صرف اونچی اونچی عمارتیں ہی نہیں جو عظمت کی ردا میں لپٹی ہوئی غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ محلوں، بنگلوں میں بسنے والی مخلوق ہی نہیں جو ٹیلیفون پہ بات کرتی ہے، کاروں میں

سوار ہوتی ہے اور جس کی طبیعت پر کار سے اتر کر ڈرائینگ روم تک اور ڈرائینگ روم سے خواب گاہ تک پہنچنا بھی بار گزرتا ہے۔ یہاں فٹ پاتھ بھی تو ہیں، وہ لوگ بھی تو ہیں، جو فٹ پاتھ پر نیلے آسمان کی چھت تلے زندگی گزارتے ہیں۔ گھاس پھوس اور جھونپڑے بھی تو ہیں، جن میں "مہاجرین" آباد ہیں۔ یہ ٹاٹ کے جھونپڑے کہاں نہیں ہیں؟ محلوں کے دائیں بائیں، بنگلوں کے پچھواڑے، اونچی اونچی عمارتوں کے سائے میں، چار ٹاٹ کے ٹکڑے اور چار دیواریں ہیں۔ ایک ٹکڑا چھت کا کام دیتا ہے۔ مقدرت ہوئی تو ایک چارپائی بچھالی، نہیں تو زمین ہی پر پڑ رہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کراچی میں چودھری خلیق الزماں ہیں، خان لیاقت علی خاں ہیں، خواجہ شہاب الدین ہیں، سردار عبدالرب نشتر بھی ہیں، سفیر ہیں، سکتر ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہاں فتو ہے جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کباب بیچتا ہے اور فٹ پاتھ ہی پر سو رہتا ہے۔ رمضانی ہے جو اپنے بیوی بچے سمیت ٹاٹ کے ایک جھونپڑے میں رہتا ہے۔ فیرانی ہے، نذیرا ہے، نقیرا ہے، شماں ہے، سلارا ہے، جماں ہے۔ ان میں کچھ ٹاٹ کے جھونپڑے والے ہیں، کچھ پھوس کے جھونپڑوں والے، اور کچھ فٹ پاتھ والے۔

میں نے حاجی کیمپ دیکھا جو صرف نام کا حاجی کیمپ ہے، کیونکہ کراچی میں حاجیوں کے ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹاٹ کے جھونپڑوں کی قطاریں دیکھیں، انہیں دیکھ کے پہلے خیال آیا کہ آبادکاری کے محکمہ کو مبارک باد کا ایک خط لکھوں، لیکن پھر اس خیال سے چپکا ہو رہا کہ کہیں وہ اس مبارک باد کو "تحسینِ ناشناس" سمجھ کے ناراض نہ ہو جائیں۔ آخر آبادکاری کے محکمے والے بھی کیا کریں، یہی غنیمت ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو فٹ پاتھ سے اٹھا کے ان ٹاٹ کے جھونپڑوں میں آباد کر دیا، یہاں تھوڑی سی آڑ تو ہے۔ ورنہ عورتیں فٹ پاتھ پر بچے جنتیں، جہاں ٹاٹ کی اوٹ بھی میسر نہیں۔

اور آخر مہاجرین ہی کا تو یہ حال نہیں، لیاری میں جو لوگ مدتوں سے بستے چلے آتے ہیں ان کا بھی تو یہی حال ہے، ڈیڑھ دو لاکھ کی آبادی ہے۔ ٹوٹے پھوٹے مکان، کہیں لکڑی کے

ٹکڑے جوڑ کے دیوار کھڑی کر لی گئی ہے، کہیں ایک طرف لکڑی کی دیوار ہے، اُس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ تنا ہے اور گرد، کوڑے کرکٹ اور غلاظت کے انبار، کچی سڑکیں، کوئی اونٹ گاڑی آنکلی تو گرد کے دَل بادَل ہر طرف چھا گئے۔

کپل وستو کے راجکمار ساکیہ منی گوتم نے ایک اپاہج، ایک اندھے بھکاری، ایک بڈھے آدمی کو دیکھا اور وہ گیان حاصل کر کے بُدھ یعنی عارف کہلایا۔ لیکن میں نے کراچی کی فریادیں سنی ہیں، اُس کے دل کے گھاؤ دیکھے ہیں، میں لیاری میں گھوما پھرا ہوں، میں نے محلوں کے سائے میں پھوس اور ٹاٹ کے جھونپڑے دیکھے ہیں اور فٹ پاتھ پر انسانیت کو دم توڑتے ہوئے پایا ہے، لیکن عرفانِ الٰہی نے میرے قلب کو نورانی نہ کیا اور ایک مجھی پر کیا موقوف ہے، پاکستان کے سب سے بڑے لیڈر مرکزی لیگ کے صدر چودھری خلیق الزمان سلمہ المنّان بھی اسی شہر میں رہتے ہیں، انہوں نے بھی یہ سب کچھ دیکھا ہوگا، لیکن ان کا دل بھی عرفانِ الٰہی سے بے نصیب رہا۔ بدھ کو گیا میں ایک درخت تلے عرفان نصیب ہوا تھا، اور کراچی میں بدقسمتی سے درخت ہی کمیاب ہیں۔

۲۳ر جون

نواب اچھن مرزا کے ہاں جو لکھنؤ کے مشہور رئیسوں میں سے تھے، چوری ہو گئی۔ ایک افیونی نے جو مرزا کے متوسّلین میں سے تھا، اُن کی خدمت میں حاضر ہو کے کہا کہ نواب صاحب آپ گھبرائیے نہیں، میری سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ اچھن مرزا نے پوچھا۔ تمہارے عندیہ میں یہ کس کی حرکت ہے؟ جواب ملا "مقرر، یہ کسی چور کا کام ہے"۔

اخباروں میں خبر رساں ایجنسیوں کی وساطت سے بعض ایسی خبریں بھی چھپتی ہیں، جنہیں پڑھ کے ہمیں بے اختیار لکھنؤ کا یہ افیونی یاد آجاتا ہے۔ مثلاً آج کے اخباروں میں ذیل کی

اطلاع چھپی ہے :-

"آج مسٹر لیاقت علی خاں سے میاں عبدالباری کی ملاقات ہوئی، کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی، اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا کیا باتیں ہوئیں۔ البتہ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سر فرانسس موڈی کی واپسی کا معاملہ اور پنجاب کے دوسرے مسائل موضوعِ گفتگو بنے رہے ہیں۔"

میاں عبدالباری اور مسٹر لیاقت علی خاں کی ملاقات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کے درمیان پنجاب کے سیاسی مسائل کے متعلق گفتگو ہوتی ہو گی اور پھر پورے وثوق کے ساتھ اس بات کا ذکر کر دینا آسان کام نہیں، اس کے لیے غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ہمّت اور جرأت کی بھی تو ضرورت ہے۔

لیکن ہماری اطلاع کے مطابق میاں عبدالباری اور خان لیاقت علی خان کے درمیان اس موقع پر پنجاب کے سیاسی مسائل خصوصاً سر فرانسس موڈی کی واپسی کے معاملہ کا ذکر تک نہیں آیا، بلکہ یہ دونوں حضرات ڈیڑھ گھنٹے تک صرف اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے ہیں، کہ "دیسی کھاد" اور "ولایتی کھاد" میں کیا فرق ہے؟ اور پاکستان کے لیے دیسی کھاد زیادہ مفید ہے یا ولایتی کھاد؟ یوں تو میاں عبدالباری "دیسی کھاد" کے بہت بڑے حامی ہیں، لیکن قیاس کہتا ہے کہ "ولایتی کھاد" کی تعریفیں سُن سُن کے ان کی نیّت بھی ضرور ڈانوا ڈول ہو گئی ہو گی۔

میاں عبدالباری دیسی کھاد کے ماہر ہیں، انہوں نے لائل پور میں دیسی کھاد کی مدد سے گوبھی اور آلو ہی کی کاشت نہیں کی، مسلم لیگ کے کھیتوں میں والنٹیر بلکہ کونسلر تک اگانے کے تجربے کیے لیکن "ولایتی کھاد" جسے "معدنی کھاد" بھی کہتے ہیں اور ہی چیز ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے انہوں نے مسئلہ کشمیر کو کھاد کے طور پر استعمال کرنا چاہا تھا، پھر خدا جانے کیا جی میں آئی کہ اسے چھوڑ کے وہ سر فرانسس مُودی کی واپسی کے قصّے کو "کھاد" کی حیثیت سے

استعمال کرنے پر آمادہ ہوگئے، پھر بھی وہ ابھی تک "ولایتی کھاد" کے منکر ہیں۔ بہر حال ذرا مسٹر غلام محمد کو جو معدنی کھاد لینے ولایت گئے ہوئے ہیں، واپس آنے دیجئے، میاں عبدالباری بھی ولایتی کھاد کی خوبیوں کا اقرار کرنے پر مجبور رہی ہو جائیں گے۔

کراچی میں "پگڑی" کا ذکر تو بہت سنا ہے، لیکن پگڑی ایک شخص کے سر پر نظر نہیں آتی۔ بظاہر پگڑی پر پانچ چھ گز ململ کا خرچ ہے جس کی قیمت کوئی بارہ تیرہ روپے ہوتی ہے، لیکن یہاں پگڑی پر دس بیس ہزار بلکہ کبھی کبھی لاکھ روپے بھی خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ پگڑی سروں پر نظر نہیں آتی، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی ہے، ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل ہو جاتی ہے گویا کراچی میں پگڑی ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کراچی میں پگڑی "رشوت" کی ایک قسم کا نام ہے، مکان کا کرایہ ایک سو روپیہ ماہانہ ہے مالک مکان دس ہزار روپیہ پگڑی مانگتا ہے اور یہ دس ہزار روپے وصول کرنے کے بعد کرایہ ماہ بماہ وصول کرتا رہتا ہے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس رسم کا نام "پگڑی" کیوں ہے، ٹوپی، قمیص، ہیٹ، پتلون یا کوٹ بلکہ "جوتا" کیوں نہیں کیونکہ جب کوئی شخص دکان یا مکان کے سلسلے میں پگڑی کا نام لیتا ہے تو بس ع

جی میں آتا ہے بڑھ کے دیں جوتا

بہر حال "پگڑی" بھی ایک قسم کی "معدنی کھاد" ہے جو بظاہر تو دیسی معلوم ہوتی ہے، لیکن در اصل اس کا کوئی وطن نہیں، دنیا کے اکثر ملک پگڑی لیتے دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ پگڑی کے "لین دین" کا یہ قصہ اخباروں میں نہیں آنے پاتا۔ مثلاً مڈل ایسٹ کا پٹرول کئی بار "پگڑی" کے طور پر استعمال ہوا ہے، لیکن کسی خبر رساں ایجنسی نے اس پٹرول کی پگڑی کا ذکر تک نہیں کیا، پنڈت نہرو نے بھی کامن ویلتھ سے جائز یا ناجائز تعلق قائم رکھنے کے لئے ضرور پگڑی مانگی ہو گی۔

لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہندوستان کا کامن ویلتھ سے وابستہ رہنا بھی تو ایک قسم کی پگڑی ہی ہے۔ ان واقعات کو سامنے رکھ کے دیکھئے تو ذوقؔ کے اس شعر کا مطلب آسانی سے سمجھ آجاتا ہے ؎

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن مے
ذوقؔ وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

۲۴ر جون

آپ کو یاد ہوگا، چند مہینے ہوئے چودھری خلیق الزّماں لاہور تشریف لائے تھے، ریلوے سٹیشن پر لوگوں نے سیاہ جھنڈیوں اور "واپس چلے جاؤ" کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ چودھری صاحب کچھ دنوں لاہور میں رہے، گورنر اور دوسرے اکابر سے ملے اور کسی عام اجتماع میں تقریر کئے بغیر واپس چلے گئے۔

حال میں چودھری صاحب ڈھاکے گئے۔ ان کے بعض نیازمندوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں یار لوگ ڈھاکے کو بھی لاہور نہ بنا دیں، لیکن شکر ہے کہ یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ڈھاکے کے لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا، پھولوں کے ہار پہنائے، زندہ باد کے نعرے لگائے اور اس طرح ثابت کر دیا کہ ع

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

لیکن ڈھاکہ میں لوگوں نے چودھری صاحب کو تقریر نہ کرنے دی یعنی لیگ کونسل کے جلسے میں چودھری صاحب نے تقریر کرنی چاہی تو بعض لوگوں نے شور مچا دیا کہ پہلے مولانا اکرم خاں کے استعفےٰ کا معاملہ سامنے آنا چاہئے، پھر چودھری صاحب کی تقریر بھی سُن لی جائے گی۔ دوسری طرف سے کہا گیا کہ مولانا اکرم خاں کے استعفےٰ پر غور ہوتا رہے گا، پہلے چودھری صاحب کی تقریر سنئے اور سر دھنئے۔ اسی بحث میں تو تکار تک نوبت پہنچی اور ایسا شور مچا کہ صدر کو جلسہ

برخاست کرنا پڑا اور اس طرح چودھری صاحب کو تقریر کا موقع نہ ملا۔

غور کیا جائے تو ڈھاکہ اور لاہور کے اس سفر میں نتائج کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ڈھاکہ کے لوگ زیادہ خوش اخلاق سہی لیکن وہ بھی صرف زندہ باد کے نعروں پر ٹرخانا جانتے ہیں، تقریر کرنے نہیں دیتے۔ گویا لاہور والے صرف گرجتے ہیں، برستے نہیں اور ڈھاکے والے گرجتے نہیں صرف برستے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو چودھری خلیق الزّماں کو اتنا لمبا سفر کرنے کے بجائے پاؤں توڑ کے کراچی ہی میں بیٹھ رہنا چاہیئے، جہاں نہ کوئی گرجتا ہے نہ برستا ہے۔ بلکہ سرے سے بارش ہی نہیں ہوتی۔

۲۵ر جون

کہتے ہیں، کراچی کے رام باغ میں ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے۔ اثنائے تقریر میں انہوں نے فرمایا "لیگ نے قرار داد پاکستان ۱۹۴۱ء میں منظور کی تھی" ایک شخص نے اٹھ کے کہا "آپ غلط فرما رہے ہیں، مسلم لیگ نے قرار داد پاکستان مارچ ۱۹۴۰ء میں بمقام لاہور منظور کی تھی" یہ سُن کے مولوی صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور چلّا کے کہنے لگے "یہ شخص مفتری ہے، مفسد ہے، پانچویں کالم سے تعلّق رکھتا ہے" معلوم نہیں یہ شخص حوالات میں ہے یا تھوڑی سی چشم نمائی کے بعد اسے رہا کر دیا گیا ہے، لیکن اتنا تو سب نے دیکھا کہ مولوی صاحب کا فتوےٰ سنتے ہی کچھ لوگ اسے کشاں کشاں جلسہ گاہ سے نکال کے لے گئے اور مولانا نے "علم وعرفان" کا دریا بہانا شروع کر دیا۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کراچی میں "علم" کو بڑی خطرناک چیز سمجھا جاتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حلیم صاحب کو پڑھنے پڑھانے سے زیادہ پہلوانی سے دلچسپی ہے۔ یوں تو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ملک بھی

صورت شکل سے اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے ہیں، لیکن پروفیسر حلیم اُن سے بھی بازی لے گئے، اور یہ جو خبریں آرہی ہیں کہ سندھ یونیورسٹی ہجرت کر کے حیدرآباد جا رہی ہے، اس کا حقیقی سبب بھی یہی ہے۔

ایک جاٹ کے پاؤں میں چوٹ آگئی۔ کسی نے پوچھا "چودھری ذرا بتاؤ تو سہی، چوٹ کہاں لگی؟" جواب ملا "میں کیا جانوں، جہاں برادری کے چار آدمی مل کے کہہ دیں گے وہیں چوٹ لگی ہوگی۔"

ہمارے خیال میں ہمیں بھی کثرت رائے سے فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ قرار داد پاکستان کب منظور ہوئی تھی، اگر کثرت رائے سے یہ طے ہو جائے کہ قرار داد پاکستان ۱۹۴۱ء میں منظور ہوئی تھی یا کم از کم اسے ۱۹۴۱ء میں منظور ہونا چاہیئے تھا تو پھر کسی شخص کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوگی کہ قرار داد پاکستان مارچ ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی تھی۔

دواؤں میں جو مرتبہ "امرت دھارا" کا ہے، قوانین میں وہی مرتبہ سیفٹی ایکٹ کو حاصل ہے یعنی اس قانون کو مناسب بدرقہ کے ساتھ ہر موقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں تو ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کی ساری دفعات جواب دے گئیں اور سیفٹی ایکٹ تیر بہدف ثابت ہوا۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کے استعمال کا سلیقہ یا تو صوبۂ سرحد کی حکومت کو ہے یا کراچی کے خداوندانِ نعمت کو اور مغربی پنجاب تو اس معاملہ میں بہت پھسڈی نظر آتا ہے۔

ایک سرکاری افسر سے کسی نے پوچھا "فلاں شخص نے آخر کیا قصور کیا تھا کہ آپ نے سیفٹی ایکٹ کی آڑ لے کر اُسے جیل بھیج دیا؟" جواب ملا ؎

بلائے سرش زہوشمندی　　　　مے تافت ستارہ بلندی

گویا جو شخص "علم و عقل" سے بہرہ یاب ہے یا اس کے چہرے سے "علم و دانش" کے

آثار ہویدا ہیں، اسے اپنے آپ کو سیفٹی ایکٹ کی زد میں سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے تو بعض اہل علم پہلوانی اور بعض قوالی کی طرف جھک پڑے ہیں تاکہ "ایں ہم بچہ شتر است" کہہ کے انہیں بھی دھر نہ لیا جائے۔ ہمارا شمار "اہل علم" میں تو نہیں ہوتا لیکن اگر خدانخواستہ ہم پر اس قسم کا شبہ کیا گیا تو ہمیں بھی مجبوراً قوالی یا پہلوانی کے دامن ہی میں پناہ لینی پڑے گی۔

حکم ہوا ہے کہ کراچی میں کوئی شخص فٹ پاتھ سے ہٹ کر نہ چلے، فٹ پاتھ سے ذرا ادھر ادھر ہوئے اور پولیس نے ٹیٹوا دبایا۔ بات تو درست ہے، فٹ پاتھ پیدل چلنے والوں کے لئے اور سڑک موٹروں، تانگوں، گھوڑا گاڑیوں وغیرہ کے لئے۔ لیکن فٹ پاتھ پہ اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ کوئی قدم رکھ سکے، سڑک سے فٹ پاتھ پر آتے ہی شیخ سعدی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے اور قدم خود بخود رک جاتے ہیں ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جان است

۲۷ر جون

مولانا عبدالباری اور خان لیاقت علی خان میں جو سمجھوتہ ہوا ہے، اس پر سب لوگ خوش نظر آتے ہیں۔ باری صاحب اس بات پہ خوش ہیں کہ ان کی بات تو رہ گئی۔ گورنر کے حامیوں کو یہ خوشی ہے کہ مشیر پانچ چھوڑ دس مقرر ہو جائیں، فی الحال سر فرانسس موڈی بدستور گورنر تو رہیں گے۔ اور مسٹر ولایت علی خاں اور ان کے ساتھی کہہ رہے ہیں کہ مولوی باری کو آخر کونسی شاخِ زعفران ہاتھ آگئی، اتنا بکھیڑا کئے بغیر بھی مشیروں کے تقرر کا معاملہ طے ہو سکتا تھا۔ غرض اس جھگڑے میں جتنے لوگ شریک تھے، سب اپنی اپنی جگہ سمجھ رہے ہیں کہ میدان انہی کے ہاتھ رہا ہے۔

لیکن ہم سے پوچھئے تو ہم یہی کہیں گے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے، اس کی حیثیت صرف تمہید

کی تھی، اصل جھگڑا یعنی "کرسی کا جھگڑا" تو اب کہیں شروع ہوا ہے۔ پہلے وزارت کی کرسی کے لئے یار لوگ دست و گریباں نظر آتے تھے، اب "مشاورت کرسی" کے لئے توڑ جوڑ ہوں گے اور خان ممدوٹ کے عہدِ وزارت کا نقشہ آنکھوں تلے پھر جائے گا۔

ہمارے ہاں سارے جلسے کُرسی سے شروع ہوتے ہیں اور کرسی ہی پر ختم ہو جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ لوگ کرسی کے لئے لڑتے بھی ہیں تو کُرسی ہی کو گُرز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں انہیں کبھی اس "کرسی برائے کرسی" کے فارمولے پر بھی غور کرنا چاہیئے، کیا عجب ہے کہ وہ ادب اور شاعری کو چھوڑ چھاڑ کے کرسی ہی کے ہو رہیں، کیونکہ کُرسی راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔

"خالق باری" ایک مشہور کتاب ہے جو امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہے، اخباروں میں جب ہم "لیاقت باری" فارمولے کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو بے اختیار "خالق باری" یاد آجاتی ہے بہتر ہوتا کہ چودھری خلیق الزّمان اور مولوی باری مل کے کوئی فارمولا مرتب کرتے۔ یہ بات ہم نے محض اس لئے عرض کی ہے کہ "خلیق باری" "فارمولا" "خالق باری" سے ذرا ملتا جلتا ہے اگلے زمانے میں "خالق باری" ابتدائی مدارس کے نصاب میں شامل تھی "خلیق باری" فارمولا محض اپنے نام کے بل پر چل نکلتا اور کیا عجب کہ ابتدائی مدارس کے نصاب میں بھی شامل کر لیا جاتا۔

یہ بات تو خیر جملۂ معترضہ کے طور پہ بیچ میں آ گئی، ورنہ اصل بحث تو "کُرسی" کی تھی جس نے مغربی پنجاب کی سیاسی زندگی کو مفلوج کر رکھا ہے۔ وزارت کی کرسیاں بھی پانچ ہی تھیں اور مشاورت کی کُرسیاں بھی پانچ ہیں، لیکن امیدواروں کی تعداد پانچ سو نہیں تو پچاس سے کیا کم ہوگی؟ الکشن قریب ہوتا تو لوگ صبر کر لیتے لیکن ڈیڑھ سال تک "بے کرسی" زندگی کیسے کٹے؟ رنڈاپا کٹ جاتا ہے مگر کرسی کے بغیر زندگی نہیں کٹتی۔

---

۲ رجولائی

نجومیوں اور رمال نکالنے والوں کو پنجابی میں "ہرڑ پوپو" کہتے ہیں، لیکن "ہرڑ پوپو" ذرا چھٹ بھیا قسم کے نجومی ہیں جو گلی کوچوں میں پھر کے گھڑی اور لگن وچارتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے لاہور میں ان لوگوں کی کثرت تھی، بعض سڑکوں کے کنارے پوتھی کھولے بیٹھے نظر آتے تھے، بعض نے باغوں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک پھٹی پرانی جنتری اور تین پانسے ان کی ساری کائنات ہوتی تھی، پھر بھی جب وہ "ین میکھ کرک سنگھ" کہہ کے پانسہ پھینکتے تھے تو اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اب خالص قسم کے ہرڑ پوپو بہت کم رہ گئے ہیں، بعض نے شاہ جی بن کے ولایت بگھارنا اور مریدوں سے نذریں وصول کرنا شروع کر دیا اور اسی کام کے ہو کے رہ گئے، بعض نے کوئی اور کام دھندا شروع کر دیا۔

سنا ہے، لاہور میں جو تھوڑے بہت ہرڑ پوپو رہ گئے ہیں، انہوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک ہرڑ پوپو یونین قائم کر لی ہے۔ ابھی تک اس یونین کی طرف سے کوئی اعلان تو شائع نہیں ہوا، البتہ بعض لوگوں کی زبانی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہرڑ پوپو یونین کے ارادے بہت بلند ہیں یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جو لوگ یونین کے ممبر نہیں۔ چاہے وہ نجم الملک یا راج جوتشی جیسے بلند آہنگ ناموں سے کیوں نہ پکارے جاتے ہوں، انہیں پریکٹس کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور یہ حکم دے دیا جائے کہ جو شخص کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرنا چاہے گا، اسے یونیورسٹی کی سند کے ساتھ ساتھ اپنی جنم پتری بھی پیش کرنی ہوگی۔

سچ پوچھئے تو کبھی کبھی قومی اور ملکی معاملات میں ہرڑ پوپو کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے، مثلاً پچھلے دنوں جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ سر فرانسس موڈی کا جانشین کون ہوگا تو ہر شخص کو اس بات کا احساس تھا کہ اس سوال کا جواب کوئی ہرڑ پوپو ہی دے سکتا ہے، لیکن یہ بات صاف صاف کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور مشیروں کے معاملہ میں تو اب قیاس آرائی کی

ہو رہی ہیں اور مشیروں کے نام بتا نادرکنار، ابھی تک یہ بھی طے نہیں ہوا کہ مشیر مقرر بھی ہوں گے یا پاکستانی گورنر کے تقرر کے بعد سرے سے ان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی اور تو اور خود مولوی عبدالباری بھی جھکم میں پڑے ہیں۔ اگر وہ کسی نجومی کی خدمات حاصل کر لیتے تو کم از کم یہ تو کہہ سکتے کہ جن پانچ مشیروں کی فہرست انہوں نے مرتب کی ہے۔ اُن کی قسمت میں مشیر بننا لکھا بھی ہے یا نہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات ہرڑپوپو بھی غلطیاں کر گزرتے ہیں، لیکن یہ غلطیاں کچھ ایسی بڑی نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک ہرڑپوپو نے کسی لڑکے کا ہاتھ دیکھ کے کہا کہ "میاں صاحبزادے مجھے تو تمہارے سر پر تاج شاہی جگمگ کرتا نظر آرہا ہے" یہ پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی، یعنی یہ لڑکا ایک تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہو گیا، جہاں وہ مدتوں سر پر تاج رکھ کر بادشاہ کا پارٹ کرتا رہا، یہ اور بات ہے کہ وہ تاج مصنوعی تھا۔ اس لئے ڈر ہے کہ کہیں ہرڑپوپو تو حساب لگا کے یہ کہہ دے کہ یہ پانچ بزرگ ضرور مشیر بن کے رہیں گے اور ان کی ساری عمر صرف اپنے محلہ کے لوگوں کو مشورے دیتے گزر جائے۔

۳ر جولائی

خالق باری جو اگلے وقتوں کی ایک مشہور درسی کتاب ہے۔ خاصی آسان ہے۔ کتاب پڑھتے جائیے اور فارسی ذہن میں اترتی چلی جاتی ہے ؎

بیا برادر۔ آؤ رے بھائی
بنشیں مادر۔ بیٹھ ری مائی

"لیاقت باری" جو "لیاقت باری خار مولا" بھی کہلاتی ہے، اگرچہ عہد جدید کی درسی کتاب ہے اور اس اعتبار سے کم از کم مغربی پنجاب والوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک زمانے میں خالق باری کو حاصل تھی لیکن اُسے پڑھنے پڑھانے میں خاصی مشکلات پیش آرہی ہیں۔

مثلاً پچھلے دنوں سیالکوٹ میں مہاجرین کا ایک جلسہ ہوا، جس میں کہا گیا ہے کہ گورنر کے جو پانچ مشیر مقرر ہونے والے ہیں، ان میں کم از کم تین مہاجر ہونے چاہئیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آگے چل کے خود مہاجرین کے درمیان اس مسئلہ پر جھگڑا نہ شروع ہو جائے، یعنی جالندھر کے مہاجر جالندھر اور امرتسر کے مہاجر امرتسر کی نمائندگی پر زور دینا نہ شروع کر دیں۔ اگر خدانخواستہ اس قسم کی بحث شروع ہو گئی، تو لدھیانہ، گورداسپور، انبالہ، دلّی، ہوشیارپور وغیرہ کب پیچھے رہیں گے، سب سے زیادہ تو اس بات کا خطرہ ہے کہ "ضلع" کی یہ بحث کہیں "ضلع جگت" کی صورت نہ اختیار کر لے۔

اور یہ جھگڑا یہیں تک محدود نہیں رہے گا، خواتین بھی چاہیں گی کہ زیادہ نہ سہی پانچ نشستوں میں سے کم از کم ایک نشست تو اُن کے حصّے میں آئے۔ یہ صحیح ہے کہ لیاقت باری فارمولا میں خواتین کی نمائندگی کا ذکر کہیں نہیں، لیکن خالق باری میں تو اس کی صراحت کر دی گئی ہے اور خواتین اس کتاب سے استناد کر کے کہہ سکتی ہیں کہ گورنر بہادر ایک مرتبہ نہیں چار مرتبہ "بیا برادر، آور سے بھائی" کہہ لیں، لیکن انہیں کم از کم ایک مرتبہ "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی" ضرور کہنا پڑے گا۔

۴ر جولائی

لاہور کے ایک مشہور اخبار نویس بزرگ نے ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں بڑے بڑے عجائبات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے :-

"ہندوستان کا سب سے پہلا انقلاب وہ ہے جس کا تذکرہ مہابھارت میں ملتا ہے اور جس کا ہیرو رام کو قرار دیا جاتا ہے"

درست ہے، رام مہابھارت کا ہیرو تھا اور ارجن کی داستان رامائن میں حکیم بزرجمہر نے لکھی ہے لیکن آپ سکندرِ اعظم اور بھیشم پتامہ کی لڑائی کا حال تو لکھنا بھول گئے، حالانکہ یہ

جنگ پانی پت کی تیسری لڑائی سے ایک برس پہلے ہو چکی تھی۔

مدّت ہوئی کسی صاحب نے کوہِ نور ہیرے کے متعلق کسی اخبار میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کوہِ نور ہیرا اصل میں نواب فاران کے ایک بزرگ کے پاس تھا جو ایران کے بادشاہ نادر شاہ افشار کے خاص معتمدین میں سے تھے، اُن سے میر جملہ نے خرید کے شاہ جہان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ معلوم نہیں یہ صاحب جنہوں نے کوہ نور ہیرے کی سرگذشت لکھی تھی، آج کل کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں محکمۂ تعلیم کو ان سے پاکستان کی تاریخ لکھوانی چاہیئے۔

ٹیکسٹائل فیکٹریز ایسوسی ایشن ملتان کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مسٹر بشیر احمد قریشی کو جو پہلے صنعت و حرفت کے محکمہ کے ڈائرکٹر تھے اور آج کل ڈیرہ غازی خاں کے ڈپٹی کمشنر ہیں، صنعت کے محکمہ کا سکرٹری مقرر کیا جائے۔ قریشی صاحب کی قابلیت میں بھی کوئی کلام نہیں اور ٹیکسٹائل فیکٹریز ایسوسی ایشن نے جو مطالبہ کیا ہے وہ بھی یقیناً سمجھ سوچ کے کیا ہوگا، لیکن اگر سرکاری افسروں کے تقرّر، تبدیلی اور ترقّی کا معاملہ بعض انجمنوں کے ہاتھ میں آجائے تو گورنر کے پاس دستخط کرنے کے سوا اور کوئی کام باقی نہیں رہتا، اور اگر ٹیکسٹائل فیکٹریز کے پریزیڈنٹ صاحب دستخط کرنے کا کام بھی اپنے ذمّے لے لیں تو گورنر کو فراغت ہی فراغت ہے۔

موضع "موہوکے" کی انجمن مہاجرین مدّت سے مطالبہ کر رہی ہے کہ ننّھے خاں پٹواری کو جسے مال کے محکمے کا بڑا تجربہ ہے، تحصیلدار بنایا جائے۔ ملتان کی ٹیکسٹائل فیکٹریز ایسوسی ایشن کا مطالبہ منظور ہو گیا تو یہ مطالبہ بھی منظور ہو جانا چاہیئے، آخر ننّھے خاں نے مال کے محکمے میں ساری عمر گزار دی ہے، اسے کیوں تحصیلدار نہ بنا دیا جائے؟

جب ایک شخص آنریری مجسٹریٹ ہو سکتا ہے تو ایک پوری کی پوری انجمن، آنریری سکرٹری چیف سکرٹری یا ڈائرکٹر بن کے کوئی محکمہ کیوں نہیں سنبھال سکتی؟ ہم تو کہیں گے کہ بشیر احمد صاحب قریشی کو سکتر مقرر کرنے کے بجائے صنعت و حرفت کے محکمہ کی سکتری کا عہدہ ٹیکسٹائل فیکٹریز ایسوسی ایشن ملتان کے حوالے کر دیا جائے، یعنی اس انجمن کو محکمۂ صنعت کا آنریری سکرٹری بنا دیا جائے۔ پرانے زمانے میں مختلف علاقے ٹھیکے پر دے دیئے جاتے تھے، اب بھی بعض ریاستوں میں مستاجری کا رواج موجود ہے، سکھوں کے زمانے میں عہدے بلکہ محکمے نیلام ہوتے تھے، ڈوگروں نے بھی کشمیر میں مدت تک اسی طریقہ پر عمل کیا، لیکن اب تو یہ کام اور بھی آسان ہو گیا ہے، کیونکہ اس زمانے میں انجمنیں نہیں تھیں، اور آج کل ہر گلی کوچے میں ایک آدھ انجمن موجود ہے جو آنریری سکرٹری، آنریری چیف سکرٹری آنریری ڈائرکٹر جنرل اور نہ جانے کیا کیا بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۵ر جولائی

رمضان المبارک کے سلسلے میں کراچی کے ناظم صاحب کی طرف سے جو اعلان کیا گیا ہے، ذرا اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

> "عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کریں جو رمضان المبارک میں روزے رکھتے ہیں تاکہ اہالیانِ کراچی کے مختلف طبقوں میں رواداری اور یگانگت کے جذبات پیدا ہوں"۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ کراچی کے عوام تو روزے نہیں رکھتے اور نہ اُن سے روزے رکھنے کی توقع کی جاتی ہے، البتہ کراچی میں کچھ لوگ ایسے بھی آ گئے ہیں جو رمضان المبارک میں روزے رکھتے ہیں اور مختلف طبقوں میں رواداری قائم رکھنے کے خیال سے یہ ضروری ہے کہ اس "روزہ دار اقلیت" کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے، گویا یہ اعلان کا ہے کو ہے، اقلیتوں کے مذہبی حقوق کا چارٹر ہے۔

خدا جانے یہ اعلان ناظم صاحب نے خود لکھا یا ان کے کسی نائب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، بہرحال اس میں جو طنز و تعریض کا پہلو ہے، اس کی داد دینے کے لئے ہمیں الفاظ نہیں ملتے۔ اعلان میں روئے خطاب کراچی کے عوام کی طرف ہے اور جو لوگ روزہ رکھتے ہیں، انہیں "عوام کے بھائی" کہا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہی مفہوم ان الفاظ میں بھی ادا ہو سکتا تھا،

"عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ رمضان المبارک میں اپنے مسلمان بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کریں۔"

ایک صاحب بہادر قسم کے مسلمان افسر جن کا اصل وطن بمبئی تھا، پنجاب کے کسی ضلع میں ڈپٹی کمشنر ہو کے گئے، اُن دنوں پنجاب میں مسلمان ڈپٹی کمشنر ایک دو ہی تھے۔ آئی سی ایس کے افسروں میں زیادہ تر انگریز تھے، ان کے بعد ہندوؤں کا نمبر آتا تھا، اس لئے مسلمان بہت خوش ہوئے کہ شکر ہے، ہمارے ضلع میں مسلمان ڈپٹی کمشنر تو آیا۔ چنانچہ عید کے دن شہر کے بہت سے سربرآوردہ لوگ جمع ہو کے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر کو اطلاع ہوئی، تو باہر نکل آئے اور فرمایا:۔

"ویل! آج آپ لوگ کا عید ہے۔"

لوگوں نے کہا "جی ہاں۔"

صاحب بہادر نے فرمایا "ویل! ہم بہت کُھش، ہم بہت کُھش۔"

یہ سُن کے لوگوں پر اوس سی پڑ گئی اور جی میں کہنے لگے، یہ کیسا مسلمان ہے جو عید کو صرف ہم لوگوں کی عید سمجھتا ہے اور "ہم بہت کُھش" اس انداز سے کہتا ہے، گویا ہم پر احسان کر رہا ہے۔

پھر ایسا زمانہ بھی آیا کہ صوبوں کے وزیر باقاعدگی سے چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں آتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں بلکہ جمعہ کے دن وعظ بھی سنا جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میاں نور اللہ، اور دتی صاحب نئے نئے وزیر ہوئے تو لاہور کی مسجدوں میں جا جا کے نمازیں بھی پڑھتے تھے، وعظ بھی کرتے تھے، اکثر اوقات میجر مبارک علی شاہ بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے لیکن یہ لوگ عوام کے ووٹوں

کے بل پر آگے بڑھے تھے، اس لئے ان کا مقابلہ ڈپٹی کمشنروں سے نہیں کیا جا سکتا، سول سروس کے انداز میں آج بھی پرانے دور کی جھلک نظر آ جاتی ہے یعنی ان کی زبان سے "ویل! آج تم لوگوں کا عید ہے" کی قسم کا ایک آدھ فقرہ ضرور نکل جاتا ہے۔ اصل میں وہ بچارے بھی معذور ہیں "صاحب بہادری" کا جو رنگ ان پر چڑھا ہوا ہے، اترتے اترتے ہی اترے گا۔

۶ر جولائی

جب سے لیاقت باری فارمولا مرتب ہوا ہے اور مشیروں کے تقرر کا فیصلہ کیا گیا ہے، ہر شخص جسے لیگ سے دور کا بھی تعلق رہا ہے، مشیر بننے کی فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ سنا ہے کہ باری صاحب یوں تو پانچ مشیروں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھے تھے، لیکن اب تک جن لوگوں کی سفارشیں ان کے پاس پہنچ چکی ہیں، ان کی فہرست پر نظر ڈالی تو کئی سو نام نظر آئے، ایک روز تو سفارشوں کے ہجوم سے ایسے گھبرائے کہ گھر سے غائب ہی ہو گئے اور ادھر لاہور میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لیجئے باری صاحب نے سیاست کے جھگڑوں سے تنگ آ کے بالآخر ترکِ دنیا کا فیصلہ کر لیا۔

بعض لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ جس شخص کو میاں عبدالباری صاحب کے ہاں یا مسلم لیگ کے دفتر میں آتے جاتے دیکھتے ہیں، اس خیال سے جھک کے سلام کرتے ہیں کہ،

شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پرو بال عنقا گردد

آخر وہ پانچ بزرگوار جن کی قسمت میں مشیرالدولہ بننا لکھا ہے انہی لوگوں میں تو شامل ہیں، جو آج کل میاں عبدالباری صاحب کے دولتکدہ اور مسلم لیگ کے دفتر کا طواف کر رہے ہیں، پھر سلام کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ کم از کم ہزاروں سلاموں میں سے پانچ سلام تو ضرور نشانے پر بیٹھیں گے۔

اس معاملہ میں میاں عبدالباری صاحب کی حالت بالکل مختلف ہے، وہ پانچ نام منتخب کر کے پیش کر دیں تو باقی لوگ ناراض ہو جائیں گے، اس لئے انہیں چاہئے کہ یا تو پوری کی پوری فہرست مسٹر لیاقت علی خان کی خدمت میں پیش کر دیں، وہ جن لوگوں کو اس منصب کا اہل سمجھیں گے انہیں منتخب کر لیں گے یا پھر یہ سفارش کی جائے کہ ان تمام حضرات کو ایک ایک مہینے یا تین تین مہینے کے لئے باری باری مشیر بنایا جائے۔ آئندہ انتخابات کہیں دو سال کے بعد ہوں گے، اگر اس عہدہ کی میعاد تین مہینہ بھی قرار دی جائے تو اس ترکیب سے کوئی چالیس بزرگوار باری باری مشیر بننے کی سعادت حاصل کر لیں گے۔ بہر حال میاں عبدالباری صاحب کو اس "باری باری مشیر فار مولا" پر ضرور غور فرمانا چاہئے۔

---

۷ رجولائی

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت پاکستان کے بعض جدید احکام سے چند فقہی مسائل کا استخراج ہوتا ہے، جن پر پاکستان کی فقہ جدید کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔ مثلاً کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں سرکاری حکم کے رو سے جمعہ کو شراب خانے بند رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کو شراب پینا حرام ہے، لیکن یہ حکم صرف سندھ کے لئے ہے، مغربی پنجاب میں اتوار کو شراب کی دکانیں بند رہتی ہیں، اس کے علاوہ وہاں ہوٹلوں میں شراب پینا ممنوع ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پنجاب میں اتوار کے دن شراب پینا حرام ہے، اس کے علاوہ بر سرِ عام پینا بھی ناجائز ہے، ہاں گھروں میں چھپ کر پی لی جائے تو مضائقہ نہیں۔

پھر حکم ہوا کہ کراچی میں رمضان کے مہینے میں شراب خانے بند رہیں گے اور کوئی شخص بر سرِ عام شراب نہیں پی سکے گا، اس حکم سے عہدِ جدید کے فقہا نے یہ استدلال کیا کہ رمضان کے مہینے میں بر سرِ عام شراب پینا قاطبتہً ممنوع ہے، ہاں شراب کی بیع و شرا جائز ہے اور کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر پی لے تو اس پر احتساب نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ محتسب را درونِ خانہ چہ کار۔

جُوا اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، گھڑ دوڑ رمضان میں بھی ہو سکتی ہے اور اس پر روپیہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر رمضان کے مہینے میں کوئی شخص سارا دن ریس کورس میں بسر کرے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ اس پر کوئی کفارہ لازم آتا ہے۔

قحبہ خانوں کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے وہ امتناعِ شراب کے حکم سے ملتا جلتا ہے یعنی رمضان بھر کے لئے قحبہ خانے بند کر دیئے گئے ہیں، گانے سننے سنانے کی بھی ممانعت ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رمضان میں عصمت فروشی ناجائز ہے، طوائفوں کا گانا سننا بھی حرام ہے۔ البتہ ریڈیو، فلم اور تھیٹر میں جو گانا بجانا ہوتا ہے، وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے ان احکام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فقۂ جدید میں قمار بازی کا مرتبہ بہت اونچا ہے اور بینکوں کا سود بھی ہر حالت میں جائز ہے۔

یہ خیالات ہمارے نہیں، ہمارے ایک کرم فرما کے ہیں جو حکومتِ پاکستان کے جدید احکام کی روشنی میں فقۂ جدید مرتب کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں اس حرکت سے باز رکھنے کی بیحد کوشش کی، لیکن انہوں نے ایسے ایسے دلائل دیئے، جن کا جواب ہمیں نہیں سوجھ سکا۔ قمار بازی کے سلسلے میں ہم نے روس کی مثال پیش کرنی چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ روسی ملحد ہیں، اس لئے روس کی کوئی مثال ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ ہم نے عرض کیا، انگلستان اور امریکہ کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ بھی تو آخر اسلامی ملک ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں ملکوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے لیکن ان صاحب کے طریقِ استدلال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو کہنا پڑے گا، یہ جو اعلان ہوا ہے کہ خان ممدوٹ کے مقدمہ کی سماعت رمضان المبارک کے بعد ہو گی، تو اس سے یہ مسئلہ مستخرج ہوا کہ کسی صوبے کے وزیر اعظم پر رمضان کے مہینے میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔

---

۱۱ رجولائی

سنا ہے، ہندوستان میں روس سے کوئی تین لاکھ ٹن غلہ آچکا ہے اور ابھی چار لاکھ ٹن غلہ اور آئے گا۔

پنڈت نہرو کی سادگی ملاحظہ فرمایئے۔ ایک طرف تو وہ مغربی بنگال کے اشتراکیوں کی سرگرمیوں سے سخت پریشان ہیں، دوسری طرف اشتراکیوں کے ملک سے غلہ منگا کے خود کھا رہے ہیں، دوسروں کو کھلا رہے ہیں۔

اصل میں پنڈت جی کا خیال ہے کہ اشتراکیت صرف بھوک کی وجہ سے پھیلتی ہے اس لئے سب سے پہلے اسی مرض کا علاج کرنا چاہئے۔ لیکن انہیں بھوک کا علاج ہی کرنا تھا تو آسٹریلیا یا امریکہ سے گندم منگواتے، روسی گندم کا تو اُلٹا اثر ہوگا، کیونکہ اشتراکیت صرف بھوک ہی سے ترقی نہیں کرتی، روسی گیہوں سے بھی پھیلتی ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ ؎

ایں خمارِ خوردنِ گندم بود

راقم الحروف نے کل حضرت شعرائے کرام اور ان کے ناموں اور تخلصوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ ایک صاحب اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ کیا اچھا ہو کہ تخلص اور نام کے بجائے اعداد پر اکتفا کیا جائے، یعنی کوئی صاحب ۱۲۰ کہلائیں اور کوئی چار سو بیس، اگر یہ طریقہ اختیار کرنے میں یہ خیال مانع ہو کہ اس طرح کروڑوں تک شمار جا پہنچے گا تو اعداد کے ساتھ ساتھ حروف سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک صاحب ۲۰۴ الف اور دوسرے ۲۰۴ ب وقس علیٰ ہذا۔

ہمارے خیال میں اس طریقے سے اس کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں کہ دس سال کے بعد مردم شماری پہ جو روپیہ خرچ ہو جاتا ہے، وہ بچ جائے گا، ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ابجد کے حساب سے ہر شخص کے نام کے عدد نکال لئے جائیں اور ناموں کے بجائے انہیں رواج دیا جائے، اس

طریقہ سے اور کچھ نہیں، کم از کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ لوگوں کو تھوڑی سی ریاضی آجائے گی اور ریاضی آئے نہ آئے کم از کم ہر "عددی" قسم کا انسان اچھا خاصا ریاضی داں ضرور معلوم ہوگا، پھر خود ہی عدد خود ہی معدود، یعنی چپڑیاں اور دو دو۔

برہمنوں نے ناموں کے معاملہ میں اعداد کے استعمال کا ایک اور طریقہ نکالا ہے، یعنی جس بڑے پنڈت کی زیادہ تعظیم مقصود ہوتی ہے، اسے شری ۱۰۸ لکھا جاتا ہے۔ شری ۱۰۸ کے معنی یہ ہیں کہ یہ پنڈت جی اتنے بڑے ودّوان یا گیانی ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ۱۰۸ مرتبہ شری لکھنا چاہیئے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ طریقہ اردو میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً علامہ ۹۹۹ علاؤ الدین صدّیقی جس کے معنی یہ ہیں کہ صدیقی صاحب کے نام کے ساتھ ۹۹۹ مرتبہ علامہ لکھنا چاہیئے۔

لیجئے اتحادی قوموں کے کمیشن سے پھر کشمیر کے جھگڑے کا کوئی حل نہ ہو سکا، چنانچہ ہمارے نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ کمیشن اگست کے آغاز میں جینوا روانہ ہو جائے گا وہاں اطمینان سے بیٹھ کے رپورٹ مرتب کرے گا، پھر لیک سکس پہنچ کے سکیورٹی کونسل کے سامنے وہی رپورٹ پیش کر دے گا۔ پاکستان سے جینوا اور جینوا سے لیک سکس تک کی منزلیں پہلے بھی طے کر چکا ہے اس لئے امید ہے کہ اب کے اس کا سفر بخیر و خوبی کٹے گا اور وہ چند ہفتوں میں پھر آموجود ہوگا۔ گویا گرمی کی تعطیلات صرف سکولوں ہی میں نہیں ہوتیں، کشمیر کمیشن بھی تعطیلات مناتا ہے، بلکہ "مسئلہ کشمیر" کو بھی ان موسمی تعطیلات سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ گرمی کی چھٹیوں میں کشمیر جایا کرتے تھے؛ اب "مسئلہ کشمیر" خود گرمی کی تعطیلات میں جینوا اور جینوا سے لیک سکس چلا جاتا ہے، اس لئے ہمارے آپ کے لئے گرمی کے موسم میں کشمیر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۷ر جولائی

ان دنوں سرفرانسس موڈی کی جانشینی کا مسئلہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس سلسلے میں بڑی دلچسپ قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں، ہمارے خیال میں مرکزی حکومت کو چاہئے کہ پانچ مشیروں میں سے ایک صاحب کو ترقی دے کے گورنر مقرر کر دے اور اگر باری صاحب کو یہ گوارا نہ ہو تو ان پانچوں کو باری باری مقرر کیا جائے تاکہ "باری کے بخار" کی طرح "باری کا گورنر" بھی زبان زدِ خاص و عام ہو کے رہ جائے۔

ہمارے بعض معاصرین کو اندیشہ ہے کہ سرفرانسس موڈی کہیں اپنا ڈنڈا جو عام طور پہ گورنرڈنڈا کہلاتا ہے، ساتھ ہی نہ لے جائیں۔ ہمارے خیال میں یہ اندیشہ غلط ہے سرفرانسس موڈی کے پاس ڈنڈا کہاں سے آیا جسے آپ گورنر کا ڈنڈا کہتے ہیں وہ تو اصل میں الف کا ڈنڈا ہے جو دفعہ ۹۲ کے ساتھ نتھی ہے۔ اب یہ تو ہونے سے رہا، کہ سر فرانسس موڈی دفعہ ۹۲ الف کو کٹ بیگ میں رکھ کے ولایت لے جائیں، اور ہم ادر آپ کچھ نہ کر سکیں۔

ہمارا ایک معاصر لکھتا ہے،

"ایک مشرقی حکیم کا قول ہے ؎

اندروں از طعام خالی دار　　　تا دراں نورِ معرفت بینی

معدہ خالی رہے تو اس میں ضرور نورِ معرفت جلوہ گر ہونے لگتا ہے، لیکن جس شخص کی زندگی کا نصب العین ہی شکم پُری ہو، وہ شکم کو خالی کیوں کرنے لگا؟"

اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے لوگ بھوکے رہتے ہیں، ان سب کے معدے نورِ معرفت سے روشن ہیں، جن مہاجرین نے کئی کئی دن فاقہ کشی کی ہے، ان کے عارف باللہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور جو لوگ بنگال کے قحط کے شکار ہو گئے ہیں، ان سب کو تو زبدۃ العارفین

کہنا چاہیئے۔

اگر عرفانِ الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ تمام اہلِ پاکستان کو اِس نعمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچائے، یہ تو کسی طرح درست نہیں کہ کچھ لوگ تو فاقے کر کر کے عارف باللہ بن جائیں اور زبدۃ العارفین کہلائیں اور کچھ دونوں وقت پیٹ بھر کے کھانا کھائیں اور عرفانِ الٰہی کی نعمت سے بالکل ہی محروم رہ جائیں! یہ بڑی بے انصافی ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ تو دولتِ عرفان لُوٹے لئے جا رہے ہیں اور مغربی پاکستان والے اُن کا مُنہ تک رہے ہیں، یہ درست ہے کہ عرفان کی دولت مغربی پاکستان کے لوگوں کو بھی ایک حد تک نصیب ہے، یعنی ہمارے ہاں بھی ایسے ایسے عارف باللہ موجود ہیں جن کے معدے میں مسلسل کئی کئی دن نورِ معرفت جلوہ گر رہتا ہے، لیکن مشرقی پاکستان کے عارفانِ کامل سے ہمارا کیا مقابلہ؟

۱۸ر جولائی

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں ماں باپ کے رکھے ہوئے نام پسند ہوں۔ بعض نوجوان اپنے نام میں تھوڑی سی قطع و برید کر کے اسے اپنے ڈھب کا بنا لیتے ہیں، بعض اسے بالکل ہی بدل دیتے ہیں اور بعض کچھ اس قسم کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ پرانا نام بالکل نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ناموں کی "مرمت" کا یہ سلسلہ مدت سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

مثلاً ایک صاحب کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ عام دستور کے مطابق اس پر شیخ کا اضافہ ہُوا اور وہ شیخ عبدالرحمٰن کہلانے لگے، کچھ عرصہ کے بعد اس پرانے انداز کے نام سے طبیعت اکتا گئی انہوں نے نام کو بالکل الٹ دیا اور عبدالرحمٰن شیخ بن گئے، تھوڑے دنوں

میں عبدالرحمٰن گھس پس کے رحمٰن بن گیا اور وہ رحمٰن شیخ کہلانے لگے، اس نام سے بھی جلد طبیعت اُکتا گئی اور آرشیخ پر خاتمہ بخیر ہُوا ع

سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

اور یہ بات کچھ "شیخ" ہی پر موقوف نہیں "ملک" کا بھی یہی حال ہے، پہلے "ملک" نام سے پہلے لکھا جاتا تھا اب نام کے بعد لکھا جاتا ہے۔ مثلاً رحمان ملک، مجید ملک، اور جمیل ملک وغیرہ۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ تخلّص نام کے بعد لکھا جاتا ہے، لیکن اس پرانے قاعدے سے بھی لوگوں نے انحراف کرنا شروع کر دیا ہے، مثلاً عبدالمتین عارف ایک ترقی پسند شاعر ہیں جن کی نظمیں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں، انہوں نے حال ہی تخلّص کو "اتار" کے نام کے آگے لگا لیا ہے یعنی اب وہ اپنے آپ کو عارف عبدالمتین لکھتے ہیں، یہ رواج چل پڑا تو عبدالمجید بھٹی کو بھٹی عبدالمجید کہلانا پڑے گا، بھٹی ہرچند تخلّص نہیں لیکن تخلّص سے مشابہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک پرانے لوگوں میں سے ہیں اس لئے وہ عارف عبدالمتین صاحب کی پیروی میں سالک عبدالمجید کہلانا گوارا نہ کریں گے، لیکن اگر یہ طریقہ چل نکلا اور لوگوں نے انہیں سالک عبدالمجید کہنا شروع کر دیا تو وہ کیا کریں گے؟ عارف عبدالمتین صاحب پر بھی اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، تخلّص ان کی ذاتی ملکیت ہے، اتار کے جہاں چاہیں لگا لیں۔

ایک زمانے میں کلکتہ کے جاہل لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کو، مولوی آزاد کلام بلکہ آجاد کلام کہا کرتے تھے اور پڑھے لکھے لوگ ان پر ہنستے تھے، کیا خبر تھی کہ ایک زمانے میں ناموں کا یہی انداز ہو جائے گا، یعنی تخلّص کو اتار کے نام کے آگے لگا لینا ہی فیشن سمجھا جائے گا۔

بہرحال ہمارا خیال ہے کہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ ابھی ناموں میں مزید قطع و برید ہوگی، کیا عجب ہے کہ عارف متین عبدل اور سالک مجید عبدل کی قسم کے نام بھی سنائی دینے لگیں اور چراغ حسن حسرت بھی حسرت حسن چراغ بن کے رہ جائے گا۔

ناموں کے اس انقلاب سے صرف فیض احمد فیض اور عابد علی عابد محفوظ رہ جائیں تو اور بات ہے، ورنہ ہمیں تو کسی اور شاعر کی خیر نظر نہیں آتی۔ فیض اور عابد کے محفوظ رہنے کا سبب بھی یہ ہے کہ ان کے نام کے آگے پیچھے تخلّص اس طرح لگا ہوا ہے جس طرح شملہ جانے والی گاڑی میں آگے پیچھے دو انجن لگے ہوتے ہیں، ورنہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کو تبسّم مصطفےٰ صوفی اور ڈاکٹر ایم، ڈی تاثیر کو تاثیر ایم، ڈی، پی، ایچ، ڈی ڈاکٹر کہلانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا۔ ہمیں سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر مولانا غلام رسول بدقسمتی سے مہر غلام رسول بن کے رہ گئے تو ان میں اور مہر علم دین میں کیا فرق رہ گیا؟

۲۰ر جولائی

کچھ عرصہ ہوا، بیروزگاری دور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی اور شیخ صادق حسن صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے تھے، اس کمیٹی نے ایک سوال نامہ مرتب کیا، جس میں لوگوں سے پوچھا گیا تھا کہ بے روزگاری دور کرنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے جائیں؟ یہ سوال نامہ ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کیا گیا، لیکن دو اشخاص کے سوا کسی نے اس کا جواب دینے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔

ہمارے خیال میں یہ سوال نامہ چھاپنا اور تقسیم کرنا ہی سرے سے غلط تھا، لوگوں نے اشتہار اور پمفلٹ تو ضرور دیکھے ہیں، اس قسم کے سوال نامے آج تک نہیں دیکھے، اس لئے اگر لوگوں نے اسے بھی بے روزگاری کمیٹی کا اشتہار سمجھا اور اسے پڑھ کے پھینک دیا تو اس میں ان کا

کیا قصور؟

بے روزگاری کمیٹی اس لئے قائم کی گئی تھی کہ لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کے طریقے معلوم کرے، اس نے خود کوئی طریقہ معلوم کرنے کے بجائے لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا، اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کسی نجومی سے رجوع کیا جاتا، کشائش رزق کا وظیفہ پڑھا جاتا یا کسی پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے تعویذ کی درخواست کی جاتی۔ اس طرح اور کچھ نہ سہی کم از کم نجومیوں اور پیروں کے لئے تو روزگار مہیا ہوتا۔

اور صرف نجومیوں اور پیروں پر کیا موقوف ہے، اگر بے روزگاری کمیٹی اپنا سوال نامہ دس لاکھ کی تعداد میں چھپوائے اور اسے بانٹنے کے لئے ایک سو آدمی مقرر کئے جائیں تو ان ایک سو آدمیوں کے علاوہ چھاپہ خانہ والوں کے لئے بھی روزگار مہیا ہو جائے گا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ بے روزگاری کمیٹی یا اس قسم کی کوئی اور جماعت بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کر سکتی ہے، اگر اس ترکیب سے بے روزگاری کمیٹی کے ارکان کے لئے روزگار مہیا ہو جائے تو اسی کو غنیمت سمجھئے۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ میاں عبدالباری بیروزگاری کمیٹی سے زیادہ مفید کام کر رہے ہیں، انھوں نے آخر کسی نہ کسی طرح یہ اصول تو منظور کرا لیا کہ پانچ اشخاص کو گورنر کا مشیر مقرر کیا جائے گا۔ گویا اس طرح پانچ بیروزگاروں کے لئے روزگار مہیا ہو جائے گا اور خدا نے چاہا تو ان پانچ کے طفیل اور سینکڑوں کنبوں کی گذر اوقات کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ گویا میاں عبدالباری اور بہت کچھ ہونے کے علاوہ اچھی خاصی بے روزگاری کمیٹی بھی ہیں، شیخ صادق حسن صاحب کو سوالنامے شائع کرنے اور عوام سے بیروزگاری دور کرنے کے طریقے دریافت کرنے کے بجائے میاں صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا چاہئے۔

ہمارے ہاں یار لوگوں نے بیروزگاری جیسے اہم مسئلہ کو ہنسی دل لگی سمجھ رکھا ہے جب

ہر طرف سے شور مچا کہ بیروزگاری کے سوال کا کوئی نہ کوئی حل ہونا چاہئے، شیخ صادق حسن جیسے "باروزگار" بزرگ کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی، اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ چھاپ دیا اور جب دو اشخاص کے سوا اور کسی نے اس کا جواب نہ دیا تو یہ کہہ کے چُپ ہو رہے کہ لوگوں کو بے روزگاری کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں، ہم کیا کریں؟ شکر ہے بے روزگاری کمیٹی نے لوگوں کی اس سرد مہری اور بے توجہی سے یہ نتیجہ نہیں نکال لیا کہ مغربی پنجاب میں صرف دو اشخاص بے روزگار ہیں۔

۲۷ر جولائی

مولوی صادق علی صاحب کو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے؛ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کا ذہن چرا لیا گیا ہے، حال میں مولوی صاحب نے ہمارے نام ایک لمبا خط لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت کو مشیروں کی ضرورت ہے تو فقیر کی خدمات حاضر ہیں، کسی نہ کسی طرح میرا نام بھی مشیروں کی فہرست میں درج کرا دیجئے، خدا نے چاہا تو مغربی پنجاب کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ گویا مولوی صادق علی صاحب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مشیر بننے کے لئے ذہن کا ہونا ضروری نہیں بلکہ وہی لوگ اس عہدے کے لئے موزوں ہیں جو مولوی صاحب کی طرح بالکل "بے ذہن" ہوں۔

بہر حال اگر اب بھی مشیروں کے تقرر کا کوئی امکان ہے تو ہم میاں عبدالباری صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ مشیروں کی فہرست میں مولوی صادق علی کا نام بھی شامل کر لیں، مولوی صاحب انگریزی بھی جانتے ہیں، عربی میں بھی دسترس رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ذہن سے بالکل محروم ہیں، ایسے بے ضرر اور "بے ذہن" شخص کو تو ضرور "مشیری" کا عہدہ ملنا چاہئے۔

سردار شوکت حیات خاں اس سے پہلے ایک بیان چھپوا چکے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حکومت کو میرے متعلق شبہات ہیں تو خان ممدوٹ کی طرح مجھ پر بھی مقدمہ چلایا جائے۔ حال ہی میں ان کا ایک اور بیان اخباروں میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بڑے شدّ و مدّ سے فرمایا ہے کہ مجھ پر بعض اخباروں نے جو الزام لگائے ہیں، ان کی تحقیقات کی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ "بن مانگے موتی ملیں اور مانگے نہ ملے بھیک" لیکن سردار شوکت حیات کو بھی یوں "مجھ پر مقدمہ چلاؤ، مجھ پر مقدمہ چلاؤ" کے نعرے نہیں لگاتے رہنا چاہیئے، کیا عجب ہے کہ ان پر سچ مچ ہی مقدمہ چلا دیا جائے، اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم انہیں خطاکار سمجھتے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ مقدمہ آخر مقدمہ ہے، وکیلوں کے پیچھے مارے مارے پھرنے اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے سے آخر فائدہ ہی کیا ہے؟

۲۱ر جولائی

انبالہ میں پچھلے دنوں آموں کی نمائش ہوئی جس میں میجر جنرل سنت سنگھ نے کہا کہ ہندوستان میں جو آم پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی ڈھائی سو قسمیں ہیں۔ لیکن جنڈیل صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ سکھوں کی بھی ڈھائی سو قسمیں ہیں اور کانگریسیوں کی قسموں کا حساب لگایا جائے تو کوئی پانچ سو تک جا پہنچتی ہیں، پھر سوشلسٹ ہیں اور ان کی مختلف قسمیں ہیں، راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا والے ہیں، جن کی قسموں کا کوئی شمار ہی نہیں۔

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کا ارشاد ہے کہ نہرو اور پٹیل ناکام ہو چکے ہیں، اس لئے جے پرکاش نرائن کو ہندوستان کا وزیر اعظم مقرر کر کے حکومت کا سارا نظم و نسق ان کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس تکلّف میں پڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ مسٹر جے پرکاش نرائن کو دلّی میں راج سنگھاسن پر بٹھا کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، مہا منتری کیوں نہیں بن جاتے تاکہ سارے

ولدرّ دور ہو جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر اشومیدھ یگیہ رچانے کا بھی کوئی انتظام ہو جائے تو مسٹر جے پرکاش نرائن آٹھوں گانٹھ چھتر پتی بن جائیں گے اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا والے بھی ان کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ باقی رہے کمیونسٹ، تو اس ترکیب سے ان کا نیا پانچہ کرنا بھی آسان ہے، اصل میں یہ کم بخت کمیونسٹ رب کے سب اُسر اور راکھشس ہیں اور مسٹر جے پرکاش نرائن، شری گو الکر مہاراج، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل سب کے سب دیوتا اور رشی منی۔ اسروں اور راکھشسوں کی کیا مجال کہ دیوتاؤں کے سامنے ٹھہر سکیں۔

پنڈت نہرو ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ ہندوستان کی موجودہ حکومت ہرگز مذہبی حکومت نہیں، لیکن یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں، ورنہ پنڈت جی اور ان کے ساتھی ہندوستان کی حکومت کو مذہبی حکومت ہی سمجھتے ہیں اور حال میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا سے کانگرس کا جو گٹھ جوڑ ہوا ہے، اس نے اس معاملہ میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی اب اگر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہمت کر کے مسٹر جے پرکاش نرائن کو دلی کے راج سنگھاسن پر بٹھا دیں تو جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے گی۔

ہندوستان کی موجودہ حکومت پر مذہب کا اثر جتنا گہرا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے نام رکھنے میں ویدوں، پرانوں اور سنسکرت کی دوسری قدیم کتابوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً سوراشٹر، ہماچل پردیش، راجستھان، مدھیہ بھارت وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دنوں کے بعد دیکھ لیجئے گا کہ انگہ، بنگہ، کالنگہ، مگدھ، پنچال، ہستنا پور، جبدی وغیرہ کی قسم کے نام بھی سننے میں آئیں گے۔ یعنی یہ لوگ ہندوستان کا سارا جغرافیہ ہی بدل کے رکھ دیں گے۔

یکم اگست

آج شام کو "اوپن ایر تھیٹر" میں "شاعروں کی عید" کے نام سے ایک مشاعرہ ہو رہا ہے گویا عید پیچھے پڑ اور پڑ پیچھے شاعروں کی عید، سکھ ہولی سے ایک دن بعد ہولی کا تیوہار مناتے ہیں اور اسے ہولا کہتے ہیں۔ شاعر عید سے تیسرے دن عید مناتے ہیں، اس لئے ہمارے خیال میں ان کی عید کو "عیدن" اور اگر شاعروں کو سکھوں کے تتبع پر اصرار ہو تو "عیدا" کہنا چاہئے

ع

اوروں کے بستی ہیں تو یاروں کا بستا

پہلے وائی، ایم، سی، اے یا ایس، پی، ایس، کے ہال میں مشاعرے ہوتے تھے اور اوپن ایر تھیٹر ڈراموں کے لئے مخصوص تھا۔ اب مشاعرہ پسپا ہو کے اوپن ایر تھیٹر میں آ گیا ہے اور وائی، ایم، سی، اے ہال میں تھیٹر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ مشاعرہ تو خیر شاعروں کی عید ہوا، تھیٹر کو کیا کہئے گا؟ ایکٹروں کی عید یا "ایکٹروں کی عیدن" اس لحاظ سے تو ٹکٹ پر جو دام خرچ ہوتے ہیں، انھیں بھی "عیدی" کہنا پڑے گا۔

عید اور پڑ کے موقع پر سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکٹ ہوئی یعنی نو آنے کا ٹکٹ ڈھائی اور تین روپے میں بکا، یہ بلیک مارکٹ والوں کی عید ہے۔ عید کو سینما سے اس لئے بھی بڑا تعلق ہے کہ لاہور کے کئی سینما انبالہ کے ایک مہاجر چودھری عید محمد کے قبضے میں ہیں۔

اگر سر فرانسس موڈی استعفے دے کے سردار عبدالرب نشتر کے لئے جگہ خالی نہ کر جاتے تو ہم کہتے مشیروں کی عید کے نام سے دلّی دروازے کے باہر ایک جلسہ ہو جانا چاہئے، لیکن موڈی صاحب کے استعفے نے اوّا ہی اڑا دیا۔ اب "مشیری" کی مکھی بیٹھے تو کہاں بیٹھے اور مشیروں کی عید ہو تو کیونکر ہو؟ وزارت کے امیدواروں کے ساتھ بھی یہی گزری تھی یعنی سلی سلائی اچکنیں درزیوں کے ہاں پڑی رہ گئیں۔

شاعروں کی عید، ایکٹروں کی عید، وزیروں کی عید، مشیروں کی عید، حلوائیوں کی عید، نائیوں کی عید، دھوبیوں کی عید، ایک دو عیدیں ہوں تو کوئی گنوائے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ عیدوں کی فہرست ختم ہونے ہی میں نہیں آتی، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ شاعر اگر مشاعرہ میں شعر پڑھ دے تو اس کی عید کیسے ہو گئی، ہم نے تو کبھی کبھی مشاعروں میں شاعروں پر ایسی لے دے ہوتی دیکھی ہے کہ مشاعرہ پر جسے آپ عید کہتے ہیں، ہولی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اور مشاعرہ شاعروں کی عید ہے تو گھڑ دوڑ کو گھوڑوں کی عید کہنا چاہئے اور ایسے موقعوں پر دانہ گھاس معمول سے زیادہ مل جائے تو اسے عیدی کہہ لیجئے۔ ہمارا خیال ہے کہ انجمن فکر و نظر نے جس کے اہتمام سے شاعروں کی یہ عید منائی جا رہی ہے، عید کا مفہوم ہی بالکل بدل کے رکھ دیا ہے، یوں تو ایرانی شاعر نے بھی کہا ہے کہ ؎

از گلستاں گل بہ بازار آمدہ
عید مرغانِ گرفتار آمدہ

لیکن اس نے ایسی دھاندلی تو نہیں کی کہ عید کا مفہوم ہی یکسر بدل دیا ہو۔

مشاعرہ اگر عید ہے تو داد کو عیدی کہنا پڑے گا اور کچھ عرصہ کے بعد دیکھئے گا کہ اخباروں اور رسالوں میں مشاعروں کی روئدادیں چھپیں گی تو اُن میں یہ لفظ بھی موجود ہو گا، یعنی آپ کو اس قسم کے فقرے بھی نظر آئیں گے "ثاقب زیروی صاحب کو سب سے زیادہ عیدی ملی"۔

---

۳ راگست

لاہور کے ایک ہفتہ وار اخبار نے "کرسی کی کہانی" کے عنوان سے ایک مضمون چھاپا ہے، جس میں ایک کرسی کی زبانی اس کی آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ یہ کرسی پہلے ایک سیٹھ صاحب کے ڈرائنگ روم میں پڑی رہی، پھر ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی جو اس کے صحیح رتبہ اور مقام

سے ناواقف تھے، اس لئے بیچاری کرسی پر ان کے ہاتھوں بڑی بڑی مصیبتیں آئیں اور وہ لنجی اور لنگڑی ہو کے رہ گئی۔

مضمون بچوں کے لئے ہے، اس لئے مضمون نگار نے ایسی ہی باتیں لکھی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں آسانی سے آسکیں، ورنہ اگر پنجاب کی سیاسیات کو سامنے رکھ کر "کرسی کی کہانی" کے عنوان سے بڑے بوڑھوں کے لئے مضمون لکھا جائے تو بہت سی کام کی باتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً وزارت اور صدارت کی کرسیوں کے لئے جو لڑائیاں ہوئی ہیں، اگر اس داستان میں ان سب کا ذکر کیا جائے تو مغربی پنجاب کی سیاسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ پانی پت کی تین لڑائیوں کی طرح کرسیوں کی بھی تین لڑائیاں ہیں، پہلی لڑائی لیگ کے عہدہ داروں کے انتخاب کے موقع پر ہوئی اور تیسری اور آخری لڑائی ایک مشاعرے میں جس کی صدارت شیخ صادق حسن کر رہے تھے۔ پہلی لڑائی کے "ابراہیم لودھی" علامہ علاؤ الدین صدیقی تھے اور تیسری لڑائی کے بسواس راؤ—— خیر اس قصے کو جانے دیجئے، ہمیں تاریخ سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں، اس لئے ڈر ہے کہ کوئی غلط بات زبان سے نہ نکل جائے۔

لکھنؤ کے قریب کرسی ایک بستی ہے۔ جہاں کے بیوقوف مشہور ہیں۔ لاہور کو احمقوں کے لئے الگ بستی بسانے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ یہاں کرسی اپنے لئے احمق اور احمق اپنے لئے کرسی تلاش کر لیتے ہیں۔ یوں تو لاہور کے نواح میں قصور کا شہر بھی موجود ہے، جہاں انجمن احمقانِ قصور کے نام سے ایک انجمن بھی قائم ہے، لیکن اس انجمن کے ممبروں کو نہ کرسی نصیب ہوئی نہ صوبہ بھر کی حماقت الاٹ ہو سکی۔

بہار میں بھی بارہ ایک قصبہ ہے، جہاں کے لوگ حماقت کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ تقسیمِ ہند کے موقع پر اور چیزیں تو ہندوستان اور پاکستان میں بحصّہ رسد تقسیم کر لی گئیں، لیکن "کرسی" اور "بارہ" کی حماقت کو ناقابلِ تقسیم سمجھ کے ہندوستان ہی کی تحویل میں رہنے

دیا گیا، شکر ہے کہ کرسی کے احمقوں کے ہندوستان کے قبضہ میں چلے جانے سے ہمیں جو نقصان پہنچا تھا جاہ و منصب کے طلب گاروں یعنی کرسی کے شیدائیوں نے اس کی تلافی کر دی۔

---

۴ اگست

سُنا ہے، سردار عبدالرب نشتر کی تشریف آوری کی خوشی میں آج مغربی پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے غربا کو کھانا کھلایا جائے گا، یوں تو بھوکوں کو کھانا کھلانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک لیگ والوں نے حصولِ ثواب کے لئے جو موقع تلاش کیا ہے وہ کچھ ایسا موزوں نہیں، غربا کو اس قسم کی دعوتوں کی چاٹ پڑ گئی تو وہ کہیں یہ دعا مانگنا نہ شروع کر دیں کہ الٰہی ایسے موقعے آئے دن نکلتے رہیں یعنی گورنر جلد جلد بدلا کریں۔

مسلم لیگ ملک سے افلاس کو دور کرنے کا دعوےٰ لے کے اُٹھی تھی۔ لیکن اب اس کا کام لے دے کے صرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی نیا گورنر آئے تو لاہور کے غربا کو ایک وقت کا کھانا کھلا دیا کرے، گویا لیگ کا تازہ فیصلہ یہ ہے کہ غربا کو نئے گورنر بہادر کی تشریف آوری کے موقع پر ہی ایک وقت کا کھانا ملنا چاہیئے۔ بہرحال لیگ نے ملک کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش تو کر ڈالی، یعنی غربا کے لئے ایک وقت کے کھانے کا انتظام تو کر دیا اور اگر سکول موسمی تعطیلات کی وجہ سے بند نہ ہوتے تو کالجوں اور ہائی سکولوں میں نہ سہی پرائمری اور مڈل سکولوں کے طلبہ میں لڈو بھی بٹوا دیئے جاتے، نہ جانے لوگ پھر بھی کیوں کہے جا رہے ہیں کہ مسلم لیگ کچھ نہیں کرتی۔

آپ کو یاد ہوگا، مشہور فلم ایکٹرس ممتاز شانتی کے ہندوستان جانے پر مغربی پنجاب کی مسلم لیگ کی طرف سے اخباروں میں ایک پریس نوٹ چھپا تھا، ہمیں یقین ہے کہ اب کے ممتاز شانتی لاہور آئی تو ملک کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی جائے گی یعنی لیگ کی طرف سے

اسکولوں میں لڈو ضرور بٹیں گے۔

اصل میں لیگ صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ علمی، ادبی، اقتصادی تجارتی فلمی جماعت بھی ہے تو ایک زمانے میں لاہور سے ست قلندر اور مستانہ جوگی کی قسم کے علمی، ادبی، تجارتی، سیاسی، اقتصادی، طبی رسالے نکلتے تھے، اب اللہ کے فضل سے لیگ جیسی جماعت موجود ہے جو علمی فلمی، ادبی، طبی، سیاسی، معاشری سبھی کچھ ہے یعنی اسے ہمارے صوبے کی مجالس میں امرت دھارا کی حیثیت حاصل ہے جسے مناسب بدرقہ کے ساتھ ہر جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا، ہم صوبائی لیگ کے ارباب اختیار سے صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس موقع پر آپ لوگوں نے حصولِ ثواب ہی پر کمر باندھی ہے تو اپنے اس فیصلہ پر کہ صرف پرانے گورنر کے جانے اور نئے گورنر کے آنے پر غربا کو کھانا کھلایا جائے نظرِ ثانی فرمایئے یعنی ممکن ہو تو اضلاع اور تحصیلوں کی لیگوں کو حکم دے دیجیے کہ وہ نئے ڈپٹی کمشنروں اور تحصیلداروں کے تقرر پر بھی اپنے اپنے علاقے میں غربا و مساکین کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا کریں بلکہ ہم تو کہیں گے کہ ایسے مبارک موقعوں پر لیگ کے خرچ سے گھوڑوں کے لئے بھی دانہ اور گھاس مہیا کیا جائے لیکن لیگ کے نقار خانے میں ہماری کون سنتا ہے۔

---

۵ راگست

"پاکستانی گورنر کی آمد کا خوشگوار اثر" کے عنوان سے ایک اشتہار بعض اخباروں میں چھپا ہے، اشتہار لاہور کے ایک ڈاکٹر صاحب کی جانب سے ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ سردار عبدالرب نشتر کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک تو شربت فولاد اور کھانسی کی دوا ٹانسو کی قیمت کم کر دی گئی ہے، دوسرے ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ غریبوں کا علاج مفت کیا کریں گے۔

یہ لیجئے، سرکلر روڈ کے یہ ڈاکٹر صاحب پنجاب مسلم لیگ سے بازی لے گئے، لیگ نے تو غریبوں کو صرف ایک وقت کا کھانا ہی کھلایا ہے، ان ڈاکٹر صاحب نے غریبوں کا علاج مفت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جن غربا کو مسلم لیگ کے خوانِ نعمت کی ریزہ چینی کے بعد سوءِ ہضم کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو، انہیں سرکلر روڈ کا رُخ کرنا چاہیئے۔

لیگ والے چند سو غریبوں کو ایک وقت کا کھانا کھلا کے سمجھے تھے کہ بہت بڑا تیر مارا، سرکلر روڈ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے ثابت کر دیا کہ لاہور میں ابھی اللہ کے ایسے ایسے بندے پڑے ہیں جو چاہیں تو لیگ سے بھی بازی لے جائیں۔

پچھلے دنوں لالہ نانک چند نازؔ ایڈیٹر "پربھات" لاہور آئے تھے "پربھات" میں انہوں نے اپنے سفر کی روئداد کئی قسطوں میں لکھی ہے، جس میں انہوں نے لاہور کی ایک صحبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ نازؔ صاحب کا بیان ہے کہ آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر "چٹان" نے انہیں اپنے دفتر میں مدعو کیا، حاضرین میں کئی اخبار نویس بھی شامل تھے، شورش صاحب نے لالہ جی سے چٹان کے لئے نظم کی فرمائش کی، نازؔ صاحب نے قلم اٹھایا اور نظم لکھ ڈالی لیکن "چٹان" میں جو نظم چھپی ہے۔ اس کے ساتھ نازؔ صاحب کا ایک خط بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ نظم لاہور میں نہیں بلکہ جالندھر جا کے لکھی تھی، خط کا مضمون ملاحظہ ہو:

پیارے بھائی شورش صاحب

جس محبت کے جذبے سے آپ مجھے لاہور میں ملے، اس نے ممنونِ احسان بنا لیا، معذرت چاہتا ہوں کہ مصروفیت کے باعث آتی دفعہ آپ کو نہ مل سکا، نہ ہی آپ کی فرمائش کے مطابق "چٹان" کے لئے نظم پیش کر سکا لیکن یہاں آ کر چند شعر لکھے ہیں۔ جنہیں پیش کرتا ہوں، پسند آئے تو چھاپ لیں۔

آپ کا نازؔ

بہتر ہوتا اگر نازؔ صاحب "پربھات" کا یہ پرچہ جس میں اس محفل کا ذکر ہے لاہور نہ بھجواتے

بعض شاعروں کو شکایت ہے کہ پچھلے دنوں اوپن ائیر تھیٹر میں "شاعروں کی عید" کے نام سے جو مشاعرہ ہُوا تھا، اس میں ان کا کلام ریڈیو پر ریلے نہیں کیا گیا، یعنی ان شاعروں کو ریڈیو سننے والوں کی داد یعنی "عیدی" میں سے کوئی حصّہ نہیں ملا۔ ان حضرات کو تعجّب ہے کہ یہ کیسی "شاعروں کی عید" تھی، جس میں نہ "سویاں" نہ "عیدی"۔ پھر ستم یہ ہے کہ بعض لوگوں کو تو ایک مرتبہ بھی ریڈیو کے ذریعے اپنی آواز اپنے عزیزوں اور دوستوں تک پہنچانے کا موقع نہیں دیا گیا اور حیرت شاہ وارثی کو دوہری عیدی ملی یعنی ان سے دو مرتبہ پڑھوایا گیا، حالانکہ نہ تو حیرت شاہ صاحب کے کلام میں کوئی خصوصیت ہے نہ آواز میں، وہ محض نشان کے ہاتھی ہیں یعنی دیکھنے والوں پر ان کی وضع اور لباس کا بڑا اثر پڑتا ہے، اس لئے ریڈیو کے لئے بالکل بے مصرف ہیں، انہیں "سننے سنانے" کے لئے نہیں بلکہ صرف "دیکھنے دکھانے" کے لئے محفوظ رکھنا چاہئے تھا۔

حیرت شاہ صاحب دوسری مرتبہ پڑھ چکے تو مولانا تاجور نجیب آبادی کی باری آئی۔ انہوں نے کلام سنانے سے پہلے کہا "ہر چند کہ حیرت شاہ وارثی کے بعد شعر سنانا خودکشی کرنا ہے، لیکن مجبوراً ایک نظم عرض کرتا ہوں"۔ نظم اچھی خاصی اور استادانہ تھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مولانا تاجور کی پیش گوئی ایک حیثیت سے درست ثابت ہوئی یعنی جب وہ نظم پڑھنے لگے تو سامعین نے کچھ ایسی چپ سادھ لی، گویا ان سب نے خودکشی کر لی ہے۔

---

۱۲ / اگست

کراچی میں اب کے جس زور کی بارش ہوئی ہے اُس کی مثالیں اس شہر کی تاریخ میں بہت کم ملیں گی، ایک صاحب کا بیان ہے کہ ایک امیر ابن امیر سے جو کوٹھی میں رہتے ہیں اور کار میں اڑے پھرتے ہیں، اس واقعہ کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگے "یہ طوفانِ باد و باراں مہاجرین ہی اپنے ساتھ لائے ہیں، ورنہ کراچی میں کبھی ایسی بارش نہیں ہوئی تھی"۔ میں نے عرض کیا "بارش

سے تکلیف بھی تو انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو فٹ پاتھ پر نیلے آسمان کی چھت تلے زندگی بسر کرتے ہیں یا ٹاٹ کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، آپ کو اس قصّے سے کیا واسطہ، دیکھئے اشرف علی خاں کی زبان اگرچہ پرانی ہے، لیکن اس کا یہ شعر کتنا آپ کے حسبِ حال ہے ؎

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سُرخ کا
کیا تیری آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

اگر کراچی کے بعض لمراواقعی یہ سمجھتے ہیں کہ مہاجرین اپنے ساتھ بارش لے کے آئے ہیں تو انہیں کسی ایسے علاقے میں بسانا چاہیئے، جہاں بارش کی سخت ضرورت ہے۔ کیا عجب ہے کہ خشک صحرا ان کے فیضِ قدوم سے سرسبز ہو جائیں اور مہاجرین بھی فٹ پاتھ پر سونے کی زحمت سے نجات پائیں۔ شکر ہے، ہندوستان کی حکومت کو خبر نہ ہونے پائی کہ مہاجرین بادلوں کو بھی بغل میں داب کے پاکستان لئے جا رہے ہیں، ورنہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی پاکستان نہ آنے پاتا اور سارا مال سرحد ہی پر رکھوا لیا جاتا، اگرچہ جامہ تلاشی کا بندوبست معقول تھا لیکن تلاشی لینے والوں کو نقدی کی تلاش تھی، اس لئے مہاجرین بادلوں کو بغل میں داب کے صاف نکل آئے۔ دریاؤں کے پانی پر پہلے ہی جھگڑا ہو رہا ہے، یہ بادلوں کا قصہ بھی ہندوستان تک پہنچ گیا تو کوئی عجب نہیں کہ نزاع کی ایک اور صورت نکل آئے۔

لیاری کا علاقہ کراچی کا ایسا حصہ ہے جہاں پینے کے لئے پانی ملے نہ ملے، جا بجا ایسے چھوٹے چھوٹے جوہڑ موجود ہیں۔ جن میں پانی لیٹا ہوا نیلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے یوں تو افیونیوں کو پانی سے بَیر ہے لیکن لیاری کے علاقے میں پانی نے افیونیوں کی سی وضع اختیار کر رکھی ہے، بارش کے بعد تو یہ علاقہ مجمع الجزائر بن گیا ہے یعنی ہر طرف پانی مست پڑا اینڈ رہا ہے اور اس میں جگہ جگہ ٹاپو نمودار ہو گئے ہیں، کہنے کو تو لاہور میں مصری شاہ بھی ہے وسن پورہ بھی، خارد ق گنج بھی، بھارت نگر بھی جہاں کیچڑ اور جوہڑوں ہی کا راج ہے لیکن لیاری کا علاقہ ان سب سے بازی لے گیا، یہاں نہ بس آتی ہے نہ کار کا گزر ہوتا ہے گویا یہاں صرف "بے بس"

اور "بے کار" لوگ ہی رہتے ہیں اور بس اور کار کا کیا ذکر ہے، وکٹوریہ یعنی گھوڑا گاڑی والا لیاری تک جانے کو اپنی بلکہ ملکہ وکٹوریہ اور اس کے ساتھ سارے انگلستان کی توہین سمجھتا ہے۔ ہاں گدھا گاڑی یا اونٹ گاڑی لیاری تک چلی جائے تو چلی جائے لیکن بچارے اونٹ اور گدھے کس شمار و قطار میں ہیں۔

لاہور کے میئر نے فرمایا ہے کہ ۱۴ اگست سے کارپوریشن کے تمام دفتروں میں انگریزی کے بجائے اُردو میں خط و کتابت ہُوا کرے گی، اس کے علاوہ لاہور کے گلی کوچوں اور سڑکوں کے نام بھی تبدیل کر دیے جائیں گے۔ انگریزی کے بجائے اردو کو کارپوریشن کی دفتری زبان قرار دینا بہت اچھا ہے لیکن اتنی سی تبدیلی سے صفائی کا انتظام بہتر ہو جائے گا؟ لاہور میں کوڑے کرکٹ کے جو انبار نظر آتے ہیں، ان کا باعث یہ تو نہیں کہ آج تک کارپوریشن کی دفتری زبان انگریزی رہی ہے، جہاں کارپوریشن کے عہدہ داروں نے اردو میں خط اور سرکلر لکھنے لکھنے شروع کیے، کوڑے کرکٹ کے انبار ختم ہو گئے اور سرکلر روڈ کا نام سرکلر روڈ کے بجائے گشتی روڈ رکھ دیجئے دل محمد روڈ کو مصفا روڈ کہہ لیجئے، اس تبدیلی سے آخر سڑکوں کی حالت میں کیا فرق پڑا؟ اردو آخر اردو ہے۔ سڑک کوٹنے کا انجن تو نہیں، نام کی تبدیلی اور نئے ناموں کی برکت سے سڑکیں تو نئی نہیں بن جائیں گی!

---

۱۳ اگست

ایک صاحب نے جو اپنا نام خاکپائے محمد مجاہد بتاتے ہیں اور ریفیوجی کمیٹی نیلی بار کے آنریری سکرٹری ہیں، ہمیں خط لکھ کے گورنر جنرل پاکستان کے عہدے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ ان صاحب کے ایثار میں تو کوئی کلام نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ اس قسم کی درخواستیں ہمارے نام کیوں آ رہی ہیں۔

جناب خاکپائے محمد مجاہد فرماتے ہیں کہ گورنر جنرل کے عہدے کے لئے باقاعدہ امتحان مقابلہ ہونا چاہیئے، چنانچہ میں اس امتحانِ مقابلہ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور میں نے پانچ ہزار روپے بھی داخلہ کی فیس کے طور پر جمع کرا دیئے ہیں۔ بہرحال گورنر جنرل کے امیدوار کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ پانچ ہزار روپے ہمیں نہیں ملے، آپنے بھی یہ غضب کیا کہ درخواست ہمیں بھیج دی اور روپے کسی دوسری جگہ جمع کرا دیئے۔

مولانا باری کو چاہیئے کہ نیلی بار کے اس مردِ مجاہد کے گزارہ کا کوئی انتظام کردیں، آخر وہ بھی تو بار کے رہنے والے ہیں اور ایک روایت کے مطابق بار ہی کی نسبت سے باری کہلاتے ہیں، مشیروں میں اس مردِ مجاہد کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تو سکتروں ہی میں سہی۔ آخر جنرل سکرٹری کا عہدہ بھی تو خالی پڑا ہے، اگر باری صاحب لوگوں سے کہہ سن کے اس عہدے پر اس مجاہدِ اعظم کا تقرر کرا دیں تو اور کچھ نہ سہی کم از کم ہمارا پنڈ ھ تو چھوٹے۔

ہمارے ہاں "خاکپائے محمد مجاہد" کی قسم کے لوگوں کی پیداوار ترقی پر ہے، گزشتہ چار پانچ مہینوں میں اس قسم کی تین چار درخواستیں آچکی ہیں، ان میں ایک صاحب ساری عمر کلرکی کرتے رہے ہیں، اب بڑھاپے میں قائدِ اعظم اور گورنر جنرل پاکستان بننے کا شوق چرایا ہے، مہینہ میں ایک آدھ مرتبہ ہمیں خط ضرور لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہمیں اپنی سندوں کی نقلیں بھی بھیج دیتے ہیں۔ ایک اور صاحب جو کرشن نگر میں مقیم ہیں مہدویت کے ساتھ ساتھ قیادتِ ملت کے بھی مدعی ہیں۔ تیسرے بزرگ مولوی صادق علی ہیں، جن کا ذہن کسی نے چرا لیا ہے، شکر ہے کہ جب ان کا ذہن چرایا گیا تو یہ کہیں دوسری جگہ تشریف فرما تھے، ورنہ چور ذہن کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کر جاتا۔

مولوی صادق علی کو ان دنوں گورنر کا مشیر بننے کی دھن ہے، تیسرے چوتھے خط لکھ دیتے ہیں کہ مجھے مشیر بنوا دیجئے، گویا انہیں یقین ہے کہ مشیر بننے کے لئے ذہن سے محروم ہونا ضروری ہے،

اور اللہ کے فضل سے یہ خوبی ان میں موجود ہے اور مولوی صادق علی بھی کیا کریں، باری صاحب نے شروع شروع میں مشیروں کی جو فہرست مرتب کی تھی اور جو اخباروں میں چھپ بھی گئی اس میں ایسے ہی لوگوں کے نام تھے، جن پر ذہن سے محروم ہونے کا شبہ بآسانی ہو سکتا تھا۔ مولوی صادق علی نے بھی سوچا ہوگا کہ جہاں یہ لوگ موجود ہیں، وہاں ہم کیوں نہیں، ہمارا ذہن تو چرایا گیا ہے اور انہیں اللہ نے سرے سے یہ دولت بخشی ہی نہیں۔

۱۹ر اگست

چودھری خلیق الزماں کے متعلق عجیب و غریب خبریں مشہور ہو رہی ہیں، کبھی سنتے ہیں، کہ چودھری صاحب اسلامی ملکوں کا بلاک بنانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں عالم اسلام کا دورہ کرنا چاہتے ہیں، کبھی خبر آتی ہے کہ چودھری صاحب نے کراچی میں اسلامی ملکوں کی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، دعوت نامے یا تو بھیج دیئے گئے یا بھیجے جانے کو ہیں۔ بہرحال مدعوئین کی فہرست میں شاہ فاروق، شاہ عبداللہ، سلطان ابن سعود، امام یمن وغیرہ سب شامل ہیں۔

دعوت نامے کے سلسلے میں خیال آیا کہ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے دعوتی رقعوں کی طرح جلسوں کے دعوت ناموں کا مضمون بھی ایک ہی ہوتا ہے جس میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں کی جاتی، اس لئے سلطان ابن سعود اور شاہ فاروق کو جو دعوت نامے بھیجے گئے ہوں گے ان میں یہ فقرہ بھی ضرور ہوگا "قیام و طعام کا انتظام مفت لیکن بستر ہمراہ لائیں"۔

وزارت ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی یہ جھگڑا بھی ختم ہو گیا تو کچھ دنوں تک بڑی بے کیفی رہی لیکن آپ جانتے ہیں کہ خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے، آخر کار لوگوں کو تبرا کی نظم معرا کے لئے ایک نیا مضمون ہاتھ آ گیا۔ ایک نے کہا، باری، دوسرے نے کہا موڈی، اور پھر وہی پرانی بحث چل نکلی اور کچھ عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ ہر شخص کی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سر فرانسس موڈی کے چلے جانے کی وجہ سے سارے جھگڑے ختم ہو گئے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ خدا ہمارے ذوقِ تولّا و تبرّا کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی سامان ضرور مہیا کر دے گا۔ ہمارے خیال میں پاکستان کی مرکزی حکومت کو چاہئے کہ اہل پنجاب کی ضرورتوں کا خیال رکھے، یعنی گورنر اور مشیروں کا تقرر کرتے وقت اس بات کی گنجائش رکھی جائے کہ کوئی نہ کوئی جھگڑا ضرور چلتا رہے۔ مرکزی حکومت تو اس عرضداشت پر غالباً توجہ نہ کرے لیکن ہمیں "زندہ دلانِ پنجاب" سے توقع ہے کہ وہ تولّا و تبرّا کے اس غیر طرحی اور بے قافیہ مشاعرہ کو جاری رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی گنجائش ضرور نکال لیں گے۔

دراصل یہ شکایت بھی بے سود ہے کہ پنجاب کی سیاست کے سامنے کوئی اصول نہیں۔ آخر بے اصولی بھی تو بجائے خود ایک اصول ہے۔ شخصیت پرستی کے مذاقِ عام کو بھی تو اصول ہی کہنا چاہیئے۔ آخر سیاست کا مقصد بھی تو یہی ہے کہ لوگوں کی تفریح کا سامان مہیا ہوتا رہے اور "زندہ باد" یا "مردہ باد" کے نعروں سے بہتر سامانِ تفریح اور کیا ہو سکتا ہے؟

کچھ عرصہ ہوا، رستمِ ہند، امام بخش پہلوان اور رستمِ زماں گاماں پہلوان، بھولو پہلوان کو اپنے ساتھ لے کے اس خیال سے کراچی آئے تھے کہ یہاں اکھاڑا بنائیں گے اور پاکستان کے لوگوں کو کشتی کا فن سکھائیں گے۔ یہاں بھولو پہلوان کو رستمِ پاکستان کا خطاب اور چاندی کا گرز تو مل گیا، لیکن اکھاڑے کے لئے جگہ نہ مل سکی اور اگر "قدر دانیٔ عالمِ بالا" کا یہی حال رہا تو شاید ان بیچاروں کو اکھاڑے کے لئے کبھی جگہ نہ ملے۔ اصل میں کراچی کے حکام یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جس شخص کو رستمی کی سند اور گرزِ گراں میسر ہے اسے اکھاڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جہاں جی میں آیا، گرز گاڑ دیا، اس پر سند رکھ کے اسے اکھاڑا بنایا، گھڑی دو گھڑی زور کیا اور پھر چل نکلے گویا گرز بجائے خود چلتا پھرتا اکھاڑہ ہے جس کے حصول کے بعد اکھاڑے کے لئے جگہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اب حکام کو یہ بات کون سمجھائے کہ یہ لوگ نٹ یا بازی گر نہیں پہلوان ہیں اور بازی گری اور پہلوانی میں وہی فرق ہے جو قوّالی اور موسیقی میں ہے۔

۲۴ر اگست

پچھلے سال سنا تھا کہ بعض لوگ "ادارۂ انتخابات" کے نام سے ایک فرم قائم کر رہے ہیں، جو ممبری کے امیدواروں کو الیکشن لڑنے کے لئے ہر قسم کا سامان مہیا کرے گی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں سارے انتظامات مکمّل ہو چکے ہیں، کمپنی کا دفتر عنقریب لاہور میں کسی موزوں مقام پر کھول دیا جائے گا اور صوبہ کے مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ فرم امیدواروں کو تنبوؤں، شامیانوں اور کرسیوں سے لے کے کنویسر تک مہیا کرے گی۔ اگر آپ پنجاب اسمبلی کے ممبر بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اس سلسلے میں ووٹ ڈھونڈنے کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، بس "ادارہ انتخابات" کے نام ایک خط لکھ دیجئے، ادارہ سارے انتظامات خود کرے گا۔ ہاں آپ کو کچھ رقم بمدِ پیشگی صدر دفتر میں ضرور جمع کرانی پڑے گی لیکن اگر آپ پانچ دس ہزار روپے صرف کر کے اسمبلی کے ممبر بن جائیں اور نہ ووٹروں کے ہاں جانا پڑے نہ کنویسروں کی خوشامد کرنی پڑے تو یہ سودا کیا بُرا ہے؟

"ادارۂ انتخابات" یہ انتظام کر رہا ہے کہ جہاں حضرات علمائے کرام کا وعظ ووٹروں کو متاثر کر سکتا ہے، وہاں علما بھیجے جائیں، جہاں گویّوں اور قوّالوں کی ضرورت ہے، وہاں گویّے اور قوّال بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔ انتخابات کی مہم میں شاعر کچھ ایسے مفید ثابت نہیں ہوئے، لیکن "ادارۂ انتخابات" کا ارادہ ہے کہ اب کے شاعروں سے بھی کام لیا جائے۔ انتخابی نظمیں لکھوائی جا رہی ہیں، ان میں "امیدواروں" کے نام بعد میں ڈال لئے جائیں گے، اور ضرورت پڑی تو کسی قدر قطع و برید بھی کر لی جائے گی۔

"ریڈی میڈ" لباس تو پہلے بھی ملتا تھا، ایک شاعر صاحب نے "ریڈی میڈ" غزل اور نظم کا

سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو خاصا کامیاب ہوا، لیکن "ریڈی میڈ" الیکشن کی ترکیب لاہور والوں ہی کو سوجھی ہے۔ نجات ہو گئی" ادارۂ انتخابات" کے صدر دفتر میں پانچ سات ہزار روپے جمع کرا دیئے اور امیدوار کو ساری بک بک جھک جھک سے نجات ہو گئی۔

ہم نے اس ادارہ کے انتظامات کے متعلق جو کچھ سنا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں اب تک مشترکہ سرمایہ کی جتنی کمپنیاں قائم ہو چکی ہیں، یہ ادارہ ان سب سے بڑا ہو گا۔ ذرا غور تو فرمایئے، جو کمپنی بیک وقت سینکڑوں جلسوں کا انتظام کر سکتی ہے، لاکھوں ووٹروں کو کھانا کھلا سکتی ہے، جس نے وعظ، مشاعرہ، قوالی اور مجرے تک کا انتظام کر رکھا ہے، اس میں کتنے آدمی کام کرتے ہوں گے۔ ہمارے خیال میں مسلم لیگ کو چاہیئے کہ امیدواروں کو ٹکٹ دینے کا ارادہ ہی ترک کر دے اور اگر ایسے امیدواروں کو ٹکٹ دیئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا تو اسے چاہیئے کہ اس کمپنی کے حصے خرید کے ٹکٹ دینے کا کام بھی اس کے حوالے کر دے۔ آخر مسلم لیگ بھی تو آہستہ آہستہ مشترکہ سرمایہ کی کمپنی بنتی جا رہی ہے۔

۲۵ر اگست

سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس نے "رتو سنگار" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ہندوستان کی چھ فصلوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اصل کتاب نظم میں ہے لیکن دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے جو ترجمے ہوئے ہیں، ان میں نظم کا التزام نہیں کیا گیا۔ اردو میں بھی اس کتاب کے دو ترجمے موجود ہیں، پہلے مولانا عبدالحلیم شرر نے دلگداز میں رتو سنگار کا ترجمہ بالاقساط شائع کیا، پھر پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے ایک منظوم ترجمہ شائع ہوا۔ راقم الحروف نے رتو سنگار کے انداز میں ساتویں موسم یعنی "الکشن کی فصل" کا حال لکھنے کی کوشش کی ہے، جسے "موسمی لیڈروں" سے معذرت کے ساتھ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ یہ داستان نظم میں بیان کی جاتی تو زیادہ دلکش ہوتی، لیکن افسوس کہ مجھ سے نظم کا اہتمام نہ ہو سکا۔

الکشن کی رُت آگئی۔

تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

آسمان پر کالے کالے بادل اس طرح جھوم جھوم کے چل رہے ہیں، جیسے وہ کنویسنگ کرنے جا رہے ہیں۔

ووٹروں کی فہرستیں مرتّب ہو رہی ہیں اور پران پیاری! میں سوچ رہا ہوں کہ ان میں میرا اور تمہارا نام بھی ضرور ہوگا۔

بڑی بڑی حویلیوں میں جو نیند کے ماتے دفعہ ۹۲ الف کی پت جھڑ کے بعد سوئے ہوئے تھے وہ ایکا ایکی آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھے۔

اُنہیں الاٹ منٹ کی برکھا رُت کے مزے یاد آگئے۔

اُنہیں ایسا معلوم ہُوا کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ صرف ایک بھیانک سپنا تھا۔

ممدوٹ وزارت نے باغ میں تھم گاڑ کے اس میں جھولا ڈال رکھا تھا، کچھ لوگ جھولا جھول چکے تھے، کچھ جھول رہے تھے اور باقی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ کسی نے جھولے کی رسّی ہی کاٹ ڈالی اور جھولنے والے دھڑام سے زمین پر آ رہے۔

پھر دفعہ ۹۲ الف کی پت جھڑ شروع ہوئی، تیز ہوائیں چلنے لگیں، درختوں تلے پیلے پیلے پتوں کے ڈھیر لگ گئے۔

یہ بھیانک سپنا ختم ہو گیا، سونے والے جاگ اُٹھے ہیں اور ڈاڑھیوں کے لئے خضاب اور طرّوں کے لئے کلف مہیّا کرنے کی تیّاریاں کر رہے ہیں۔

الکشن کی بسنت رُت آگئی پران پیاری! الکشن کی بسنت رُت آگئی ہے۔

وہ لکشمی کا بیٹا پانچ تیروں والا دیوتا مدن جو اس رُت میں بے کھٹکے دلوں کا شکار کھیلتا پھرتا ہے، اسمبلی ہال کے آس پاس کہیں گھات لگائے بیٹھا ہے۔

میں اس سے ڈرتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا تیر میرے دل میں بھی ترازو ہو جائے، اور میں تجھے بھول کے اسمبلی کی ممبری کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں۔

دیکھ، کہ بڑے بڑے تپسوی جو مری کے پہاڑوں کی گپھاؤں میں دُنیا سے منہ موڑے بیٹھے تھے،

ان کا بھی من ڈولا جا رہا ہے۔

اندر دیوتا نے رمبھا اور رمبکا کو بھیج کے وشوامتر کا آسن ڈگانے کا جتن کیا تھا، اب نہ جانے کس دیوتا نے "سورگ" سے "ممبری" کی اپسرا بھیج کے ان تپسویوں کا آسن ڈگانے کا جتن کیا ہے۔

اگلے رشیوں نے کہا ہے کہ بھیک من کو اُجالتی ہے "ممبری" کے پریمی بھی من کو اُجالنے کے لیئے ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں اور بھیک میں ووٹ نہیں ملتے تو انہیں خرید لینا چاہتے ہیں۔

تو نے کبھی کوئی ایسا پریمی بھی دیکھا ہے جو کبھی ساہوکار ہے اور کبھی بھکاری، یعنی جب اسے بھیک نہیں ملتی تو مول تول پر اُتر آتا ہے۔

تو نے کوئی ایسا چھتری بھی دیکھا ہے جو ضرورت پڑنے پر برہمن بن کے بھیک بھی مانگ لیتا ہے،

"ممبری" کی اپسرا کا سوئمبر سچ مچ بہت انوکھا ہے۔

یہ اپسرا اپنے چاہنے والوں کے روپ پر نہیں ریجھتی۔

وہ دھن دولت کو نہیں دیکھتی۔

اسے جیتنے کے لیئے شو کی کمان کا چلّہ چڑھانے کی بھی ضرورت نہیں۔

جو زیادہ ووٹ لے آتا ہے، وہ اس کے گلے میں مالا ڈال دیتی ہے۔

جو لوگ "ممبری" کی اپسرا کو جیت لیتے ہیں، وہ اسمبلی ہال میں پہنچ کے کچھ عرصہ کے لیئے امر ہو جاتے ہیں۔

اسمبلی ہال اس زمانے کا مندراچل ہے، وہ دیولوک ہے جہاں دیوتا آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔

الکشن کی رُت آگئی پران پیاری!

فشاستہ مہنگا ہو گیا ہے اور بازار میں خضاب ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

میں سوچتا ہوں کہ میں بھی اپنا ووٹ "ممبری" کے کسی پریمی کو دے ڈالوں تا کہ وہ ضمانت

ضبط کرانے سے بچ جائے۔

اور کوئی عجب نہیں کہ وہ سچ مچ دیوتا بن کے اسمبلی ہال کے دیولوک میں پہنچ جائیں اور یکش اور گندھرب آکاش سے مجھ پر پھولوں کی برکھا کریں۔

---

۲۷ راگست

سُنا ہے، میاں عبدالباری صاحب نے "مشیری" کے لئے اکیس حضرات کے نام پیش کئے ہیں ہز ایکسیلنسی گورنر ان میں سے پانچ مشیر خود منتخب کر لیں گے۔ تعجب ہے کہ باری صاحب نے صرف اکیس نام کیوں پیش کئے، دو سو ناموں کی فہرست کیوں نہ پیش کر دی، مشیر تو پانچ ہی منتخب ہوتے اور لیگ کے دو سو کارکنوں کی گردنیں باری صاحب کے بارِ احسان سے تو جھکی رہتیں۔

یوں کہنا چاہئے کہ مولانا عبدالباری نے "آقا" تغی کے باغ کے آموں کی ایک ٹوکری گورنر بہادر کے حضور میں پیش کر دی ہے۔ وہ پکے پکے پانچ دانے چھانٹ کے رکھ لیں گے اور باقی واپس کر دیں گے، دیکھیں نشتر صاحب کی نگاہِ انتخاب کس کس پر پڑتی ہے۔

فوج کی بھرتی میں یہی ہُوا کرتا ہے، بیس اکیس آدمی بھرتی ہونے آئے ہیں، لیکن کسی کا قد چھوٹا ہے کسی کی چھاتی ۲۸ انچ ہے کوئی کسی مرض میں مبتلا ہے، اس لئے پانچ چھ منتخب ہوتے ہیں باقی کو صاف جواب مل جاتا ہے۔ راقم الحروف نے جب یہ خبر سُنی کہ باری صاحب نے آخر جی کڑا کر کے اکیس ناموں کی فہرست پیش کر دی تو بھرتی کے دفتر کا منظر آنکھوں تلے پھر گیا، اکیس آدمی قطار باندھے کھڑے ہیں، کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے، کوئی تہ بند۔ کسی کے ہاتھ میں کھرپا ہے کسی کے ہاتھ میں درانتی، کوئی سر سے ننگا ہے۔ کوئی میلا سا پھینٹا باندھے ہوئے ہے۔ ابھی ابھی ریکروٹنگ افسر صاحب ڈاکٹر کو ساتھ لے کے آئیں گے، قد اور چھاتی ناپی جائے گی، ڈاکٹر سینے کو ٹھونک ٹھونک کر دیکھے گا، جو لوگ معیار پر پورے اتریں گے، انہیں بھرتی کر لیا

جائے گا، باقی اپنی اپنی راہ لیں گے۔

فوجی بھرتی اور مشیروں کی بھرتی میں فرق صرف اتنا ہے کہ فوجی بھرتی کا ایک معیار مقرر ہو چکا ہے جو اس پر پورا اترتا اُسے ضرور بھرتی کر لیا جائے گا۔ لیکن مشیروں کی بھرتی کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں یا اگر معیار طے ہو چکا ہے تو ہمیں معلوم نہیں۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کن کن حضرات کو مشیر مقرر کیا جائے گا۔ بہرحال اتنا تو واضح ہے کہ مشیروں کی بھرتی میں نہ قد ناپا جائے گا نہ چھاتی، بلکہ قومی خدمات کا طول و عرض ناپ کے مشیروں کے تقرر کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ فوجی بھرتی کے معیار کو ایسے موقعوں پر بھی پیش نظر رکھا جاتا، تو سیّد محسن شاہ اور مولوی غلام محی الدین قصوری کے لئے قومی خدمت کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہا تھا۔

---

۲۸ راگست

کراچی میں پچھلے دنوں ایک شخص مسجد سے جوتی چراتا پکڑا گیا تھا، لوگوں نے اس کا منہ کالا کر کے اسے سارے شہر میں پھرایا۔ ہمارے خیال میں "جلوس" لیڈروں سے مخصوص ہو کے رہ گیا ہے، کراچی کے لوگ اگر اس معاملہ میں یونہی اسراف بے جا فرماتے رہے یعنی جلوس کو "جوتی چوروں" پر صرف کیا جاتا رہا تو بیچارے لیڈر کیا کریں گے؟

ہم ہمیشہ سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ ملک خدا کا اور جلوس لیڈروں کا، اس لئے اگر آپ نے لیڈروں کی حق تلفی کر کے جوتی چوروں کے جلوس نکالنے شروع کر دیئے تو ایک دن آئے گا کہ بے چارہ لیڈر بالکل "بے جلوس" ہو کے رہ جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ جس طرح "بے لیڈر جلوس" صحیح معنوں میں جلوس ہی نہیں، اسی طرح "بے جلوس لیڈر" کو لیڈر کہنے میں ہمیں تامّل ہوتا ہے۔

عرصہ ہوا۔ پنجاب کے ایک لیڈر گجرات تشریف لے گئے، اگرچہ وہاں کے قومی کارکنوں کو تار کے ذریعے اطلاع دے دی گئی تھی، لیکن تار وقت پر نہ پہنچا۔ اس لئے لیڈر صاحب گجرات پہنچے تو دیکھا کہ سٹیشن پر انہیں لینے کو کوئی موجود نہیں۔ بہت برہم ہوئے سٹیشن سے خلافت اور کانگرس کے عہدہ داروں کو پیغام بھجوایا کہ میں سٹیشن تک پہنچ گیا ہوں، اب مجھے آ کے لیجائیے، وہ بیچارے بات پا گئے اور جلوس کا بندوبست کیا۔ بیچارا لیڈر صبح کو اسٹیشن پر پہنچا، شام کو جلوس تیار ہوا "زندہ باد" کے نعرے سنتے آدھی رات کو قیام گاہ پہ پہنچنا نصیب ہوا، پھر بھی لیڈر اس خیال سے بہت خوش تھا کہ یہ لوگ تو صرف جلسے پر ٹرخا دینا چاہتے تھے لیکن ہم نے بھی جلوس نکلوا کے ہی دم لیا۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں کانگرس اور خلافت کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوئے، کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے اور ان کا جلوس بڑے طمطراق سے نکلا تھا، مسلمانوں نے بھی خلافت کانفرنس کے صدر مولینا محمد علی مرحوم کا جلوس نکالنے میں اپنی بساط سے زیادہ روپیہ صرف کر ڈالا، پنجاب کے بعض لیڈران ونوں "یوسف بے کارواں" بنے ہوئے تھے، یعنی "بے جلوس" پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے زکریا اسٹریٹ کے کچھ پنجابی دکانداروں کو اکٹھا کر کے جلوس کا انتظام کیا۔ چنانچہ جب کانگرس اور خلافت کے اجلاس قریب قریب ختم ہو چکے تو یہ "جلوس" نکلا۔ جلوس کا تو صرف نام ہی نام تھا، لیڈروں کو ملا کے کل کوئی دو ڈھائی سو آدمی ہوں گے، پھر بھی لیڈر خوش تھے کہ الحمدللہ ہمیں بھی "جلوس" کی سعادت نصیب ہو گئی۔

کراچی کے لوگوں کو اللہ نے جلوس نکالنے کی توفیق بخشی ہے تو چاہیئے کہ "جوتی چوروں" پر یہ دولت صرف کرنے کے بجائے لیڈروں کے جلوس نکالیں۔ آخر ان لیڈروں کے لئے جو نا آفس میں ہیں نہ کرسی میں، جلوس کے سوا اور کیا تسکین کا سامان رہ گیا ہے؟ آپ نے ان سے جلوس بھی چھین لیا تو وہ بیچارے کہاں جائیں اور کیا کریں۔ "جوتی چوروں"

کو نوازنا ضروری ہے تو کوئی اور طریقہ تلاش کیجئے، لیڈروں کے حقوق پر چھاپا نہ ماریئے

اے برق ڈھونڈ لے کوئی خرمن زمانے میں
رہنے دے چار تنکے مرے آشیانے میں

۲۹ر اگست

آغا محو شرف نے جو اَن پڑھ ہونے کے باوجود خواجہ آتش کے شاگردوں میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اپنے گھر کی ویرانی کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

شکستہ چند قبریں ہر طرف اک ہو کا عالم ہے
وہاں رہتا ہوں میں مُردہ نہیں آتا جہاں برسوں

لاہور کے گورکنوں سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ نے حال میں جو انٹرویو کیا ہے، اسے پڑھ کے بے اختیار یہ شعر یاد آ گیا۔ گورکنوں کا بیان ہے کہ آج کل بہت "مندا" ہے، کئی کئی دن میانی صاحب کے قبرستان میں ایک جنازہ نظر نہیں آتا۔ ایک بڈھے گورکن نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا کہ میں نے کوئی دو ہزار قبریں کھودی ہیں، لیکن ایسا "مندا" کبھی نہیں دیکھا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کا نمایندہ بڑا سنگدل ہے کہ قبرستان تک گیا اور زندہ واپس چلا آیا، ہمارا تو اس فقرہ پر مر جانے کو جی چاہتا ہے۔

معاف کیجئے گا، ہمیں تو ان گورکنوں کا بیان خاصا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، لاہور میں اللہ کے فضل سے بہت سے نیم حکیم موجود ہیں، پھر ایسے ڈاکٹر بھی نظر آ جاتے ہیں، جنہوں نے کوئی سند حاصل کئے بغیر اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ دو ڈھائی مہینے ہوئے ایک صاحب اس الزام میں پکڑے بھی گئے تھے، اس لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ بہر حال محکمہ حفظانِ صحت کا پروپیگنڈا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ گورکنوں سے انٹرویو کیا اور جھپاک سے اخباروں میں چھپوا دیا۔

ہمارے خیال میں دوسرے محکموں کو بھی اپنے اپنے پروپگینڈے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ساری نیک نامی حفظانِ صحت کے محکمہ والے لوٹ کے نہ لے جائیں مثلاً پولیس والوں کو نیک نام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اخباروں میں جیب کتروں اور چوروں کے انٹرویو شائع کئے جائیں، جن کا مضمون کچھ اس قسم کا ہو کہ ان دنوں ہمارے کاروبار کی حالت بہت خراب ہے۔ جیب کترنے کا موقع ملتا ہے، نہ نقب زنی کا حوصلہ پڑتا ہے۔ اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ اپنا قدیمی پیشہ چھوڑ کے کسی سیاسی جماعت میں شریک ہو جائیں اور نئی الاٹمنٹ سے فائدہ اٹھائیں۔

---

۳۱ اگست

انجمن سازی بھی لاہور کی خاص صنعتوں میں ہے۔ جہاں دو تین اشخاص مل بیٹھے، ایک انجمن عالمِ وجود میں آگئی، کوئی بلند آہنگ قسم کا نام تجویز ہوا، ایک شخص صدر بن بیٹھا، دوسرا سکریٹری مقرر ہوا تیسرے کے حصے میں خازن کا عہدہ آیا اور کہیں کہیں تو ایسا ہوتا آیا ہے کہ ایک شخص ہی انجمن کا صدر، سکریٹری خازن، سبھی کچھ ہے اور ضرورت آپڑے تو چپراسی کی خدمات بھی اسے خود ہی انجام دینی پڑتی ہیں، گویا یہ بھی ایک قسم کی وحدتِ وجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وحدتِ وجود کے خلاف نہ کوئی فتوےٰ دیتا ہے، نہ اس کے قائلوں کو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں جو منصور کو پیش آئے تھے۔

لاہور میں ایسی بیسیوں انجمنیں ہیں، جن کا کام صرف یہ ہے کہ کوئی خاص موقع پیش آیا تو گورنر جنرل کو تار بھیج دیا، یا اللہ نے زیادہ توفیق بخشی تو ایک آدھ جلسہ کرا ڈالا جنہیں اتنی بھی توفیق نہیں، وہ چھوٹے موٹے شاعروں یا ادبی محفلوں پر اکتفا کرتی ہیں اور اسی کو غنیمت سمجھتی ہیں کہ ان کی سرگرمیوں کی خبریں اخباروں میں تو چھپ جاتی ہیں۔

بعض لوگ خود انجمن ہیں بعض لوگوں نے انجمنیں الاٹ کرا رکھی ہیں اور انہیں کسی ترکیب سے اتنا مختصر کر لیا ہے کہ ہینڈ بیگ میں اور بعض اوقات تو جیب میں آ جاتی ہے تو اس قسم کے حضرات جہاں جاتے ہیں اپنی انجمن کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ مثلاً گرمی کے موسم میں مری کا رُخ کیا، تو ہینڈ بیگ میں انجمن بھی موجود ہے، ایک دن انجمن کو نکال کے ذرا دھوپ میں پھیلا دیا اور چند لمحوں میں آل پاکستان قسم کی انجمن بن گئی۔ یا اپنے ساتھ انجمن لانا بھول گئے ہیں تو کسی مقامی انجمن کے سر پر دستِ شفقت پھیر کے اسے آل پاکستان قسم کی انجمن بنا دیا۔

غرض لاہور میں انجمن سازی گھریلو دستکاری کی حیثیت سے خاصی اہمیت رکھتی ہے اور ابھی کیا ہے، آگے چل کے جب ہمارے ملک میں صنعت و حرفت ترقی کرے گی تو انجمن سازی کی صنعت کو بھی بڑا فروغ ہوگا یعنی انجمنیں مشینوں میں ڈھلنے لگیں گی۔ بہر حال ابھی تو اس گھریلو دستکاری ہی پر قناعت کیجئے، اگر خدانخواستہ انجمن سازی کی یہ گھریلو دستکاری بھی نہ ہوتی تو جو لوگ اس صنعت کی بدولت گزر کر رہے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔

یکم ستمبر

مغربی پنجاب میں "ہاری ساری پارٹی" کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم ہوئی ہے، جو آئندہ انتخابات میں عبدالباری پارٹی یعنی موجودہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے "ہاری ساری پارٹی" ٹھیٹھ پنجابی میں پیپلز پارٹی کا ترجمہ ہے۔ اردو میں "ہاری ساری" کا ترجمہ ناممکن ہے، زیادہ سے زیادہ "ایرا غیرا نتھو خیرا" کہہ لیجئے، لیکن ایرا غیرا میں جو تحقیر کا پہلو ہے وہ "ہاری ساری" میں نہیں۔ غرض پارٹی کامیاب ہو یا نہ ہو، یار لوگوں نے پنجابی میں پیپلز پارٹی کا ترجمہ تو کر ڈالا۔

ہمارے خیال میں آگے چل کے پنجاب میں جو سیاسی پارٹیاں قائم ہوں گی، وہ سب ہاری ساری کی ہم قافیہ ہوں گی۔ مولانا عبدالباری نے مصرع طرح عرض کیا تھا میجر کفایت علی نے

اس پر گرہ لگائی، خدا نے چاہا تو اب اس پر دو غزلے کہے جائیں گے۔ یعنی کچھ دنوں میں آپ دیکھئے گا کہ ایک شخص نے "کاروباری پارٹی" بنالی ہے، دوسرے نے اپنی جماعت کا نام "باری باری پارٹی" رکھ لیا ہے، تیسرے نے "ہماری تمہاری پارٹی" کا عَلَم بلند کر رکھا ہے ہمارے خیال میں اس قسم کے ناموں میں سے "ہاری تمہاری پارٹی" سب سے اچھا نام ہے تعجب ہے کہ "ہاری ساری پارٹی" والوں کو یہ نام کیوں نہ سوجھا؟

اور یہ معاملہ کچھ پنجاب ہی تک محدود نہیں، سندھ میں بھی آگے چل کے جو پارٹیاں قائم ہوں گی، ان کے ناموں میں ہاری ساری اور ہماری تمہاری کے قافیہ کا خیال رکھا جائے گا۔ اس صوبہ میں "ہاری" پہلے ہی موجود ہیں، ان کی ایک مجلس بھی قائم ہو چکی ہے، بس اس انجمن کو مضبوط کرنے اور اس کے نام میں تھوڑی سی کتر بیونت کر کے اسے "ہاری ساری" کے قافیہ کے ڈھب پر لانے کی ضرورت ہے اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ صرف لیاری کے علاقے میں جو لوگ بستے ہیں وہ الگ پارٹی بنانا چاہیں تو "لیاری پارٹی" کے نام سے اچھی خاصی پارٹی بنا سکتے ہیں

راقم الحروف نے کل کی اشاعت میں لاہور کی صنعت انجمن سازی اور "جیبی" اور "سفری" انجمنوں کا ذکر کیا تھا، ایک صاحب اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "لاہور میں جو انجمنیں قائم ہیں، ان کی شاخیں ہر جگہ تو نہیں کھولی جا سکتیں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر دوسرے مقامات پر لاہور کی کسی انجمن کی ضرورت پڑے تو مناسب اجرت پر پوری انجمن یا اس کا ایک حصہ پارسل کے ذریعے بھیج دیا جائے، انجمن کے صدر یا سکرٹری صاحب اس کے ساتھ نہ بھی جائیں، جب بھی کوئی حرج نہیں، آخر "پرچہ ترکیب استعمال" کس مرض کی دوا ہے؟"

بات ٹھیک بھی ہے، جب جیبی سائز کی انجمنیں موجود ہیں تو انہیں پارسل کے ذریعہ باہر بھیجنے میں کیا حرج ہے، ضمانت کے طور پر کچھ روپیہ جمع کرا دیجئے اور انجمن کو لے جایئے۔ ہمارے خیال میں اگر انجمنوں کی برآمد کا یہ کاروبار چل نکلا تو لاہور اور کراچی میں کئی ایسی ایجنسیاں

قائم ہو جائیں گی جو صرف انجمنوں کی سپلائی کا کام کریں گی اور ہاری ساری پارٹی کا تو نام ہی ایسا ہے کہ وہ صرف لاہور ہی تک محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ اسے کراچی میں بھی سپلائی کرنے کا کوئی انتظام ضرور ہونا چاہئے۔

۲ر ستمبر

ہم نے "ہاری ساری پارٹی" کے تذکرہ میں عرض کیا تھا کہ "ہاری ساری پارٹی" قائم ہوئی تو اب کوئی "زمینداری جاگیرداری پارٹی" بھی ضرور قائم ہو کے رہے گی۔ سندھ کے وزیراعظم مسٹر یوسف ہارون نے ہمارے اس خیال کی تصدیق کر دی، چنانچہ انہوں نے سندھ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جو تقریر کی ہے، اس میں فرمایا ہے کہ زمینداری کی حفاظت کے لئے سندھ کے بڑے بڑے زمیندار اور اسمبلی کے بعض ارکان سازش کر رہے ہیں۔

لیکن ہمارے خیال میں مسٹر یوسف ہارون صاحب کو اس قسم کی سازشوں سے پریشان نہیں ہونا چاہئے، آخر یہ لوگ زیادہ سے زیادہ وزارت کو توڑنے کی کوشش کریں گے، لیکن وزارت چھن گئی تو مسٹر یوسف ہارون "زمینداری پارٹی" کے مقابلے میں کوئی "کاروباری پارٹی" بنا لیں گے، وزارت کی کرسی نہ سہی گھڑ دوڑ کا میدان سہی، "ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست"

یوں تو ہر وزارت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے لیکن سندھ کی وزارت اس معاملہ میں دوسری وزارتوں سے کہیں آگے نظر آتی ہے۔ اس نے کھوڑو صاحب سے وفا نہ کی، بچارے پیر الٰہی بخش بھی اس کی بے وفائی کے شکوہ سنج ہیں، پھر مسٹر یوسف ہارون کو اس سے وفا کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ کرسئ وزارت نہیں تو نہ سہی، ایوانِ تجارت تو کہیں نہیں گیا۔

سُنا ہے کہ چودھری خلیق الزّمان اسلامستان لیگ قائم کرنے کے ارادے سے ۱۲ر ستمبر کو کراچی سے روانہ ہو جائیں گے، پہلے وہ ایران جائیں گے، پھر دوسرے اسلامی ملکوں کا دورہ کریں گے اور خدا نے چاہا تو اسلامستان لیگ قائم کر کے ہی لوٹیں گے۔ چودھری صاحب کا بیان ہے کہ اسلامستان لیگ اسلامی ملکوں کے عوام کی جماعت ہو گی لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ چودھری صاحب مسلم لیگ کو صحیح معنوں میں عوام کی جماعت نہ بنا سکے تو اسلامستان لیگ کو وہ کیونکر عوام کی جماعت بنا لیں گے؟

امروز (کراچی) میں ایک مراسلہ چھپا ہے، جس کا عنوان ہے "آوازہ و انصاف کو انصاف کہاں ہے؟" اس کے جواب میں عرض ہے کہ حضرت! اگر انصاف کراچی میں نہیں تو لاہور میں بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بچارا انصاف گرمی کا موسم گزارنے مری چلا گیا ہے، آخر وہ بھی کیا کرے، لاہور والے بھی اسے آوازیں دے رہے ہیں، کراچی میں بھی لوگ اسے دم بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتے، ذرا نظروں سے اوجھل ہوا اور شور مچ گیا کہ "آوازہ و انصاف کو انصاف کہاں ہے؟" اس لئے اگر وہ چھٹی منانے مری چلا گیا ہے تو آوازیں دے دے کے اسے پریشان تو نہ کیجئے۔

۲۰ر ستمبر

سُنا ہے کہ بمبئی کی پولیس نے اٹھارہ اشخاص کو راشن کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔ ان لوگوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ کھانا کھانے بیٹھے اور کوئی ۲۲ من ڈکار گئے۔ ہمارے خیال میں حکومت کو چاہئے تھا کہ انہیں تمغے دیتی بلکہ بسیار خوری کے بین الاقوامی مقابلہ کا انتظام کرتی جس میں ان لوگوں کے طفیل ہندوستان کا پلّہ یقیناً بھاری رہتا، لیکن پولیس نے انہیں اُلٹا گرفتار کر لیا اور اب راشن کے احکام کی خلاف ورزی کے جرم میں ان پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے، افسوس کہ ہندوستان میں لیڈری ہی پر زوال نہیں آیا بلکہ پیٹوپن کی بھی قدر نہ رہی۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہندوستان میں بسیار خوری اور شکم پروری بہت بڑا ہنر سمجھی جاتی تھی اور برہمن، خاص طور پر متھرا کے برہمن جو چاروں ویدوں کے عالم ہیں اور چوبے کہلاتے ہیں، اس معاملے میں یکتا مانے جاتے تھے۔ آپ نے یہ لطیفہ سنا ہوگا کہ ایک چوبے جی بہت کھا گئے، بیوی نے کہا، تھوڑا سا چورن کھا لیجئے" چوبے جی نے جواب دیا "بھاگوان! پیٹ میں چورن کی گنجائش ہوتی تو ایک پوری اور وہیں نہ کھا لیتا۔

ایک اور چوبے جی کا حال سُنا ہے کہ کھانا کھا کے تو خود جوتا پہن نہ سکتے تھے، اصل میں ان کے لئے جھک کے یہ دیکھنا ناممکن ہوتا تھا کہ جُوتا کہاں پڑا ہے، لیکن یہ پُرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب نہ وہ متھرا ہے نہ متھرا کے پیڑے نہ وہ چوبے جو بیس بیس سیر پیڑے کھا جاتے تھے اور ڈکار تک نہیں لیتے تھے اور بمبئی کے اس واقعہ کے بعد بسیار خوری کی قدر ہی اٹھ گئی۔

بعض مولوی بھی بسیار خوری کی وجہ سے انگشت نما ہیں، لیکن مولوی تو یونہی بدنام ہیں، البتہ بعض پیروں اور لیڈروں کو تو ضرور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ کشمیر کے ایک پیر صاحب کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو کئی آدمیوں کا کھانا اکیلے ڈکار جاتے تھے۔ ایک صاحب جو بسیار خوری میں بہت مشہور تھے، لوگوں کے سامنے کھانا نہیں کھاتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ ایک اور صاحب کی ساری جائداد بڑھاپے میں تباہ ہو گئی تھی، اس لئے بہت دل گرفتہ رہتے تھے، ایک مرتبہ بیمار پڑے، ان کے بڑے بیٹے نے پوچھا کہ آپ کو بھوک ہے تو کچھ کھا لیجئے، جواب ملا کہ اس بڑھاپے میں بھوک کے سوا میرے پاس اور کیا رہ گیا ہے؟

اس موقع پر ایک اور صاحب یاد آ گئے، جنہیں ضعفِ معدہ کی شکایت تھی، ایک مشہور طبیب سے ان کا یارانہ تھا، جو ان کے لئے چٹنیاں، معجونیں، خمیرے بناتے رہتے تھے۔ صبح اُٹھ کے ایک حریرہ نوش فرماتے تھے، پھر ناشتے سے پہلے ایک خمیرہ شربت کے ساتھ کھاتے تھے، دوپہر کے کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے ایک دوا کھاتے تھے اور کھانے سے ایک

گھنٹے کے بعد ایک سفوف پھانکتے تھے۔ غرض دواؤں کا یہ سلسلہ آدھی رات تک چلتا تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان دواؤں کا مجموعی وزن سیر بھر سے کچھ ہی کم ہوتا ہوگا اور غذا کا وزن اس سے کوئی دس گنا سمجھ لیجئے۔ با ایں ہمہ بسیار خوری کے معاملہ میں ہندوستان پاکستان سے بہت آگے ہے۔ متھرا اور بنارس ہندوستان میں ہیں اور وہاں کے چوبے اور دوبے گئے گذرے زمانے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے، پھر ان اٹھارہ آدمیوں کی ٹیم ہے جو بائیس من پوریاں، کچوریاں ڈکار گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں غلّہ کم ہے۔ اس لئے ہندوستان کی حکومت ان لوگوں کی قدر نہیں کر سکتی۔

سرحد اور پنجاب کے بعض بزرگوار جو اپنے آپ کو عمرو معدی کرب کا جانشین سمجھتے ہیں، بمبئی کے ان اٹھارہ پیٹوؤں کی بسیار خوری کی داستان سُن کے حیران رہ گئے ہوں گے لیکن بمبئی کا من چالیس سیر کا نہیں بلکہ ڈھائی تین سیر کا ہوتا ہے، اس لئے یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں جو پاکستان والوں سے نہ بن پڑے۔ البتہ بمبئی کے لوگوں کے ڈیل ڈول کو دیکھئے تو اٹھارہ آدمیوں کا سوا من یا ڈیڑھ من اناج چٹ کر جانا خاصا بڑا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔

---

۱۴ ستمبر

مسٹر لیاقت علی خاں نے سندھ یونیورسٹی کے خطبۂ تقسیم اسناد میں فرمایا ہے کہ "انگریزی زبان میں جو علوم ہیں وہ سب کے سب جب تک اردو میں منتقل نہ ہو جائیں اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جا سکتا" اس کے معنے یہ ہیں کہ اردو کو کہیں سو برس کے عرصے میں وہ مقام نصیب ہوگا، جو آج انگریزی کو حاصل ہے۔ کیونکہ تمام مغربی علوم کو اردو میں منتقل کرنا کوئی ایک آدھ سال کا تو کام نہیں اس پہ سو برس تو ضرور صرف ہو جائیں گے۔

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے تو فوراً یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آئندہ تعلیم اُردو زبان میں دی

جائے گی۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت ایک دارالترجمہ قائم کر دے تو برس ڈیڑھ برس میں کم از کم اتنی کتابیں اردو میں منتقل کی جا سکتی ہیں کہ سکولوں اور کالجوں کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اگر ہم نے یہ تہیہ کر لیا کہ جب تک تمام مغربی علوم اردو میں منتقل نہیں ہو جاتے، انگریزی بدستور مسلط رہے گی تو یقین رکھئے کہ نہ تو تمام مغربی علوم اردو میں منتقل ہوں گے، نہ انگریزی سے ہمارا پنڈ چھوٹے گا۔ یہ نو من تیل کی شرط بہت کڑی ہے، اس لئے رادھا تو کیا ناچے گی، البتہ بی انگریزی خانم ضرور لعنگا پھڑکاتی رہیں گی۔

اگر خود انگریز بھی اسی قسم کا طرزِ استدلال اختیار کرتے تو انگلستان میں لاطینی اور یونانی کا سکہ چلتا رہتا اور انگریزی کو اپنے اصل وطن میں بھی وہی حیثیت حاصل ہوتی جو آج پاکستان میں اردو کو حاصل ہے۔

ایک ادبی رسالہ میں ضمیر اظہر صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی ہے، ملاحظہ ہو:

ہر ذرہ ذرہ تھامے ہوئے ہے دلِ فگار
یہ رہگزر تو ان کی کہیں راہ گزر نہیں

ضمیر اظہر صاحب اگر ہر ذرہ کہہ لیتے، جب بھی درست تھا، ذرہ ذرہ کہنے پر کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن یہ ہر ذرہ ذرہ تو شبِ لیلۃ القدر کی قسم کی چیز ہے۔ بدقسمتی سے بحر ہر ہر ذرہ ذرہ سہہ نہیں سکتا؛ ورنہ کلام میں اس تکرار سے زیادہ لطف پیدا ہو جاتا

مقطع بھی سن لیجئے:

اظہر مری نظر میں ہے بے سود وہ کلام
جس میں نوائے وقت کا سوز و اثر نہیں

یہ شعر اخبار نوائے وقت کی مدح میں ہے تو خوب ہے، ورنہ قطعاً بے معنی ہے۔ بہرحال یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ضمیر اظہر صاحب نظمیں لکھتے لکھتے لٹھ لے کے غزل کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔

۵ر ستمبر

علی گڑھ میں ایک صاحب ہیں جن کا دعوےٰ ہے کہ انگریزی زبان اصل میں اردو سے نکلی ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں اُردو کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ایک محفل میں وہ اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے، کسی نے کہا "اچھا یہ بتائیے کہ ڈیکوریشن جس کے معنی آرائش کے ہیں، اردو کے کون سے لفظ سے نکلا ہے، جواب ملا، ڈیکوریشن اصل میں "دیکھوری شان" تھا۔ انگریزوں نے اسے ڈیکوریشن بنا لیا۔

معلوم نہیں یہ صاحب کہاں ہیں اور ان کی تحقیق کا کیا حال ہے، لیکن امیر البحر نمٹز کو کشمیر کے معاملہ میں ثالث بنانے کی جو تجویز پیش کی گئی ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نمٹز اصل میں نمٹانا سے مشتق ہے۔ اسی لئے تو نمٹز صاحب کو کشمیر کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے ثالث یعنی "نمٹاؤ" مقرر کیا جا رہا ہے۔

کشمیر کے جھگڑے میں ثالث شروع سے موجود ہیں، البتہ ثالث بدلتے رہتے ہیں، یا یوں کہئے کہ جب ایک ثالث سے معاملہ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا تو وہ اپنی طرف سے کوئی دوسرا ثالث مقرر کر دیتا ہے، اصل ثالث تو خود اتحادی قوموں کی انجمن ہے، اس نے سکیورٹی کونسل کو ثالث مقرر کیا، سکیورٹی کونسل نے ثالثی کا کام کشمیر کمیشن کے حوالے کر دیا اور اب امیر البحر نمٹز کو یہ ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔ گویا یہ معاملہ "ثالث در ثالث" قسم کا ہے، ابھی ثالثوں کی اس فہرست میں پریذیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر ایٹلی کا نام ہی نہیں آیا۔ انہیں بھی شامل کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس "ثالثی در ثالثی" کا معاملہ کتنا وسیع ہے؟ بس یہ سمجھئے کہ صندوق میں صندوقچی، صندوقچی میں تھیلا، تھیلے میں بٹوا اور بٹوے میں ڈبیا۔

ثالث کا کام انصاف کرنا ہے، لیکن کشمیر کے معاملے میں ہر ثالث کا یہ انداز رہا ہے کہ

فیصلہ بھی ہو جائے اور ہندوستان بھی ناراض نہ ہونے پائے، حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اگر ہندوستان کو خوش کرنا ہے تو انصاف سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا اور اگر انصاف کرنا ہے تو ہندوستان ضرور ناراض ہوگا، یہ تو ہونے سے رہا کہ ہندوستان ناراض بھی نہ ہو، اور انصاف بھی ہو جائے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ سمندر سے انصاف کا کیا تعلق ہے؟ یعنی انصاف کرانے کے لئے امیر البحر یا یوں کہئے کہ "جل سیناپتی" قسم کے لوگوں سے کیوں رجوع کیا جاتا ہے، کیونکہ مونٹ بیٹن صاحب بھی امیر البحر تھے اور نمٹز صاحب بھی امیر البحر ہیں۔

---

۷ ستمبر

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے توڑ پر پچھلے دنوں "اسلام پسند مصنفین" اور "تعمیر پسند مصنفین" کے نام سے دو انجمنیں قائم ہوئی تھیں، اب سنا ہے کہ انجمن مصنفین کے نام سے ایک اور انجمن قائم ہو رہی ہے۔ ہمارے خیال میں ترقی پسند، اسلام پسند اور تعمیر پسند جیسے ناموں کے مقابلہ میں انجمن مصنفین بہت کم حیثیت سا نام معلوم ہوتا ہے؛ اس سے تو اچھا ہے کہ اس انجمن کا نام "فقط مصنّفین" رکھ دیا جائے۔

لیگ میں ان دنوں یہ جھگڑا چل رہا ہے کہ باری صاحب مشیروں کو نامزد کرنے کے تمام حقوق اپنے لئے محفوظ کرا لینا چاہتے ہیں اور مسلم لیگ کونسل اس فکر میں ہے کہ یہ سعادت اس کے حصے میں آئے اور کسی کو خیال نہیں آتا کہ جو لوگ "مشیری" کے عہدے کے امیدوار ہیں، ان پر کیا گزر رہی ہے؟ باری صاحب اور لیگ کونسل جو چاہیں کریں لیکن اتنا تو فرما دیا جائے کہ جن لوگوں نے مشیر بننے کی امید میں اچکنیں سلوائی ہیں، وہ درزی کو ان کی اجرت ادا کر دیں، یا اونے پونے داموں اچکنیں ہی بیچ ڈالیں؛ جلسے تو ہوتے ہی رہیں گے لیکن ذرا درزی کے تقاضے کا بھی تو خیال کیجئے۔

یہ دَور الاٹمنٹ ہی کا دَور نہیں تحقیقات کا دور بھی تو ہے یعنی جو شخص اٹھتا ہے تحقیقات کا مطالبہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں مسٹر جے پرکاش نے بھی کہہ دیا کہ مغربی بنگال کی وزارت کی بدعنوانیوں کی تحقیقات ضرور ہونی چاہیئے، ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں جہاں وزارت مہاجرین قائم ہے، وہاں ایک "وزارت تحقیقات" بھی قائم ہو جانی چاہیئے جو تحقیقات کے سوا اور کوئی کام نہ کرے۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر خدانخواستہ وزارت تحقیقات کے اہلکاروں کے اعمال کی تحقیقات ضروری ہو گئی تو یہ کام کون انجام دیگا؟

میسور میں اخبار نویسوں کی جو کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس کے صدر مسٹر سبھا راؤ نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ وزراء کو سرے سے جمہوریت کے معنی ہی معلوم نہیں۔ بات تو ایک حد تک درست ہے، لیکن مسٹر سبھا راؤ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو لوگ وزارت کا منصب حاصل کر لیتے ہیں، انہیں جمہوریت کے معنی یاد نہیں رہا کرتے، ذرا ان سے وزارت چھین کے دیکھئے، چودہ طبق روشن نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ۔

مغربی پنجاب میں یہی ہوا یعنی جو لوگ وزارت کے منصب پر پہنچ کے جمہوریت کے معنی بھول گئے تھے، آج ان سے زیادہ جمہوریت شناس ہی نظر نہیں آتا اور ابھی کیا ہے، جوں جوں الیکشن کا زمانہ قریب ہوتا جائے گا جمہوریت کے معنی ان لوگوں پر زیادہ واضح ہوتے جائیں گے۔ اُدھر الکشن ختم ہوا اور ادھر جمہوریت کا ذوق و شوق بھی ختم۔ اصل میں ان لوگوں پر مرگی کے دورے کی طرح جمہوریت کا بھی دورہ پڑا کرتا ہے، تعجب ہے، اخبار نویس ہو کے یہ آسان سی بات بھی مسٹر سبھا راؤ کی سمجھ میں نہیں آئی۔

---

۸ ستمبر

دولتانہ صاحب، باری صاحب اور مسٹر چیمہ ان دنوں جو بیان بازی فرما رہے ہیں،

اسے دیکھ کے بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بیان بازی کا ہے کو ہے، اچھی خاصی مجلس مشاعرہ ہے، میاں عبدالباری نے مصرع عرض کیا، مولانا صاحب نے پیش مصرع لگا کے اسے شعر بنا دیا، چیمہ صاحب اٹھے اور شعر پر تیسرا مصرع لگا کے اسے مثلث کی صورت دے دی، لیکن گستاخی معاف ہمیں تو یہ مقابلہ "چنا جور گرم والوں" کا مقابلہ معلوم ہوتا ہے، جسے آپ مشاعرہ تو نہیں ہاں تک بندی کا مقابلہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔

مغربی پنجاب میں "چنا جور گرم والے" تو بہت کم نظر آتے ہیں، لیکن دلّی اور یو۔پی وغیرہ میں ان کی کثرت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "دو چنا جور گرم والے" آمنے سامنے کھڑے ہو گئے، اور "چنا جور گرم" کی تعریف کرنی شروع کر دی، ایک کہتا ہے ؎

میرا چنا ہے سب سے نیارا
جس کو کھائے عالم سارا
منشی، متصدّی، پٹواری
جمّا، فتّا، عبدالباری
چنا جور گرم

دوسرا جواب دیتا ہے ؎

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا
اس کو کھائے قسمت والا
اس کے گاہک بڑے والے
یعنی ہپ ہپ ہرے والے
سارے مہاجر اور انصاری
چیمہ، لڈّن، عبدالباری
چنا جور گرم

اتنے میں تیسرا "چنا جور گرم" والا آ جاتا ہے اور یہ سلسلہ دیر تک چلتا ہے۔ لیکن "چنا جور گرم

والوں" کی بیت بحثی ہو یا ہمارے لیڈروں کی بیان بازی، ان کی حیثیت محض تجارتی مقابلہ کی ہے۔ تعجب ہے کہ اخبار والے ان بیانوں کو بیان کی حیثیت سے کیوں چھاپتے ہیں، اشتہار کی حیثیت سے چھاپ کے چھ روپے فی انچ کے حساب سے اُجرت وصول کیوں نہیں کر لیتے؟

---

۹ ستمبر

آل انڈیا فارورڈ بلاک نے پنڈت نہرو کو لکھا ہے کہ جب تک تمام پناہ گزینوں کو آباد کرنے کے کام سے فراغت نہیں ہو جاتی، وزرا کو پانچ سو روپے سے زیادہ تنخواہ نہ دی جائے۔ ہمارے خیال میں پناہ گزینوں کی آبادکاری کا مسئلہ حل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ وزرا کو دس دس ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہیں دی جائیں تاکہ وہ الاٹمنٹوں میں گڑبڑ نہ کریں۔ وزیروں کو پانچ سو روپے تنخواہ ملے گی تو کسی نہ کسی طریقہ سے روپیہ کمانے کی کوشش کریں گے اور پناہ گزینوں کی آبادکاری کا مسئلہ قیامت تک حل نہ ہو گا۔ معلوم نہیں، فارورڈ بلاک والے کس دُنیا میں رہتے ہیں، انہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ ہندوستان کے عوام کو مطمئن کرنے سے وزراء کو مطمئن کرنا زیادہ ضروری ہے۔

سندھ کی حکومت نے ایک نئی تعلیمی سکیم مرتب کی ہے، چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ دس سال کے اندر سندھ میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔ ہمارے خیال میں سندھ کی حکومت اگر اس تعلیمی سکیم کا نفاذ ملتوی بھی کر دے، جب بھی دس سال کے اندر لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد میں ضرور اضافہ ہو گا۔ پچھلے دس برس میں اگرچہ سندھ کی حکومت نے تعلیم پر کچھ زیادہ روپیہ صرف نہیں کیا، پھر بھی لکھے پڑھے سندھیوں کی تعداد ۱۹۳۹ء سے کہیں زیادہ ہے؛ آخر تعلیم پر مزید روپیہ صرف کرنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟ فی الحال اس سکیم کو رہنے دیجئے اور اس روپے کا کوئی اور مصرف تلاش کیجئے۔

سچ پوچھئے تو پڑھنا لکھنا سیکھنے سے بھی کیا فائدہ؟ ہمارا تجربہ ہے کہ جو لوگ پڑھنا لکھ

جلتے ہیں، وہ اخبار پڑھتے ہیں، دوسرے ملکوں کے حالات پڑھ کے اپنی حالت کا ان سے مقابلہ کرتے ہیں، اسی طرح ان میں بے اطمینانی پھیلتی ہے اور وہ حقوق مانگنا شروع کر دیتے ہیں، ان جھگڑوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم پھیلانے کے بجائے تعلیم کو روکا جائے۔

---

۱۱ ستمبر

ہندوستان میں سردار بلدیو سنگھ کے متعلق بہت سے لطیفے مشہور ہیں جو ہم تک نہیں پہنچتے مثلاً کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں سردار بلدیو سنگھ نے ایک محفل میں فرمایا کہ کشمیر کی لڑائی میں اب تک تو ہماری فوج اور ایر فورس ہی نے حصّہ لیا ہے، لیکن اب کے جنگ ہوئی تو مجھے نیوی بھی بھیجنی پڑے گی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کا سمندری بیڑا پٹھان کوٹ تک تو ریل گاڑی کے ذریعے بھیجا جائے گا، وہاں سے اسے لاریوں پر لاد کے جموں اور جموں سے رام بن پہنچایا جائے گا اور وہاں وہ دریائے چناب کو کھنگالتا پھرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جنگی بیڑے کا ایک حصّہ ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر بھیجا جائے، اور وہاں اسے ڈل، وُلر، یا دریائے جہلم میں ڈالنے کا کوئی بندوبست کیا جائے۔

بظاہر تو یہ لطیفہ محض یار لوگوں کی گھڑنت معلوم ہوتا ہے، لیکن کوئی عجب نہیں کہ سردار بلدیو سنگھ نے جوش میں آکے کوئی اس قسم کی کوئی بات کہہ دی ہو۔ سردار دسوندھا سنگھ کے متعلق جب اخباروں میں لطیفے چھپنے شروع ہوئے تو اکثر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ بعض اشخاص نے یہ لطیفے گھڑ کے سردار دسوندھا سنگھ سے منسوب کر دیئے ہیں، لیکن جو لوگ سردار دسوندھا سنگھ سے واقف ہیں، ان کا بیان ہے کہ سردار صاحب سے سچ مچ یہ حرکتیں سرزد نہیں ہوئیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ وہ اس قسم کی حرکتوں کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بات سردار بلدیو سنگھ

پر بھی صادق آتی ہے، یعنی اس قسم کی حرکت ان سے بعید معلوم نہیں ہوتی۔ سردار بلدیو سنگھ نے امیر البحر ممٹبز کے کشمیر آنے کی خبر سُن کے اپنے سمندری بیڑے کو سری نگر بھیجنے کا ارادہ کر لیا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

---

۱۴ ستمبر

معلوم ہوا ہے کہ مغربی پنجاب کے ایک مشہور جاگیر دار سردار محمد نواز خاں کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں ڈپٹی منسٹر کی حیثیت سے لے لیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پنجاب کے ایک اور جاگیردار کو پاکستان کی مرکزی وزارت میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے پچھلے دنوں اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ جاگیرداری اور زمینداری کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ہمارے خیال میں جاگیرداری اور زمینداری کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ سردار محمد نواز خاں کی قسم کے بڑے بڑے جاگیرداروں کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں بڑے بڑے عہدے دے دیئے جائیں۔ یہ لوگ وزارتوں اور سکتریوں کے پھیر میں پڑ کے اپنی زمینوں اور جاگیروں کی دیکھ بھال نہ کر سکے تو جاگیرداری اور زمینداری خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

سردار صاحب کی قابلیت کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ مس میو نے "مدر انڈیا" میں ان کی تعریف کی ہے، کیا عجب کہ یہی سرٹیفکیٹ ان کے کام آ گیا ہو۔ اس کے علاوہ وہ یونینسٹ بھی تو رہے ہیں بلکہ اب بھی "نیمے دروں نیمے بروں" قسم کے یونینسٹ ہیں، معلوم نہیں، عہدوں کی تقسیم کے موقع پر ملک خضر حیات خاں کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ ان دنوں مغربی پنجاب مسلم لیگ کے لیڈروں میں جو لڑائی ہو رہی ہے، اس میں میدان کس کے ہاتھ میں رہے گا؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ میدان کسی کے ہاتھ

بھی نہیں رہے گا، کیونکہ تینوں لیڈر یعنی باری، چیمہ اور دولتانہ برابر کی چوٹیں ہیں۔ آپ نے کبھی اصیل مرغوں کی لڑائی نہیں دیکھی؛ ایک نے بڑھ کے لات دی، دوسرے نے چونچ ماری اور حریف کی آنکھ حلقۂ چشم سے نکل آئی، لہولہان ہوتے جا رہے ہیں، لیکن جب تک تن میں جان ہے، کیا مجال ہے کہ قدم پیچھے ہٹائیں تو عرض یہ ہے کہ پنجاب کے لیڈروں کی لڑائی اصیل مرغوں کی لڑائی ہے، یہ لوگ مرتے مرجائیں گے، لیکن ہار نہیں مانیں گے۔ افسوس کہ آپ نے گھاکس بٹیروں کی لڑائی ہی دیکھی ہے، اصیل مرغوں کی لڑائی ملاحظہ فرمانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

---

۱۵ ستمبر

شاید سہروردی صاحب ان دنوں ولایت میں ہیں اور پاکستان کی فارن سروس کے لئے انگریز افسر بھرتی کر رہے ہیں، سنا ہے کہ اس معاملہ میں آئی، سی، ایس کے پرانے افسروں کو جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں اور "ہم مانگتا" کہہ کے اردو کی ٹانگ توڑ سکتے ہیں، ترجیح دی جا رہی ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے ملک سے جنوبی افریقہ، ملایا اور برما وغیرہ کے لئے قلی بھرتی کئے جاتے تھے، اب برطانیہ سے پاکستان کے لئے افسر بھرتی کئے جا رہے ہیں!

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ برطانیہ سے انجینئر یا ڈاکٹر منگوائے جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن محکمہ خارجہ تو بڑا اہم محکمہ ہے، اس میں بھی انگریز افسر بھر دیئے گئے تو ہمارا کوئی راز انگلستان سے کیسے چھپا رہ سکتا ہے؟ لیکن انگلستان والوں سے پردہ داری کی بھی کیا ضرورت ہے، دائی سے بھی کبھی کوئی پیٹ چھپاتا ہے، ایک تو ڈیڑھ سو برس کا پرانا تعلق ہی کچھ کم نہیں، پھر کامن ویلتھ کے اس نئے رشتے سے بھی تو برطانیہ ہمارا "محرم" ہے۔

سنا ہے، ریڈیو والوں کو روز اس مضمون کے خط آرہے ہیں کہ آپ بے گانے بجانے

میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں، اپنی عاقبت سنوارنا ہے تو ریڈیو پہ نماز پنجگانہ کا انتظام کیجئے اور نماز جمعہ کا تو خاص اہتمام ہونا چاہئے۔ گویا یہ حضرات چاہتے ہیں کہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں بھی نہ جانا پڑے، ریڈیو ہی پر نماز بھی پڑھ لی جایا کرے، پیش امام ریڈیو سٹیشن پہ نماز پڑھا رہا ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقتدی بنے ہوئے نماز باجماعت کا ثواب حاصل کر رہے ہیں۔

اقبالؒ نے تو نمازیوں کی تعداد کم دیکھ کے کہہ دیا تھا کہ ع

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں نمازی نہ رہے

لیکن اگر خدانخواستہ ریڈیو کے محکمہ نے نمازیں پڑھانے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، تو مسجدیں بالکل سنسان نظر آئیں گی اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھا کریں گے۔ ادھر ریڈیو پر اذان سنائی دی اور لوگوں نے وضو کر کے مصلے بچھائے، قد قامت الصلوٰۃ کی آواز آئی تو نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، جمعہ کے روز مسجد جامع میں بھی جانے کی ضرورت نہیں، گھر میں بیٹھے بیٹھے خطبہ سن رہے ہیں۔

اس تجویز میں ایک قباحت یہ ہے کہ مسجدوں کے پیش امام اور مؤذن بیکار ہو کے رہ جائیں گے۔ ان میں سے بعض کو تو خیر پروگرام اسسٹنٹ، پروگرام اگزیکٹو، ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریڈیو میں ملازمت مل سکتی ہے، بعض لوگوں کو تنخواہ دار آرٹسٹ کی حیثیت سے بھی ملازم رکھا جا سکتا ہے، لیکن سارے پیش اماموں اور مؤذنوں کے لئے تو ریڈیو کے محکمے میں گنجائش نہیں نکل سکتی، اس لئے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ان لوگوں کی "آباد کاری" کا کوئی انتظام ہو جانا چاہئے۔

ہمارے خیال میں تو ان تجاویز پہ پوری طرح عمل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریڈیو کے پورے محکمہ ہی کو علمائے کرام کے حوالے کر دیا جائے، اگر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی

اس محکمہ کا کنٹرولر بننا منظور فرمائیں تو سبحان اللہ، ورنہ کسی دوسرے بزرگ کو یہ عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ کراچی کا سٹیشن ڈائرکٹر بننے کے لیے مولانا عبدالحامد بدایونی بہت موزوں ہیں۔ لاہور کی سٹیشن ڈائرکٹری کے لئے مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، اور مولانا ابوالحسنات کے نام پیش کیئے جا سکتے ہیں۔ ہاں آمین بالجہر، رفع یدین، یا فاتحہ خلف امام پر جھگڑا ہو گیا تو ضرور مشکل پیش آئے گی اور کوئی عجب نہیں کہ اس جھگڑے کی وجہ سے ریڈیو کا محکمہ ہی ختم ہو جائے۔

---

۱۶ ستمبر

کراچی میں ان دنوں ایک صاحب حال بزرگ کی کرامت کا بہت چرچا ہے، یہ صاحب جن کا نام شیر بہادر ہے، ہزارہ کے رہنے والے ہیں اور ان دنوں کراچی میں تشریف فرما ہیں۔ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں ایک مسجد کا موذن جو ان کے کمالات سے ناواقف تھا، ان کی شان میں گستاخی کر بیٹھا تھا۔ شاہ صاحب نے ناراض ہو کے پھونک ماری اور بچارا موذن تڑپ کے ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے، یعنی پیر شیر بہادر کی پھونک میں ایسا ہی اثر ہے تو انہیں فوج میں بھرتی کر لینا چاہیئے، اگر خدانخواستہ کہیں جنگ چھڑ گئی تو پیر شیر بہادر کی پھونک ایٹم بم کا کام دے گی۔

پچھلے دنوں ہندوستان کے اخبارات نے بھی یہ عجیب و غریب خبر شائع کی تھی کہ کسی گاؤں میں ایک عورت کی لاش چتا پر رکھی جا چکی تھی کہ ایک سادھو آ گیا، اس نے آتے ہی کوئی ایسا منتر پڑھا کہ عورت ہری اوم ہری اوم کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اس قسم کا خرق عادت کسی مسلمان بزرگ سے نسبت رکھتا ہو تو ارباب تصوف کی اصطلاح میں اسے کرامت کہتے ہیں اور کسی غیر مسلم سے ایسا کمال سرزد ہو تو وہ استدراج کہلاتا ہے اور پنجاب کے لوگوں نے تو استدراج کے بعض واقعات مہاراجہ رنجیت سنگھ سے بھی منسوب کر رکھے ہیں۔

راقم الحروف کے ایک عزیز جو تصوف کے کوچے سے بھی آگاہ ہیں، ۱۹۳۱ء میں فقیرانہ وضع میں سری نگر کے نواح میں پھرتے رہے ہیں۔ فقیرانہ وضع اختیار کرنے کی انہیں ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ وہ ایک جرم میں ماخوذ تھے اور پولیس ان کی تلاش میں تھی، چونکہ انہیں ہر مہینے ان کا ایک دوست تیس چالیس روپے سرینگر کے بڑے ڈاکخانے کی معرفت بھیج دیتا تھا جو ان کی گزر کے لئے کافی تھے۔ کشمیر میں "پیر پرستی" عام ہے، اس لئے بعض لوگ ان کے معتقد ہو گئے، لیکن وہ کسی سے کوئی چیز ہدیہ کے طور پر قبول نہیں کرتے تھے۔ اپنی ضرورت کی جو چیزیں لوگوں سے لیتے تھے۔ ان کی نقد قیمت ادا کر دیتے تھے، اس چیز نے لوگوں کو اُن کا زیادہ عقیدت مند بنا دیا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے ان کی بزرگی کی دھاک سری نگر کے گرد و نواح کے علاقے میں بٹھا دی۔ وہ ایک گاؤں میں قیام پذیر تھے اور جو لوگ ان سے ملتے تھے، انہیں ڈوگروں کے خلاف ابھارتے رہتے تھے۔ ایک دن گاؤں کا ایک خوشحال شخص جو اُن کا مخالف تھا، اُن سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ خیر چاہتے ہو تو اس گاؤں سے فوراً چلے جاؤ۔ یہ کہتے ہی اُس کی حالت غیر ہو گئی، یعنی اُس نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔ متواتر تین مہینے تک اُس کی یہی حالت رہی، ا ، وہ اچھا بھی ہوا تو کسی نے اس کے معالجوں کی داد نہ دی، بلکہ اُس کی دیوانگی کی طرح اُس کی شفایابی کو "شاہ صاحب" ہی کی کرامت سمجھا۔

میں نے اپنے ان عزیز سے ایک مرتبہ پوچھا کہ :-

"آخر تم نے کیا ترکیب لڑائی کہ اس بچارے کا دماغ خراب ہو گیا"

جواب ملا :

"اسے محض اتفاق سمجھنا چاہئے کہ دیوانگی کا دورہ تو اسے ہر حال میں ضرور پڑتا لیکن اتفاق سے عین اس وقت پڑا جب وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔"

سری نگر اور اس کے اطراف میں ابھی تک اُن کے مرید موجود ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں راقم الحروف کو سری نگر جانے کا اتفاق ہُوا تو خود ان کے مریدوں سے اس واقعہ کی ساری تفصیل معلوم ہوئی لطف یہ ہے کہ بچارے "شاہ صاحب" اپنے آپ کو پیر نہیں کہتے، اس واقعہ کو اپنی کرامت پر محمول نہیں کرتے، پیروں فقیروں سے انہیں کبھی واسطہ نہیں رہا، گنڈے تعویذ کے وہ سرے سے قائل ہی نہیں، لیکن مریدوں کو کون قائل کرے؟

ایک جاہل پٹھان اپنے پیر کی تعریف میں بڑے غلو سے کام لیتا تھا، ایک موقع پر تو یہاں تک کہہ دیا کہ:-

"واللہ پیر ما خدا است"۔

پیر صاحب تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے کہا:

"استغفر اللہ! اس جاہل نے تو حد ہی کر دی، ورنہ کہاں مَیں اور کہاں خُدا؟"

لوگوں نے پٹھان سے ذکر کیا کہ پیر صاحب کو تو "خدا ہونے" سے انکار ہے، تو پٹھان کہنے لگا:

"واللہ کہ خدا است، پدر سوختہ انکسار مے کند"۔

---

۱۸ ستمبر

کانگریس اسمبلی پارٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے آیندہ دو نام ہوں گے، ایک "انڈیا" دوسرا "بھارت" دستور کے انگریزی مسودے میں وہ "انڈیا" ہی رہے گا، لیکن ہندی مسودے میں اسے "بھارت" لکھا جائے گا۔ گویا ہندوستان کے ان دو ناموں میں ایک باہر کے لوگوں کے لئے ہے، دوسرا اہل ملک کے لئے، یوں سمجھئے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

"انڈیا" ہندوستان کا اصلی نام نہیں بلکہ انگریزوں کا عطیہ ہے جسے ہندوستان کے لیڈروں نے صاحب بہادر کی خوشنودیٔ مزاج کی سند کی طرح سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، کرنل سمتھ کے بیرے کا نام شہیب اللہ تھا، وہ اس نام کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اُسے "شیڈلا" کہتے تھے، کرنل سمتھ ولایت چلے گئے، ان کا بیرا شہید اللہ کہلاتا ہے، حالانکہ اگر وہ ہندوستانی لیڈروں کی پیروی کرتا تو "شیڈلا" ہی کہلاتا۔

ہندوستان کے لیڈروں نے تو اس معاملہ میں کمال ہی کر دیا، وہ اپنے ملک کے اصل نام یعنی "ہند" کو جسے صاحب بہادر نے بگاڑ کے "انڈیا" بنا لیا ہے، بالکل بھول ہی گئے لیکن ہندوستان کے لیڈر اپنے ملک کو چاہے انڈیا کہیں چاہے بھارت، عام لوگ اسے ہند اور ہندوستان ہی کہتے رہیں گے، اس حساب سے ہندوستان کے تین نام ہوئے ؎

مایا تیرے تین نام
پرسو پرسا پرسرام

جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے، ہندوستانی لیڈر جن پر راشٹریہ سیوک سنگھ کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے، اس دُھن میں ہیں کہ کسی طرح اپنے ملک کو دو ہزار برس پیچھے ہٹا لے جائیں۔ پہلے ملک کے مختلف حصوں کے لئے ایسے نام تجویز کئے گئے جو آج سے ڈیڑھ دو ہزار برس پہلے رائج تھے، مثلاً "سوراشٹر، نشادھ، ہماچل پردیش بھرپور" پورے ملک کا نام بھارت تجویز کیا گیا، اب شہروں کے نام بدلے جا رہے ہیں، بنارس کا نام تو "کاشی" تجویز کر لیا گیا، اب یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ دلی کو اندر پرستھ، فیض آباد کو اجودھیا اور الہ آباد کو پراگ نہ کہنا شروع کر دیں۔ بہرحال ہندوستان نے تو شہروں کے ناموں کی "شدھی" شروع کر دی ہے لیکن ہم نے "سڑکوں" کو بھی مشرف باسلام نہیں کیا، لاہور میں کرشن نگر، رام نگر، بھارت نگر وغیرہ ابھی تک موجود ہیں۔ کراچی میں نہرو روڈ، رنچھوڑ لائن، پٹیل روڈ وغیرہ جیسی "ہندو سڑکیں" مزے کر رہی ہیں۔

---

۲۰ ستمبر

سُنا ہے، سرحد کی حکومت نے ٹریفک کے مقدموں کے لئے "چلتے پھرتے مجسٹریٹ" مقرر کر دیئے ہیں جو چل پھر کے مقدموں کی سماعت کیا کریں گے۔ پنجاب کی مرحوم وزارت کے زمانے میں نیک نامی تُل کے بکتی رہی ہے، اب عبدالقیوم خاں نے "انصاف" کا خوانچہ لگایا ہے اور مجسٹریٹوں کو "خوانچے والے" بنا کے رکھ دیا ہے۔

سچ پوچھئے تو سکھ اپنے زمانۂ حکومت میں اس سے بھی بڑے کارنامے انجام دے چکے ہیں، مثلاً گوجر سنگھ جس کے نام پر قلعہ گوجر سنگھ مشہور ہے، اپنی حکومت کے زمانے میں صبح سویرے کندھے پر لٹھ رکھ کے گھر سے نکلتا تھا اور کھٹ مُنوں کے انداز میں "انصاف کرا لو" کی صدا لگاتا پھرتا تھا۔ عبدالقیوم خاں سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ انہوں نے "انصاف" کو ٹریفک تک محدود کر کے رکھ دیا ہے، ورنہ اگر ہر قسم کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لئے سفری مجسٹریٹ مقرر کر دیئے جائیں جو اپنے ریڈر اور عدالت کے پیادوں کو ساتھ لئے محلوں میں گھومتے پھریں تو عبدالقیوم خاں کے بڑے بڑے منکر اُن کی اُپج کی داد دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

اگر یہ طریقہ چل نکلا یعنی پھیری والے مجسٹریٹوں کا دائرہ ٹریفک کے مقدمات ہی تک محدود نہ رہا تو بچارے وکیل بھی وکالت کا خوانچہ لگانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یعنی آپ چند دنوں میں دیکھ لیجئے گا کہ بڑے بڑے وکیل جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے "ریہڑی" پر کتابیں رکھے "وکالت کرا لو" کی صدائیں لگاتے پھریں گے۔ آخر سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے، اس لئے کوئی عجب نہیں کہ ایک زمانے میں "سفری مجسٹریٹ" اور "سفری وکیل" کی طرح "جیبی مجسٹریٹ" اور "جیبی وکیل" بھی ایجاد ہو جائیں۔

---

۱۲ ستمبر

خواجہ شہاب الدین وزیر مہاجرین حج کرنے تشریف لے گئے ہیں، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی بھی ان کے ساتھ ہیں، لیکن بعض اخباروں نے لکھا ہے کہ خواجہ خیر سگالی کا وفد لے کے جا رہے ہیں اور مولانا عثمانی اس وفد کے رکن ہیں۔ اخباروں نے یہ نہیں بتایا کہ خواجہ صاحب یہ وفد کس کے پاس لے جا رہے ہیں لیکن یہ بتلانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ خواجہ صاحب، وفد لے کے مکہ معظمہ جا رہے ہیں اور مولانا شبیر احمد عثمانی بھی شریک وفد ہیں، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ وہ خیر سگالی کا یہ وفد لے کے اللہ میاں کے پاس ہی جا رہے ہوں گے۔

پچھلے سال جو لوگ حج کرنے گئے، اُن میں بعض ایسے تاجر اور زمیندار بھی تھے جنہوں نے بلیک مارکیٹ میں لاکھوں روپے کمائے اور اسی بلیک مارکٹ کی کمائی کی بدولت حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے دل و دماغ پر بلیک مارکٹ کا اثر اتنا چھایا ہوا تھا کہ حج کے موقع پر اللھم لبیک کی جگہ بار بار زبان سے "اللھم بلیک" نکل جاتا تھا۔

مرزا ارشد گورگانوی دہلوی جو مدت تک لاہور میں رہے ہیں، بڑے مزے کے بزرگوار تھے جس زمانے میں لاہور آئے، حاجی شمس الدین مرحوم جو انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں سے تھے نئے نئے حج کر کے آئے تھے۔ مرزا صاحب نے حاجی شمس الدین صاحب کے توڑ پر نمازی ارشد کہلانا شروع کر دیا، لوگ پوچھتے تھے کہ آپ کو نمازی ارشد کہلانے پر اتنا اصرار کیوں ہے، تو جواب ملتا تھا کہ شمس الدین صاحب نے صرف ایک حج کیا اور حاجی شمس الدین کہلانے لگے، میں ساری عمر باقاعدگی سے پنج وقتہ نماز پڑھتا رہا ہوں، پھر نمازی ارشد کیوں نہ کہلاؤں؟

کل وائی، ایم، سی، اے ہال لاہور میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی صدارت میں جو جلسہ

ہُوا، کہتے ہیں، ایک خاتون نے ایک شاعر کو ازراہِ قدردانی دس روپے عطا فرمائے۔ اب تک تو شاعری صرف جھوٹی سچی واہ واہ کے سہارے زندہ تھی لیکن مشاعروں میں یوں نوٹ برسنے لگے تو ہر طرف شاعر ہی شاعر نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انعام دینے والی خاتون کے نام کا اعلان تو نہیں کیا گیا؛ البتہ انعام پانے والے شاعر کے نام کا اعلان برسرِ مشاعرہ ہی کر دیا گیا تھا۔ بہرحال انعام کا تو یہ طریقہ نہیں، البتہ خیرات کا سب سے اچھا طریقہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ خیرات دینے والے کا نام کسی کو نہ بتایا جائے۔

۲۲ر ستمبر

پونڈ کی قیمت کم ہو جانے سے ہم پر کیا اثر پڑے گا؛ اس بحث کو تو جانے دیجئے لیکن اس واقعہ سے اتنا معلوم ہو گیا کہ پاکستان کا روپیہ پونڈ کا بال باندھا غلام ہے۔ آقا پر جو مصیبت گزرے گی، غلام کو بھی اس میں حصّہ لینا پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ پونڈ نے ڈالر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو مجبوراً روپے کو سر جھکا دینا پڑا۔ اور اکیلے روپے ہی پر تو یہ آفت نہیں آئی، بچارے کا سارا کنبہ یعنی اٹھنّی، چوّنی، دوّنی، اکنّی، پیسہ، دھیلہ اور پائی اسی مصیبت میں مبتلا ہے، اب بچارا کرے بھی تو کیا کرے ع

تہمت ہے تیرے عشق کی ہم پر لگی ہوئی

پرانے زمانے کے قمار باز جوا کھیلتے تھے تو ساری دولت ہارنے کے بعد اپنا سارا کنبہ بھی ہار جاتے تھے۔ پانڈونے کوروسے جوا کھیلا تھا تو یہی کیا تھا، لیکن پونڈ پانڈو سے بھی بڑھ گیا، اپنے کنبے یعنی شلنگ، پنس کو ہار جانے کے بعد اپنے غلام روپے اور اس کے سارے کنبے یعنی چوّنی، دوّنی اور اکنّی کو بھی داؤ پہ لگا کے ہار گیا۔

سنا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے بڑے بڑے شاعروں کو ان دنوں

ملک الشعرا کا خطاب مرحمت ہو رہا ہے۔ مدراس میں تو صرف ایک شخص کو یہ خطاب ملا ہے، لیکن بمبئی کے چار شاعروں کو اس اعزاز کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے۔ قاعدے کے مطابق تو ایک ملک میں ایک ہی شخص ملک الشعرا ہو سکتا ہے، کیونکہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" لیکن بمبئی کے پردھان منتری صاحب ایک صوبے میں چار ملک الشعرا بنانے پر تُلے ہوئے ہیں تو کوئی انہیں کیونکر روک سکتا ہے؟

ہمارے خیال میں یہ طریقہ بُرا نہیں۔ ہمیں بھی پاکستان کے مختلف صوبوں کے بڑے بڑے شاعروں کو ملک الشعرا کا خطاب دے کے ہندوستان کی اس طرح پر گرہ لگانا چاہیئے۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ہم چاہیں تو پاکستان کے ہر محلہ میں ایک "ملک الشعرا" تعینات کر سکتے ہیں جو میر محلہ کے فرائض بھی انجام دے اور ضرورت پڑے تو محلّہ کے نوجوانوں کو شعر بھی لکھ دیا کرے۔

لاہور میں تو خیر بڑے بڑے جغادری شاعر بھرے پڑے ہیں جو پورے پورے مشاعرے جیب میں لئے پھرتے ہیں، لیکن کراچی بھی لاہور سے کم نہیں، یعنی یہاں ہر اونٹ گاڑی والا شاعر ہے، آخر یہ قطعہ کسی اونٹ گاڑی والے ہی کا تو ہے ؎

اُشتر صراحی گردنا دانم چہ خواہی کردنا
گردن درازی مے کنی پنبہ بخواہی خوردنا

کھیر صاحب سمجھے کہ بمبئی کے چار شاعروں کو ملک الشعرا کا اعزاز مرحمت کر کے انہوں نے بڑا تیر مارا، حالانکہ پاکستان میں یہ سلسلہ چل نکلا تو لاہور اور کراچی کو پچاس پچاس شاعروں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ مثلاً کراچی میں ایک صاحب بولٹن مارکیٹ کے ملک الشعرا ہیں، دوسرے بزرگوار لیاری کوارٹرز میں ملک الشعرائی فرما رہے ہیں، تیسرے کے ممالکِ محروسہ میں پوری بندر روڈ آ گئی ہے۔ اسی طرح لاہور میں ایک صاحب مال روڈ

کے ملک الشعرا مقرر ہوں گے، دوسرے کے حصّے میں میکلوڈ روڈ آئے گی تیسرے کو انار کلی اور جھنگڑ محلہ الاٹ کیا جائے گا، وقس علی ہذا۔

لیکن ایک ملک الشعرا اگر دوسرے ملک الشعرا کے علاقے میں شعر سنانا بلکہ شعر کہنا بھی چاہے تو یہ شرارت کی بات ہے، ممکن ہے کہ ایسے موقعوں پر "ملک الشعرا" قسم کے دو بزرگوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ بہر حال مطمئن رہئے کہ یہ جنگ مولانا عبدالباری اور میاں محمد ممتاز دولتانہ کی جنگ سے زیادہ خطرناک نہیں ہوگی، کیونکہ شاعر زیادہ سے زیادہ ہجو ہی کہے گا، لیڈروں کی طرح سر سے ٹوپی تو نہیں اتارے گا۔

---

۲۳ ستمبر

ہمارے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے "ستارۂ صبح" ۱۹۱۸ء میں لاہور سے نکالا تھا اور اس میں جناب امین حزیں سیالکوٹی کی نظمیں بھی چھپا کرتی تھیں جہاں تک ہمیں یاد ہے، مولانا ظفر علی خاں نے ستارۂ صبح ۱۹۱۴ء میں کرم آباد سے نکالا تھا، ہماری نظر سے ستارۂ صبح میں امین حزیں صاحب کی نظمیں تو نہیں گزریں، ممکن ہے کبھی ایک آدھ نظم چھپ گئی ہو۔

ستارۂ صبح کی پیشانی پر یہ شعر چھپا کرتا تھا ؎

من آں ستارۂ صبحم کہ در محلِ طلوع
ہمیشہ پیش روِ آفتاب می باشم

اب اگر کوئی صاحب اس شعر سے یہ نتیجہ نکالیں کہ مولانا ظفر علی خاں نے پہلے ستارۂ صبح نکالا، پھر لاہور سے آفتاب شائع کیا، اس کے بعد کہیں دکن ریویو، پنجاب ریویو اور زمیندار کی باری آئی تو بتائیے ہمارے اور آپ کے پاس اس استدلال کا کیا جواب ہے؟

سُنا ہے، بہاول پور کی حکومت آج کل بہاول پور کے چڑیا گھر کو پاکستان کا سب سے بڑا چڑیا گھر بنانے کی فکر میں ہے، ایک کالا تیندوا تو آگیا ہے، اب بلجیم کے ایک تاجر کو زرافوں کے ایک جوڑے کا آرڈر دیا گیا ہے۔ گویا بہاول پور کی سب سے بڑی ضرورت چڑیا گھر ہے، اگر حکومت بہاول پور کو پاکستان کا سب سے بڑا چڑیا گھر بنانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تو بس راوی چین لکھتا ہے۔

بہاول پور کے عوام یونہی شور مچا رہے ہیں کہ ریاست میں ذمہ دار نظام حکومت قائم ہونا چاہئے۔ عوام کے دُکھ دُور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ تو چڑیا گھر کا قیام ہے۔ دو زرافے ایک تیندوا، ایک زیبرا، دو شیر، چار چیتے، پانچ بھالو اور کرنل ڈرنگ تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر بہاول پور ایک کرنل ڈرنگ اور لے آئیں ہمارے خیال میں پاکستان کے عوام کو بھی دو زرافوں، اور ایک تیندوے والا نسخہ پلے باندھ لینا چاہئے شاید کبھی کام آئے۔

۲۵ر ستمبر

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ حکومت ہند ماسٹر تارا سنگھ کی رہائی کے سوال پر غور کر رہی ہے، ہمارے خیال میں اب ماسٹر تارا سنگھ کو رہا کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب سے ہندوستان نے روپیہ کی قیمت کم کی ہے۔ لیڈروں کی قیمت بھی خود بخود کم ہو گئی ہے، بلکہ بہتر ہو گا کہ سارے اکالیوں کو رہا کرا دیا جائے، روپیہ کی کوئی حیثیت نہ رہی تو دوّنی چوّنی کی کیا حیثیت ہے؟

پاکستان نے اگرچہ اپنے روپے کی قیمت کم نہیں کی، تاہم مغربی پنجاب کے لیڈروں کی قیمت میں ضرور تخفیف ہوئی ہے۔ اس صوبہ کے سب سے بڑے لیڈر تو دولتانہ صاحب تھے،

لیکن پچھلے دنوں ان کی لیڈری بھی ہندوستان اور پاکستان کی شرح مبادلہ کے رو سے پنڈت گوپی چند بھارگو کی لیڈری کے برابر ہو کے رہ گئی ہے! اس حالت میں ان دونوں چونیوں یعنی ان کے اہالی موالی کا کیا ذکر جنہیں اُن کی لیڈری کا سہارا تھا۔

یاری صاحب کو دو نتانہ کی لیڈری کے زوال پر خوش نہیں ہونا چاہیئے، اس زمانے میں جب کہ نئی ٹکسال کے کھنکھناتے سکوں کو کوئی نہیں پوچھتا، ان ایسے نانک شاہی سکوں کی پروا کون کرے گا؟ ہمیں تو اندیشہ ہے کہ نئی شرح مبادلہ کے رُو سے کہیں ان کی لیڈری ڈاکٹر سیتاپال کے برابر نہ سمجھی جائے۔

---

۲۶ ستمبر

پرانے زمانے کے مہوس سونا بنانے کے شوق میں ساری عمریں صرف کر دیا کرتے تھے، کبھی گندھک کا تیل نکالا جا رہا ہے، کبھی پارے کو قائم النار کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں، کبھی اس فکر میں پڑے ہیں کہ شمس مغربی سے کیمیا کا جو مشہور نسخہ منسوب کیا جا رہا ہے، اس میں "خون تیرہ" سے کیا مراد ہے؟ آخر اگلے بزرگوں نے یہ جو کہا ہے کہ "در خون تیرہ تر کن دانگہ بنار در کن" تو کچھ سمجھ ہی کے کہا ہوگا۔

پرانے زمانے کے یہ مہوس زمانے کے ساتھ مٹ گئے، صرف لے دے کے چودھری خلیق الزّمان سلمۃ المنّان پرانے کیمیا گروں کی یادگار باقی رہ گئے ہیں یعنی ہمارے ملک کے پُرانے لیڈروں میں صرف اُنہی کو معلوم ہے کہ خون تیرہ کسے کہتے ہیں، پارہ کیونکر قائم النار کیا جا سکتا ہے اور سونا کیونکر بنتا ہے لیکن چودھری صاحب کو بھی سونا بنانے سے زیادہ اسلامستان بنانے کی فکر ہے، چنانچہ ان دنوں اسلامستان کے نسخے کے اجزا جمع کرنے کی فکر میں اسلامی ملکوں کی سیر کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اسلامستان کے نسخے کے اجزا کیا کیا ہیں؟ اس میں بھی پارے کو قائم النار کرنا ضروری ہے یا نہیں، اور سچ پوچھئے تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کسی "صدری نسخہ" کے مطابق اسلامستان بنانا چاہتے ہیں یا انہوں نے یہ نسخہ فارما کوپیا برٹانیکا سے سے لیا ہے۔ پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ چودھری صاحب کسی مستند نسخہ کے مطابق اسلامستان بنانے کی کوشش کریں گے، یہ اور بات ہے کہ "ایک آنچ" کی کسر باقی رہ جائے اور اسلامستان بن ہی نہ سکے۔

چودھری صاحب نے اگر فارما کوپیا برٹانیکا کے کسی نئے نسخے کے مطابق اسلامستان بنانے کا ارادہ کیا ہے تو خیر اور بات ہے، لیکن اگر انہیں صرف اپنے صدری نسخوں پر بھروسہ ہے تو ہم اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ خونِ تیرہ کے پرانے نسخے ہی کے بھروسے پر نہ رہئے گا، بلکہ تھوڑی سی ٹنکچر الاٹمنٹ بھی شامل کر لیجئے گا۔ باور نہ آئے تو شاہ عبداللہ سے مشورہ کر لیجئے، وہ بھی پرانے مہوس ہیں اور ان کا بس چلے تو صرف شام یا فلسطین ہی نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کو اپنے نام الاٹ کرالیں۔

چودھری خلیق الزماں کہیں کے نواب یا جاگیردار نہیں بلکہ نرے لیڈر اور مہاجر قسم کے لیڈر ہیں، لیکن طبیعت شاہانہ پائی ہے، وہ پرانے امیرزادوں کی طرح بٹیر بازی اور پتنگ بازی یا بڈھے رئیسوں کی طرح سونا بنانے کے چکر میں نہیں پڑے تو کیا ہوا، انہیں اسلامستان بنانے کا شوق کیمیا گری اور مہوسی سے کیا کم ہے؟

چودھری خلیق الزماں نئے نئے ہندوستان سے پاکستان آئے تو لوگ سمجھتے تھے کہ وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کے مہاجرین کی حالت سدھارنے کی کوشش کریں گے اور جو لوگ فٹ پاتھ پر زندگی گزار رہے ہیں انہیں چودھری صاحب کی کوششوں سے کہیں نہ کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا مل جائے گا، لیکن چودھری صاحب کو رہنے کے لئے کوٹھی اور وقت

گذارنے کے لئے لیگ کی صدارت مل گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ الٹ ہو گیا تھا، پھر وہ اس بکھیڑے ہی میں کیوں پڑتے؟ کہ کس کو کیا ملا اور کس کو کیا نہیں ملا؟

---

۲۸ ستمبر

برطانوی عہدِ حکومت میں والیانِ ریاست بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے، اصطبل میں سیکڑوں گھوڑے، فیل خانہ میں بیسیوں ہاتھی جن کی دیکھ بھال کے لئے سائیسوں اور چرکٹوں کی پوری فوج مقرر تھی، اس کے علاوہ والیٔ ریاست کی سرکار سے کئی طوائفیں، سازندے، گوّیے اور پہلوان وابستہ تھے۔ محل کے اندر پیش خدمتوں اور ڈومنیوں کا راج تھا اور باہر طوائفوں کا تسلط، گویا بقول شخصے محل میں ڈومنی رٹ (ڈومنین سٹیٹس) تھا اور باہر "طوائف الملوکی" کا دور۔

ہندوستانی ریاستوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے نہ اصطبل رہے نہ فیل خانے، گوّیے اور پہلوان موقوف کر دیئے گئے، طوائفیں اور سازندے، ڈومنیاں اور پیش خدمتیں معرضِ تخفیف میں آ گئیں۔

موسیقی کے ایک مشہور استاد پنڈت اونکار ناتھ نے پنڈت نہرو کو خط لکھا ہے جس میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں جگہ جگہ موسیقی کے سکول کھولے جائیں تاکہ ریاستوں سے جو گوّیے نکالے گئے ہیں، ان کی معاش کا انتظام ہو جائے، لیکن اول تو موسیقی کے اسکول کھولنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اور اگر روپیہ فراہم بھی ہو جائے تو "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" یعنی جب تک یہ اسکول کھلیں کئی گوّیے بھینسوں کے آگے بین بجاتے بجاتے لڑھک چکے ہوں گے۔

چلئے ہاں مان لیتے ہیں کہ پنڈت جی اونکار جی مہاراج کی کوششوں سے چند گویّوں کی آباد کاری کا انتظام ہو گیا، لیکن سازندوں، طوائفوں، مہاوتوں، جیب کتروں، سائیسوں اور گھوڑوں کی آباد کاری کا کیا انتظام کیجئے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ بعض طوائفیں دلی، کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں آباد ہو گئی ہیں، لیکن ان شہروں کو صرف آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہے وہ نرت اور بھاؤ کی قدر کیا کریں گے؟ اور طوائفوں کو تو خیر پھر بھی کوئی نہ کوئی ٹھکانہ مل جائے گا، لیکن مہاوت اور سائیس، ہاتھی اور گھوڑے کیا کریں گے؟!

ہاتھیوں کے لئے صرف سرکسوں میں گنجائش نکل سکتی تھی، لیکن ہندوستان میں سرکس بھی نہیں رہے۔ پنڈت نہرو نے چاہا تھا کہ سفیروں کی طرح ہاتھیوں کو بھی "خیر سگالی کے مشن" پر باہر بھجوایا جائے لیکن جاپان جیسے ملک میں بھی صرف ایک ہتھنی کی گنجائش نکل سکی اب اگر ہر ملک میں سفیر کے ساتھ ساتھ ایک ہاتھی بھی بھجوا دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ پچیس تیس ہاتھیوں کی گنجائش نکل آئے گی، اس طرح ہاتھیوں کی آباد کاری کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔

گھوڑوں کے گھاس دانے کا پھر بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو گیا ہے یعنی ریاستوں سے جن گھوڑوں کو دیس نکالا ملا ہے، ان میں بعض تانگوں اور گھوڑا گاڑیوں میں جت گئے ہیں لیکن کہاں وہ مزے کہ ہفتوں تھان پر کھڑے ہنہنا رہے ہیں اور کہاں یہ دن رات کی ٹک ٹک۔ پھر گھوڑا گاڑی والا تو کسی قدر "ریاستی آداب" سے واقف ہے، اس لئے گالیاں نہیں دیتا، لیکن تانگے والے کی زبان سے خدا بچائے، گالیاں دینے پر آتا ہے، تو بس تار ہی باندھ دیتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ آخر راجہ صاحب کی سواری کا گھوڑا ہے اور اس کا سلسلۂ نسب رستم کی سواری کے گھوڑے رخش تک پہنچتا ہے۔

۵ر اکتوبر

پچھلے دنوں "پاکستان ٹائمز" نے پنجاب یونیورسٹی کی بدعنوانیوں کی حکایت چھیڑی تھی

یونیورسٹی والوں سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک لمبا چوڑا بیان اخباروں میں چھپوا دیا، لیکن پاکستان ٹائمز نے یونیورسٹی والوں پر جو الزامات لگائے تھے، اس بیان سے ان کی تردید نہیں ہوتی، بلکہ بعض الزامات کی تو تائید ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک بڑا الزام یہ تھا کہ یونیورسٹی میں اہلِ علم کا قحط ہے اور یہ بیان سامنے رکھ لیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی ٹٹ پونجیے اخبار نویس یعنی مرحوم اخبار "منٹر چھٹکار" کے مرحوم ایڈیٹر، یا پنجاب کے کسی سیاسی اکھاڑے کے استاد کی زبان ہو تو ہو، لیکن اہلِ علم کی زبان تو ہرگز نہیں۔

یونیورسٹی والوں کو چاہیئے تھا کہ یا تو "پاکستان ٹائمز" کے الزامات کا جواب ہی نہ دیتے، کیونکہ زبان بہتیرے راز فاش کر دیا کرتی ہے یا پھر بیان لکھوانے کے لئے اہلِ علم کی خدمات حاصل کرتے، یونیورسٹی میں اہلِ علم نہ سہی، لیکن یونیورسٹی سے باہر تو موجود ہیں، دُنیا ان سے خالی نہیں ہو گئی، بہرحال ہمارا مشورہ یہی ہے کہ جو لوگ صرف "بل کے ٹاٹ" کے بھروسے پر اولوالعزمی کے راستے میں قدم رکھنا چاہتے ہیں، انہیں چُپ رہنے کی عادت ڈالنی چاہیئے، کیونکہ ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یونیورسٹی کے "اصحاب دانش و فرہنگ" کو کون سمجھائے کہ اہلِ علم اعتراضات سُن کے یوں جھنجھلایا نہیں کرتے، منہ میں کف نہیں بھر لاتے، بیان بازی پر فخر نہیں کرتے، اپنے کارناموں کی داستان سرائی نہیں فرماتے، اپنے پیشروؤں کا ذکر نامناسب الفاظ میں نہیں کیا کرتے یعنی گلی کوچوں اور ہاٹ بازار میں خوانچہ والوں کی طرح صدا لگا لگا کے علم کی جنس بیچتے پھرنا، اور چنا جور گرم والوں کی طرح اپنے حریفوں پر چوٹیں کرنا اہلِ علم کے منہ پر نہیں کھلتا۔

پاکستان ٹائمز نے اعتراض کیا تھا کہ اردو کے نصاب میں مستند شعرا کے کلام

کی جگہ آج کل کے بعض "استخواں بندوں" کا کلام شامل کر لیا گیا ہے جس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ "معاصر شعرا" کا کلام شامل کرنا بھی لازمی تھا لیکن ان "معاصر شعرا" پر شاعری کی تو صرف تہمت ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ یونیورسٹی میں جس جتھے کا زور ہے۔ یہ بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ اگر میر و سودا، انیس و غالب کا کلام نصاب سے خارج کر کے اس کی جگہ نتھو رام بیدل۔ مرموز عتابی اور تربوز شادابی کی قسم کے شاعروں کا کلام رکھ دیا جائے تو اسے کون "معاصر شعرا" کی قدر شناسی سمجھے گا؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر وائس چانسلر صاحب کا بیرا شاعر ہوتا، تو اس کا کلام بھی نصاب میں شامل کر لیا جاتا! وہ تو خیریت گذری کہ ان کے بیرے بلکہ خود ان کے پورے خاندان میں کوئی شاعر نہیں ہے، بیرے کے کلام کو شامل نصاب کرنا کوئی عجیب بات نہیں، روما کے ایک شہنشاہ کیلی گولا نے بھی تو اپنے گھوڑے کو سینٹ کا ممبر بنا دیا تھا۔

یونیورسٹی کی جانب سے کہا گیا ہے کہ جن حضرات کو یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا گیا ہے ان میں بڑے بڑے اہلِ علم شامل ہیں۔ درست ارشاد فرمایا، ان بزرگوں کے علم کا طول و عرض اور ارتفاع اسی سے ظاہر ہے کہ ایک صاحب جنہیں یونیورسٹی کے فیلو ہونے کی سعادت حاصل ہے، اپنے آپ کو 'فیلو' نہیں بلکہ "فیلو" کہتے ہیں اور اس خیال میں مگن ہیں کہ علمی مدارج میں 'فیلو' یعنی "فیل علم" بھی ایک درجہ ہے جو یونیورسٹی کی ساری ڈگریوں سے اونچا سمجھا جاتا ہے اور بات صحیح بھی ہے، یونیورسٹی کے فیل خانے میں بڑے بڑے سپید ہاتھی جن کی زری دار جھولوں پر نظر نہیں ٹھہرتی اپنے اپنے تھان پر جھوم رہے ہیں۔

بہر حال یہ تو ایک الگ بحث ہے جو مستقل فرصت کی محتاج ہے، اس موقع پر ہم یونیورسٹی کے اربابِ علم و فضل کی خدمت میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے بیان جن سے علم کے نام کو بٹہ لگتا ہے، شائع کرتے رہنا کوئی اچھا مشغلہ نہیں۔ اہلِ علم کو ہر موقع پر اپنے عالمانہ وقار کا خیال رکھنا چاہئے اور اس قسم کی "بیان بازیوں" سے لوگوں کو اپنے آپ پر

ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔

۱۱ر اکتوبر

سُنا ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے فتوے دے دیا ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ممبر چاہیں تو کانگریس کے ممبر بن سکتے ہیں ۔ البتہ وہ کانگریس کے اندر اپنا علیحٰدہ گروپ نہیں بنا سکتے۔ گویا راشٹریہ سیوک سنگھ والوں کو صرف کانگریس کا ممبر بننے کی اجازت ہے ع

اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ والوں کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی تحریک ہوئی تھی، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے راشٹریہ سیوک سنگھ کی طرف سے کسی سلسلہ جنبانی کے بغیر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب سنگھ والے کانگریس کے ممبر بنیں نہ بنیں، یہ ان کی مرضی پر موقوف ہے۔

ہمارے خیال میں راشٹریہ سیوک سنگھ کو بھی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اب اگر کانگریسی سنگھ کے ممبر بننا چاہیں تو چشم ماروشن دل ماشاد، کیونکہ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ البتہ کانگریسی اگر سنگھ کے اندر اپنا علیحٰدہ گروپ بنانا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اور سچ پوچھئے تو کانگریسیوں کو سنگھ میں اور سنگھ والوں کو کانگریس میں علیحٰدہ گروپ بنانے کی بھی کیا ضرورت ہے، کانگریس سنگھ کا گروپ ہے اور سنگھ کانگریس کا گروپ۔ گویا "من تو شدم تو من شدی والا" معاملہ ہے، یہ ویدانت کا مسئلہ ہے "ایکو برہم دوتیو ناستی" صوفی اسی کو وحدتِ وجود کہتے ہیں، یعنی کانگریس ہو یا راشٹریہ سیوک سنگھ گول والکر ہوں یا پٹیل، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ع

ہر لحظہ بہ شکلِ دگر آں یار برآمد

نہ جانے شیخ عبداللہ نے پرجا پریشد اور راشٹریہ سیوک سنگھ والوں سے کیوں لڑائی چھیڑ

رکھی ہے! اگر راشٹریہ سیوک سنگھ والوں پر کانگریس کے دروازے بھی کھل گئے اور کانگریس اور راشٹریہ سیوک سنگھ یوں یک جان و دو قالب ہو کے رہ گئیں تو بیچاری نیشنل کانفرنس کس کھیت کی مولی اور شیخ عبداللہ کس کیاری کے بتھوے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک پنڈت جی نے ذرا زور سے "درڑھ نشچے" کہہ دیا تھا تو شیخ صاحب کو غش آچلا تھا، لیکن اب تو شیخ صاحب کو "پرنتو" اور "کیول" ہی، نہیں "درڑھ نشچے" بھی کہنا پڑے گا، بلکہ ہندی پڑھنی پڑے گی کیونکہ ع

بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

شیخ سعدیؒ کے متعلق ایران میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں جو کسی کتاب میں نہیں ملتے، مثلاً ایرانی کہتے ہیں کہ شیخ کی لونڈی بھی حاضر جواب اور بذلہ سنج تھی، ایک مرتبہ شیخ سعدی گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، لونڈی نے باہر جا کر دیکھا، لمحہ بھر کے بعد واپس آئی اور کہنے لگی۔ "عبداللہ است"، شیخ نے کہا "عبداللہ باشد" لونڈی بولی "عبداللہ است، زیراکہ بر عینش نقطہ است" شیخ یہ نکتہ سن کے پھڑک گئے، کیونکہ جو شخص ان سے ملنے آیا، اس کی ایک آنکھ میں موتیا بند تھا۔

شیخ عبداللہ کی دونوں آنکھیں ماشاءاللہ صحیح و سالم ہیں لیکن باطن کی چٹم ہیں۔ گویا وہ بھی "غبداللہ" ہو کے رہ گئے ہیں، اسی لئے ان کی سمجھ میں آج تک یہ آسان سی بات نہیں آئی کہ راشٹریہ سیوک سنگھ اور کانگریس دونوں ایک ہیں۔ کانگریس سے یہ ربط ضبط اور راشٹریہ سیوک سنگھ یا اس کی ساختہ پرداختہ پرجا پریشد سے مفت کی ٹھائیں ٹھائیں کوئی اچھی بات نہیں، دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر، آخر یہ قصہ کب تک چلے گا، ایک نہ ایک دن تو انہیں سنگھ والوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے اور اگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے تو "درڑھ نشچے" اور اس قسم کے دوسرے جناتی الفاظ کا صحیح تلفظ کرنے والا کوئی اور نکل آئے گا، آخر بخشی غلام محمد تو کہیں گئے نہیں۔

۱۹ر اکتوبر

چودھری خلیق الزّمان نہ منصور حلاّج ہیں نہ انہیں رُوئی سے بنولے الگ کرنے کا ڈھب آتا ہے، بلکہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ "بز رقطونا" جس کے متعلق شاعر کہہ گیا ہے، کہ "داڑھی میں لگا شیخ کی جب "بز رقطونا"، اور بجنے لگی گت" کس بلا کو کہتے ہیں لیکن حکومت کی "مردم شناسی" کے قربان جائیے کہ جب چودھری صاحب لکھنؤ سے کراچی تشریف لائے، تو ایک جننگ فیکٹری یعنی رُوئی اوٹنے کا کارخانہ کچھ اس بے تکلّفی سے اُن کے نام الاٹ کر دیا گیا، گویا چودھری صاحب کی ساری عمر رُوئی اوٹتے ہی گزر گئی ہے۔

چودھری صاحب کو روئی سے بنولے اور لیگ سے لیگ، کے پُرانے خدّام کو الگ کرنے کے شغل میں تھوڑے ہی دن گُزرے تھے کہ حکومت نے ازراہِ قدردانی ان کے مطبخ کے اخراجات کے لئے ایک ہوٹل بھی الاٹ کر دیا، اب سُنا ہے کہ اُدھر چودھری صاحب اسلامستان بنانے کے لئے اسلامی ممالک کے دورہ پر روانہ ہوئے، اُدھر چاول صاف کرنے کا ایک کارخانہ انہیں الاٹ کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ چودھری صاحب اسلامستان بنانے تشریف لے گئے ہیں یا انھوں نے دھان کوٹنے اور روئی اوٹنے کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے اتنے لمبے سفر کی زحمت گوارا فرمائی ہے؟

چودھری خلیق الزّمان لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے یا لیڈری فرماتے تھے، نہ وہ کوئی روئی اوٹنے کا کارخانہ چھوڑ کر آئے ہیں، نہ اُن کے قبضہ میں کوئی ہوٹل یا دھان کوٹنے کی کوئی فیکٹری تھی۔ اس لئے ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ اُوپر تلے تین تین الاٹمنٹیں کیسی؟ چودھری صاحب کو چاہیئے تھا کہ کارخانے اور ہوٹل الاٹ کرانے کی بجائے لکھنؤ کی طرح کراچی میں بھی وکالت کرتے اور اگر اُن کے پاس قانون کی کتابیں نہیں تھیں تو حکومت سے کہہ کے کسی وکیل کا کتب خانہ اپنے نام الاٹ کرا لیتے۔

بعض ریاستوں کے متعلق ہم نے سُنا ہے کہ وہاں چیف انجینئر کو میڈیکل آفیسر اور میڈیکل آفیسر کو چیف انجینئر بنا دیا جاتا ہے، لیکن الاٹمنٹ کے سلسلے میں ہمارے ہاں بھی اس قسم کی اکثر بوالعجبیاں دیکھنے میں آئی ہیں، یعنی درزی کو ہیئر کٹنگ سیلون اور نائی کو درزی کی دکان الاٹ کر دی گئی ہے۔ بزاز کو بنئے کی دکان مل گئی ہے اور بنئے کو بزاز کی دُکان۔ درزی بال اس طرح ناپ ناپ کے کاٹتا ہے۔ گویا کپڑا قطع کر رہا ہے اور برُش اس کے ہاتھ میں آتے ہی استری بن جاتا ہے۔ بنیا کپڑا تول کے بیچتا ہے اور بزاز ہلدی کی گرہ گز سے ناپ کے فروخت کرتا ہے۔ چودھری خلیق الزّمان کے معاملہ میں بھی یہی ہوا ہے، وکیل کو روئی اوٹنے کا کارخانہ اور ہوٹل الاٹ ہو گیا۔۔۔ تو جن لوگوں کی ساری عمر روئی اوٹنے یا ہوٹل چلانے میں گزری ہے، انہیں مجبوراً وکالت الاٹ کرانی پڑے گی۔

۱۸ر اکتوبر

پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اِن دنوں واشنگٹن میں براج رہے ہیں، اپنے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ ہندوستان ایشیا کی قیادت کا بارِ گراں اٹھانا تو نہیں چاہتا، لیکن کیا کیا جائے، اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

پنڈت جی ایشیا کی قیادت کی ہوس میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور ادھر بیچارے ہندوستان کا بھٹہ نکلا جا رہا ہے، یہ تو وہی بات ہوئی کہ "باہر میاں ہفت ہزاری اگھر میں جورو فاقوں ماری۔ برسو رام جھڑاکے سے، بڑھیا مر گئی فاقے سے۔"

ایشیا کی نام نہاد قیادت کوئی ایسی عزت تو نہیں جو ہندوستان اور ہندوستان کے ذریعے صرف پنڈت نہرو ہی کے حصّے میں آئی ہو، اس سے پہلے چین یا یوں کہئے کہ چیانگ کائی شیک پر بھی یہی معرکہ گذر چکا ہے۔ وہ بچارے ایشیا کی قیادت لے کے اُٹھے تھے اور چین بھی چھنوا بیٹھے۔ اگرچہ پنڈت نہرو بیگار میں پکڑے گئے ہیں، لیکن ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اُن کا حشر

بھی بیچارے چیانگ کائی شیک کا سا نہ ہو، ایشیا کی قیادت چیانگ کو راس نہیں آئی تو نہرو کو کب راس آئے گی ؎

کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

دو تین دن ہوئے، مال روڈ کے ایک ریستوران میں ایک مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی، جس کے صدر ایک پولیس افسر تھے۔ حاضرین میں بھی زیادہ تعداد پولیس والوں کی تھی۔ مشاعرہ کہیں نو بجے شروع ہوا اور غالباً دن نکلنے تک جاری رہتا۔ لیکن پولیس والے مصرعے اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے، اس لیے رات کے دو بجے یہ محفل ختم کر دی گئی۔ بہرحال یہ بات بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ پولیس کو شاعری سے کیا تعلق؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبوب کی کمر اور دہن کا سراغ لگانے کے لیے صرف سی، آئی، ڈی کے دو تین افسروں کو دعوت دی گئی تھی، لیکن بہت سے پولیس والے "موقع واردات" پر پہنچ گئے۔

یہ صحیح ہے کہ پولیس کو شاعری سے کوئی سروکار نہیں اور ضمنی کو غزل سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا، لیکن پولیس والوں میں بعض خوش گو شاعر بھی ہو گزرے ہیں، یا یوں کہئے کہ بعض خوشگو شاعروں کو پیٹ کی خاطر پولیس میں بھی بھرتی ہونا پڑا ہے۔ مثلاً ظہیر دہلوی شاگردِ ذوق مدت تک الور اور جے پور میں تھانہ دار رہے ہیں۔ ان کے بھائی انور بھی شاعر تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے، یہ انور وہی ہیں جن کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

نسیم بھرت پوری جو خاصے خوش گو شاعر تھے، پولیس ہی کے محکمہ میں ملازم تھے۔ عزیز بٹالوی جو مدت تک امرتسر میں تھانہ دار رہے ہیں، خاصے اچھے شعر کہتے تھے، اور مولانا

عبدالمجید سالک اور مولینا تاجور نجیب آبادی کے اُستاد رسا رامپوری سے سلسلۂ تلمذ رکھتے تھے۔ اس لئے اگر لاہور کے پولیس والے مصرع اٹھاتے اٹھاتے اور داد دیتے دیتے شعر کہنے لگیں، یا دو چار شاعر پولیس میں بھرتی ہو جائیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور جب سے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں پر پولیس کا پہرا بیٹھا ہے، ہمیں تو یقین ہو چلا ہے کہ اس قسم کا کوئی سانحہ ضرور ہو کے رہے گا۔

حکومت تھانہ دار مولوی بھرتی کر کے دیکھ چکی، اب ذرا تھانہ دار شاعر بھرتی کر کے بھی دیکھ لے

شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پر و بال

اور ہمارے خیال میں تمام ایسے شاعروں کو جو بیاض بغل میں لئے پھرتے ہیں اور شعر سُنا کے جبراً داد وصول کرتے ہیں، ضرور پولیس میں بھرتی کر لینا چاہئے۔

---

۲۱ راکتوبر

انجمن اصلاحِ ادب نے فیصلہ کیا ہے کہ طرحی مشاعروں کو فروغ دینے کے لئے مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں مشاعرے کرائے جائیں، چنانچہ اسی قسم کا ایک مشاعرہ رتی بھون لاہور میں ۲۲ راکتوبر کو منعقد ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں انجمن کے جنرل سیکریٹری صاحب نے جو بیان شائع کرایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں :-

طرحی مشاعرے حکیمانہ نکتہ ہائے فکر کو واضح کرنے مضمون آفرینی اور طبیعت کو پختہ کرنے نیز شاعر کو محنت پسند بنانے میں مفید ثابت ہوں گے اور اس طرح شاعر کا مستقبل تابناک ہوگا۔ (کذا فی الاصل)

سیکرٹری صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طرحی مشاعرہ کیا ہے، اچھا خاصا "پزاوہ" ہے، طرح کو "اینٹ پزاوہ" کہہ لیجئے، شاعر کی طبیعت سانچہ ہے، جس میں اس اینٹ کے

نمونہ کے مطابق اینٹیں ڈھلتی ہیں اور پزاوہ میں پختہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں طرحی مشاعرہ مشترکہ کھیتی باڑی کی قسم کی چیز ہے کیونکہ سارے شاعر ایک ہی "زمین" کو "سرسبز" کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی قافیہ، وہی ردیف، وہی خیال وہی "تلاش"۔ ہر شاعر اپنی بساط کے مطابق قافیہ کو "بہلانے" کی کوشش کرتا ہے، کبھی قافیہ بولتا ہے، کبھی بالکل گونگا معلوم ہوتا ہے، کبھی ردیف اور قافیہ باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ردیف کو لیٹی کے ساتھ قافیہ سے چپکا دیا گیا ہے۔ بہر حال اس شغل میں قافیہ "باندھا" ضرور جاتا ہے، کیونکہ ڈر ہے کہ اسے باندھا نہ جائے تو کہیں بھاگ نہ نکلے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ طرحی مشاعرہ کی مشترکہ زراعت میں قافیہ بیل کا کام دیتا ہے۔

اگرچہ اس سلسلہ میں جو اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہے کہ یہ سارا قصہ زراعت سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً "زمین، سنگلاخ زمین، زمین کو سرسبز کرنا" وغیرہ، تاہم طرحی شاعری کے سلسلہ میں ایسی اصطلاحیں بھی آتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرحلوں پر معاملہ زراعت کے میدان سے نکل کر تجارت کی سرحد میں جا پہنچا ہے۔ مثلاً "مصرع طرح پر گرہ لگانے ہی کو لے لیجئے"، اگرچہ طرحی شاعری کی گرہ ہلدی کی گرہ نہیں، تاہم جو شاعر مصرع طرح پر کامیابی سے گرہ لگاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ سچ مچ ہلدی کی گرہ اس کے ہاتھ آگئی۔

مشاعرہ کو منڈی کہنا چاہیئے، جہاں فصل کٹ کے آتی ہے، جہاں حضرات شعرائے کرام اپنی اپنی کیاری کی پیداوار پیش کرتے ہیں اور شعرا اور شعرا کے قدردان دل کے مصرعے اٹھاتے ہیں۔ ہرچند یہ غیر طرحی مشاعروں میں بھی ہے، لیکن طرحی مشاعروں میں مصرعے اٹھانے کا جو لطف ہے، وہ غیر طرحی مشاعروں میں کہاں؟ انجمن اصلاح ادب کے سکریٹری صاحب نے اسی لئے فرمایا ہے کہ طرحی مشاعروں کی بدولت شاعر محنت پسند ہو جاتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں کو سرسبز کرتے کرتے اور مصرعے اٹھاتے اٹھاتے شاعر محنت پسند ہو جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

---

۲۸ اکتوبر

فرانس سے خبر آئی ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب نے "آب حیات" جس کی تلاش میں سکندر مارا مارا پھرا، تیار کر لیا ہے، بس ایک گھونٹ پی لیجئے، خدا نے چاہا تو بڑھاپا پاس نہیں پھٹکنے پائے گا۔ تعجب ہے کہ ملک خضر حیات تو مغربی پنجاب کے حصہ میں آئے اور آب حیات مغربی یورپ کے ڈاکٹروں نے تیار کر لیا ہے

سر خدا کہ عارف و واعظ بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ممکن ہے کہ ملک خضر حیات ہی نے یورپ کے ڈاکٹروں کو آب حیات کا نسخہ بتا دیا ہو کیونکہ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری کہ وہ پیرس میں دیکھے گئے تھے۔

اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ "آب حیات" بازار میں کنٹرول کے داموں تو ملتا نہیں البتہ بلیک مارکٹ میں بڑی بھاری قیمت پر ضرور فروخت ہو رہا ہے۔ یہ درست ہے تو آب حیات کیا ہوا "کالا پانی" ہوا، اس لئے بلیک مارکٹ یعنی "کالی منڈی" کی رعایت سے اسے "کالا پانی" ہی کہنا چاہئے۔ اللہ اللہ بلیک مارکٹ میں بھی کیا کیا چیزیں پہنچ رہی ہیں اور نوادر اب تو لیڈری کی بھی بلیک مارکٹ شروع ہو گئی ہے۔

ملک خضر حیات اور آب حیات کے تذکرہ میں ہمیں بے اختیار سیفٹی ایکٹ اور اس کا بڑا بھائی سیفٹی آرڈی ننس یاد آ گئے، ملک صاحب جاتے جاتے سیفٹی ایکٹ کو سچ مچ آب حیات پلا گئے جبھی تو یہ قانون بوڑھا ہونے میں نہیں آتا بلکہ بوڑھا ہوتے ہوتے جوان ہو جاتا ہے اور آئے دن نئے نئے قالب بدلتا ہے۔ ملک خضر حیات گئے، ان کا ولی نعمت یعنی انگریز گیا، لیکن سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈی ننس بدستور موجود ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔

ہمارے ملک کی آزادی کی جدوجہد رولٹ ایکٹ سے شروع ہوئی لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی رولٹ ایکٹ کی قسم کے قوانین سے نجات نہیں ہوئی، یعنی سیفٹی آرڈی ننس آج بھی ہمارے سر پر مسلّط ہے۔ اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے، کہ جو لوگ رولٹ ایکٹ، سیفٹی ایکٹ بنگال، سیفٹی آرڈی ننس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، وہی آج سیفٹی آرڈی ننس کے حامی ہیں۔ انگریز گیا تو کیا ہوا، سیفٹی آرڈی ننس کے شیدائی اب بھی موجود ہیں ؎

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

سیفٹی آرڈی ننس کا نام زبان پر آتے ہی سیفٹی ریزر اور سیفٹی ریزر سے ہردوار کے نائیوں کی جانب ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو سیفٹی ریزر کے جانی دشمن ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہردوار میں برہمنوں کے بعد تعداد کے اعتبار سے نائیوں کا درجہ ہے اور ہردوار میں جتنی مذہبی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، ان سب میں برہمنوں کا دخل ضرور ہوتا ہے، لیکن ایک رسم ایسی ہے جس کے لئے برہمنوں کی بجائے نائیوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے یعنی "بھدرا" کرنا ہو تو نائیوں کا زیر بارِ احسان ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پچھلے دنوں حکومت اور نائیوں کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا، یعنی ہندوستان کی سرکار نے خالی خزانہ کو بھرنے کے لئے نائیوں پر جو ٹیکس لگایا تھا، انہوں نے وہ ادا کرنے سے صرف انکار کر دیا۔

آپ جانتے ہیں کہ نائی آخر نائی ہیں، نکتہ طرازی پر آتے ہیں تو بال کی کھال کھینچتے ہیں، اور بڑے بڑوں کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست

اور ان کے پاس ایک نسخہ تو ایسا ہے کہ ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوا ہے، یعنی انہوں نے کسوت بغل میں دابی اور بھدر یرشوں کا بھدرا کرنے سے انکار کر دیا۔ معلوم نہیں ہند سرکار

نے اس موقع پر سیفٹی ایکٹ کے استرے سے بھی کام لیا، یا ضابطۂ فوجداری اور تعزیراتِ ہند ہی کے دائرے میں رہی۔

بہر حال اس قصّے میں کئی ناموں کی حجامت ہوگئی، یعنی انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن یہ نائی جنہوں نے ہردوار میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، سینکڑوں مہاپرشوں کے چار ابرو کا صفایا کر چکے ہیں، آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے، آخر حکومت ہی کو مونچھ نیچی کرنی پڑی، یعنی ٹیکس کم کر دیا گیا اور استرے کو "تحریر" اور قینچی کو "تقریر" کی آزادی مل گئی۔ قینچی حجام کی زبان کی طرح چلتی ہے اور استرا بے کھلے خط بناتا ہے۔ افسوس کہ ہندوستان میں "سول لبرٹیز" کی تحریک کے بانی پنڈت نہرو اس موقع پر امریکہ میں تھے، ورنہ وہ ہردوار کے نائیوں کی ہمّت کی ضرور داد دیتے۔

۲۹ر اکتوبر

پاکستان نیوز ایڈیٹرز کانفرنس کی سٹینڈنگ کمیٹی نے سیفٹی آرڈی ننس کے متعلق ایک قرارداد منظور کی ہے، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سیفٹی آرڈی ننس کی جن دفعات کا تعلّق اخبارات سے ہے، واپس لے لی جائیں۔ بات درست بھی ہے، آخر ہم اخبار نویسوں نے ساری دنیا کا اجارہ تو نہیں لے رکھا، ہمیں تو آرڈی ننس کی انہی دفعات سے سروکار ہے، جن کا تعلّق ہم سے ہے۔ سرکار انہیں واپس لے لے تو ہم خوش ہمارا خدا خوش، باقی رہے "غیر اخبار نویس" قسم کے لوگ، تو ہمیں ان سے کیا واسطہ ؎

ہماری ہم سے پوچھو، کوہکن کی کوہکن جانے

غرض جہاں تک اس قرارداد کا تعلق ہے، کسی اخبار یا اخبار کے عملے کے رکن کو اس کی معقولیت سے انکار نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ڈر ضرور ہے کہ کہیں دوسری جماعتیں بھی اسی قسم کی قراردادیں منظور نہ کرنا شروع کر دیں۔ مثلاً مودودی صاحب کے ساتھی کہیں

حکومت سے یہ درخواست نہ کر بیٹھیں کہ بس ایک جماعت اسلامی کو مستثنیٰ کردیجئے، باقی جسے جی چاہے، سیفٹی آرڈی ننس کا نشانہ بنایئے اور یہ سلسلہ چلا تو مشکل ہی سے ختم ہونے میں آئے گا، یعنی لیڈر کہیں گے کہ سیفٹی آرڈی ننس کی خوبیوں میں کسے کلام ہے، بس اتنی ترمیم ہو جائے کہ اس آرڈی ننس کے رُو سے کسی لیڈر کو نہ گرفتار کیا جائے۔ بلم ٹیر یعنی رضا کار قسم کے لوگ کہیں گے کہ آپ لیڈروں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو چشمِ ما روشن دلِ ماشاد، لیکن رضاکاروں پر ہاتھ نہ ڈالئے، لیڈروں کا کیا ہے، آخر انہیں تو جیل میں بھی "اے کلاس" مل جائے گی، مصیبت تو ہمارے لئے ہے۔

مولٰنا ابوالحسنات صدر جمعیۃ علمائے پاکستان شروع سے سیفٹی آرڈی ننس کی حمایت کرتے چلے آئے ہیں، لیکن اب، تو وہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کے علما بلکہ ان کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ کو بھی سیفٹی آرڈی ننس سے محفوظ کرانے کا کوئی بندوبست کر لینا چاہیئے۔ کیا معلوم کہ کل کلاں پولیس علما پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے اور علما نے سیفٹی آرڈی ننس کی زد سے بچنے کا بندوبست کر لیا، تو مشائخ کیوں پیچھے رہیں گے، وہ بھی چاہیں گے کہ سیفٹی آرڈی ننس سے انہیں اور ان کے مریدوں کو مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، یعنی اور کسی کے متعلق نہ سہی کم از کم اہلِ خانقاہ کے متعلق یہ طے ہو جائے کہ ؎

انا الحق کہیں اور پھانسی نہ پائیں

غرض اخباروں کے ایڈیٹروں کی انجمن نے سیفٹی آرڈی ننس کے سلسلے میں جو مصرع طرح عرض کیا ہے۔ اس پر اگر حسین شہید سہروردی صاحب گرہ لگانا چاہیں تو وہ کہیں گے، کہ مجھے مستثنیٰ کر دیجئے اور پیر مانکی شریف کو پکڑ لیجئے۔ پیر مانکی شریف کہیں گے کہ مجھے چھوڑیئے سہروردی صاحب کو پکڑیئے اور خان غلام محمد خان لوندخوڑ تک معاملہ پہنچے گا تو وہ فرمائیں گے کہ ان سب کو پکڑ لیجئے مجھے مستثنیٰ کر دیجئے۔ غرض نفسا نفسی اور آپا دھاپی کا عالم نظر آئے گا، ہر شخص یہ کوشش کرے گا کہ سیفٹی آرڈی ننس کی زد میں چاہے ساری دنیا آجائے، کم از کم

میں بچ نکلوں۔

اب یہ دیکھیں، یہ لوگ ہم اخبار نویسوں کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنے لئے کوئی نیا راستہ نکالتے ہیں۔

ایڈیٹروں کی کانفرنس نے جو قرار منظور کی ہے، اس کے معنی یہ ہیں۔ بہرحال اگر کوئی صاحب لاہور کے کسی جلسے میں ایک زناٹے کی تقریر کر کے اور سیفٹی آرڈی ننس کی زد میں آجائیں، تو انہیں بڑے گھر کی سیر کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وہی تقریر کسی اخبار میں چھپ جائے، تو سیفٹی آرڈی ننس اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا اور ہم اخبار نویسوں کو تقریروں اور مقرروں سے کیا واسطہ، ہمیں تو تحریر کی آزادی سے سروکار ہے۔ تقریر جب تک تقریر ہے، سیفٹی آرڈی ننس کی زد میں ہے، اخبار میں چھپ کے تحریر بن گئی تو اسے آرڈی ننس کی زد سے باہر ہو جانا چاہیئے۔ ایڈیٹروں نے تحریر کی آزادی کا بندوبست تو کر لیا، جو لوگ جلسوں میں تقریریں کرتے پھرتے ہیں، وہ چاہیں تو تقریر کی آزادی کا بھی کوئی بندوبست کر لیں۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ، آخر ہم اخبار نویسوں نے ساری دُنیا کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔

سنة ١٩٥٠

یکم اکتوبر

سُنا ہے، راولپنڈی کے حکّام نے پتنگ بازی کی ممانعت کر دی ہے۔ ایک پولیس افسر سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! آخر اس ممانعت کی وجہ کیا ہے تو انھوں نے فرمایا، پتنگ بازی کی وجہ سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔

شاید بعض لوگوں کو پتنگ بازی کی ممانعت کے لیے یہ عذر کافی معلوم ہو لیکن گستاخی معاف ہمیں تو یہ دلیل چنداں وزنی معلوم نہیں ہوتی۔ لڑائی جھگڑے کس کھیل میں نہیں ہوتے بٹیر بازی، کبوتر بازی، مرغبازی وغیرہ کو تو جانے دیجیے، سیاست کے بیسیوں کھیل ایسے ہیں، جن میں بات بات پر ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ پولیس والے تو پتنگ بازوں کی تلاش میں لٹھ لیے پھرتے ہیں اور ان لوگوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں جو سیاست کے لم ڈورے پیچ لڑا رہے ہیں ؎

محتسب در قضائے رندان است
غافل از صوفیانِ شاہد باز

مثلاً لاہور میں لیگ کا اجلاس جب کبھی ہُوا ہے، یا تو لڑائی ہوئی ہے یا لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ آپ کو کرسیوں کی پہلی لڑائی تو یاد ہو گی جو پانی پت کی پہلی لڑائی کی طرح تاریخ کے مشہور واقعات میں شمار کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی لیگ کا جلسہ ہوتا ہے، پولیس کو خاص انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ اس سال لیگ کے دو اہم

جلسے ہوئے ہیں، دونوں موقعوں پر پولیس کے بھاری دستے لیگ کے صدر دفتر کو گھیرے ہوئے تھے۔ پیدل پولیس کے علاوہ گھڑسوار پولیس بھی ہتھکڑیاں لئے ہوئے موجود تھی، لیکن حکام کو کبھی خیال نہیں آیا کہ آئے دن کے جھگڑوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے لیگ کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا جائے، یا کم از کم اسے لاہور کی حدود میں جلسہ منعقد کرنے کی ممانعت کر دی جائے۔

اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لیگ ملک کی مقتدر سیاسی جماعت ہے جس میں پاکستان کے اکابر شامل ہیں، لیکن آپ پتنگ بازوں کو بھی تو اتنا گیا گزرا نہ سمجھئے۔ پاکستان کے اکابرین کون ہے؟ جس نے آج نہ سہی کم از کم لڑکپن میں پتنگ بازی نہیں کی، "دے ڈھیل" یا "وہ کاٹا" کا نعرہ نہیں لگایا اور لڑکپن کی بھی جانے دیجئے، ابھی پارسال اخباروں میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ پاکستان کی مرکزی حکومت کے وزراء میں سے ایک صاحب ہوا بندر پہ پتنگ اڑا رہے تھے اور کبھی کبھی ترنگ میں آ کے سعدی کا یہ شعر گنگنا اٹھتے تھے ؎

اے کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر ایں پنج روز دریابی

معاف کیجئے گا جس فنِ شریف کو وزرا کی سرپرستی کا شرف حاصل ہو اس سے اس قسم کے سلوک کے کیا معنی؟ اگر پتنگ بازی میں لڑائی جھگڑے کا احتمال ایسا ہی قوی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ لیگ کونسل کے جلسوں کی طرح پتنگ بازی کے مقابلے بھی پولیس کی نگرانی میں ہوا کریں۔

۲ر اکتوبر

ہندوستان تو دستور سازی کے کام سے کبھی کا فارغ ہو چکا اور ہمارے ہاں

دستور سازی اب شروع ہوئی ہے یعنی ع

ہم تو اے بی ہیں رہے اور یار بی اے ہو گئے

آج سے سال سوا سال پہلے حکومت کی جانب سے کہا گیا تھا کہ دستور سازی کا کام اس لئے شروع نہیں ہو سکا کہ اس کام کے لئے جن کتابوں کی ضرورت ہے وہ میسّر نہیں لیکن بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات پہ ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں اب بھی میسّر نہیں ہو سکیں، لے دے کے ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند موجود تھا، اسے سامنے رکھ کر جو کچھ لکھا جا سکا لکھ ڈالا گیا ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ان سفارشات کے رُو سے مرکز میں دو قانون ساز مجالس ہوں گی، یہ دونوں مجالس مل کے پانچ سال کے لئے کسی صاحب کو امیر المومنین منتخب کر لیں گی۔ حضرت امیر المومنین کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان دونوں مجالس میں کسی مجلس کے رکن ہوں، یہ ممکن ہے کہ ایک صاحب کسی مرکزی مجلس کے ممبر منتخب نہ ہو سکیں اور امیر المومنین بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیں اور کوئی عجب نہیں کہ اللہ ان مجالس کے ارکان کے دلوں میں رحم ڈالے اور وہ انہیں امیر المومنین منتخب کر لیں۔ امیر المومنین کا عہدہ اگرچہ صرف پانچ برس کے لئے ہے، لیکن جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوں گے تو انہیں معقول پنشن دی جائے گی، تاکہ وہ اپنی باقی زندگی فراغت سے گزار سکیں۔ یہ پنشن کی شق تو ایسی ہے جسے پڑھ کے ہوور اور ٹرومین دونوں کے مُنہ میں پانی بھر آیا ہوگا، کیونکہ ان بچاروں کے لئے تو پنشن چھوڑ پراویڈنٹ فنڈ کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

امیر المومنین کے اختیارات کا حال کچھ نہ پوچھئے، وہ "دارا صولت، سکندر حشمت" "قدرتِ قدرت بندگان عالی متعالی" کی قسم کے "امیر" ہوں گے، جن کا نام زبان پر آتے ہی مولانا ابو الحسنات اور مولانا عبد الحامد قادری بدایونی "السلطان ظل اللہ فی الارض" کے نعرے لگائیں گے اور سننے

والے جھوم جھوم جائیں گے۔ اُن کی ذات والاصفات قانون سے بالاتر ہوگی، نہ دیوانی کا کھٹکا نہ فوجداری کا ڈر۔ امیرالمومنین کا مرتبہ تو خیر بہت اونچا ہے، صوبوں کے حاکم یعنی والی، وزرائے دولت اور امرائے سلطنت یعنی مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے ارکان موخذہ سے بالاتر ہوں گے۔ فرض کیجیے کہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے ایک رکن نے رشوت لی ہے یا ناجائز الاٹ منٹ کرالی ہے یا اپنے سالے کو کوئی بڑا عہدہ دلوادیا ہے تو اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں ہو سکے گی۔

افسوس ہے کہ خان ممدوٹ ذرا وقت سے پہلے پیدا ہوئے اور پہلے ہی لیڈر بن گئے۔ انہیں لیڈر بننے کے لئے کم از کم پاکستان کے نئے آئین کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

۳ر اکتوبر

لیگ کے پرانے آئین کے رو سے وزیر اور مشیر لیگ کے عہدہ دار نہیں بن سکتے، لیکن کہا جاتا ہے کہ نئے آئین میں وزیروں اور مشیروں کے لئے لیگ کا صدر اور سکتر بننے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ پاکستان لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس میں چودھری خلیق الزمان کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے گا اور ان کی جگہ خان لیاقت علی خان صدر مقرر ہوں گے۔ ہمارے خیال میں لیگ کی سکتری بھی انہی کے حوالے کر دینی چاہئے، تا کہ چودھری خلیق الزمان کے ساتھ ساتھ یوسف خٹک صاحب سے بھی لیگ کو نجات ملے اور لوگ اطمینان سے کہہ سکیں کہ ع

تھے یہ بھی دو حساب جو یوں پاک ہو گئے

سچ پوچھئے تو یہ بات ہماری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ لیگ کا نام تو خان لیاقت علی خان اُچھالیں، لیگ کی حمایت میں لمبی لمبی تقریریں کریں اور کراچی سے لندن اور لندن سے نیویارک تک لیگ کا نام روشن کرائیں اور چودھری خلیق الزمان لیگ کی کرسیٔ صدارت

پر بیٹھے مفت میں واہ وصول کرتے رہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دُکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ یار لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ چودھری خلیق الزمان کو دھتا بتانے کا فیصلہ کر لیا، وہ تو بیچ پج کباب میں ہڈی بن کے رہ گئے تھے۔

ہمیں یقین ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے اخباروں میں یہ تذکرہ پڑھا ہوگا، تو ماتھا پیٹ لیا ہوگا کہ ہائے یہ نکتہ مجھے نہ سوجھا، یہ قصہ یوں طے ہو جاتا تو ٹنٹنڈن بیچ میں کیسے آٹپکتا؟

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لئے قرآن پڑھنا ضروری قرار دیا جائے گا اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ لوگ اپنی زندگی قرآن وحدیث کے احکام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے ارکان صرف عام مسلمانوں کو تو قرآن پڑھانا چاہتے ہیں، لیکن خود قرآن پڑھنا نہیں چاہتے۔ ہمارے خیال میں انہیں اس موقع پر یہ کہنا چاہئے تھا کہ پاکستان میں مسلمانوں کو قرآن پڑھنے، بلکہ حج کرنے، روزہ رکھنے اور نمازیں پڑھنے کی اجازت ہوگی۔ کمیٹی کے ارکان نے جس قسم کی سفارشات کی ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے تو اس موقع پر یہی فقرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔

مشہور مصنف ٹالسٹائی نے ایک مرتبہ کسی پولیس والے کو ایک کسان پر ظلم کرتے دیکھا۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ آگے بڑھ کے پولیس والے سے کہنے لگا "تم نے انجیل پڑھی ہے؟" اس نے جواب دیا "بڑے میاں! میں نے انجیل تو نہیں پڑھی لیکن کیا تم نے پولیس کوڈ کا مطالعہ کیا ہے؟"

ہم اگر بنیادی کمیٹی کے ارکان سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ آپ حضرات نے خود بھی قرآن پڑھا ہے تو غالباً یہی جواب ملے گا کہ ہم نے قرآن نہیں پڑھا، لیکن تم نے ۱۹۳۵ء کا قانون حکومتِ ہند، چندرگپت موریا کے وزیر چانکیہ کا ارتھ شاستر، میکیاولی کی کتاب "پرنس" پڑھی ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سلاطین وامرا "زمین پر خدا کا سایہ" ہیں؟!

۴ر اکتوبر

کرشن نگر میں مدّت سے ایک صاحب حکیم عبدالغفار خان مقیم ہیں، جن کا دعوےٰ ہے کہ انہوں نے ایٹم بم کا توڑ معلوم کر لیا ہے۔ کوئی سات مہینے ہوئے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ان کا ایک خط چھپا تھا، اُسے پڑھ کے ہمیں بھی حکیم صاحب کے حالات معلوم کرنے کا شوق ہُوا۔ حُسنِ اتفاق سے ایک روز خود وہ دفتر "امروز" میں تشریف لائے۔ باتیں کیں تو معلوم ہُوا کہ حکیم صاحب کو طب سے چنداں سروکار نہیں، البتہ کسی طبیب کی صحبت میں ضرور بیٹھے ہیں، اس لئے بعض طبّی اصطلاحات ازبر ہیں۔

حکیم صاحب کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مدّت تک طبّیہ کالج دہلی میں پروفیسر رہے ہیں۔ دلّی کے جو اطبّا لاہور میں موجود ہیں، ہم نے ان سے رجوع کیا تو معلوم ہُوا کہ طبّیہ کالج کی پروفیسری تو محض افسانہ ہے، البتہ حکیم عبدالغفار خاں حکیم جمیل خاں کی خدمت میں ضرور رہے ہیں۔ دو وقت کے کھانے کے علاوہ ساڑھے چودہ روپے ماہانہ جیب خرچ کے لئے ملتے تھے، دن رات کے حاضر باشوں میں تھے۔ حکیم جمیل خاں انہیں بناتے تھے اور یہ بنتے چلے جاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا حکیم آغا جان عیشؔ دہلوی نے ایک ہدہد پالا تھا جس کی ٹھونگوں سے مرزا غالب بھی نہیں بچے۔ حکیم جمیل خاں نے بھی ہدہد پالا، جو فسادات کی آندھی میں دلّی سے اُڑ کے لاہور پہنچا اور کرشن نگر میں گھونسلا بنا کے بیٹھ گیا۔

حکیم عبدالغفار خاں سے ہماری ملاقات مارچ کے اخیر میں ہوئی تھی، یکم اپریل قریب تھا ہم نے حکیم صاحب کے حالات، ایٹم توڑ گنگے کے متعلّق اُن کے ارشادات ایک جگہ جمع کئے اور ان کی تصویر کے ساتھ یوم الحمقا کی مناسبت سے یکم اپریل کے اخبار میں چھاپ دیئے، لیکن حکیم صاحب ایسے آدمی نہیں تھے جو گھبرا جاتے، انہوں نے "امروز" کے اس شمارے کے کئی نسخے خرید کے اپنے عقیدت مندوں میں تقسیم کر دیئے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی

کہ "امروز" میں جو کچھ چھپا ہے وہ دراصل اُن کی مدح میں ہے۔

انہی دنوں حکیم عبدالغفار خان نے مسٹر لیاقت علی خان کے نام ایک خط لکھا جس میں "ایٹم توڑ گنڈے" کا ذکر تھا۔ وہاں سے رسمی طور پر جواب آ گیا کہ آپ اپنی سکیم ذرا تفصیل سے لکھ بھیجئے، یہ جواب پا کے حکیم صاحب کے حوصلے بڑھ گئے، انہوں نے بعض دوسرے اکابر کے نام بھی اسی مضمون کے خط لکھنے شروع کئے اور وہاں سے جو جواب آئے، انہیں سنبھال کے رکھ چھوڑا۔ اس زمانے میں مسٹر نسیم حسن مشیر تعلیم تھے، حکیم صاحب اُن سے بھی ملے، اُن پر لاہور کی فضا نے انقباض سا طاری کر رکھا تھا، حکیم صاحب سے مل کے بہت خوش ہوئے اور انہیں ایک تعارف نامہ کے ساتھ لغاری صاحب کے پاس بھیج دیا، جو اس زمانے میں بحالیات کے کمشنر تھے۔ لغاری صاحب کے توسّط سے حکیم عبدالغفار خاں دوسرے افسروں کے پاس پہنچے اور مدّت تک "گل بازی" بنے رہے۔

کہا جاتا ہے بحالیات کے محکمہ کے بعض افسر حکیم عبدالغفار خان کے پاس خان لیاقت علی خان، مسٹر نسیم حسن اور دوسرے اکابر کے خط امروز اور رسول کے مضامین کے کٹنگ دیکھ کے بہت مرعوب ہوئے اور بعض حضرات کو تو یقین آ گیا کہ حکیم صاحب کو اگر مناسب سازوسامان ہاتھ آ جائے تو وہ "ایٹم توڑ گنڈا" تیار کر کے ہی دم لیں گے۔ چنانچہ سُنا گیا ہے کہ انہیں نرائن داس بھگوان داس کے دواخانے کی عمارت کا بالائی حصہ جس میں ٹھاکر اینڈ کمپنی کا دفتر تھا الاٹ کر دیا گیا، جس پر وہ بلا شرکت غیرے قابض ہیں۔ گویا اس وقت حکیم صاحب کے قبضہ میں دو مکان ہیں، کرشن نگر میں ان کی سکونت ہے اور انار کلی کا مکان اُن کا معمل ہے، جہاں وہ "ایٹم توڑ گنڈا" تیار کر رہے ہیں۔

حکیم صاحب کے بعض معتقدین کا خیال ہے کہ انہیں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا پرنسپل بنا دینا چاہئے، کیونکہ وہ حکیم اجمل خان کے ہاں مدّتوں دوائیں کوٹتے رہے ہیں۔ لیکن افسوس

ہے کہ انہیں یہ عہدہ بخش دینا محکمہ بحالیات کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال حکیم عبدالغفار خاں کا نام اچھالنے اور انہیں غیر ضروری اہمیت دینے کے گناہ میں ہم بھی شریک ہیں۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے مضمون کو جو بہ سبیل تفنن لکھا گیا تھا، لوگ سنجیدہ تحریر سمجھ لیں گے اور خاصے پڑھے لکھے اور معقول آدمی اس بات پر یقین کر لیں گے کہ حکیم عبدالغفار خان سچ مچ ایٹم بم کا توڑ بنا سکتے ہیں۔ ہمیں "سخن فہمیٔ عالم بالا" کے متعلق پہلے بھی شبہات تھے، لیکن اس بات کا یقین اب آیا کہ ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سخن فہم ہی بھرے پڑے ہیں۔

۵ر اکتوبر

لاہور کارپوریشن اپنے ہاں پبلسٹی کا شعبہ کھولنا چاہتی ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کسی تجربہ کار شخص کو معقول تنخواہ پر پبلسٹی افسر مقرر کیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں کارپوریشن کو پبلسٹی افسر پر روپے خرچ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، لاہور کی ہر سڑک کارپوریشن کے پبلسٹی افسر کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ آخر یہ کوڑے کرکٹ کے انبار جو شاہ ایران کے لاہور سے تشریف لے جانے کے بعد جمع ہونے شروع ہوئے تھے اور شاہ مصر کی تشریف آوری کے زمانے تک یونہی پڑے رہیں گے، کارپوریشن کی پبلسٹی نہیں کرتے تو اور کیا کر رہے ہیں؟ پھر مکھیوں اور مچھروں کے لشکر ہیں جو دن رات کارپوریشن کی پبلسٹی میں مصروف ہیں۔ ایسے خدام کے ہوتے ہوئے نہ جانے پبلسٹی افسر کے تقرر کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

صوفی عبدالحمید صدر پنجاب مسلم لیگ نے فرمایا ہے کہ میں کراچی سے مطمئن ہو کے لاہور واپس جا رہا ہوں، پھر تھوڑی دیر کے توقف کے بعد کہا، مرکز ضرور پنجاب کی امداد کرے گا۔

صوفی صاحب لاہور سے کراچی تشریف لے گئے تھے، جب بھی وہ مطمئن تھے۔ کراچی میں جب تک رہے، اطمینان نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اب وہ کراچی سے لاہور آ رہے ہیں،

جب بھی اطمینان کا پشتارہ اُن کی گردن پر ہے۔ اصل میں صوفی صاحب کو "اطمینانِ دائمی" کی نعمت میسّر ہے۔ کیسا ہی حادثہ کیوں نہ گزر جائے، اُن کے "اطمینان" میں فرق نہیں آتا۔

خان لیاقت علی خاں نے کوریا کے سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے بار بار فرمایا ہے کہ ہم نے جنوبی کوریا والوں کی مدد کے لیے صرف گندم بھیجا ہے۔ غالباً اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے گندم بھیجا ہے بھُس نہیں بھیجا۔ حالانکہ اگلے زمانہ کے بزرگ کہہ گئے ہیں، کہ "گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است"، اگر ہم بھُس بھیجتے تو اس کے عوض بھُس ہی ملتا۔ . . . . . . جو بھیجتے تو جو ہی ہاتھ آتے۔ لیکن ہم نے ہمت کر کے گندم بھیج دیا۔ اب معاوضہ میں گندم ہی کی توقع رکھنی چاہیے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

لیکن ہم گندم کا نام سنتے ہیں تو طرح طرح کے وہم ہوتے ہیں۔ حضرتِ آدم نے اسی کی خاطر جنت سے ہاتھ اٹھایا تھا، ہم نہ جانے گندم کی اس تجارت میں کیا کر بیٹھیں ؎

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوے نفروشم

اکبر الٰہ آبادی نے گندم کے اس قصے سے نیا مضمون نکالا ہے ؎

اضافہ ہوئی مجھ سے گندم پہ مے
یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی

۶ر اکتوبر

جب سے یہ خبر مشہور ہوئی ہے کہ خان لیاقت علی خاں کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا جائے گا، بعض حضرات نے اس طرح "مبارک سلامت" کے نعرے لگائے کہ پُرانے

زمانے کے اُمرا اور ان کے مصاحبوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان لوگوں کی باتیں سنئے تو معلوم ہوتا ہے کہ لیگ کی صدارت نہیں اورنگ جہاں بانی ہے۔ خان لیاقت علی خاں کے "تختِ صدارت" پر رونق افروز ہوتے ہی ساری دنیا کی کایا پلٹ جائے گی اور شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "لیگ کی صدارت کا جامہ قدرت نے حضور ہی کے قامت کے لئے قطع فرمایا ہے"۔ دوسرے صاحب کا ارشاد ہے "ملتِ اسلامیہ کی فلاح اسی میں ہے کہ حضرت دستورِ معظم لیگ کے تاجِ صدارت کو زیبِ سر فرمائیں"۔ ہمارے خیال میں ان قصائدِ منثور کا خاتمہ اس نعرے پر ہونا چاہیئے کہ "یقین ہے کہ حضرت وزیرالوزرا اس منصبِ عالی پر فائز ہونے کے بعد ان خانہ زادوں کو جو لاہور میں بیٹھے دعا گوئی میں مصروف ہیں، فراموش نہیں کریں گے ؎

دوستاں را بہ ہمت یاد کردن مردی ست
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمرے افگند

دوسرے لوگوں کا تو خیر کیا ذکر ہے، معاصر "ڈان" (انگریزی) بھی قصیدہ طرازوں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ ڈان نے اس موقع پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لیگ میں قحط الرّجال ہے اور بجز خان لیاقت علی خان کے کوئی شخص صدارت کے منصبِ عالی پر فائز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر لیگ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو صدارت کا بوجھ اُٹھا سکے تو ایسی جماعت کے قائم رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ ایک بھنبھیری کے اڑنے سے تو ساون نہیں آتا، یہ مانا خان لیاقت علی بڑے لائق شخص ہیں، لیکن وہ امرت دھارا تو ہرگز نہیں اور ہر مرض میں تو امرت دھارا چھوڑ پنسلین بھی مفید ثابت نہیں ہوئی۔

ہمارے ملک میں خوشامدی مصاحبوں اور پیشہ ور قصیدہ نگاروں کا جو گروہ پیدا ہو گیا

ہے اس کی باتیں سُن کے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کراچی یا لاہور میں نہیں بلکہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے دہلی یا نصیر الدین حیدر شاہ کے زمانے کے لکھنؤ میں بیٹھے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی اور ان لوگوں نے "اعجاز اعجاز" کا غل مچانا شروع کر دیا اور سچ پوچھئے تو محمد شاہ اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں بھی اس وضع کے لوگ مشکل سے ملتے تھے، یہ حضرات تو شہزادہ منّا جان کے حاشیہ نشین معلوم ہوتے ہیں۔

۸ر اکتوبر

ایک ہفت روزہ اخبار نے لکھا ہے کہ پنجاب میں پچھلے دنوں جو سیلاب آیا ہے، وہ قربِ قیامت کی نشانی ہے۔ ہمارے خیال میں تو پاکستان کے آئین کے متعلق جو سفارشات کی گئی ہیں، انہیں بھی قربِ قیامت کی نشانی سمجھنا چاہیئے بلکہ لیگ کی صدارت کے لئے خان لیاقت علی خان کا نام تجویز کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

پچھلے دنوں "ڈان" نے لکھا تھا کہ لیگ کی صدارت کے لئے سب کی نظریں خان لیاقت علی خان ہی پر پڑتی ہیں۔ حال میں پیر علی محمد صاحب راشدی نے اس موضوع پر "سندھ آبزرور" میں جو مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو سال بھر پہلے ہی کہہ دیا تھا، کہ ہمیں مسٹر لیاقت علی خان کے سوا کسی شخص میں لیگ کا صدر بننے کی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ "ڈان" کی موقع شناسی میں تو کلام نہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس موقعہ پر "سندھ آبزرور" "ڈان" سے بازی لے گیا۔

اب "سندھ آبزرور" کو زک دینے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی صاحب آگے بڑھ کے کہہ دیں کہ ہم نے دو سال پہلے یہی بات کہی تھی۔ لاہور میں بڑے بڑے نجومی موجود ہیں، لیکن کسی میں ہمت نہیں کہ اس قسم کا دعوےٰ کر بیٹھے۔ ہمیں یاد ہے، ایک زمانے میں ایک نجومی نے خان لیاقت علی خان

کی جنم پتری بنائی تھی۔ تعجب ہے، اسے بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ایک زمانے میں لیگ کی صدارت کا تاج بھی انہی کے سر پر رکھا جائے گا۔

۹ر اکتوبر

پچھلے دنوں ہم نے پولیس کی "سخن فہمی" کے بارے میں ایک لطیفہ عرض کیا تھا، یعنی پولیس کے دو آدمی یونائیٹڈ پریس آف پاکستان کے دفتر میں جا گھسے اور پوچھنے لگے "آپ کا چھاپہ خانہ کہاں ہے؟" مینجر نے کہا "یہ تو نیوز ایجنسی کا دفتر ہے، یہاں چھاپہ خانہ کہاں سے آیا؟" ایک پولیس والا کہنے لگا "آپ نے دروازے پر تو "یونائیٹڈ پریس آف پاکستان" کا سائن بورڈ لٹکا رکھا ہے اور پھر یہ بھی کہے جا رہے ہیں کہ یہاں چھاپہ خانہ کہاں سے آیا؟"

اس سے ملتا جلتا واقعہ ہندوستان کے ایک اخبار نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں، ایک مرتبہ جالندھر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا اپنا ہفتہ وار رسالہ ہونا چاہیئے، جس میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے جلسوں کی کارروائی شائع ہوا کرے۔ بعض ممبروں نے اس تجویز کی حمایت کی بعض نے مخالفت۔ لیکن بورڈ کے ایک ممبر چودھری الٰہی بخش جو علاقے کے ذیلدار تھے اور بڑے بارسوخ شخص سمجھے جاتے تھے چپکے بیٹھے رہے، جب ڈپٹی کمشنر نے جو ڈسٹرکٹ بورڈ کا بھی چیئرمین تھا، ان سے پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے تو چودھری صاحب کہنے لگے، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں پہلے ہی جگہ تھوڑی ہے، آخر اس رسالے کے گھوڑے بندھیں گے کہاں؟

اس پر ہمیں ایک اور واقعہ یاد آگیا، چار پانچ سال ہوئے پنجاب کے ایک مولوی صاحب دلّی تشریف لے گئے۔ دلّی کے ایک متموّل مسلمان سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی، اسی کے ہاں جا کے اترے، صاحب خانہ کو کوئی ضروری کام تھا، اسی لیے وہ تو چلا گیا، لیکن

جاتے جاتے نوکروں کو ہدایت کرتا گیا کہ دیکھنا مولوی صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے تھوڑی دیر میں ایک نوکر آیا اور کہنے لگا "مولوی صاحب! آپ زردہ تو کھاتے ہیں"، زردہ کا نام سن کے مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، کہنے لگے، نیکی اور پوچھ پوچھ، جب تک کھانا تیار ہوتا ہے زردہ ہی سہی، یہ سن کے نوکر گیا اور پان لے آیا۔

مولوی صاحب کھانے کو تو پان کھا گئے، لیکن تھوڑی دیر میں سر چکرانے لگا تو بہت گھبرائے اور چلّا کے کہنے لگے: "اوظالماں توں مینوں اے کی کھوا دتا"۔ نوکر نے کہا "حضرت میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ آپ زردہ کھاتے ہیں یا نہیں۔ اب مولوی صاحب کی سمجھ میں آیا کہ زردہ صرف مزعفر ہی کو نہیں کہتے، پان کے اجزا میں بھی ایک چیز ایسی ہے، جس کا نام زردہ ہے۔

ہماری دستور ساز اسمبلی میں بعض بزرگ ایسے تو ہوں گے، جنہوں نے "بنیادی حقوق" کا نام سن کے سمجھا تو صرف یہ کہ حقوق حقّہ کی جمع ہے اور حقّہ کی خاص قسم ایسی بھی ہے، جسے "بنیادی" کہتے ہیں جس انداز سے یہ لوگ خان لیاقت علی خان اور خواجہ شہاب الدین کی تقریریں سن کے سر ہلاتے رہے ہیں، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شکر کیجیے کہ ان میں سے کسی صاحب نے خان لیاقت علی خان کی طرف رُخ کر کے کہیں یہ نہیں کہہ دیا

حقّہ جو ہے حضور معلّٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریّا کے ہاتھ میں

---

۱۰ / اکتوبر

لیگ کی صدارت کے معاملہ میں جو خبریں پچھلے چند دنوں سے مشہور ہو رہی تھیں، وہ بالآخر درست ثابت ہوئیں۔ یعنی خان لیاقت علی خان نے جو سب سے پہلے لیگ کے لیڈر کی حیثیت سے "روشناسِ خلق" ہوتے تھے، بالآخر مرکزی لیگ کی کلاہِ صدارت اپنے سر پر رکھ لی

دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ لیگ کو آئندہ حکومت کا ایک محکمہ تصور کر کے اس کا پورٹ فولیو مسٹر لیاقت علی خان کے سپرد کر دیا جائے انہیں دو اعزاز پہلے ہی حاصل ہیں یعنی وہ وزیرِ اعظم بھی ہیں اور وزیرِ دفاع بھی "وزارت لیگ" کا تیسرا پورٹ فولیو ان دو مناصب پر اضافہ سہی۔

خان لیاقت علی خان نے وزارت کی ہے، لیگ کے سکتر بھی رہے ہیں۔ لیکن آج تک انہیں صدارت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، ورنہ لیگ کی صدارت کی حیثیت تو صرف اس قدر ہے کہ ؎

کلاہِ دلکش است امّا بہ دردِ سر نمی ارزد

انھیں کچھ روز صدارت کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ انہوں نے یہ بارِ گراں اٹھانے میں سخت غلطی کی ہے۔ ان کی صدارت کی وجہ سے لیگ کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، کیونکہ اس طرح لیگ ہر حیثیت سے حکومت کا "مُرغِ دست پرور" بن کے رہ گئی ہے اور لیگ کو تو جانے دیجئے، اس طرح خود خان لیاقت علی خان کے وقار میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن خدا ان خوشامدی مصاحبوں سے بچھے جو یہ ثابت کرنے میں مصروف ہیں، کہ خان لیاقت علی خان بیسویں صدی کے "ذوالقرنین" ہیں، کیونکہ ان کے سر پہ کلاہِ وزارت کے ساتھ افسرِ صدارت بھی نظر آ رہا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے سلسلے میں خاصا کام کر رہی ہے، چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دستخطوں سے حال میں سیلاب زدوں کی اعانت کے لیئے ایک اپیل بھی شائع ہوئی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا، مولانا نے جہادِ کشمیر کے سلسلہ میں کہہ دیا تھا کہ میں اس لڑائی کو جہاد ہی نہیں سمجھتا، شکر ہے۔ مولانا نے سیلاب کے معاملہ میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ورنہ

اگر وہ کہہ دیتے کہ میں اس سیلاب کو سیلاب ہی نہیں سمجھتا تو کوئی اُن کا کیا کر لیتا؟

بہرحال یہ بہت اچھی بات ہے کہ مولانا مودودی نے سیلاب کو سیلاب تسلیم کر لیا اور سیلاب زدگان کی امداد کے سلسلہ میں ایک اپیل بھی کر ڈالی، لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جماعتِ اسلامی کے حامی اخبار جماعتِ اسلامی کی کارکردگی کی سندات کیوں شائع کر رہے ہیں اور ان سندات کا انداز بھی تو کچھ ایسا ہے، گویا جماعتِ اسلامی کو سیلاب زدگان کی امداد کا پرانا تجربہ ہے اور وہ طوفانِ نوح سے پنجاب کے سیلاب تک بس یہی کام کرتی چلی آئی ہے۔ لیگ والے اس قسم کی سندات چھاپیں تو اور بات ہے، جماعتِ اسلامی کو اس قسم کی حرکات نہیں کرنی چاہئیں۔

۱۱؍ اکتوبر

خان لیاقت علی خان کے صدر منتخب ہونے پر مختلف حلقوں میں مختلف قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، مثلاً ایک صوفی بزرگ جو کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے ہیں، کل فرما رہے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی وحدتِ وجود ہے۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

ایک نوجوان مولوی صاحب جو ابھی فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے، سُن کے پکار اُٹھے غلط بالکل غلط، وزیر عربی زبان میں بوجھ اٹھانے والے کو کہتے ہیں، خان لیاقت علی خان نے دو گٹھڑ پہلے ہی اٹھا رکھے تھے، اب تیسرا گٹھڑ بھی اٹھا لیا۔ ایک بڈھا پنواڑی ان دونوں کی باتیں سُن رہا تھا، کہنے لگا، میں عربی جانتا ہوں نہ فارسی۔ لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ "لیگ داخل دفتر" ہو گئی۔

چودھری خلیق الزماں جب تک لیگ کے صدر تھے، کسی اخبار نے ان کے حق میں کلمۂ خیر

نہیں کہا، لیکن ان کے لیگ کی صدارت سے الگ ہونے کے بعد لوگوں کو یقیناً اُن کی صدارت کا زمانہ یاد آئے گا۔ لوگ اُن سے طرح طرح کی شوخیاں کرتے تھے لیکن وہ باایں پیرانہ سالی سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ لاہور والوں نے تو حد ہی کر دی یعنی چودھری صاحب تشریف لائے تو انہیں کالی جھنڈیاں دکھائیں، گو بیک اور مردہ باد کے نعرے لگائے، لیکن اب لیگ کے صدر سے اس قسم کی گستاخی کرنا ناممکن ہے، خان لیاقت علی خاں لیگ کے صدر ہی نہیں ہمارے فرمانفرما بھی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ع

نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارند

جہاں کسی شخص نے ادب کے دائرہ سے قدم باہر نکالا سیفٹی ایکٹ یا سیفٹی آرڈی ننس نے بڑھ کے ٹیٹوا دبایا۔

ڈھاکہ سے "منشور" نام ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا ہے، اس کے تازہ پرچے کے سرورق پر خواجہ شہاب الدین کے متعلق ایک نظم چھپی ہے۔ نظم تو واجبی سی ہے، لیکن بعض شعر خاصے ہیں مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

جسم ہے لاغر و نحیف تو کیا
جیب میں تو ہے نصف پاکستان

یہ نظم خان لیاقت علی خان کے صدر مقرر ہونے سے پہلے لکھی گئی ہے، اس زمانے میں نصف پاکستان خواجہ شہاب الدین کی جیب میں ہو تو ہو، آج کل تو خان لیاقت علی خان نے سارے پاکستان کو کندھے پر اٹھا رکھا ہے۔

افسوس کہ خواجہ شہاب الدین کی قدر ان کے اپنے وطن ڈھاکہ میں بھی کسی نے نہ کی۔ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے ان کے متعلق اس قسم کے اشعار لکھے جاتے تو اور بات تھی، اس زمانہ تک انہوں نے صرف ایک حج کیا تھا، پھر داڑھی بھی باقاعدگی سے منڈواتے تھے۔ اب تو وہ حج کر چکے چہرے پر ڈاڑھی بھی ہے جو انہوں نے . . . بڑھائی، "منشور" کو خواجہ صاحب کا پاس نہیں

تو اُن کی کھچڑی ڈاڑھی ہی کا لحاظ کیا ہوتا، بہر حال خواجہ صاحب کو اپنی تسکین کا سامان تلاش کرنا چاہیئے کہ "نبی بھی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا، تا بدیگراں چہ رسد"۔

۱۲ر اکتوبر

جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "تسنیم" کے ضمیمہ کے طور پر ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

"سو دو سو روپے اگر گھر میں پڑے رہیں تو کسی نہ کسی طرح خرچ ہو جاتے ہیں لیکن یہی قلیل رقم تجارت میں لگا دی جائے تو معقول منافع کے ذریعہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، کیونکہ مسلمان کا روپیہ سود سے نہیں بلکہ تجارت سے بڑھتا ہے۔ اگر آپ اسلامی اصول کے مطابق تجارت میں لگانا چاہتے ہیں، اگر آپ گھر بیٹھے معقول منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں تو شرکت احباب اسلامی مظفر گڑھ (پنجاب) میں شریک ہو جائیں، اس ادارے کے تحت دو فلور مل اس وقت باقاعدہ کام کر رہے ہیں، ان کی آمدنی بڑھانے کے لئے مزید مشینوں کے اضافہ کے انتظامات کئے گئے ہیں، جن سے انشاء اللہ تعالیٰ کافی منافع حاصل ہوگا"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، اشتہار بھی اسلامی، تجارت بھی اسلامی، فلور مل بھی اسلامی اور اس میں جو آٹا پستا ہے، وہ بھی اسلامی، غرض اخبار سے لے کے اشتہار اور اشتہار سے کاروبار تک ہر چیز پر اسلام ہی چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

کہنے کو تو یہ سود کا کاروبار نہیں خالص اسلامی تجارت ہے، لیکن غور کیجئے تو یہ تجارت کیا ہے "کرخنداری" ہے۔ ہاتھ تک نہ ہلائیے، گھر پڑے رہئے، البتہ شرکت احباب اسلامی کے حصے خرید لیجئے اور "یا اللہ بھیج" کے نعرے لگائیے، خدا نے چاہا تو سال بھر کے بعد معقول

منافع آپ کے گھر پہنچ جائے گا اور لطف یہ ہے کہ تجارت کی تجارت، کرخنداری کی کرخنداری پھر "دہ در دنیا ستر در آخرت" عاقبت میں اس عمل صالح کی بدولت جو نعمتیں نصیب ہوں گی، وہ الگ رہیں۔ صرف اتنی کسر باقی رہ گئی ہے کہ عہدِ صحابہ میں "شرکتِ احبابِ اسلامی" کی قسم کے کسی سرمایہ دارانہ ادارہ کی کوئی مثال نہیں ملتی، لیکن جماعت اسلامی کے محققین اس کوشش میں ہیں کہ عہدِ فاروقی سے "شرکتِ احبابِ اسلامی" کی وضع کے کسی ادارہ کی سند تلاش کر لائیں تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ:

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے یہ چُوکتا بھی نہیں

ممکن ہے بعض اصحاب کو خیال آئے کہ "شرکتِ احبابِ اسلامی" اچھی ہے یا بُری لیکن اس نے جو کاروبار شروع کر رکھا ہے، وہ تو خاصا "نفع بخش" ہے، اس لئے لاؤ دو تین حصے ہم بھی خرید لیں۔ لیکن اس کاروبار میں شرکت کے لئے ایک کڑی شرط بھی لگا دی گئی ہے جسے بہت کم لوگ پورا کر سکتے ہیں، یعنی اشتہار میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ "اس کاروبار میں صرف جماعتِ اسلامی کے ارکان و ہمدردان شریک ہو سکتے ہیں" گویا یہ اشتہار شرکتِ احبابِ اسلامی کا اشتہار نہیں، ایک حیثیت سے خود جماعتِ اسلامی کا اشتہار ہے یعنی اس "کرخنداری" میں شریک ہونے کی سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ پہلے جماعتِ اسلامی کے ہمدردوں میں نام لکھائیے، پھر شرکتِ احبابِ اسلامی کے حصے خرید کے دنیا و عقبیٰ کی سرخروئی حاصل کیجئے۔

یہ شرط پڑھ کے بعض لوگوں کو محسوس ہؤا ہو گا کہ جنّت کا دروازہ جو ان پر لمحہ بھر کے لئے کھُلا تھا، پھر بند ہو گیا۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہؤا ہو گا کہ فردوس کا راستہ جماعتِ اسلامی کے صدر دفتر سے ہو کر گزرتا ہے جس کے پھاٹک پر مولانا مودودی صاحب کھڑے پہرہ دے رہے ہیں اور جس کے ایک طرف کوثر موج مار رہا ہے اور دوسری جانب "تسنیم"

لہریں لے رہا ہے، یعنی "شرکتِ احباب اسلامی" نے جو نعمتیں جمع کر رکھی ہیں۔ ان سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو مولانا مودودی کے ہاتھ پر بیعت کریں، اُن کے بتائے ہوئے رستے پر چلیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی ایسا ہی تنگدل فرقہ ہے جیسا فرقۂ باطنیہ جو اپنے اعمال و اسرار کو دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے ہمیشہ بچائے رکھتا تھا اور جو لوگ اس فرقہ میں شامل ہونا چاہتے تھے، انہیں بعض خاص شرطیں پوری کرنی پڑتی تھیں۔

یہ معلوم نہیں ہوا کہ "شرکتِ احباب اسلامی" کی فلور مل میں جو آٹا پستا ہے اسے صرف "جماعتِ اسلامی کے ارکان اور ہمدردان" کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے، یا دوسرے لوگ بھی یہ آٹا خرید سکتے ہیں۔

۱۳ر اکتوبر

مسٹر ہاشم گزدر نے پاکستان پارلیمنٹ میں سوال کیا، آیا یہ صحیح ہے کہ شاہِ ایران کی تشریف آوری کے موقع پر کراچی میں گدھا گاڑیوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی تھی؟ چودھری نذیر احمد نے جواب دیا، جی ہاں! لیکن یہ ممانعت عارضی تھی، اب گدھا گاڑیاں کسی روک ٹوک کے بغیر کراچی میں آ جا سکتی ہیں

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر شاہِ ایران سست رفتار گدھا گاڑیوں کو کراچی کی سڑکوں پر سے گزرتا دیکھ لیتے تو کونسی قیامت آ جاتی؛ گدھے طہران میں بھی تو ہوتے ہیں اور کابل میں بھی۔ اور کابل کے گدھوں کے متعلق تو مدت ہوئی مولانا ظفر علی خاں یہ فتوے دے چکے ہیں کہ

گدھوں کی آج کل کابل میں ہے اتنی فراوانی
گماں ہوتا ہے یہ انساں یہاں پیدا نہیں ہوتے

خدا کے لئے اب یہ ثابت کرنے کی کوشش تو نہ کیجئے کہ کراچی میں گدھے نہیں ہوتے،

ورنہ کابل کے گدھوں کے متعلق جو محاورہ اُردو میں مدّت سے چلا آتا ہے، اس میں ترمیم کر کے ہمیں آئندہ یوں کہنا پڑے گا کہ "کیا کراچی میں گدھے نہیں ہوتے"۔

مولانا مودودی نے فتوے تو دے دیا کہ پنجاب میں جو سیلاب آیا وہ واقعی سیلاب تھا لیکن مولانا نے اس سلسلہ میں نہ تو مستند علما کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، نہ کوئی دلیل پیش کی ہے۔ اس لیئے اندیشہ ہے مولانا نے جس طرح جہادِ کشمیر کے سلسلہ میں اپنا عقیدہ بدل دیا تھا، سیلاب کے معاملہ میں بھی اپنا عقیدہ بدل نہ ڈالیں۔ بزرگانِ جماعتِ اسلامی کو ایک کانفرنس منعقد کر کے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آیا یہ سیلاب واقعی سیلاب تھا، یا مسئلہ جہادِ کشمیر کی طرح اس معاملہ میں بھی مولانا نے تسامح ہُوا ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا جماعتِ اسلامی کے لیے تمام سیلاب زدگان کی امداد کرنا جائز ہے؟ ابھی کل کی اشاعت میں ہم نے مشترکہ سرمایہ کی ایک کمپنی کا ذکر کیا تھا، جو "شرکتِ احبابِ اسلامی" کے نام سے حال میں قائم ہوئی ہے اور جس کی شرائط میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ جو لوگ جماعتِ اسلامی کے ارکان یا "ہمدردان" میں شامل نہیں، وہ اس کاروبار میں شرکت نہیں کر سکتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سیلاب زدگان کی امداد کے کاروبار کو لمیٹڈ کمپنی سمجھ کے نہ چلایا جائے، یعنی سیلاب زدگان میں سے انہی لوگوں کی امداد کی جائے جو کم از کم جماعتِ اسلامی کے ہمدردوں میں شامل ہیں۔ یہ واضح رہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ایسے موقع پر اپنے بیٹے کنعان کی بھی مدد نہیں کی تھی۔

بہر حال یہ سب بعد کی باتیں ہیں، پہلے تو جماعتِ اسلامی کو یہ طے کرنا ہے کہ آیا یہ سیلاب واقعی سیلاب تھا؟ اور اگر اس کا سیلاب ہونا مسلّم ہے تو اسے سیلِ عرم کی قسم کا سیلاب سمجھا جائے یا طوفانِ نوح کی قسم کے حوادث میں سے شمار کیا جائے؟

ہمارے ملک کے ادیبوں کے کئی گروہ پہلے ہی موجود تھے، پچھلے سال تعمیر پسند مصنفین کے

نام سے ایک نئی انجمن قائم ہوئی، یہ انجمن نام سے تو امپروومنٹ ٹرسٹ کی کوئی سکیم معلوم ہوتی تھی، لیکن چند دنوں میں اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ پھر ہم نے سُنا کہ اس کے ملبہ سے اسلام پسند مصنّفین کی دیواریں اٹھائی جائیں گی، چنانچہ ایک روایت ہے کہ انجمن اسلام پسند مصنّفین قائم ہو چکی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی سرگرمیاں منظرِ عام پر نہیں آئیں

ادیبوں کے مختلف گروہوں میں کوئی ادب برائے ادب کا قائل ہے، کوئی ادب برائے زندگی کا، لیکن اسلام پسند مصنّفین کہتے ہیں کہ ہم "ادب برائے خدا" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ خود مولانا مودودی بھی "ادب برائے خدا" کے پُرزور حامی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام پسند مصنّفین خاص اللہ تعالیٰ کے مطالعہ کے لئے نظمیں افسانے اور مضامین لکھنا چاہتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلیّ العظیم۔ ادب اور شاعری کے تاجر اپنے مال کو بیچنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اللہ ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔

۱۳ر اکتوبر

معلوم ہوا ہے کہ سیلاب زدہ علاقوں میں ملیریا بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اتنے ڈاکٹر ہی نہیں کہ ملیریا کی روک تھام کا مناسب انتظام کیا جا سکے۔

ہمارے پاس اللہ کے فضل سے ایسے "لنگوٹ بند" لیڈر بھی ہیں جو لنگوٹ باندھ کے پہروں راوی کے کنارے ٹہل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور، راولپنڈی، کراچی، پشاور، اور ڈھاکہ میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے شاعر بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں، ہر شہر میں کثرت سے ایسی ادبی انجمنیں بھی موجود ہیں جو اگر ریلیف فنڈ میں چندہ کے طور پر ایک ایک شاعر بھی بھیج دیں تو سیکڑوں سخنورانِ کامل جمع ہو جائیں، لیکن ملیریا کی روک تھام کے لئے ہمیں نہ لیڈروں کی ضرورت ہے نہ شاعروں کی، بلکہ صرف ڈاکٹر درکار ہیں اور ایسے ڈاکٹر جو سیلاب زدہ

علاقے میں کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں، کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں۔

اگر ملیریا کے مچھروں سے مناظرہ کرنے سے کام چل جاتا تو ہم ایسے ایسے علما اُن کے مقابلے پر بھیجتے، جنہیں شمس بازغہ تک ازبر ہے۔ مشاعرہ گر کے مچھروں کو شکست دی جا سکتی، تو شاعروں کی ایک کھیپ بھیج دی جاتی جو بیاضیں بغل میں دبائے مچھروں پر پل پڑتے، اور اپنے کلام بلاغت التیام سے اُن کی نیند حرام کر دیتے۔ لیکن یہ کم بخت مچھر نہ شاعروں سے ہار مانتے ہیں، نہ علما کی پروا کرتے ہیں، نہ لیڈروں سے ڈرتے ہیں۔ نہ نیشنل گارڈ والوں کو خاطر میں لاتے ہیں۔ لے دے کے صرف ڈاکٹروں سے اُن کی کور دبتی ہے اور پیلوڈرین اور کونین ہی ایسے قاطع دلائل ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے جغادری مچھر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اگر حضرات شعرائے کرام ڈاکٹروں کا بدل ہو سکتے ہیں تو حکومت کو چاہیے کہ اس سلسلہ میں کوئی واضح اعلان کر دے، تاکہ ہم بھی ادارہ "امروز" کی طرف سے دو تین شاعروں کو سیلاب زدہ علاقے میں بھیج دیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ان حضرات سے ملیریا کے مچھروں کی نیند حرام کرنے کا کام نہ لیا جا سکا تو اپنے کلام سے ہماری نیند حرام کرتے رہیں گے۔

لاہور کے ایک اخبار نے خبر چھاپی ہے کہ "لاہور کے ایک شاعر کی شادی سادہ طریق سے انجام پائی" تعجب ہے، شاعر کی شادی سادہ طریق سے کیسے انجام پا سکتی ہے! یہ مانا کہ دولہا نے سہرا نہ باندھا، آرسی مصحف کی رسم ادا نہ کی گئی، شادیانے نہ بجے، لیکن جو شعرا برات میں شریک تھے۔ انہوں نے سہرے تو ضرور لکھے ہوں گے، الفاظ کے لعل و گہر تو ضرور نثار کیے ہوں گے، شاعری بجائے خود صناعی ہے اور صناعی بھی کیسی، جس کے متعلق خود شاعر کہتا ہے ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری ہے کام آتش اک مرصع ساز کا

دراصل شعرائے کرام ہر موقع پر تکلف سے کام لیتے ہیں یا مبالغہ کریں گے یا کسرِ نفسی فرمائیں گے۔ اس شادی کے متعلق انہوں نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے، ورنہ جس شادی پہ اچھی خاصی مجلس مشاعرہ منعقد ہو جائے "عرض کیا ہے"، ارشاد، ارشاد، کیا خوب فرمایا، واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دے، اسے "سادہ" کون کہتا ہے، یہ طمطراق تو بڑے بڑے امرا کو بھی میسّر نہیں۔

شاعر کی شادی پہلے بھی کبھی سادہ طریق سے انجام نہیں پائی اور آج تو خیر زمانہ ہی اور ہے۔ بزرگوں کی زبانی ضامن علی جلال لکھنوی کی شادی کا حال سنا ہے جس میں دوسرے مشہور شعرا اور اہلِ علم کے علاوہ امیر اور داغ بھی شامل تھے۔ لکھنؤ کی طوائفوں کے علاوہ بھانڈوں کا ایک طائفہ بھی موجود تھا۔ میرزا داغ کو بھانڈوں کی شوخیاں کسی قدر گراں گزریں، اُن کمبختوں نے ایک نقل میں داغ ہی کی گت بنا ڈالی۔ اکبر الہ آبادی مرحوم کی دونوں شادیاں خاصی دھوم دھام سے ہوئیں، ان کے صاحبزادے عشرت میاں کی شادی کے موقع پر تو طوائف کے مجرے کا بھی انتظام تھا۔ بہرحال آج کل کے شعرا اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم شادی کے موقع پر مشاعرے کا انتظام تو ہو سکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ مشاعرہ لاکھ تکلفوں کا ایک تکلف ہے۔

لاہور کے ایک اخبار میں ایک صاحب کا اعلان چھپا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے جلسہ میں کوئی صاحب اُن کا نیا سائیکل لے گئے اور اپنا پُرانا سائیکل چھوڑ گئے۔

سچ پوچھئے تو زمانہ نے اس معاملہ میں بھی خاصی ترقی کی ہے، ایک زمانہ تھا کہ لوگ مسجدوں اور بیاہ شادی کی محفلوں سے نئے جوتے چُرا لے جاتے تھے۔ جو لوگ زیادہ محتاط تھے، اور اس طرح جوتا چرانے کو "خلافِ تقویٰ" سمجھتے تھے، وہ اپنا پُرانا جوتا چھوڑ جاتے تھے، اور کسی کا نیا جوتا پہن کے رب رب کرتے گھر سدھارتے تھے کہ "عوض معاوضہ گلہ ندارد"

اب معاملہ جوتوں سے سائیکلوں تک پہنچا ہے، گویا ہم نے اس معاملہ میں جو ترقی کی ہے اسے "صنعتی ترقی" کہنا چاہئے اور جوتے اور سائیکلیں چرانا بھی تو ایک قسم کی صنعت ہے؛ یہ اور بات ہے کہ اس کا شمار گھریلو قسم کی صنعتوں میں ہوتا ہے۔

۱۶ر اکتوبر

لاہور کارپوریشن ان دنوں پبلسٹی آفیسر کے تقرر کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے، ہمارے خیال میں پبلسٹی آفیسر پر روپیہ خرچ کرنا اسراف بیجا ہے۔ اگر کراچی کارپوریشن نے کوئی پبلسٹی آفیسر مقرر کر رکھا ہے تو اس سے لاہور کارپوریشن کی پبلسٹی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور اگر بلدیہ کراچی نے ابھی تک کوئی پبلسٹی آفیسر مقرر نہیں کیا تو اسے اب اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے، یا پھر کچھ دنوں انتظار کیا جائے، جب خان لیاقت علی خان کراچی کارپوریشن کے صدر منتخب ہوں گے تو یہ ساری الجھنیں خود بخود دُور ہو جائیں گی۔

آپ کہیں گے کہاں خان لیاقت علی خان کہاں بلدیہ کراچی کی صدارت! لیکن ہمیں اُمید ہے کہ زود یا بدیر بلدیہ کراچی کی صدارت کا قرعۂ فال بھی انہی کے نام پڑے گا، کیونکہ ہمارے ہاں لے دے کے خان لیاقت علی خان ہی تو ایک ایسے شخص ہیں جو اس قسم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ بلدیہ کراچی کی صدارت کا بوجھ اٹھانا منظور کر لیں —— اور انہیں یقیناً کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے؛ جہاں وزارتِ عظمیٰ اور صدارت عظمےٰ کے بڑے بڑے گٹھڑ ان کے کندھوں پر ہیں، وہاں ایک بُقچہ بھی سہی —— تو اس صورت میں لاہور کارپوریشن کا تتمہ بنا دینا چاہئے، یہ صورت ہو جائے تو لاہور کارپوریشن کے لئے نہ میئر کی ضرورت نہ کونسلروں کی حاجت، نہ پبلسٹی آفیسر کا بکھیڑا، بس وہی مضمون ہے کہ ع

"من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی"

بعض حضرات شاید لاہور کارپوریشن کے یوں "نھنی الف" بن جانے کا قضیہ سن کے کہیں کہ "سندباد جہازی" یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، لاہور کارپوریشن کو کراچی کارپوریشن کا تتمہ کیونکر بنایا جا سکتا ہے؟ لیکن ان دنوں ہماری سیاست میں جو رنگ اچھل رہا ہے، اس پر ذرا غور کیا جائے تو بلدیہ لاہور کا بلدیہ کراچی کے "توابع" میں شامل ہو جانا چنداں عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ آخر مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے جس کا مرکز کراچی ہے پنجاب اسمبلی کے لیے امیدوار نامزد کرنا بھی تو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ پھر لاہور کارپوریشن کو تتمہ تصور کر لیا جائے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے؟

ہماری تجویز مان لی جائے تو یہ صورت ہو جائے گی کہ وزیرِ اعظم بھی خان لیاقت علی خان، وزیرِ دفاع بھی خان لیاقت علی خان، مسلم لیگ کے صدر بھی خان لیاقت علی خان، اور کراچی کارپوریشن کے صدر بھی خان لیاقت علی خاں، پارلیمنٹری بورڈ وہی، پنجاب اسمبلی کے امیدوار نامزد کرنے والے بھی وہی، گویا ؎

یک چراغ است کہ از پرتوِ آں
ہر کجا انجمنے ساختہ اند

---

۱۷ اکتوبر

سنا ہے حکومت کی طرف سے مسجدوں کے پیش اماموں کو دو یا تین ایکڑ زمین دی جائے گی۔ پیش امام مسجدوں میں پانچ وقت نماز پڑھاتے ہیں، اس لئے حکومت کو چاہیئے تھا کہ ان کے لئے کم از کم پانچ ایکڑ زمین منظور کرتی، تاکہ فی نماز ایک ایکڑ زمین تو حصے میں آتی۔

قرآن کریم میں آیا ہے کہ ان الارض للہ یرثہا عبادی الصالحون ۔ یعنی

زمین اللہ کی ہے اور اس کے وارث ہوں گے، اللہ کے صالح بندے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بڑی بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ علامہ مشرقی نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے کہ یورپ کے لوگ جنہوں نے بڑے بڑے وسیع ممالک پر قبضہ کر لیا ہے، اللہ کے صالح بندے ہیں، اسی لئے خدا نے انہیں زمین کا وارث بنایا ہے، مودودی صاحب کے نزدیک اگرچہ صالح کی تعریف کچھ اور ہے، لیکن اس بات سے تو انہیں بھی انکار نہیں ہوگا کہ مساجد کے پیش امام جن میں سے بعض کو دو ایکڑ، اور بعض کو تین ایکڑ زمین مل گئی ہے، یقیناً اللہ کے صالح بندے اور اس آیہ کریمہ کے صحیح مصداق ہیں۔

فاطمی خلیفہ معز الدین اللہ نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ایک محفل منعقد کی جس میں مصر کے علما کو بلا کے اپنی خلافت کی تائید و توثیق چاہی۔ بعض لوگوں کو خلیفہ کے حسب و نسب کے بارے میں شکوک تھے اور عام طور پر یہ بھی مشہور تھا کہ عبداللہ المہدی پہلا فاطمی خلیفہ دراصل ایک مجہول النسب شخص تھا، اس لئے انہیں معز کی خلافت کی تصدیق کرنے میں تامل ہوا۔ معز نے تلوار کھینچ لی اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا "یہ میرا نسب ہے"۔ ساتھ ہی غلاموں نے اس کے اشارے سے اہلِ محفل کے قدموں میں اشرفیوں کے بدرے ڈال دیئے اور آواز آئی "یہ میرا حسب ہے" یہ دونوں دلائل ایسے قاطع تھے کہ کسی کو مجالِ اعتراض نہ رہی۔

علماء کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ بنیادی حقوق کی سفارشات جنہیں دستور ساز اسمبلی نے منظور کر لیا ہے، اسلام کے مطابق نہیں لیکن اب تو دو یا تین ایکڑ زمین پر اللہ کے صالح بندوں یعنی آئمہ مساجد کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے، اس لئے ہماری رائے میں اعتراض کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ لہٰذا بنیادی حقوق پر نکتہ چینی اور حرف گیری کرنے کے بجائے اب تو منبروں سے یہ صدا گونج اٹھنی چاہئے کہ السلطان السلطان العادل، ظل اللہ تعالیٰ فی الارض اللھم متع المسلمین بطول حیاتہ وضاعف ثواب جمیلہ وحسناتہ وارفع درجہ ادامہ و دولاتہ

و دمرّ علیٰ اعدائہٖ و شنائتہٖ ۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر زمین کے بجائے آئمہ مساجد کے لئے نقد وظیفہ مقرر ہو جاتا تو بہت اچھا تھا ۔ ائمہ میں بعض حضرات کا یہ حال ہے کہ نہ چولھے میں آگ ، نہ گھڑے میں پانی ، ہفتوں چولھا گرم نہیں ہوتا ۔ بعض نیک دل لوگ کھانے کو کچھ بھیج دیتے ہیں ، اسی پر گزارہ ہوتا ہے ، زمین کی کاشت کا بکھیڑا کون کرے گا ، اور اگر بچارے ائمۂ مساجد زمین کی کاشت کے قضیئے میں اُلجھ گئے تو نمازیں کون پڑھائے گا ، درس و تدریس کے فرائض کون انجام دے گا ؟

یورپ کے ایک مُلّا عبدالرحمٰن نام غالب و ذوق کے زمانے میں دلّی آ نکلے تھے ، حکیم آغا جان عیشؔ دہلوی نے اُن کے لئے ہُدہُدؔ تخلص تجویز کیا ۔ پہلے خود شعر لکھ کے دیئے کچھ عرصے کے بعد وہ خود بھی شعر کہنے لگے ۔ اگرچہ سرکار سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا لیکن انہیں وہ زمانہ نہیں بھولتا تھا ، جب وہ کسی مسجد میں پیش امام تھے ، اور بڑے اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے ، اسی لئے وہ ایک موقع پر کہتے ہیں ؎

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے
فلک کہے ہے ۔ مقرر میں باجرا کر دوں

دو یا تین ایکڑ زمین پر اگر پیش امام کی معاش کا انحصار ٹھہرا تو بچارے کو یقیناً باجرا ہی میسّر ہو گا ۔

---

۱۸ / اکتوبر

مسلم لیگ کے لیڈروں میں سے بعض حضرات یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جب سے خان لیاقت علی خان نے زمامِ صدارت اپنے ہاتھ میں لی ہے ، لیگ لوہا لاٹ بن گئی ہے ، اسے اپنی جگہ سے

کوئی ہلا نہیں سکتا ؎

سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا

لیکن پچھلے دنوں سے جو واقعات ہو رہے ہیں، ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھرا ہُوا میلہ اب اجڑنے کو ہے، مولوی عبدالباری گئے۔ ملک غلام نبی گئے، اس وقت جو حالات ہیں، اگر اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو یقین ہے کہ استعفوں کی لین ڈوری بندھ جائے گی اور دولتانہ صاحب "یوسفِ بے کارواں" ہو کے رہ جائیں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگ، جو ٹکٹ کی چاٹ میں لیگ کا دامن تھامے بیٹھے ہیں، لیگ ہی میں رہیں گے۔ کیونکہ ایسے "بے ٹکٹ" لوگوں کے لئے ٹکٹ میں بڑی کشش ہے، لیکن اس کے ہرگز معنی یہ نہیں کہ لیگ کو وہی مقام حاصل ہے جو آج سے تین چار برس پہلے حاصل تھا۔ ایک زمانے میں لوگ دوسری جماعتوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے لیگ میں شامل ہوتے تھے، لیکن کچھ دنوں کے بعد لیگ میں وہی لوگ رہ جائیں گے، جن کا کوئی ٹھور ٹھکانہ ہی نہیں اور لیگ سے اس لئے وابستہ ہیں کہ اسے چھوڑیں تو جائیں کہاں؟

اخبارات میں مسٹر نسیم حسن سابق مشیرِ تعلیم کا ایک بیان شائع ہُوا ہے، جس میں انہوں نے فرمایا ہے:۔

"وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد کی، انہیں یہ دیکھ کے بے حد مایوسی ہوئی ہے کہ مسلم لیگ اپنا اقتدار کم کر رہی ہے، انہیں مسٹر لیاقت علی خاں کے صدر منتخب ہونے پر اُمید ہو چلی ہے کہ مسلم لیگ پھر زندہ ہو جائے گی"۔

مسلم لیگ زندہ ہو جائے تو ہو جائے، لیکن مسٹر نسیم حسن کو یقین رکھنا چاہئے کہ گورنر پنجاب کی "مجلسِ مشاورۃ" ہرگز زندہ نہیں ہو گی۔

ہم موجودہ لیگ سے چنداں حسنِ ظن نہیں رکھتے۔ ہماری رائے میں مسلم لیگ مختلف امراض میں مبتلا ہے جس میں ذات الجنب، ضیق النفس، ورمِ جگر، ضعفِ قلب جیسے امراض شامل ہیں اور چونکہ وقت پر کوئی علاج نہیں ہو سکا اور جو لوگ اپنے آپ کو لیگ کا معالج کہتے ہیں وہ دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ لیگ کو کوئی مرض ہی نہیں یوں ہی کبھی کبھی زکام ہو جاتا ہے۔ اس لئے کچھ عرصے میں ہماری لیگ غفر لہا ہو جائے گی، لیکن معالج ٹاپتے رہ جائیں گے۔ لیکن مسٹر نسیم حسن جو لیگ کے خاص تیمارداروں میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ لیگ تو مر چکی، لیکن امید ہے کہ خان لیاقت علی خان کے صدر منتخب ہو جانے کی وجہ سے لیگ زندہ ہو جائے گی۔

خان لیاقت علی خان کی مسیحا نفسی سے انکار مقصود نہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ لیگ اگر غفر لہا ہو چکی ہے تو محض خان لیاقت علی خان کے صدر بن جانے سے وہ کیسے زندہ ہو جائے گی، گستاخی معاف لیگ کو "ذات الصدر" کا مرض نہیں تھا، ذات الجنب تھا، ضیق النفس تھا، عظم طحال تھا اور ورمِ جگر تھا، وہ ذات الصدر ہی سے انتقال کر جاتی تو خان لیاقت علی خاں اسے کیسے زندہ کر لیتے؟ بہر نوع پہلے یہ طے ہو جانا چاہئے کہ لیگ زندہ ہے یا مر چکی ہمیں تو لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ "بیمار کا حال اچھا ہے" اور مسٹر نسیم حسن تو فرماتے ہیں کہ اس کا تو چہلم بھی ہو گیا۔ گویا وہی مضمون ہے کہ ؎

گھر سے خط آیا ہے یاں ہو گیا چہلم ان کا
پانیر لکھتا ہے، بیمار کا حال اچھا ہے

بتائیے، ان دونوں روایتوں میں سے کونسی روایت پر یقین کریں؟

۱۹ر اکتوبر

پروفیسر محمد حسن اعظمی ایک پروفیسر صاحب ہیں جنہوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے۔ ڈیڑھ

دو سال ہوئے، اخباروں میں ان کا ایک بیان چھپا تھا کہ پاکستان کی زبان عربی ہونی چاہئے۔ چونکہ بیچارے اعظمی صاحب نرے پروفیسر تھے، اس لئے کسی نے ان کے بیان کو چنداں اہمیت نہ دی۔ لیکن حال ہیں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن چودھری معظم حسین نے بھی اسی قسم کا ایک بیان دیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ عربی بڑی وسیع زبان ہے، اس میں ٹائپ رائٹر بھی موجود ہے، طباعت کی سہولتیں بھی میسر ہیں، اس لئے پاکستان کو چاہئے کہ اسے فوراً اپنی قومی زبان بنالے۔

ہم وثوق کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ چودھری معظم حسین صاحب کو خود کتنی عربی آتی ہے؟ لیکن اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کو عربی زبان اور عربی رسم الخط کا فرق بھی معلوم نہیں۔ کیونکہ انہوں نے عربی زبان کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، وہ دراصل خطِ نسخ اور خطِ ثُلث کی خوبیاں ہیں۔ ممکن ہے کہ چودھری صاحب صرف یہ کہنا چاہتے ہوں، کہ ہمیں نستعلیق کے بجائے خطِ نسخ اختیار کر لینا چاہئے اور غلطی سے یہ کہہ گئے کہ ہمیں عربی کو اپنی قومی زبان بنا لینا چاہئے۔

بہت سے لوگ جو قاعدہ بغدادی پڑھ کے ناظرہ قرآن پڑھ لیتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے عربی پڑھ لی۔ بعض مسجدوں کے پیش امام ایسے ہیں جنہیں عربی بالکل نہیں آتی، چند ادعیہ ماثورہ یاد کر لی ہیں اور لوگوں پر رعب جما رکھا ہے کہ ہمیں عربی میں سندِ فضیلت حاصل ہے اس قسم کے مولوی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ عربی میں ٹھنڈی روٹی کو کیا کہتے ہیں؟ مولوی صاحب کی تعلیم تو واجبی تھی لیکن بڑے حاضر جواب شخص تھے۔ کہنے لگے "عرب کے لوگ روٹی ٹھنڈی ہونے ہی نہیں دیتے، ہمیشہ گرم روٹی کھاتے ہیں، اس لئے اُن کی زبان میں ٹھنڈی روٹی کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں"۔

بہر حال اگر چودھری معظم حسین صاحب کا منشا یہ ہے کہ نستعلیق کے بجائے خطِ نسخ

اختیار کر لیا جائے تو یہ تجویز معقول ہے اور اس پر حکومت پاکستان کو غور کرنا چاہئے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا جائے، خط و کتابت عربی میں ہوا کرے، پاکستان کی پارلیمنٹ یعنی مجلس شورائے ملی میں جتنی تقریریں ہوں، عربی میں ہوں، اسکولوں میں عربی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے بلکہ لوگ آپس میں بھی عربی ہی میں بات کیا کریں۔ تو یہ کام ذرا مشکل ہے کیونکہ "طیب طیب" کہہ کے سر ہلا دینے کے معنی یہ نہیں کہ عربی آگئی جو لوگ عربی دانی کے مدعی ہیں اور ساری عمر عربی ہی پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں اور اس زبان میں روانی کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے، تو "تا بدیگراں چہ رسد"

ہاں اگر چودھری معظم حسین کو عربی سیکھنے کا کوئی آسان سا ٹوٹکا ہاتھ آگیا ہو، تو اور بات ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انجکشن کے ذریعے انسان کے جسم میں دوائیں تو داخل کی جا سکتی ہیں، لیکن انجکشن سے کوئی زبان سکھانے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ کوئی تعویذ بھی ایسا نہیں جسے گھول کے پلا دیا جائے اور لوگ فرفر عربی بولنے لگیں۔ کم از کم نقش سلیمانی اور حزب البحر کے جو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان میں سے تو کوئی ایسا تعویذ نظر نہیں آیا۔

ہمارے ہاں سید کا لقب بنی فاطمہ کے لئے مخصوص ہے اور سادات کا عام طور پر جو احترام کیا جاتا ہے، اس نے بہت سے نقلی سید بھی پیدا کر دیئے ہیں، اسی لئے تو کسی ظریف نے کہا ہے کہ ع

غلہ چوں ارزاں شود امسال سید می شوم

لیکن عرب ممالک کا یہ حال نہیں، وہاں سید مسٹر یا جناب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ مصر، عراق وغیرہ کے اخبار پاکستان کے وزرا کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ناموں کے ساتھ "سید" ضرور لکھتے ہیں، مثلاً السید لیاقت علی خان، السید غلام محمد، السید ظفر اللہ خان، یہاں تک تو خیر چنداں مضائقہ نہیں تھا، لیکن چند مہینے ہوئے، عربی زبان کے ایک اخبار میں مسٹر منڈل کا ذکر آیا تو ان کا نام بھی اس طرح چھپا تھا، "صاحب السعادۃ السید جوگندر ناتھ منڈل"

یہ نہ سمجھیے کہ منڈل صاحب غلہ کی ارزانی یا پاکستان سے وابستگی کے باعث "سیّد" بن گئے، مصر کے اخبار "المصور" نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بھی "السیّد راجندر پرساد" لکھا ہے حالانکہ نہ تو وہ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہندوستان میں غلہ ہی کچھ ایسا سستا ہے۔

۲۰ر اکتوبر

لاہور کے دو اخباروں نے دلّی کے ایک اخبار کے حوالے سے یہ خبر چھاپی تھی کہ خواجہ حسن نظامی انتقال کر گئے، ہم نے دلّی کے سارے اخبارات دیکھ ڈالے، یہ خبر کہیں نہیں ملی۔ ایک روایت ہے کہ ہندوستان کے جس اخبار نے یہ خبر چھاپی تھی، اس نے خود ہی اس کی تردید کر دی ہے۔ لیکن اس اخبار کے نام کے بارے میں بھی اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے "ملاپ" نے یہ خبر چھاپی تھی، کوئی "پرتاپ" کا نام لیتا ہے، بہر حال یہ خبر کسی نے چھاپی ہو نری غپ ہے۔

اس خبر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ خواجہ صاحب نے آج سے مہینہ بھر پہلے اپنی وفات کی تاریخ بتا دی تھی یعنی صاف کہہ دیا تھا کہ میرا انتقال ۲ر محرم کو ہوگا، چنانچہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی یعنی ۲ر محرم ہی کو اُن کا وصال ہوا۔ لیکن اب تو اس خبر ہی کی تردید ہو گئی ہے، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یا تو خواجہ صاحب نے اس قسم کی کوئی پیش گوئی ہی نہیں کی تھی یا پیشگوئی کی تھی وہ تو درست ثابت نہیں ہوئی۔ یعنی ۲ر محرم بھی گزر گئی اور خواجہ صاحب اللہ کے فضل سے صحیح و سالم موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں یاد آیا کہ خواجہ حسن نظامی پر اس قسم کا سانحہ پہلی مرتبہ نہیں گزرا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ان کی وفات کی خبر مشہور ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ ان کے کسی دشمن نے اخبار وکیل امرتسر، وطن لاہور، اور پیسہ اخبار کو خط لکھ دیا تھا کہ خواجہ صاحب انتقال کر گئے، ان

اخباروں نے اس موقع پر لمبے لمبے تعزیتی نوٹ لکھے۔ دوسری مرتبہ ۱۹۱۳ء میں جب انہوں نے مسجد کانپور کے حادثہ سے متاثر ہو کے میرٹھ کی مسجد میں ایک تقریر کی تو کسی نے دلّی میں یہ خبر اڑا دی کہ میرٹھ میں بلوہ ہو گیا جس میں خواجہ حسن نظامی مارے گئے۔ دو تین دن کے بعد خواجہ صاحب دلّی آئے تو انہیں کھلی بگھی میں بٹھا کے سارے شہر میں پھرایا گیا، پھر بھی لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا، پاس آ آ کے دیکھتے تھے کہ سچ مچ خواجہ حسن نظامی ہی ہیں، یا یار لوگوں نے اُن کی شکل کا پتلا بنا کے گاڑی میں بٹھا دیا ہے۔

نو دس برس ہوئے، ایک مرتبہ خبر آئی کہ جگر مرادآبادی کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر ریڈیو پر بھی سنائی گئی، اخباروں میں بھی چھپی، لاہور ریڈیو والے بہت مستعد لوگ تھے، انہوں نے راقم الحروف سے کہا کہ جگر کی شاعری کے متعلق فوراً تقریر لکھ ڈالو، راقم نے جگر کے حالات فراہم کئے، لائبریری سے اُن کا کلام نکلوایا اور اسی شام کو ریڈیو پر تقریر کر ڈالی، جس میں اُن کے حالات کے علاوہ اُن کی شاعری کے محاسن کا بھی ذکر تھا۔ جن لوگوں نے ریڈیو پر یہ تقریر سُنی، ان میں غالباً خود جگر مرادآبادی بھی تھے، بعض شہروں میں ادبی محفلوں نے جلسے بھی کئے، اگرچہ ان جلسوں میں جگر کو شرکت کرنے کا موقع نہ ملا، تاہم انہیں اس بات کا اندازہ ضرور ہو گیا کہ لوگ اُن کی کتنی قدر کرتے ہیں؟

۱۹۴۸ء کے شروع میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ اختر شیرانی ٹونک سے لاہور آ رہے تھے کہ راستے میں گاڑی پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا اور بہت سے مسلمان جن میں اختر بھی تھے مارے گئے یہ خبر قریب قریب سارے اخباروں میں چھپ گئی، مہینہ بھر کے بعد اختر نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا، ہم نے امروز میں یہ خط چھاپ دیا۔ غالب نے وبائے عام میں مرنے کو کسرِ شان سمجھا تھا، اختر کو ہنگامۂ عام میں، اور وہ بھی راجپوتانہ کے کسی گم نام اسٹیشن پہ مرنا ناگوار تھا، اس لئے کچھ عرصہ کے بعد لاہور آ گئے اور یہیں انتقال کیا۔

---

۱۲ / اکتوبر

مولانا حسرت موہانی لاہور آئے اور چلے بھی گئے، لیکن بہت کم لوگوں کو اُن سے ملاقات کا موقع ملا۔ لاہور اسٹیشن پر جب راقم الحروف اُن سے ملا تو مولانا اس کشمکش میں تھے کہ اپنا سامان خود اٹھائیں یا قلی سے اٹھوائیں۔ ایک صاحب کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ دراصل یہی مولانا حسرت موہانی ہیں، مجھ سے بار بار پوچھتے تھے کہ تم سے کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی، مولانا حسرت کو اچھی طرح پہچانتے بھی ہو یا نہیں؟

جس گاڑی سے مولانا حسرت موہانی لاہور تشریف لائے، اُسی سے چودھری عبدالکریم سابق آنریری مجسٹریٹ جو آج کل پنجاب مسلم لیگ کے بہت بڑے لیڈروں میں سے ہیں، کراچی سے آرہے تھے، اُن کی نئی شیروانی، ترکی ٹوپی اور لمبی ڈاڑھی کو دیکھ کے ایک صاحب کو خیال ہُوا کہ ہو نہ ہو یہی مولانا حسرت موہانی ہیں۔ چودھری صاحب نے اگرچہ قرارداد مقاصد کے پاس ہونے کے بعد ڈاڑھی رکھی ہے اور ڈاڑھی کیا رکھی ہے، سچ پوچھئے تو قرارداد مقاصد چہرے پر لٹکالی ہے، لیکن اب اُن میں "چودھری پن" کم رہ گیا ہے "مولویت" زیادہ ہے۔ اگر انہیں اور چودھری عبدالکریم کو ایک ساتھ کھڑا کرکے اس بات پر رائے شماری کرائی جائے کہ ان میں حسرت موہانی کون ہیں، تو زیادہ ووٹ چودھری صاحب ہی کو ملیں گے۔

مولانا حسرت تیرھواں حج کرکے آئے ہیں۔ کراچی جہاز سے اُترے اور وہاں ٹھہر کے لاہور کا رُخ کیا، لاہور میں صرف دو دن ٹھہرے اور ہندوستان چلے گئے۔ اب مولانا بہت ضعیف ہو چکے ہیں، لیکن دم خم وہی ہے، وضع میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ ٹوٹی ہوئی جوتی ہے، بے پُھندنے کی ٹوپی، دو میلے میلے بقچوں میں کچھ کتابیں ہیں، بستر پہ ایک میلی سی دری پھٹی ہوئی، قلی کو زیر بار نہیں کرتے، بستر کندھے پر رکھا، کتابیں بغل میں ماریں اور چل نکلے۔

اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ شخص جس کی درویشانہ وضع دیکھ کے قرونِ اولیٰ کے مسلمان یاد آجاتے ہیں، اس وقت، الٰہ آباد جیل میں چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن کر رہا تھا، جب ہمارے بڑے بڑے لیڈر ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اسے سیاسی لیڈری کی حیثیت سے نمود حاصل نہیں بلکہ اپنے زمانے کا وہ سب سے بڑا غزل گو بھی ہے، لیکن وہ یقیناً "بڑا آدمی" نہیں، کیونکہ ہماری لغت میں بڑا آدمی تو وہ ہے جو کوٹھی میں رہے، ٹیلیفون پہ بات کرے، کار پہ سوار ہو کے نکلے، اس کے آگے پیچھے خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا ہجوم ہو۔

مولانا حسرت موہانی، کوئی مکان، دکان یا فیکٹری الاٹ کرانے نہیں آئے تھے، وہ ہجرت کر کے پاکستان نہیں آنا چاہتے بلکہ ہندوستان میں رہ کے وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، راقم نے یہ بات اس لئے لکھ دی کہ جو لوگ الاٹمنٹوں کے چکر میں پڑے ہیں، انہیں کوئی اور وہم نہ ہو۔

۲۳ر اکتوبر

سُنا ہے، ہاورڈ یونیورسٹی پریس (امریکہ) کی جانب سے خان لیاقت علی خان کی تقریروں کا ایک مجموعہ شائع کیا جارہا ہے، جس کا نام "ایشیا کا دل" رکھا گیا ہے۔ پاکستان واقعی "ایشیا کا دل" ہے، لیکن امریکہ والوں کی دلبری اور دلستانی میں بھی کلام نہیں ؎

دلوں کے لینے کی آمادگی جو فرمائی
تو اشتیاق سے گھر میں بلا بلا کے لئے

اور ایک پاکستان ہی پر کیا موقوف ہے، کوریا شمال مشرقی ایشیا کا دل ہے، ہندچینی کو مشرقِ اقصیٰ کا دل کہہ لیجئے اور غالب کا یہ مصرعہ بار بار پڑھئے کہ ع

تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ملا غنیمت کنجاہی نے مثنوی نیرنگِ عشق میں دل کی خرید و فروخت کا ماجرا بڑے عجیب

انداز میں لکھا ہے جو اس شعر پر ختم ہو جاتا ہے ؎

بگفتا قیمتش، گفتم نگاہے
بگفتا کمتر ک، گفتم کہ گاہے

شعر تو خاصا پرانا ہے، لیکن موجودہ عہد کی سیاسیات میں دلستانی و دلبری کا جو طریقہ چل نکلا ہے، اس پر بہت حد تک چسپاں ہوتا ہے۔

عقل وخرد کا تعلق دماغ سے ہے اور عشق وجنوں دل سے تعلق رکھتے ہیں، گویا پاکستان کو ایشیا کا دل کہہ کے امریکہ والوں نے ہمارا "عاشقی پیشہ" ہونا تسلیم کر لیا۔ جو لوگ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی پر متعجب ہیں، انہیں اب کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ دل کے معاملات عقل کے دائرے سے باہر ہیں اور آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اہلِ خرد جسے مراد مندی اور کامرانی کہتے ہیں، وہ عاشقوں کے نزدیک ناکامی اور نامرادی ہے۔ محمد جان شاد لکھنوی نے کیا صحیح کہا ہے ؎

عقل کہتی ہے اِدھر آ کہ اُدھر سب کچھ ہے،
عشق اُدھر کو لئے جاتا ہے جدھر کچھ بھی نہیں

ان دنوں لاہور کے صرّافوں نے ہڑتال کر رکھی ہے، پولیس کا بیان ہے کہ صرّاف چوری کا مال خریدتے اور بیچتے ہیں۔ صرّاف کہتے ہیں کہ پولیس کی گیر و دار سے جان ضیق میں ہے، گویا ہڑتال ختم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ صرّافوں کو چوری کا مال خریدنے اور بیچنے کی اجازت دے دی جائے۔ افسوس کہ یہ صرّاف صرف سونے چاندی کو پرکھتے، خریدتے اور بیچتے ہیں۔ "نقد دل" کے صرّاف نہیں، ورنہ انہیں چوری کا مال بیچنے کی عام اجازت مل جاتی، کیونکہ "نقدِ دل" کو اڑا لینا ہرگز کوئی جرم نہیں، بلکہ دلبری کو تو ہمارے شعرا نے خداداد نعمتوں میں شمار کیا ہے ؎

تا دل کہ تواند تا جاں کہ تواند بُرد — دل بُردن و جاں دادن ایں ہر دو خداداد است

بہرحال پاکستان "اربابِ عشق" کا ملک ہے۔ جنہوں نے دماغ کو دل کے تابع کر رکھا ہے، اس لئے اگر لاہور کے صرّافوں کو چوری کا مال خریدنے اور بیچنے کی اجازت مل جائے، تو کیا حرج ہے۔ اگر "نقدِ دل" کے لین دین میں کوئی مضائقہ نہیں تو زر و سیم کی کیا حقیقت ہے ایسی باتوں کا خیال تو وہ لوگ کرتے ہیں، جو دل کو دماغ کا تابع سمجھتے ہیں اور یہاں معاملہ ہی برعکس ہے۔

۲۴ر اکتوبر

بعض اخبارات میں میاں محمد ممتاز دولتانہ کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جو انہوں نے ایک روایت کے مطابق پاک پٹن کے ایک "عظیم الشان اجتماع" میں ارشاد فرمائی، مگر پاک پٹن مسلم لیگ کے سکرٹری کا بیان ہے کہ دولتانہ صاحب پاک پٹن میں آئے ضرور تھے، لیکن صرف تھوڑی دیر ٹھہر کے چلے گئے، نہ یہاں کوئی جلسہ ہوا، نہ انہوں نے کوئی تقریر کی، حیرت ہے کہ اخبارات میں یہ غلط خبر کیسے چھپ گئی؟

لیکن پاک پٹن مسلم لیگ کے سکرٹری صاحب کو اس خبر کے چھپ جانے پر تعجّب کیوں ہے، یہ بات درست سہی کہ پاک پٹن میں نہ کوئی جلسہ ہوا، نہ اس جلسہ میں دولتانہ صاحب نے کوئی تقریر کی، لیکن انہوں نے جلسہ کرنے اور جلسہ میں تقریر کرنے کی نیّت تو ضرور کر رکھی تھی، اور انّما الاعمال بالنّیات۔ ممکن ہے، انہوں نے تقریر کا مسودہ پہلے ہی مرتب کر رکھا ہو، بدقسمتی سے وہ تقریر تو نہ کر سکے، لیکن یہ مسودہ غلطی سے اخبارات میں چھاپنے کے لئے بھیج دیا گیا اور لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ دولتانہ صاحب پاک پٹن تشریف لے گئے، وہاں جلسہ بھی کیا، تقریر بھی ارشاد فرمائی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ دولتانہ صاحب نے محض اس لئے پاک پٹن میں تقریر نہ کی ہو کہ وہ لاہور سے

اپنے ساتھ "حاضرین" لے جانا بھول گئے تھے۔ چونکہ "حاضرین" کے بغیر جلسہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے انہوں نے تقریر کا مسودہ، اخبارات میں چھاپنے کے لئے بھیج دیا اور بات ٹھیک بھی ہے، اگر سوءِ اتفاق سے "حاضرین" کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکا تو تقریر کیوں اشاعت سے محروم رہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ یہ تقریر نہیں محض بیان تھا، تقریر حاضرین کے بغیر نہیں ہو سکتی، لیکن بیان کے لئے اس قسم کی کوئی شرط نہیں، گویا اصل بات صرف اتنی ہے کہ دولتانہ صاحب نے اخبارات میں ایک بیان چھاپنے کے لئے بھیجا۔ جس پر پاک پٹن لکھا ہوا تھا۔ اخبارات نے غلطی سے سمجھا کہ یہ بیان نہیں تقریر ہے اور پاک پٹن کے جلسے میں کی گئی ہے۔

دولتانہ صاحب کے لئے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ جب تک "حاضرین" کا بندوبست نہیں ہوتا، وہ بیانات پر اکتفا کریں یعنی جلسے منعقد کر کے ان میں تقریریں کرنے کے بجائے ہر روز ایک بیان جاری کر دیا کریں، بیان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے جیب میں ڈال کے جہاں جی چاہے لے جایئے، لیکن "حاضرین" کو تو آپ جیب میں ڈال کے نہیں لے جا سکتے۔

بہر حال ہمیں تعجب ہے کہ سکرٹری صاحب مسلم لیگ پاک پٹن کو اخباروں میں اس قسم کا بیان چھپوانے کی جرأت کیسے ہوئی ؟ اگر پاک پٹن میں جلسہ نہیں ہو سکا، دولتانہ صاحب تقریر نہیں کر سکے تو یہ سراسر مسلم لیگ پاک پٹن کے سکرٹری کا قصور ہے، کیونکہ انہوں نے کافی تعداد میں حاضرین مہیا نہیں کئے۔

ہمیں اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں الکشن کے زمانے میں مسلم لیگ کو حاضرین کی فراہمی کے لئے ٹھیکہ نہ دینا پڑے، یوں یہ کام "امانی" طریق پر بھی ہو سکتا ہے لیکن ان دنوں ٹھیکہ کا رواج اتنا زیادہ ہے کہ مسلم لیگ کو بھی یہ طریقہ اختیار کرنے سے مفر نہیں۔ حاضرین کی فراہمی کے بارے میں اطمینان ہو جائے تو تقریر کرنا کیا مشکل ہے ؟

۲۷ راکتوبر

آج ایک اخبار نے خان لیاقت علی خان کے نام کے ساتھ لیاقتِ ملّت لکھا ہے، ہمارے نزدیک یہ خطاب کافی حد تک موزوں ہے اور اگر اس قسم کے خطابات کا سلسلہ چل نکلا تو بہت سے دوسرے حضرات کے خطابات تجویز کرنے میں بڑی آسانی ہو گی۔ ایک زمانے میں خان افتخار حسین (خان ممدوٹ) کو لوگ افتخارِ ملّت اور سردار شوکت حیات کو شوکتِ پنجاب کہتے تھے، ان خطابات کو تو اب سکّہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل نہیں لیکن "لیاقتِ ملّت" کے خطاب نے ہمیں یاد دلا دیا ہے کہ اس طرح کے اور خطابات بھی تجویز کئے جا سکتے ہیں، مثلاً دولتانہ صاحب کو "ممتازِ ملّت" اور صوفی عبدالحمید صاحب کو "صوفیِ ملّت" کہنے میں کیا حرج ہے اور بنیادی حقوق کی سفارشات کی منظوری کے بعد تو "ملّت" پر "دین" کا اضافہ بھی ہونا چاہئے، یعنی ہمیں چاہیئے کہ خواجہ ناظم الدین کو ناظم الملۃ والدین اور خواجہ شہاب الدین کو شہاب الملۃ والدین لکھا کریں، وقس علیٰ ہذا۔

ایک زمانے میں خواجہ حسن نظامی سال کے سال خطابات کی فہرست شائع کیا کرتے تھے، مثلاً اکبر الٰہ آبادی کو انہوں نے لسان العصر، علامہ اقبال کو ترجمانِ حقیقت اور مولانا راشد الخیری کو مصوّرِ غم کا خطاب دیا تھا اور یہ خطابات بہت مقبول ہوئے اور اگرچہ لوگ علامہ اقبال کے نام کے ساتھ اب ترجمانِ حقیقت نہیں لکھتے تاہم اکبر مرحوم اور مولانا راشد الخیری کے ناموں کے ساتھ اب بھی لسان العصر اور مصوّرِ غم بھی لکھے جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ پاکستان کے لیڈروں کے لئے خطابات تجویز کرنے کا کام خواجہ حسن نظامی کے سپرد کر دیا جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس کام کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے جس کے صدر خواجہ صاحب ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین جسے بعض لوگوں

نے سکندر سے منسوب کر دیا ہے، در اصل ایران کے بادشاہ سائرس کا لقب تھا اور اسے ذوالقرنین اس لئے کہتے تھے کہ وہ دو مملکتوں کا حکمران تھا۔ ہماری رائے میں خان لیاقت علی خان کو قائدِ ملت یا لیاقتِ ملت کے بجائے "ذوالقرنین" کیوں نہ کہا جائے اُنہیں تو کئی دُہری نسبتیں اور دُہرے اعزاز حاصل ہیں، وزیرِ اعظم اور وزیرِ دفاع کی حیثیت سے وہ پہلے ہی صاحبِ سیف وقلم اور اس مصرع کے صحیح مصداق ہیں کہ ؎

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را

اب تو اس پر ایک اور دُہری نسبت کا اضافہ ہوا ہے، یعنی وہ وزیر بھی ہیں اور لیگ کے صدر بھی، اس لئے وہ ذوالقرنین کہلائیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

۲۹ر اکتوبر

میاں عبدالباری نے اپنے استعفا میں لیگ کی برسرِ اقتدار جماعت کو "امیر معاویہ" کا "گروہ" کہا ہے۔ خان لیاقت علی خان اس معاملہ میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے، یعنی ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ پاکستان کی سہ سالہ ترقی کے معجزہ پر ایمان نہیں لائے، انہیں "ابوالہب" کہنا چاہیئے۔ خدا کرے کہ معاملہ یہیں تک رہے اور یہ قصہ ترقی کر کے معجزہ سے کن فیکون یعنی "نبوت" سے "الوہیت" تک نہ جا پہنچے۔

گالیاں دینے کے اور طریقے بھی ہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ گالی پر اسلامی تاریخ کا رنگ چڑھا کے اسے بالکل اسلامی تاریخ بلکہ یوں کہئے کہ "دشنام شریف" بنا لیا جائے، یعنی دشنام طرازی کا سلسلہ شروع ہو تو ابوالہب، ابوجہل، عبداللہ بن ابی سے قصہ شروع ہو کے ابن سعد، ابن زیاد اور شمر ذی الجوشن تک پہنچ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اُٹھے اور کہہ دے کہ میں مختار بن ابو عبیدہ ثقفی ہوں، یزیدیوں سے انتقام لینے آیا ہوں۔

پرانے زمانے میں بھی لوگ کبھی کبھی اس قسم کی حرکات کر گزرتے تھے، مثلاً نواب آصف الدولہ نے بھیلوں کے بن میں شیر کا شکار کیا، میرزا رفیع سودا ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ یہ خبر سن کے کہا ؎

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارا،
شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

آصف الدولہ کو معلوم ہُوا تو میرزا سے شکایت کی کہ یہ آپنے کیا کہہ دیا؟ میرزا نے جواب دیا، آخر شیر بھی تو خدا ہی کا تھا اور بات آئی گئی ہو گئی، لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص شیر کا شکار کرے، اسے ابن ملجم کہنا دھاندلی ہے۔ خان لیاقت علی خان نے بھی مخالفین کو ابولہب کہہ کے اسی قسم کی زیادتی کی ہے۔

معاصر احسان (کراچی) نے میاں عبدالباری اور ملک غلام نبی کو ملک نبی بخش لکھ دیا ہے، یہ اصل میں کراچی کی آب و ہوا کا اثر ہے، کیونکہ کراچی میں عام طور پر استعفیٰ دینے والے لیڈروں کے نام کے اخیر میں "بخش" ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً مولا بخش، الٰہی بخش اور رحیم بخش وغیرہ سب کے سب "مستعفی قسم" کے حضرات ہیں۔ وہ تو خیر گذری کہ میاں عبدالباری کے نام پر "بخش" کا اضافہ بہت بے جوڑ معلوم ہوتا تھا، ورنہ انہیں "باری بخش" بنا دیا جاتا، اور بات ٹھیک بھی تو ہے جو شخص لیگ سے استعفا دیتا ہے، یہی کہنا ہوا کہ بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی سہی، اس لئے ملک غلام نبی کو نبی بخش اور میاں عبدالباری کو "باری بخش" نہ سہی، "خدا بخش" تو ضرور کہنا چاہیئے۔

---

۶ نومبر

پچھلے دنوں خان لیاقت علی خان نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ جو لوگ پاکستان کی سہ سالہ ترقّی کے معجزہ پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ ابولہب ہیں، اس سلسلے میں ہمارے

ایک کرم فرما لکھتے ہیں :-

"کیا آپ کے نزدیک اس موقع پر معجزہ کا استعمال صحیح ہے اور کیا ہمارے محترم وزیرِ اعظم نے جس ترتیب کے ساتھ "معجزہ"، "ایمان" اور "ابو الھب" کا استعمال کیا ہے، اس سے تشابہ و تماثل مقصود نہیں!"

یقیناً اس موقع پر "معجزہ" کا استعمال قطعاً غلط ہے، لیکن اس معاملہ میں خان لیاقت علی خان کو ایک حد تک معذور سمجھنا چاہئیے، اُن کے ذہن میں انگریزی کا لفظ "مریکل" موجود تھا، جس کا ترجمہ عام طور پر "معجزہ" ہی کیا جاتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ "معجزہ" انبیا علیہم السلام سے مخصوص ہے اور "معجزہ" کے ساتھ ابو الھب کا ذکر آئے گا تو لوگ ان فقروں کا کیا مطلب سمجھیں گے۔

آج کل تو "معجزہ" کا لفظ اس کثرت سے جا و بے جا استعمال ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ صوفی عبدالحمید کا بیان معجزہ تھا اور دولتانہ صاحب نے سرگودھا اور میانوالی میں جو تقریریں فرمائی ہیں، وہ معجزات میں سے ہیں تو غالباً ان فقروں کو بھی چنداں قابلِ اعتراض نہ سمجھا جائے، لیکن آج سے پندرہ بیس برس پہلے "معجزہ" کا لفظ ایسے غلط موقعوں پر استعمال کیا جاتا تو اس پر ضرور بڑا پُرزور احتجاج ہوتا۔ کیونکہ مسلمان ہمیشہ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ اگر نبی سے خرقِ عادت کا ظہور ہو تو وہ معجزہ ہے۔ کسی نیک اور اللہ والے مسلمان سے کوئی غیر معمولی بات سرزد ہو، وہ کرامت ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر مسلم اس قسم کا کمال کر دکھائے تو اسے استدراج کہنا چاہئیے۔ صوفی عبدالحمید سے لے کے خان لیاقت علی خان تک تمام بزرگوں کی کرامات کے تو ہم قائل ہیں، لیکن خدا کے لئے "معجزہ" کو تو اپنے مالِ مقبوضہ میں شامل نہ کیجئے۔

۸ر نومبر

پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ خواجہ حسن نظامی انتقال کر گئے، ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا

کہ خواجہ صاحب اللہ کے فضل و کرم سے موجود ہیں، دلّی کے اخبار نے یونہی اُن کے مرنے کی خبر اُڑائی جو پاکستان کے بعض اخبارات میں بھی چھپ گئی، لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ خبر اُڑی کیسے، حال میں ہندوستان سے جو اُردو اخبارات آئے ہیں، انہوں نے یہ معمّہ بھی حل کر دیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے کہیں لکھ دیا تھا کہ میں مدّت سے بیمار چلا آتا ہوں، اس لئے اغلب ہے کہ ۱۰ محرم کو میرا انتقال ہو جائے۔ اخبار پرتاپ کے ایڈیٹر کی نظر سے خواجہ صاحب کی یہ تحریر گزر چکی تھی، اس نے سوچا کہ خواجہ حسن نظامی کبھی غلط بات نہیں کہتے، ۱۰ محرم کو یقیناً وہ اس عالمِ فانی سے کوچ کر جائیں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی اس پیش گوئی پر اعتماد کر کے اس نے ۱۰ محرم کو تحقیق کئے بغیر یہ اطلاع شائع کر دی کہ خواجہ حسن نظامی کا انتقال ہو گیا۔ حالانکہ خواجہ صاحب کی یہ پیش گوئی غلط نکلی، یعنی ۱۰ محرم کو ان کا انتقال نہیں ہوا اور خدا نے چاہا تو ابھی وہ مدت تک زندہ رہیں گے۔

اپنی موت کی پیش گوئیاں کرنا اور پھر اُن کا بار بار غلط نکلنا کچھ خواجہ حسن نظامی ہی پر موقوف نہیں، اُن کے ایک ہم وطن یعنی مرزا غالبؔ پر بھی یہ ماجرا گزر چکا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے مرنے کی پیش گوئی کی تھی بلکہ تاریخ تک نکال رکھی تھی، لیکن یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔ ایک بار دلّی میں وبا پھیلی، بعض لوگوں کو خیال گزرا کہ اب کے تو پیش گوئی ضرور درست ثابت ہو گی، لیکن عین وقت پر مرزا کی نیت بدل گئی، یعنی مرزا نے وبائے عام میں مرنے کو کسرِ شان سمجھا اور موت کے پنجے سے صاف بچ نکلا اور آپ جانتے ہیں کہ مرزا غالبؔ بھی اچھے خاصے ولی تھے، اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا غالبؔ کی ولایت میں تو لوگوں کو اور صرف دوسرے لوگوں ہی کو نہیں، خود مرزا غالبؔ کو اس لئے کلام تھا کہ وہ شراب پیتے تھے اور صوفی عبدالحمید صاحب صدر پنجاب مسلم لیگ کی ولایت اس لئے مشتبہ ہے کہ وہ لیگ کے صدر ہیں، ورنہ مسائل تصوف کے معاملہ میں صوفی صاحب مرزا غالبؔ سے پیچھے نہیں۔ اس کے علاوہ اگر مرزا غالبؔ کو اپنے بیان پر ناز تھا تو صوفی صاحب کو بھی اپنے "بیان" پر ناز ہے، افسوس کہ لیگ کی صدارت نے اُن کے سارے کمالات پر پانی پھیر دیا۔

۱۰ر نومبر

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ لاہور سے گھی بالکل غائب ہوگیا تھا۔ لوگوں نے بہت شور مچایا، اخباروں میں "تلاشِ گم شدہ" کے عنوان سے اشتہارات چھپے تو گھی عرف روغنِ زرد سلمہٗ کی صورت پھر نظر آئی، لیکن سچ پوچھئے تو یہ گھی وہ گھی نہیں تھا جو لاہور سے روٹھ کے چلا گیا تھا۔ چنانچہ آج کل جو گھی ملتا ہے۔ وہ اصل میں وائٹ آئل کی ذریت میں سے ہے، اس کے شجرۂ نسب میں مکھن، دہی یا دودھ کا نام کہیں نہیں آیا۔

گھی تو خیر گھی ہے، گیہوں کا آٹا جسے مولانا ابی قیبوس ولدلی ہمیشہ آردِ گندم لکھتے ہیں، دراصل گندم سے بہت تھوڑا تعلق رکھتا ہے، یعنی اس میں لکڑی کا برادہ، چنے کا آٹا، جو کا آٹا، اور نہ جانے کیا کیا ملایا جاتا ہے، یوں کہنا چاہیئے کہ آردِ گندم کا شجرۂ نسب بھی قابلِ اعتماد نہیں، پسی ہوئی ہلدی اور پسی ہوئی سرخ مرچ کا بھی یہی حال ہے، یعنی اُن میں پرانی اینٹیں پیس کے ملائی جاتی ہیں۔ جب سے اس صنعت نے ترقی کی ہے، لاہور میں پرانی اینٹیں کمیاب ہوگئی ہیں، شاہ عالمی دروازے کے اندر جو اینٹوں کے انبار نظر آتے تھے، وہ آہستہ آہستہ غائب ہوتے جارہے ہیں۔ گویا ان اینٹوں نے ہلدی کی گانٹھوں کی شکل اختیار کرلی ہے اور ان ہلدی کی گانٹھوں کے طفیل بہت سے حضرات پنساری بن بیٹھتے ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ کراچی میں خالص گھی میّسر ہے۔ خالص آٹا مل جاتا ہے اور ہلدی میں بھی کسی قسم کی آمیزش کی جاتی، کراچی میں بھی گھی کئی قسم کے تیلوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ آٹے میں لکڑی کا برادہ بھی یقیناً موجود ہوگا، لیکن کراچی والوں کو ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں، کیونکہ لاہور میں جو حادثہ گھی پر گزرا تھا، کراچی کے بعض حصوں میں قریب قریب وہی حادثہ پانی پر گذر گیا ہے۔ یعنی نل موجود ہے۔ لیکن اس میں پانی نہیں۔ بہتیرا گڑگڑا چکے، اخباروں میں اشتہار بھی دے کے دیکھ لیا، لیکن پانی ہے کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ لاہور والوں نے تو خیر وائٹ آئل سے گھی تیار کر لیا، لیکن کراچی والے اب تک کیمیائی ترکیب سے پانی بھی تیار نہیں کر سکے۔

۱۱ر نومبر

سُنا ہے، جنوبی افریقہ کی دو لڑکیاں لندن سے پیدل چلی ہیں اور سوڈان جا پہنچی ہیں۔ اُن کا ارادہ ہے کہ جنوبی افریقہ تک سارا سفر پا پیادہ ہی طے کیا جائے، یہ "خرامِ ناز" یا "گلگشت" نہیں بلکہ بہت لمبا سفر ہے جسے دخانی جہاز۔ موٹر یا ریل گاڑی پر طے کرنا پڑے تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔ اسی لئے تو آج کل کے مرزا منش لوگ اتنے لمبے سفر کے لئے ہوائی جہاز کو ترجیح دیتے ہیں۔

پا پیادہ سفر کے تذکرے میں ہمیں یاد آگیا کہ پیدل سفر کرنا الگ رہا، اس زمانے میں چند قدم چلنا بھی بڑی قدامت پسندانہ حرکت بلکہ افلاس کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ خوش حال لوگوں کا خیال ہے کہ چلنا انسان کا کام نہیں بلکہ صرف موٹریں چلتی ہیں، ریل گاڑیاں چلتی ہیں، یا پھر تانگے چلتے ہیں، انسان بھی چلنے لگے تو اس میں اور تانگے کے گھوڑے یا کولھو کے بیل میں کیا فرق رہا؟ یہ ٹھیک ہے کہ غریب لوگ جنہیں نہ موٹر میسّر ہے نہ تانگہ ابھی تک پیدل چلنے کو معیوب نہیں سمجھتے، لیکن ان لوگوں کی حرکات ہمارے آپ کے لئے سند نہیں۔

اکثر لوگوں کو شکایت ہے کہ پرانے زمانے کی بہت سی صنعتیں اور ہنر بالکل مٹ گئے، مثلاً ڈھاکہ کا شہر آج پہلے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، لیکن ڈھاکہ کی ململ کا نام و نشان مٹ گیا۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ بھی بعض چھوٹی موٹی صنعتوں کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے، لیکن یہ صنعتیں ہمارے دیکھتے دیکھتے بے نشان ہو گئیں۔ لیکن کسی کو خیال نہیں آتا کہ چلنا بھی ایک "ہنر" تھا، جو کسی شہر سے مخصوص نہیں تھا، لیکن آج یہ ہنر شہروں سے قریب قریب بالکل اٹھ گیا۔ صرف دیہات کی "غیر تعلیم یافتہ" اور "پس ماندہ آبادی" میں موجود ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہروں کے خوش حال لوگوں کو بھی کبھی نہ کبھی چلنا پڑتا ہے لیکن وہ بھی بالکل اس طرح جیسے عید، بقر عید کو جلا ہا پان کھا لیتا ہے۔ ڈرائنگ روم سے اٹھ کے کھانے کے کمرے میں چلے جانا یا خواب گاہ سے غسل خانہ تک کا فاصلہ طے کر لینا آخر چلنا تو نہیں۔ ڈرائنگ روم سے نکلنا، برآمدہ تک آنا اور پھر جھپاک سے کار میں جا بیٹھنا اچھی خاصی زحمت سہی لیکن "چلنا" اس کو بھی نہیں کہتے، جس چیز کو چلنا کہنا چاہیے، اصل میں ان لوگوں کو اس سے کبھی کبھار ہی سابقہ پڑا ہے۔

بعض لوگ کبھی کبھار چل لیتے ہیں کہ ڈاکٹر نے انہیں صبح شام چلنے کا مشورہ دے رکھا ہے۔ گویا ان کے نزدیک چلنے کی حیثیت دوا کی ہے، اگرچہ اس دوا کو کونین مکسچر کی طرح شیشی میں ڈال کے نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ ابھی تک "قرصِ رفتار" ہی ایجاد ہوئی ہے، پھر بھی یہ دوا کونین سے زیادہ کڑوی ہے۔ اس کا طریق استعمال یہ ہے کہ موٹر میں بیٹھ کے باغِ جناح تک تشریف لے گئے، موٹر کھڑی کر کے چند قدم چلے اور ہانپنے لگے۔

پیدل چلنے کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں، شیخ سعدی مرحوم ساری عمر پیدل چلتے رہے، آخری عمر میں پیدل چلنے سے توبہ کی اور فرمایا ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ خدمت ہزار جاں است

شکر ہے کہ چچا سعدی کی اس نصیحت پر ہمارے زمانے میں لوگوں نے عمل کرنا شروع کر دیا ہے یعنی شہروں سے تو چلنے کی رسم بالکل مٹتی جاتی ہے۔ البتہ دیہات کے لوگوں کو ابھی اس نصیحت پر عمل کرنے کی پوری طرح توفیق نہیں ہوئی۔

ہمیں یقین ہے کہ یہی کیفیت رہی تو کچھ عرصہ کے بعد نشستگاہ سے خوابگاہ یا کھانے کے کمرے تک پہنچنے کے لئے چلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی یعنی کوئی ایسا طریقہ نکل آئے گا، کہ نشستگاہ خود سرک کے خوابگاہ تک آجایا کرے گی۔ غسل خانہ تک جانے کی ضرورت پڑے گی تو بٹن دبا کے غسل خانے کو نشست گاہ میں بلا لیا جائے، یعنی چلنے کی رسم بالکل ہی اُٹھ جائے گی اور کسی شخص کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ چلتے وقت پہلے داہنا قدم اٹھانا چاہئے، یا بایاں قدم، یا دونوں قدم بیک وقت اٹھانا ضروری ہے۔ آج بھی شہروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ڈرائنگ روم میں تو دو قدم چل لیتے ہیں لیکن اُنھیں گھر سے باہر نکل کے چند قدم چلتے بھی شرم آتی ہے، اسی لئے تو کسی نے کہا ہے ؎

ہمیں گھر سے باہر نکلنا نہ آیا
چلے عمر بھر اور چلنا نہ آیا

۱۲ر نومبر

۸ر نومبر کو ریڈ کراس کے ہفتہ کے سلسلے میں جو مزاحیہ مشاعرہ ہُوا، اس میں راقم الحروف کو تو شرکت کا موقع نہیں ملا، البتہ اس کی روئداد کئی معتبر راویوں کی زبانی سنی ہے۔ ریڈ کراس کے ہفتہ سے اس مشاعرہ کو صرف اس قدر مناسبت تھی کہ بعض حضرات نے اس موقع پر شاعری کو صلیب دینے کی کوشش کی، لیکن اُردو شاعری ایسی سخت جان ہے کہ پھر بھی زندہ بچ رہی شکر ہے، یار لوگوں نے اس تقریب پر محفل منعقد نہیں کی، ورنہ شاعری کے ساتھ ساتھ

موسیقی بھی مصلوب ہو کے رہ جاتی۔

کہتے ہیں کہ ایک مہاجر شاعر صاحب آباؤ اجداد کے وطن سے ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے، تو ہر چند زخارفِ دنیوی کی کمی نہیں تھی، لیکن وہ اس بے سروسامانی کے ساتھ گھر سے نکلے کہ صرف ایک مصرع ؎

مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

جو بزرگوں کے تبرکات میں سے ہے اور سینکڑوں دیوانوں پہ بھاری معلوم ہوتا ہے، ان کی ساری کائنات تھا۔ شکر ہے، ان کی محنت ٹھکانے لگی، یعنی اس مصرع کو ریڈکراس کے مزاحیہ مشاعرہ میں مصرع طرح بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

آپ جانتے ہیں، مزاحیہ مشاعرہ بجائے خود اچھی خاصی مصیبت ہے۔ اس پر طرح کی قید آفت ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ "لٹھا نظر آتا ہے"، سے جو قافیہ پیمائی کا سلسلہ چلا تو "بیٹھا نظر آتا ہے"، پہ جا کے ختم ہوا۔ مصرعوں کو سبب، فاصلہ اور وتد سے ناپنے والے کہاں سے آتے، بزازوں نے طرح اور گرہ دونوں کو گز سے ناپا اور قافیہ پیما شاعر "لٹھا نظر آتا ہے"، پکارتے پکارتے بالکل "نین سکھ" بن کے رہ گئے۔

کہتے ہیں کہ اس مشاعرے میں مصرعے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے اور کہیں کوئی مصرع اٹھانے والا نظر نہیں آتا تھا، مشاعرہ کے منتظمین سے بھی ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے مصرع اٹھوانے کے لئے قلیوں کا انتظام بھی نہ کیا، حاضرین شعرا کے کلام سے زیادہ شعرا کی جانب متوجہ تھے اور اکثر اوقات شاعر کی صورت شکل، وضع قطع، لباس، پڑھنے کا انداز، لے، سُر، تان، گٹکری معرضِ بحث میں آجاتی تھی، اس لئے انہیں مصرع اٹھانے کی فرصت ہی نہ ملی۔ بعض اوقات تو سامعین شاعر اور شاعر کے کلام دونوں کو بھول کے قافیہ پیمائی شروع کر دیتے تھے۔ مثلاً ایک شاعر صاحب جن کی آواز خاصی پست تھی، اسٹیج پر تشریف لائے اور دو تین مرتبہ سر ہلا ہلا کے "نظر آتا نظر آتا ہے"

کہا، اتنے میں سامعین میں سے ایک صاحب نے اٹھ کے کہا ؎

آواز نہیں آتی چہرا نظر آتا ہے

اور محفل چمک اُٹھی۔

کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں تین چار شعرا کا کلام سرسبز ہوا، جن میں مجید لاہوری اور سیّد محمد جعفری قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں نور محمد چارلی تشریف لائے اور علم میں خلم کا پیوند لگا کے مشاعرہ کو کشتِ زعفران بنا دیا۔ جناب ظریف جبل پوری اس مشاعرہ میں شریک ہونے کے لئے کراچی سے تشریف لائے تھے، انہوں نے دو مرتبہ اپنا کلام سُنایا۔ لیکن دونوں مرتبہ رنگ نہ جما، پہلی مرتبہ تو انہوں نے اپنی مزاحیہ شاعری کا سکہ جمانا چاہا، یہ وار خالی گیا تو نقالی پر اُتر آئے، یعنی حفیظ جالندھری کی نقل اُتارنے کی کوشش فرمائی، لیکن افسوس ہے کہ شاعری کی طرح نقالی کی بھی داد نہ ملی۔

اس جلسہ کے صدر جناب فلک پیما تھے، انہوں نے اس موقع پر ایک تقریر بھی ارشاد فرمائی، لیکن بچارے فلک پیما ایک تو تقریر کے مردِ میدان نہیں، دوسرے وہ قافیہ پیمائی میں گھرے ہوئے تھے، اس لئے اکثر لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ تقریر لاہوتی تھی یا ناسوتی، فلکیات کے متعلق تھی یا زمین کے مسائل سے تعلق رکھتی تھی۔ بہرحال جب مشاعرہ ختم ہوا، تو بعض حضرات جن کے کان ابھی تک "کیا کیا نظر آتا ہے" اور "ننگا نظر آتا ہے" کی صداؤں سے بھرے ہوئے تھے، یہ سوچتے رہ گئے کہ یہ مشاعرہ ریڈکراس کے ہفتہ کے سلسلے میں تھا یا "سرمۂ مقوی بصر" کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔

۲۱ر نومبر

سرحد کے ایک جاگیردار مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں، مولینا نے جیل سے

نکلنے کے بعد جب ایک پریس کانفرنس میں جاگیرداری کی حمایت فرمائی تو خان صاحب پھولے نہ سماتے تھے۔ بار بار اپنے مصاحبوں سے کہتے تھے کہ ہمارے مولوی کو دیکھا کیا پتے کی باتیں کہتا ہے، خدا کی قسم اصل اسلام یہی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب مولینا مودودی نے جاگیرداری کی مخالفت میں ایک دو فقرے کہے تو جاگیردار بگڑ گئے، جس اخبار میں مودودی صاحب کی یہ تقریر چھپی تھی، اُسے غصے میں آ کے پھاڑ ڈالا، اہالیو موالیوں نے پوچھا، خان صاحب خیر باشد، آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟ کہنے لگے، "میں جس مولوی کا اتنا معتقد تھا، افسوس کہ آج وہ بھی کمیونسٹ ہو گیا۔"

یہ واقعہ ہمیں اس لئے یاد آ گیا کہ راجہ غضنفر علی خان نے لورینگز ہوٹل کی پریس کانفرنس میں جو باتیں کہی ہیں وہ کچھ اس قسم کی ہیں کہ صرف بعض حلقوں میں انہیں سخت ناپسند کیا جائے گا، خان لیاقت علی خان ان لوگوں کے خلاف فتوے دے چکے ہیں جو مسلم لیگ کو چھوڑ کے دوسری پارٹیاں قائم کر رہے ہیں۔ لاہور کے ایک اخبار کے مالک تو وزیراعظم پاکستان کی خدمت میں یہاں تک عرض کر چکے ہیں کہ حضور! یہ غدار جو آئے دن نت نئی پارٹیاں قائم کرا رہے ہیں، ان سب کو توپ دم کرا دیجئے لیکن راجہ غضنفر علی خان ہیں کہ ان لوگوں کو غدار سمجھنے کے بجائے سچا پاکستانی سمجھ رہے ہیں، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ان فتووں کا رُخ راجہ صاحب ہی کی طرف نہ پلٹ جائے۔ جہاں مولینا مودودی صاحب ایسے لوگ کمیونسٹ قرار دے دیئے گئے، وہاں راجہ غضنفر علی خاں یار لوگوں کے فتوے سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟

راجہ صاحب نے اس پریس کانفرنس میں بڑی مزے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کا ذکر آیا جو پاکستان کے قائم ہونے سے پہلے پاکستان کے قیام کے مخالف تھے تو راجہ صاحب نے فرمایا کہ اس قسم کے لوگ تو مرکزی وزارت میں بھی موجود ہیں اور یہی نہیں، راجہ صاحب پاکستان میں حزب مخالف کا وجود ضروری سمجھتے ہیں اور لیگ

کی مخالف پارٹیوں میں سے کسی کو غدار تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ بعض لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ جب راجہ صاحب اس قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، زمین کیوں نہ پھٹ گئی، بھونچال کیوں نہ آگیا، اور ینگز ہوٹل کی عمارت ابھی تک کیوں صحیح و سالم کھڑی ہے؟

دولتانہ صاحب کے حامی اخبار مولانا ظفر علی خاں کا یہ فقرہ بار بار دہرا رہے ہیں کہ پنجاب کا دل لاہور ہے اور لاہور کا دل موچی دروازہ۔ لیکن تعجب ہے کہ میاں ممتاز دولتانہ بھکر ہو آتے ہیں، جھنگڑ محلے کے مسلم لیگی کارکنوں سے ملنے تشریف لے جاتے ہیں، لیکن موچی دروازے نہیں آتے۔ حالانکہ اگر انہیں پنجاب کی دلبری کا دعویٰ ہے تو لاہور میں کوئی عام جلسہ منعقد فرمانا چاہئیے اور لاہور کی دلبری کا ارادہ ہے تو موچی دروازے کا رُخ کرنا چاہئیے۔

ہمیں تو یقین ہے کہ دولتانہ صاحب موچی دروازے میں جلسہ کر لیتے تو سچ مچ "دلبرِ پنجاب" بن گئے ہوتے۔

۲۲ر نومبر

ہمارے ایک معاصر نے راجہ غضنفر علی خان کی پریس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حزبِ مخالف کے تو ہم بھی قائل ہیں۔ اس قسم کی ایک جماعت تو ضرور ہونی چاہئیے، لیکن وہ ایسی جماعت نہ ہو جو پاکستان کے برسرِ اقتدار لوگوں پر اعتراض کرے رشوت ستانی اور اقربا پروری کے قصے بیان کرے، تحریر و تقریر کی آزادی چاہے سیفٹی آرڈی نینس کا تذکرہ لے بیٹھے۔

یہ بات ہمیں آج معلوم ہوئی کہ حزبِ مخالف درباری شاعروں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کا لیڈر ملک الشعراء کہلاتا ہے۔ مثلاً محمود کے دربار میں چار سو شعرا کی حزب مخالف موجود تھی، جس کے ارکان میں فرخی، منوچہری، عنصاری، اسدی بہت مشہور ہیں۔

عنصری ان کا لیڈر یعنی ملک الشعراء تھا۔ اصل میں الفاظ اور ان کے معنی زمانے کے ساتھ بدل جاتے ہیں، چنانچہ جن خیالات کو ادا کرنے کے لیئے زبان میں الفاظ موجود ہیں۔ ان کے لیئے بھی نئے نئے الفاظ تراشے جا رہے ہیں۔

کراچی میں عنقریب عظیم الشان مشاعرہ یا یوں کہئے کہ ایک "عظیم الڈان مشاعرہ" ہونے والا ہے، جس میں بڑے بڑے جغادری شعراء شریک ہوں گے۔ ہمارے خیال میں جو شعراء اس مشاعرہ میں شریک ہوں گے۔ انہی میں سے حزبِ مخالف مرتب ہو جانی چاہئے۔ سو دو سو شاعروں میں کم سے کم دس بیس تو ایسے نکل آئیں گے جو صرف قصیدہ ہی کہہ سکتے ہوں۔ غرض جیسا عظیم الڈان مشاعرہ ہے، ویسی ہی عظیم الڈان حزبِ مخالف بھی ہوگی۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کہتے ہیں، وہ عام طور پر تعمیری نکتہ چینی پر بڑا زور دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے تو لاہور اور کراچی کی سڑکوں، اندرون شاہ عالمی دروازہ کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں، مہاجرین کے جھونپڑوں کا ذکر بھی کر کے دیکھ لیا، اعتراض کرنے والے اسے بھی تخریبی نکتہ چینی ہی سمجھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر سرکار شاعروں کو جمع کر کے حزبِ مخالف بنانا چاہتی ہے تو اسے تعمیری نکتہ چینی کا کام پی، ڈبلیو، ڈی کے انجینروں کے سپرد کر دینا چاہئے۔

۲۳ر نومبر

ادھر کئی دن سے اخباروں میں اعلان ہو رہا تھا کہ مولانا اختر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار" ۲۰ر نومبر کو وائی، ایم، سی، اے ہال میں اپنے سفرِ انگلستان کا حال بیان کریں گے۔ ۲۰ر نومبر کو مولانا وقتِ مقررہ پر وائی، ایم، سی، اے ہال میں پہنچ گئے۔ جلسے کے منتظم اور صدرِ جلسہ اُن سے پہلے ہال میں پہنچ چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں "زمیندار" کا رپورٹر بھی پہنچ گیا اور یہ چاروں

بزرگ سامعین کا انتظار کرنے لگے۔ یہ حضرات کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، لیکن کسی اللہ کے بندے نے ہال میں جھانک کے بھی نہ دیکھا۔

مولانا اختر علی خاں چاہتے تو اس موقع پر اچھی خاصی تقریر کر ڈالتے، کیونکہ یہاں تو صدر سمیت کم از کم تین سامعین موجود تھے۔ ہمارے خیال میں یہ جلسہ نہیں تھا جلسے کا "ست" تھا، طبیب لوگ دواؤں کا جوہر اڑا لیتے ہیں، اس موقع پر جلسہ کا جوہر اڑا کے اسے اتنا مختصر کر دیا گیا کہ جی چاہے تو ڈبیا میں بند کر کے رکھ لیجئے۔

اصل میں لاہور کے لوگ بد ذوق ہوتے جاتے ہیں۔ مولانا اختر علی خاں ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں جیسے پرانے خادم ملّت کے فرزند ارجمند ہیں اور حال میں انگلستان کا سفر کر کے تشریف لائے ہیں، لوگ ان کی تقریر سننے نہ آئے تو کسی دوسرے شخص کو اہلِ لاہور سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ اس موقع پر صدارت کے لئے جن صاحب کو منتخب کیا گیا تھا، وہ بھی مشہور شاعر، ادیب اور بڑے ذہین و طبّاع بزرگ ہیں، لیکن تعجب ہے کہ لوگوں کو ان کے نام میں بھی کوئی کشش نظر نہ آئی۔

ہندوستان کے اخبار نویسوں کے فیڈریشن کے صدر رانا جنگ بہادر سنگھ سارے ایشیا کے اخبار نویسوں کی ایک انجمن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں انہوں نے بڑی کسر نفسی سے کام لیا ہے، انہیں ساری دنیا کے اخبار نویسوں کی انجمن قائم کرنا چاہیئے اور اگر مریخ میں بھی اخبار نویسی کا رواج ہے تو اس انجمن میں وہاں کے اخبار نویسوں کو بھی شامل کر لینا چاہیئے تاکہ لوگ آل انڈیا ورکنگ جرنلسٹس فیڈریشن کے صدر سے اتنا کہہ سکیں کہ ؎

تو کارِ جہاں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

معاصر "زمیندار" لکھتا ہے :۔

"عوامی مسلم لیگ نے کونسا اسلامی نظام پیش کیا ہے، جناح لیگ نے کونسی کتاب الآئین فتاوائے عالمگیری کے ماتحت مرتب کی ہے، میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات کہاں کے ملا علی قاری ہیں؟"

درست ارشاد فرمایا، لیکن یہ زبدۃ العارفین میاں محمد ممتاز دولتانہ یقیناً اس دور کے ملاحسین، واعظ کاشفی ہیں۔ اسی لئے تو وہ ابھی زود دن ہوتے عارف والا میں واعظ فرما چکے ہیں۔

---

۲۴ نومبر

"ڈان" کے ایڈیٹر مسٹر الطاف حسین کو اخبار نویسی کے کوچے میں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے، اس لئے وہ ایڈیٹر کے فرائض اور اس کی حیثیت کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ مثلاً اخبار میں جو مقالہ افتتاحیہ لکھا جاتا ہے، اس میں ایڈیٹر جا بجا "میں" کے بجائے "ہم" لکھتا ہے۔ مسٹر الطاف حسین کو یہ غلط فہمی ہے کہ اس "ہم" سے خود اُن کی ذات والا صفات مراد ہے اور انہیں بھی بادشاہوں کی طرح "ہم" یا "مابدولت" کہنے کا حق حاصل ہے۔

آپ کو یاد ہوگا، مسٹر الطاف حسین نے "ڈان" کا نام بدل کے "ہیرلڈ" رکھ دیا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ "ڈان" کے بجائے "ہیرلڈ" نام اخبار نکال لیا تھا۔ جب اس واقعہ پر شور مچا تو مسٹر الطاف حسین نے مجبور ہو کے "ہیرلڈ" کے بجائے پھر "ڈان" نکال لیا، اس موقع پر انہوں نے جو اعلان فرمایا، اس کے صحیح الفاظ ہمیں یاد نہیں، لیکن اُن کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے :۔

"لوگ "ڈان" مانگتا ہے، مابدولت ان کو "ڈان" واپس دیتا ہے۔"

آج ہمیں یہ باتیں عرض کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ حال میں مسٹر الطاف حسین نے نیوز کرانیکل کے نامہ نگار مسٹر نارمن کلف کی پاکستان دشمنی کے سلسلے میں ایک طویل مقالہ افتتاحیہ سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں اپنے سفر انگلستان اور نیوز کرانیکل کے ایڈیٹر سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے، اس میں بھی "ہم" اور "مابدولت" کی تکرار موجود ہے، حالانکہ اس مضمون میں بھی ذاتی تاثرات ہیں اور "ہم" سے مراد اخبار نہیں بلکہ خود مسٹر الطاف حسین کی ذاتِ گرامی ہے۔

مسٹر الطاف حسین اگر کوئے صحافت کی رسم وراہ سے آگاہ ہوتے تو اس مضمون کو مقالۂ افتتاحیہ کے طور پر ہرگز نہ چھاپتے بلکہ اسے علیحدہ مستقل مضمون کی حیثیت سے شائع کرتے اور اس پر اپنا نام لکھتے۔ بہرحال اس مضمون کا مقالۂ افتتاحیہ کے طور پر چھپ جانا اس اعتبار سے مفید ہے کہ اسے پڑھ کے "انانیت" کے معنی بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

---

۲۶ رنومبر

بعض اخباروں میں منٹگمری کے بعض تاجروں کے ایک وفد کا بیان چھپا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کی مخالف جماعتیں یقیناً مٹ جائیں گی۔ یہ بیان بڑے بڑے تاجروں سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں کسی کا نام نہیں بتایا گیا؛ تاہم اس کے غیر تاجرانہ انداز سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بیان سے لاہور، کراچی، منٹگمری، راولپنڈی ملتان بلکہ چوہڑکانہ کے کسی تاجر کو بھی ہرگز کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ کسی صاحب نے یہ بیان گھر میں بیٹھ کے گھڑ لیا ہے اور پھر اپنی ساکھ بڑھانے کے لئے اسے خواہی نخواہی منٹگمری کے تاجروں سے منسوب کر دیا ہے۔

ہم نے اس لئے اس بیان کو یار لوگوں کی گھڑنت کہا ہے کہ تاجر چاہے وہ لاہور کا ہو یا کراچی کا، پشاور کا، یا راولپنڈی کا، جو بات کہتا ہے وہ باون تولہ پاؤ رتی ہوتی ہے لیکن

اس بیان میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ "ٹکے سیر" کی قسم کی ہیں۔ یعنی یہ وہی مال ہے جو لیگ کی منڈی میں منوں بھرا پڑا ہے اور جسے تاجر تو تاجر راہگیر بھی آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے۔ اس مال کی کھپت نہ ملک کے اندر ہے نہ باہر، نہ وہ پاکستان میں فروخت ہو سکتا ہے، نہ دساوَر میں اس کی کوئی گنجائش ہے۔ اگر خدانخواستہ تاجر لوگ ایسے مال کی خرید و فروخت شروع کر دیں تو چند دنوں میں اُن کا دیوالہ نکل جائے۔

تاجر لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لیگ کا بازار اِن دنوں مندا ہے، نہ تھوک کا کوئی خریدار ملتا ہے نہ خوردہ مال کے گاہک دستیاب ہو سکتے ہیں اور تاجر تو وہی مال خریدے گا، جس کی بازار میں مانگ ہو۔ اس معاملہ میں دھونس نہیں چلتی۔ یعنی کوئی بیوپاری چاہے، وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جو مال لائے ہیں، وہ سب کو خریدنا ہی پڑے گا اور جو انکار کرے گا، اسے کولھو میں پلوا دیا جائے گا۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے، لوگوں کے جی میں آئے گا، خریدیں گے، ورنہ آپ چاہے جتنے جتن کر لیجئے آپ کا مال فروخت نہیں ہو گا۔

اور ایک تو یاد رکھئے کہ جو مال یار لوگوں نے گلی گلی پھر کے، شور مچا کے، ڈھول بجا کے بیچنا شروع کر دیا، اس کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔ لیگ سے بھی یہی غلطی ہوئی ہے، اس نے بھی خوانچے والوں کی طرح ڈھول بجا بجا کے "جو چیز اٹھاؤ پانچ آنے، پانچ آنے، پانچ آنے" کی صدا لگانی شروع کر دی ہے۔ اب کوئی راہ گیر اس داؤ میں آجائے تو اور بات ہے، لیکن تھوک مال کے تاجر تو اس قسم کا مال خریدنے سے رہے اور منٹگمری تو پاکستان میں غلّہ کی بہت بڑی منڈی ہے، وہاں کے تاجر "گندم نما جو فروش" قسم کے بیوپاریوں کے پھندے میں کیونکر آ سکتے ہیں۔

یہ سارا بیان قطعاً غیر تاجرانہ ہے۔ تاجر اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اگر وہ تجارت

کے معاملے میں اس قسم کی تنگ دلی برتنے لگیں تو پاکستان بھر میں صرف ایک ہی دکان باقی رہ جائے، کھوڑو صاحب اور ملک ممتاز دولتانہ اس پر قبضہ کرکے بیٹھ جائیں اور چودھری عبدالکریم، ملک لال خاں اور صوفی عبدالحمید کا یہ حال ہو کہ منیم بننے کے شوق میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں گز ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں پنسیری۔ غرض اس طرح تو اصول یہ ہوا کہ ایک لیڈر، ایک جماعت اور ایک دُکان۔

۲۷ر نومبر

ایک صاحب نے جن کے پاس کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ فالتو پڑا ہے، کچھ عرصہ ہوا، پارچہ بافی کا کام شروع کیا تھا، لیکن اس میں ناکامی ہوئی اور ریا پانچ دس ہزار روپے کھڈیوں پر ضائع ہو گئے، اور وہ بیچارے بیکار ہو کے گھر جا بیٹھے۔ پچھلے دنوں انہوں نے اخباروں میں پڑھا کہ مسلم لیگ نے انتخابی مہم شروع کر دی ہے، پنجاب بھر میں جلسے ہو رہے ہیں لیکن "حاضرین" نہیں ملتے۔ تجارت کا ایک پرانا اصول انہیں یاد تھا کہ جس مال کی مانگ زیادہ ہو، اس کی فراہمی اور فروخت کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کا ارادہ ہے کہ "ادارہ فراہمیٔ حاضرین" کے نام سے ایک فرم کھول لیں، کیونکہ ان کی رائے میں پورے پاکستان خصوصاً پنجاب میں سب سے زیادہ اسی مال کی کھپت ہے۔

یہ ادارہ قطعاً غیر سیاسی ہوگا اور اگرچہ اسے زیادہ تر مسلم لیگ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، لیکن دوسری جماعتیں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ جو جماعت اسے آرڈر دے گی، یہ ادارہ اسے "حاضرین" مہیا کر دے گا، لیکن آرڈر دیتے وقت اس بات کی تصریح کر دینا ضروری ہے کہ کس قسم کے حاضرین چاہئیں؟ جلسہ کب ہوگا اور کہاں؟ "حاضرین" مقامی ہوں یا باہر سے بھیجے جائیں، مختلف قسم کے "حاضرین" کے لئے شرح اُجرت مختلف ہے، چوتھائی رقم آرڈر کے ساتھ بھیجی جائے،

اور باقی جلسہ ختم ہونے پر ادا کر دی جائے، چک قبول نہیں کئے جائیں گے۔" ادارۂ فراہمی حاضرین" اور مسلم لیگ یا دوسری کسی جماعت کے مابین جو خط و کتابت ہو، اسے پوشیدہ رکھا جائے گا، اور یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی جائے گی کہ جلسے میں جو لوگ شریک ہیں، وہ "ادارہ فراہمی حاضرین" نے مہیا کئے ہیں یا مقرّروں کے ناموں کی کشش انہیں جلسے میں کھینچ لائی ہے۔

"ادارۂ فراہمی حاضرین" اکّا دکّا جلسوں کیلئے بھی حاضرین فراہم کر سکتا ہے اور اگر کوئی جماعت چاہے کہ اس سے مستقل طور پر معاہدہ کرے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً ایک جماعت کو اپنے مختلف جلسوں کے لئے دو لاکھ حاضرین کی ضرورت ہے تو اس کے لئے سب سے آسان صورت یہ ہے کہ "ادارہ فراہمی حاضرین" کو بعیانہ کے طور پر ایک رقم ادا کر دے، اسے دو لاکھ حاضرین دو دو ہزار اور پانچ پانچ ہزار کی قسطوں کی صورت میں بہم پہنچا دیئے جائیں گے۔ فرض کیجئے اسے عارف والا یا بھکر میں جلسہ کرنا ہے تو "ادارہ فراہمی حاضرین" کو جلسے سے چھتیس گھنٹے پہلے یا تار دے دینا کافی ہے کہ اتنے حاضرین بھجوا دو۔ اگر تار میں تصریح کر دی جائے کہ حاضرین سب کے سب بہرے ہوں جو تقریریں نہ سن سکیں، البتہ موقع بہ موقع نعرے لگاتے جائیں تو اس کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے؛ لیکن بہرے حاضرین سو سے زیادہ فراہم نہیں کئے جا سکتے۔

جلسوں کو گرمانے کے لئے ایسے لوگوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو خاص خاص موقعوں پر "اللہ اکبر" اور "زندہ باد" کے نعرے لگائیں۔ ایک زمانے میں بعض مجالس نے اس فن کے بڑے بڑے استاد جمع کر رکھے تھے جنہوں نے یہ مہارت بہم پہنچا لی تھی کہ صرف نعروں سے گرمئ محفل کا سامان مہیا کر دیتے تھے۔ جلسے سے پہلے باقاعدہ ریہرسل ہوتی تھی جس میں حضرات مقررین کرام اور یہ لوگ موجود ہوتے تھے، اور یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ تقریر کے دوران میں کس کس موقع پر کون کونسا نعرہ لگایا جائے۔ جلسہ شروع ہوتا تھا تو یہ مشاق استاد جلسہ گاہ میں خاص خاص مقامات پر جا کھڑے ہوتے تھے اور نعروں

کی بدولت حاضرین پر عجب کیفیت طاری کر دیا کرتے تھے۔ ادارۂ فراہمی حاضرین" اس قسم کے بہت سے اساتذہ فن کی خدمات حاصل کر سکتا ہے۔ کسی مجلس کو اگر ان کے کمالات سے فائدہ اٹھانے کی حاجت پیش آئے تو ادارۂ مذکور سے گفتگو کرے، لیکن آرڈر ذرا سوچ سمجھ کے دینا چاہیئے، ان "انجمن آرا" اور "ہنگامہ افگن" حضرات کی شرح اجرت بہت زیادہ ہے۔ جتنے روپوں میں دس استاد آتے ہیں اتنے میں دو ہزار حاضرین مہیا ہو جاتے ہیں۔

اس فرم کے انتظامات ابھی مکمل نہیں ہوئے مختلف شہروں میں شاخیں نہیں کھلیں ایجنٹ مقرر نہیں ہوئے، صرف ابتدائی انتظامات کا مرحلہ طے ہوا ہے، لیکن یقین ہے کہ جب اس کے انتظامات کی تکمیل ہو چکی تو وہ پاکستان میں حاضرین فراہم کرنے کی سب سے بڑی فرم کی حیثیت حاصل کرے گی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی دکانیں پہلے بھی ہر شہر میں موجود ہیں، لیکن کہاں وہ چھوٹی چھوٹی دکانیں جو خاص خاص جماعتوں سے وابستہ ہیں اور کہاں یہ عظیم الشان فرم جو چھتیس گھنٹے کے نوٹس پر چالیس پچاس ہزار حاضرین "یک مشت" فراہم کر سکتی ہے۔ یہ فرم خوردہ مال بھی بیچے گی، لیکن زیادہ تر وہ تھوک مال فراہم کرے گی اور فرمائش پر پانچ پانچ دس دس ہزار حاضرین کی کھیپ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچا دے گی۔

اس فرم کا ارادہ ہے کہ حاضرین کی بہم رسانی کے کاروبار کے ساتھ ساتھ الیکشن لڑنے والی جماعتوں کی دوسری ضرورتیں بھی پوری کر دے۔ مثلاً دیگیں، شامیانے، تنبو خیمے، کمبل، لحاف، پوسٹر اور اشتہار لکھنے والے، خوش الحان واعظ وغیرہ اس میں "ہر جنس" کا نرخ الگ الگ ہے۔ پھر ہر جنس کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً جس طرح گیہوں کی قسم "وڈا" ہے، اس طرح واعظوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے، جو بہت سستی ہے اور اس لحاظ سے اسے بھی "وڈا" کہہ لیجئے، اسے جہاں چاہے استعمال کیجئے، واعظ کی قسم اعلیٰ شاخ زعفران

کی طرح بہت مہنگی ہے۔

۲۸ر نومبر

پنجاب مسلم لیگ کی جانب سے پوسٹروں اور اشتہاروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کا انداز کچھ اس قسم کا ہے۔

"نقالوں سے ہوشیار رہو، اصلی لیگ مارکہ گھی خریدو، لیگ کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کے بہت سی نقلی لیگیں بھی پیدا ہو گئی ہیں، مال خریدنے سے پہلے لیبل پڑھ لیا کرو، اصلی اور "وڈی" لیگ یہی ہے"

جلتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے
"بیمار لیڈروں" کا یہی ہسپتال ہے

افسوس کہ گزشتہ پچیس سال سے اشتہار بازی کے فن نے کوئی ترقی نہیں کی۔

کلکتہ کی بخشی اینڈ کمپنی کی طرف سے ایک زمانے میں سندری سہاگ کا اشتہار اخباروں میں شائع ہوا کرتا تھا جس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا:

تیلوں میں کونسا تیل سب سے اچھا ہے	سندری سہاگ تیل
کونسا تیل بالوں کو لمبا کرتا ہے	سندری سہاگ تیل
کونسا تیل خوشبو میں سب تیلوں سے بہتر ہے	سندری سہاگ تیل
کونسا تیل دماغ کو تقویت پہنچاتا ہے	سندری سہاگ تیل

ہمیں یاد ہے، یونینسٹ پارٹی نے اپنی انتخابی مہم میں اسی اشتہار کی نقل اتاری تھی اور یونینسٹ پارٹی ایک طرف رہی، اب تو لیگ کے پوسٹروں کا ڈھنگ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا جا رہا ہے۔

وہ کونسی جماعت ہے جو قوم کی سچی خادم ہے	مسلم لیگ

وہ کونسی مجلس ہے جس نے پاکستان قائم کیا — مسلم لیگ
کونسی جماعت ہے جو ساری جماعتوں سے زیادہ قوی ہے — مسلم لیگ

اس کے معنی یہ ہیں کہ "لیگ کے ہمدرد" جب تک اسے بالکل "سندری سہاگ" بنا کے نہیں رہیں گے، انہیں چین نہیں آئے گا۔

ان اشتہاروں اور پوسٹروں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ لیگ کے لیڈر تو کچھ اور کہے جا رہے ہیں اور اشتہاروں کا مضمون کچھ اور ہے۔ بس وہی معاملہ ہو گیا ہے کہ "من چہ سرائم و طنبورۂ من چہ می سراید" مثلاً دولتانہ صاحب تو ایک دو جلسوں میں صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ لیگ سے واقعی بڑی بڑی غلطیاں ہوئی ہیں، اب کے ہمیں معاف کر دیجئے، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی اور جماعت اسلامی کے خلاف لیگ کی جانب سے جو اشتہار شائع ہوا ہے، اس کے اخیر میں یہ حدیث نقل کر دی گئی ہے کہ "مومن ایک سوراخ سے دوبارہ ڈنک نہیں کھاتا" مسلمان یہ اشتہار پڑھ کے کہہ رہے ہیں کہ آخر ہم لیگ کے سوراخ سے دوسری بار کیوں ڈسے جائیں۔

بت خانۂ جبیں سہی تر امگر؟
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

پروپیگنڈے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو لیگ نے اختیار کر رکھا ہے یعنی اخباروں میں اشتہار چھپ رہے ہیں، دیواروں پہ پوسٹر چسپاں کئے جا رہے ہیں، لیکن ایک طریقہ اور بھی ہے جو فلم والوں میں بہت مقبول ہے، یعنی ڈھول تاشے کے ساتھ جلوس نکلتا ہے، ٹانگے یا موٹر میں مائیکروفون ہے اور ایک شخص منادی کرتا جاتا ہے، کچھ لوگ لمبی لمبی کاغذی ٹوپیاں پہنے ساتھ ساتھ ہیں۔ یوں تو اس قسم کے جلوس نکالنے کی ممانعت ہو چکی ہے لیکن لیگی لیڈر کوشش کریں تو انہیں پرمٹ مل جائے گا اور گلی کوچے اس صدا سے گونج اٹھیں گے "خلقت خدا کی، ملک لیگ کا، حکم سرکار کا اور یہ حکم ہے کہ مسلم لیگ ...."

۲۹ نومبر

کوئی دو برس ہوئے۔ کرنل الٰہی بخش نے جو میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں اور مرحوم قائدِ اعظم کے مرض الموت کے زمانے میں ان کے معالج رہ چکے ہیں، ایک کتاب لکھی تھی جس میں قائدِ اعظم کی زندگی کے آخری زمانے کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ اس کتاب کو چھپے ہوئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، لیکن اب تک اس کی فروخت کی نوبت نہیں آئی۔ ایک زمانے میں اس کے چند نسخے بعض کتاب فروشوں کے ہاں نظر آ جاتے تھے، لیکن اب بازار میں ایک نسخہ بھی نہیں ملتا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگوں کو یہ کتاب پسند نہیں آئی۔ کرنل الٰہی بخش کی کتاب صرف موضوع کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی بہت دلچسپ ہے، اس لئے اس کی اشاعت کا مناسب انتظام ہوتا تو اس کے جتنے نسخے شائع ہوئے ہیں، ہاتھوں ہاتھ بک جاتے، لیکن مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ میڈیکل کونسل کو کرنل الٰہی بخش کی یہ حرکت پسند نہیں آئی، کیونکہ قاعدہ کے رو سے کوئی ڈاکٹر نہ تو اشتہار دے سکتا ہے، اور نہ اپنا پروپیگنڈے کا کوئی اور طریقہ اختیار کر سکتا ہے اور میڈیکل کونسل کا خیال ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچی تو کرنل صاحب کا پروپیگنڈا ضرور ہو گا اور لوگ یقیناً ان کی جانب رجوع کریں گے۔ اس لئے کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی ہے اور لوگ قائدِ اعظم کے زندگی کے آخری دنوں کے حالات سننے سے اس لئے محروم رہ گئے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف ایک ڈاکٹر ہے۔

میڈیکل کونسل ڈاکٹروں کے احتساب کے معاملے میں عام طور پر بڑی سختی برتتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی ڈاکٹر سے ناراض ہیں اور اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ میڈیکل کے محکمہ کے افسروں سے اس ڈاکٹر کی شکایت کیجئے یا اخباروں میں اس کے

خلاف مراسلے چھپوا لیتے ہیں۔ بیچارے ڈاکٹر سے انتقام لینے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تعریف میں ایک آدھ مراسلہ کسی اخبار میں چھپوا دیجئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میڈیکل کونسل جو ایسے معاملات میں بڑی چوکس ہے۔ بس اتنی سی بات میں پنجے جھاڑ کر ڈاکٹر کے پیچھے پڑ جائے گی، اب وہ بیچارا ہزار کہے کہ میرا اس مراسلے سے کوئی تعلق نہیں، میں نہ مراسلہ نگار کو جانتا ہوں، نہ اخبار کے ایڈیٹر سے میری واقفیت ہے اور نہ مجھے اخباروں میں اپنی تعریف چھپوانے کا شوق ہے، اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا، اور اسے اس مراسلے کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ آج کل یہ حال ہے کہ جب کوئی ڈاکٹر کسی اخبار نویس کا علاج کرنا شروع کرتا ہے تو اس سے صاف صاف یہ کہہ دیتا ہے کہ دیکھئے صاحب کہیں اپنے اخبار میں میری تعریف نہ کر دیجئے گا، بہتر تو یہ ہے کہ اخبار میں میرا نام ہی نہ آنے پائے۔

کرنل الٰہی بخش اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ ان کی کتاب کے جتنے نسخے کتاب فروشوں کے ہاں موجود ہیں وہ واپس منگوا لئے جائیں گے اور آئندہ اس کتاب کا ایک نسخہ بھی کسی شخص کے ہاتھ فروخت نہیں کریں گے، اس لئے میڈیکل کونسل کو مطمئن ہو جانا چاہئے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس قضیئے کی خبر جس طرح اخباروں میں چھپی ہے، اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کرنل الٰہی بخش قائدِ اعظم کے معالج رہے ہیں، گویا اخبار والوں نے یہ خبر شائع کر کے ایک اور مقدمہ کھڑا کر دیا، خبر کے چھپ جانے سے کرنل صاحب کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے اور اس قسم کا پروپیگنڈا جرم ہے۔

راقم الحروف نے "حرف وحکایت" میں کرنل الٰہی بخش کی کتاب کا ذکر تو کر دیا، لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں میڈیکل کونسل اس تذکرے کو بھی ان کا پروپیگنڈہ نہ سمجھ لے اور وہ بیچارے اس جرم میں دھر نہ لئے جائیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف کو نہ تو کرنل الٰہی بخش سے شرفِ نیاز حاصل ہے، نہ میں نے کبھی ان سے علاج کرایا، اور تو اور راقم کو ان سے کوئی پرخاش بھی نہیں۔

۳۰ر نومبر

پاکستان کی پارلیمنٹ میں خان لیاقت علی خاں نے فرمایا ہے کہ "مصر سے ہمارا براہِ راست کوئی تعلق نہیں" بات صحیح بھی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو مصر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، ہمارا تعلق کوریا سے ہے، ہمارا تعلق کوریا سے ہے۔ فارموسا سے ہے، برما سے ہے، جو لوگ خواہی نخواہی مصر سے تعلق جتا رہے ہیں، وہ افتراق پسند ہیں اور پاکستان کی تخریب کے درپے ہیں، یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ع

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

اب اگر اس "کلاہِ کج" کا رُخ کوریا کی جانب ہے تو ہمارا رُخ بھی اسی طرف ہونا چاہئے۔

مصر کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ پُرانے زمانے میں اس ملک کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔ ایک فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کے لئے بھیجے گئے تھے، جب اس کی سرکشی اور نافرمانی میں کوئی فرق نہ پڑا تو اللہ نے اسے بحیرۂ قلزم میں غرق کر دیا۔ لیکن اتنی سی بات سے مصر کے ساتھ ہمارا تعلق تو ثابت نہیں ہوتا اور تعلق ہے بھی تو براہِ راست ہرگز نہیں، پہلے حضرت موسیٰ کے ذریعے تھا اور اب حضرت عیسیٰ کے ذریعے ہے

ایک زمانے میں جب چینی کا رواج نہیں ہوا تھا اور لوگ گڑ۔ کھانڈ اور شکر پر گذارہ کرتے تھے، مصر سے ایک قسم کی قند آتی تھی جسے ہم مصر کی مناسبت سے مصری کہتے تھے، کچھ عرصے کے بعد ہمارے ہاں بھی مصری بننے لگی۔ لیکن اب مصری کا رواج اٹھ گیا ہے، چائے میں چینی پڑتی ہے، مٹھائیاں بھی اسی سے بنتی ہیں اور چینی کے سارے کارخانے چیانگ کائی شیک کے قبضے میں ہیں اور اس کی تجارت امریکہ کے ہاتھ میں ہے گویا ع

خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

پھر مصر سے ہمارا کیا تعلق باقی رہ گیا؟

مصر سے زیادہ سے زیادہ ہمارا صرف اس قدر تعلق ہے کہ لاہور کے ایک محلے کا نام مصری شاہ ہے، لیکن ایک محلے کا نام پاکستان کی مرکزی حکومت کی پالیسی پر کیسے اثر انداز ہو سکتا ہے اور یہ تعلق بھی تو براہِ راست نہیں بلکہ لاہور کے ایک محلے کی وجہ سے ہے، مرکزی حکومت چاہے تو کوریا اور برما کے نام پر بیسیوں محلے آباد کر سکتی ہے اور نئے محلے آباد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے، بندر روڈ کا نام کوریا روڈ اور نیپیر روڈ کا نام برما روڈ رکھ دیا جائے تو بچارے مصری شاہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

آپ شاید اس موقع پر کہیں گے کہ ہم بھی مسلمان، مصر کے لوگ بھی مسلمان، پھر مصر سے اتنی بے تعلقی کیسی؟ چلیئے آپ کی خاطر مان لیا کہ اسلام کے توسط سے ہمیں مصریوں سے ایک گونہ تعلق ہے، لیکن یہ تعلق بھی تو براہ راست نہیں۔ ہمیں اسلام سے تعلق ہے، اور مصریوں کو بھی اسلام سے تعلق ہے، پس ثابت ہوا کہ ہمیں مصریوں سے ضرور تعلق ہے گویا اس تعلق کو ثابت کرنے کے لئے اچھی خاصی منطق لڑانی پڑتی ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ آپ چاہے کعبے کے راستے مصر پہنچیں، چاہے لندن کی راہ سے قاہرہ تشریف لے جائیں، خان لیاقت علی خان نے جو بات کہی ہے، وہ تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ مصر سے براہِ راست ہمیں کوئی تعلق نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مصر تک جانے کے لئے ہمیں ذریعے اور وسیلے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور بڑے لمبے لمبے چکر کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ لیکن کوریا تک تو سیدھی جرنیلی سڑک چلی جا رہی ہے جس میں نہ کوئی پھیر ہے نہ موڑ، نہ کوئی ندی نالہ ہے نہ کبھی سیلاب ہی آیا ہے جو سڑک کے بعض حصوں کو بہا لے گیا ہے۔

یکم دسمبر

سُنا ہے، گجرات میں جلسہ سے پہلے لیگ کے خاص خاص کارکنوں اور گجرات کے

سربرآوردہ اور ممتاز لوگوں کا ایک اجتماع ہوا، جس میں حاضرین "چندہ" کے طور پر طلب کئے گئے۔ گجرات کے ایک "مخیر" بزرگ شفیع شاہ صاحب نے فرمایا، میں "دس حاضرین" پیش کروں گا۔ نواب زادہ مہدی صاحب نے کہا، میری جانب سے تیس "حاضرین" قبول فرمایئے۔ بسال قبیلہ کے اس صاحب نے جو موقع پر موجود تھے، چالیس "حاضرین" پیش کئے۔ غرض اس اجتماع کے شرکا میں سے تمام اصحاب نے حسبِ مقدور "حاضرین" کی صورت میں "چندہ" پیش کیا، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

عربی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جو ہیں تو جمع، لیکن اُردو میں بعض مقامات پر واحد استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اولیا، ولی کی جمع ہے، لیکن اسے واحد بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ "مہاجرین" مہاجر کی جمع ہے۔ لیکن ہم نے بڑے بڑے بزرگوں کی زبانی یہ فقرہ سُنا ہے کہ "ایک مہاجرین سے میری ملاقات ہوئی"۔ یہی حال "حاضرین" کا ہے۔ ایک لیگی لیڈر نے پچھلے دنوں ایک شخص سے پوچھا "تم مہاجرین ہو؟" جواب ملا "نہیں میں "مہاجرین" تو نہیں، البتہ لیگ کے جلسوں کا ایک حاضرین ضرور ہوں"۔

کچھ عرصے کے بعد دیکھ لیجئے گا کہ "حاضرین" کو پیشوں میں شمار کیا جائے گا اور تمسکوں میں اس قسم کے فقرے نظر آیا کریں گے "منکہ قدرت اللہ ولد حشمت اللہ قوم نجار پیشہ حاضرین . . . الخ۔

جو لوگ اسمبلیوں کے ممبر بن جاتے ہیں، انہیں اپنے ووٹروں کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے ہیں، کوئی کہتا ہے تحصیلدار سے میری سفارش کر دیجئے، کوئی تھانہ دار کے نام سفارشی خط چاہتا ہے۔ اب ووٹروں کی طرح "حاضرین" بھی لیگی لیڈروں کو پریشان کیا کریں گے، لیڈر پوچھے گا۔ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟ "حاضرین" جواب دے گا، میں آپ کے جلسے کا "حاضرین" ہوں، آپ کو یاد نہیں رہا، منٹگمری کے جلسے میں سب سے پہلے میں نے ہی "زندہ باد" کا نعرہ لگایا تھا اور بیچارے لیڈر کو سر جھکا کے کہنا پڑیگا کہ

گہ بر سرو چشمِ من نشینی
نازت بہ کشم کہ حاضرینی

۴ر دسمبر

پرانے زمانے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ کسی کا ہاتھ چلتا ہے اور کسی کی زبان یعنی کمزور آدمی جب اپنے حریف کو ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتا تو گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے، لیکن اس زمانے میں یہ حال نہیں۔ امریکہ پٹتا ہے تو گالیاں دینے کے بجائے ایٹم بم پھینکنے کی دھمکی دیتا ہے، گویا ایٹم بم گالی کا قائم مقام بن کے رہ گیا ہے۔

کوریا میں ان دنوں عجیب تماشا ہو رہا ہے۔ میکارتھر[۱] صاحب برابر پٹتے چلے جا رہے ہیں، ٹرومین صاحب اسے یہ کہہ کے تسلی دے رہے ہیں کہ میرے لال تو فکر نہ کر، میں اب ایٹم بم پھینکے بغیر نہیں رہوں گا۔ اور ساری دنیا سمجھا رہی ہے کہ اجی بڑے صاحب جانے بھی دیجئے، کہیں سچ مچ ایٹم بم ہی نہ مار بیٹھے گا۔ ہمارے خیال میں ٹرومین صاحب کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر انھوں نے ایٹم بم استعمال کیا تو ان کی بڑی ہیٹی ہوگی، یعنی ساری دنیا یہی کہے گی کہ واہ چینیو! تمہارا کیا کہنا، ایسا رگیدا، ایسا رگیدا کہ بس امریکہ والے چیں بول گئے اور آخر کار ایٹم بم پر اُتر آئے۔

پچھلے دنوں سیاسی لیڈروں نے ایک دوسرے کو "تاریخی اور" "اسلامی" گالیاں دینی شروع کی تھیں۔ اب گالیوں کا انداز بدل گیا ہے، مثلاً حال میں دولتانہ صاحب نے لیگ کے مخالفین کو "گدھ" کہا ہے۔ اگر دوسری طرف سے بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا، یعنی اسی طرح چڑیماروں کی زبان میں گالیاں دی جانے لگیں تو "میدانِ سیاست" اچھا خاصا چڑیا گھر

---

[۱] امریکی سپہ سالار جنرل ڈوگلس میکارتھر

بن کے رہ جائے گا، کیونکہ صرف گدھ ہی نہیں، بہت سے دوسرے جانور بھی ایسے ہیں جن سے اس "مبادلہ دشنام" میں خاصا کام لیا جا سکتا ہے۔

لیگ نے جو پبلسٹی کا محکمہ قائم کر رکھا ہے، اسے چاہئے کہ ان جانوروں کی ایک فہرست مرتب کر کے پیش کر دے تاکہ لیگی لیڈروں کو گالی دیتے وقت دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یہ فہرست گالی دینے کے ہی کام نہیں آئے گی بلکہ اس سے قصیدہ طرازی کا بھی کام لیا جا سکتا ہے، مثلاً کھوڑو صاحب کو اگر "شیر بیشۂ سیاست" اور دولتانہ صاحب کو "ہمائے اوجِ سعادت" کہہ دیا جائے تو یہ ہجو تھوڑے ہی ہے مدح ہے، یہ اور بات ہے کہ ہُما بھی ہڈیاں ہی کھاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مختلف جانوروں مثلاً شیر، شہباز، عقاب، تدرو، زاغ، کرگس، شغال، روباہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ بعض خاص خاص موقعوں پر اقبال کے کلام سے بھی کام لیا جائے۔

ایک مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک علامہ اقبال کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اثنائے گفتگو میں کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب میں چاہتا ہوں "علامہ اقبال کے جانور" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ڈالوں" علامہ مرحوم نے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" سالک صاحب کہنے لگے "آپ نے اپنے کلام میں جا بجا مختلف جانوروں کا ذکر کیا ہے، میں ایک مضمون لکھ ڈالنا چاہتا ہوں، جن میں ان سب کا ذکر آ جائے گا" علامہ نے فرمایا "بہت اچھا خیال ہے"

افسوس کہ سالک صاحب کو آج تک یہ مضمون لکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ بہرحال آج کل بہت اچھا موقع ہے، مضمون کیا "اقبال کے جانورستان" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھ ماریں اور اسے پنجاب کے سیاسی لیڈروں کے نام معنون کر ڈالیں۔

پچھلے دنوں سے اس قسم کی خبریں اُڑ رہی ہیں کہ دولتانہ صاحب ہی پنجاب کی وزارت عظمٰے

کے امیدوار نہیں۔ کچھ اور لوگ بھی وزارت پر ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں کندے تول رہے ہیں، مثلاً پچھلے دنوں سرگودھا میں ملک فیروز خاں نون نے جو تقریر کی تھی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر پنجاب کو ملک صاحب کی ضرورت پڑی تو وہ گورنری سے دستبردار ہو کے بھی "صوبہ کی خدمت" کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر راجہ غضنفر علی خان نے لورینگز کے ایک اجتماع میں جو باتیں کہیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ راجہ صاحب بھی "صوبہ کی خدمت" پر آمادہ ہیں۔ آج کل یہ خبریں مشہور ہو رہی ہیں کہ گجرات کے نواب زادے میاں مشتاق احمد گورمانی کو "پنجاب" کی خدمت پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بہرحال اتنا تو ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت کی وزارت، سفارت اور گورنری میں "خدمت کا زیادہ موقع نہیں مل سکتا، خدمت کی سب سے اونچی قسم "صوبے کی خدمت" ہے، چاہے کوئی شخص انجمن حمایت اسلام کا سیکرٹری ہو جائے۔ کوئی یتیم خانہ کھول کے بیٹھ جائے" انجمن ترقی مسلمین" کی صدارت کے عہدے پر پہنچ جائے، اس کے کارناموں کو "صوبے کی خدمت" نہیں کہہ سکتے۔ خدمت کرنا ہے تو الیکشن لڑیئے، گالیاں دیجئے، گالیاں کھائیے پھر وزارت پر ہاتھ صاف کر کے صوبے کی خدمت انجام دیجئے اور سعادتِ دارین حاصل کیجئے۔

۷ر دسمبر

موچی دروازہ لاہور کے باہر پنجاب مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا "امروز" کے تاریخ گو نے میاں ممتاز دولتانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے کہا "وہ دیکھ شہنشاہِ سیاست لاٹھیوں کے سائے میں" عدد گنے تو پورے ۱۱۵۰ ہوئے۔ جلسہ ختم ہوا تو ہجری تاریخ کہی "واہ شیرِ بیشۂ سیاست" ہمارے نزدیک اور کسی حیثیت سے نہیں تو کم از کم ان ہی دو تاریخوں کی وجہ سے میاں محمد ممتاز خاں دولتانہ کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس جلسے کے لئے جو "لٹھ بند حاضرین" بھرتی کئے گئے تھے، ان کا عام نرخ تو پانچ روپے تھا، لیکن بعض "حاضرین" کو آٹھ دس اور پندرہ روپے بھی دیئے گئے۔ اس حساب سے اس معرکے پر ایک روایت کے مطابق پندرہ ہزار اور دوسری روایت کے رو سے بیس ہزار روپے خرچ آئے۔ جن لوگوں کو پندرہ روپے ملے وہ قسم اعلیٰ میں شمار کئے جاتے ہیں، انہوں نے لاٹھی ہی نہیں چلائی "کائد پنجاب مُمتاج دولتانہ جندہ باد" کے نعرے بھی لگائے۔ گویا انہوں نے دُگنی مشقت اٹھائی اور تگنی اجرت وصول کی۔

جنرل دولتانہ کی لٹھیت فوج میں ان کی ساری باجگزار ریاستوں کے سپاہی موجود تھے، اچھرہ اور اس کے نواح کے دیہات سے کوئی ایک سو سپاہی آئے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے ساٹھ جانباز بھیجے گئے تھے۔ لاہور شہر کے اندرونی حصے کے جنگ آزما بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موچی دروازہ کیا ہے، ایک مورچہ ہے جسے سر کرنے کے لئے ملک ملک کے سپاہی چلے آ رہے ہیں۔

بہر حال چاہے بیس ہزار روپے خرچ ہوئے یا پندرہ ہزار، سپاہی اچھرہ سے آئے، یا بھاٹی دروازہ سے، ریلوے اسٹیشن سے بھرتی کئے گئے یا قلعہ گوجر سنگھ سے اس معرکہ میں جنرل دولتانہ کو جو کامیابی ہوئی ہے، وہ جنرل میکارتھر کو بھی نصیب نہیں ہوئی یعنی جنرل میکارتھر فاتح کوریا بنتے بنتے رہ گئے اور جنرل دولتانہ اچھے خاصے فاتح موچی دروازہ بنے ہوئے ہیں، اور اگر یہی حال رہا تو وہ چند دنوں میں فاتح بیڈن روڈ اور فاتح گوالمنڈی بھی کہلائیں گے۔

ہمیں تو اس قصے میں کرنل لال خاں کی حالت پر افسوس آتا ہے، وہ بچارے خلافت کے زمانہ سے آج تک بیسیوں مورچے سر کر چکے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں سیلاب کے زمانے میں انہوں نے دریائے راوی پر فتح مبین حاصل کی تھی۔ اسی لئے بعض لوگ انہیں فاتح دریائے راوی کہتے ہیں، لیکن موچی دروازے کے معرکے میں انہیں خچر باتری کی کمان سپرد

کی گئی اور جنرل دولتانہ کے باڈی گارڈ کی افسری کا سوال آیا تو کرنل ابو سعید انور کو اُن پر ترجیح دی گئی ع

تُفو بر تو اے چرخِ گرداں تُفو

۹ر دسمبر

فسانۂ آزاد کے میاں خوجی کو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے، کہتے ہیں، وہ جب کسی پر بگڑ جاتے تھے تو چلّا کے کہتے تھے "لانا میری قرولی" مرزا سودا کا قصّہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے، وہ کسی پر ناراض ہوتے تھے تو خادم سے پکار کے کہتے تھے کہ "لائیو۔ میرا قلمدان"۔ مسٹر ٹرومین کی حالت بھی ان دونوں سے چنداں مختلف نہیں۔ وہ ناراض ہوتے ہیں تو خدّام بارگاہ کو ایٹم بم لانے کا حکم دیتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خوجی کی شخصیت فرضی ہے اور اس کی قرولی اس کی شخصیت سے بھی زیادہ فرضی ہے۔ مرزا سودا نرے شاعر تھے، قلمدان منگوا کے ہجو لکھتے تھے اور اس ترکیب سے جی کی بھڑاس نکال لیتے تھے اور پریزیڈنٹ ٹرومین کی شخصیت فرضی نہیں اور نہ ان کی قرولی یعنی ایٹم بم فرضی ہے، پھر وہ شاعر بھی نہیں کہ ہجو کہہ کے دل کا غبار نکال لیں گے، بلکہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ہیں۔ ایٹم بم جیسا مہلک حربہ ان کے قبضے میں ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی موت و حیات ان کی مرضی پر موقوف ہے۔

دنیا میں بہت سے حکمران ایسے ہو گزرے ہیں، جنہوں نے بستیوں کی بستیوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔ مثلاً رومن بادشاہوں میں کیلی گولا اور نیرو بہت سفّاک سمجھے جاتے ہیں، ہندوستان کے ہن فرمانرواؤں میں مہر کل ظلم و ستم کی وجہ سے بہت مشہور ہے، حجاج بن یوسف اگرچہ ولید بن عبدالمالک کے عہد میں ایک صوبے کا حاکم تھا، لیکن اس کا نام ظلم و خونریزی میں ضرب المثل ہو کے رہ گیا ہے، فاطمی خلفاء میں حاکم بامر اللہ بڑا ظالم شخص

تھا، چنگیز اور ہلاکو کے ہاتھوں دُنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر تباہی آئی، تیمور نے شہر کے شہر ویران کر دیئے، نادر شاہ نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن ان مطلق العنان فرمانرواؤں میں سے کسی کو وہ ساز و سامان میسّر نہیں تھا، جو جمہوریہ امریکہ کے صدر کو نصیب ہے، پھر بھی پریزیڈنٹ ٹرومین کی رحم دلی کی داد دیجئے کہ انہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد انہوں نے ابھی تک کہیں ایٹم بم نہیں پھینکا، صرف ایٹم بم پھینکنے کی دھمکی دی ہے اور اس انداز میں دھمکی دی ہے، گویا ایٹم بم نہ ہوا، میاں خوجی کی قرولی ہوئی۔

پرانے زمانے میں لڑائی کے جن آداب کا خیال رکھا جاتا تھا انہیں اب کوئی نہیں پوچھتا حریف نہتّا ہوتا تھا تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے یا اس کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ جاتی تھی تو ہاتھ روک لیتے تھے اور جب تک اسے نئی تلوار مہیا نہیں کر دی جاتی تھی، لڑائی رُکی رہتی تھی۔ جنگ اُحد میں کفار کی فوج کا عَلَم دار حضرت علیؓ کے مقابلہ پر آیا لیکن ایک ہی ضرب پڑی تو گر کے تڑپنے لگا اور بدحواسی کے عالم میں بالکل برہنہ ہو گیا، یہ دیکھ کے حضرت علیؓ نے اس کی جان بخشی کر دی۔ سلطان صلاح الدین ایوّبی کی زندگی کا یہ واقعہ اکثر یورپین مورّخوں نے نقل کیا ہے کہ جب ان کا حریف رچرڈ شیر دل بیمار پڑا تو سلطان نے خود اس کا علاج کیا اور جب تک وہ تندرست نہیں ہوا، جنگ رُکی رہی۔ پرانے زمانے کے آداب حرب کو ملحوظ رکھا جائے تو پریذیڈنٹ ٹرومین کو چاہیئے کہ ایک ایٹم بم چینیوں کے حوالے کریں، ایک اپنے پاس رکھیں اور پھر کہیں کہ آؤ اب مقابلہ کر لو لیکن وہ تو اس اُلٹے بار بار ایٹم بم کا نام لے رہے ہیں، کیونکہ انہیں یہ معلوم ہے کہ چینیوں یا کوریا والوں کے پاس ایٹم بم موجود نہیں، ورنہ انہیں ایٹم بم کا نام لینے کی بھی ہمت نہ پڑتی۔

---

۱۰ دسمبر

ہمارے وزراء میں پیرزادہ عبدالستار صاحب وزیر خوراک و صحت موسیقی کا خاص

ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں مرینہ ہوٹل کراچی میں میوزک اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام ایک بزمِ سرود منعقد ہوئی تھی، جس کی صدارت پیر زادہ صاحب نے فرمائی تھی۔ صدارت کرنا تو بڑا کام نہیں، اکثر حضرات جو نہ شعر کہہ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں، بڑے بڑے عظیم الشان مشاعروں کی صدارت کر چکے ہیں۔ لیکن پیر زادہ صاحب کا معاملہ ان سے مختلف ہے، وہ ستار بھی بجا لیتے ہیں، گانا بھی جانتے ہیں، بلکہ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ایک زمانے میں ریڈیو پہ گا بھی چکے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پیر زادہ عبدالستار کے سپرد خوراک اور صحت کے محکمے کیوں کئے گئے، انہیں ریڈیو کے محکمے کا انچارج کیوں نہ بنایا گیا؟ جہاں انہیں اپنے ذوقِ موسیقی سے کام لینے کے موقعے آسانی سے فراہم ہو سکتے تھے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ اعتراض صحیح نہیں، خوراک اور صحت کے محکموں کو بھی موسیقی سے خاصا تعلق ہے۔ مثلاً آپ تو یہ جانتے ہیں، کہ موسیقی غذائے روح ہے، یعنی روح کو بالیدہ کرنے میں موسیقی کا وہی حصہ ہے جو جسم کی نشوونما میں گیہوں، چاول، مکئی، جوار اور جو وغیرہ کا! اس لئے پیر زادہ عبدالستار کو وزیرِ خوراک ہی ہونا چاہئے تھا۔

اس کے علاوہ موسیقی اور صحت میں بھی بڑا مضبوط رشتہ ہے۔ چنانچہ استاد تان تورخان کے متعلق مشہور ہے کہ مختلف راگنیوں سے مختلف امراض کا علاج کیا کرتے تھے، ایک شخص بخار میں مبتلا ہے، استاد نے اسے سامنے بٹھا کے ملھار گانا شروع کیا، گاتے گاتے استاد کو پسینہ آگیا اور مریض کا بخار ٹوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ ملھار سے ملیریا کا بڑا تعلق ہے، ملھار ایک خاص طریقے سے گایا جائے تو بارش ضرور ہوتی ہے اور برسات میں ملیریا کے مچھر پیدا ہوتے ہیں جو تھوڑا بہت گا لیتے ہیں، ہم نے بڑے بڑے گویّوں کو بے سرا ہوتے دیکھا ہے، لیکن بے سرا مچھر آج تک نہیں دیکھا۔

بے سرے پن کے سلسلہ میں ایک بات یاد آ گئی، کہتے ہیں، گوالیار میں میاں تان سین کے مزار پر املی کا پیڑ ہے۔ مشہور ہے کہ جو شخص اس کی پتیاں کھا لے، اُسے گانا آجاتا ہے اور گویا کھا لے تو موسیقی کے سارے اسرار اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور وہ مرتے دم تک کبھی "بے سرا" نہیں ہوتا۔ پیر زادہ عبد الستار صاحب اگر اس املی کے بیج منگوا کے ان کی کاشت کا انتظام کر دیں تو یقیناً پاکستان میں بھی موسیقی کو بہت فروغ ہوگا اور ریڈیو اسٹیشنوں پر تو املی کی پتیاں رکھوا دینی چاہئیں، تاکہ کوئی گویا بے سُرا نہ رہے اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر املی کی کاشت کا انتظام ذرا وسیع پیمانے پر کیا جائے اور ہر شخص اس کی پتیوں سے فائدہ اٹھا سکے تو پنجاب کے کسان ماہیا اور ڈھولے کے بجائے دھرپد الاپا کریں گے۔

اا ردسمبر

لاہور کے ایک اخبار میں سیالکوٹ کے ایک جلسے کی روئداد شائع ہوئی ہے، جس کے بعض حصے ملاحظہ ہوں:

> "بزم اردو جموں و کشمیر کا ایک اجلاس خصوصی جناب علامہ خمیری کی صدارت میں منعقد ہوا، بزم اُردو کی آئندہ ادبی مجلس ۸ ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو اردو کالج واقع پیرس میں ۷ بجے شام منعقد ہوگی۔"

اگر یہ سہو کتابت کا کرشمہ نہیں، یعنی سیالکوٹ میں علامہ خمیری نام کے کوئی بزرگ واقعی موجود ہیں تو ناروووال کو چاہئے کہ کہیں سے ایک علامہ فطیری ڈھونڈھ لائے تاکہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رہیں۔

اصل میں تخلص کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ شعر کے لئے نیا مضمون ہاتھ آجائے تو آجائے، نیا تخلص نہیں ملتا۔ بہرحال اگر علامہ خمیری اور علامہ فطیری موجود ہیں، تو ہمیں علامہ باقرخانی، بلکہ علامہ شیرمال کے ظہور کا بھی منتظر رہنا چاہئے۔

اس اطلاع میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اطلاع سیالکوٹ سے آئی ہے، جلسہ بزمِ اُردو جموں و کشمیر کا ہے اور اردو کالج پیرس میں منعقد ہو رہا ہے، گویا ؎

خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

بہرحال اس اطلاع سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے دارالحکومت میں ایک اردو کالج بھی موجود ہے، جس میں بزمِ اردو جموں و کشمیر کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ دنیا میں آئے دن کیسے عجیب و غریب واقعات رُونما ہوتے ہیں، جس سے ہم لوگ قطعاً بے خبر ہیں۔

"خادمِ ملت" ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ کو شکایت ہے کہ سیاسی جماعتوں نے ملیریا کے انسداد کے کام میں کوئی حصہ نہیں لیا، حالانکہ "محکمۂ حفظانِ صحت کے اعلیٰ افسر بڑی دیانت داری سے کام میں مصروف ہیں اور حکومت نے بھی روپیہ خرچ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی" ڈاکٹر صاحب کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ ملیریا کے مریض کو پہلے کونین کا ٹیکہ لگایا جائے، پھر کوئی ملیین دوا دی جائے، اس کے بعد مہینہ بھر تک کونین اور فولاد اور ایک خاص قسم کا مکسچر استعمال کرائے جائیں۔ لیکن یہ کام اکیلے ڈاکٹر سے نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں کے عہدہ دار اور رضاکار بھی موجود ہونے چاہئیں۔

معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ بیگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ جب کسی مریض کو کونین کا ٹیکہ لگائیں تو دولتانہ صاحب اسے ملیین دوا استعمال کرائیں، خان ممدوٹ کونین کھلائیں اور رضاکار زندہ باد کے نعرے لگائیں، میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات اسے مہینہ بھر تک مکسچر پلائیں اور اگر خدانخواستہ اثنائے علاج میں بیچارے مریض کا انتقال ہو جائے، تو علامہ مشرقی جو بیلچہ کندھے پر رکھ کے مدتوں چپ و راست کرتے رہے ہیں، اس کی قبر کھودیں اور مولینا مودودی نماز جنازہ پڑھائیں، ہمارے خیال میں مریض کو کونین کا ٹیکہ لگانے کا کام بھی کسی سیاسی لیڈر کے سپرد کر دیا جائے تو حکومت بلکہ اس کے ساتھ

ساتھ ڈاکٹروں کو بھی اس جھنجھٹ سے ہمیشہ کے لئے نجات نصیب ہو جائے گی۔

لگے ہاتھوں ایک بات اور عرض کر دوں، تمام سیاسی پارٹیوں کو ملیریا کی روک تھام کے کام میں جھونک دینا مناسب نہیں۔ اوّل تو انہیں ایک ہی پلیٹ فارم پر چاہے وہ ملیریا کا پلیٹ فارم ہی کیوں نہ ہو، جمع کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر ہمارے ملک میں ایک ہی مرض تو نہیں اور امراض بھی ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو الگ الگ امراض کے انسداد کے کام پر لگا کے لیڈروں میں پورٹ فولیو تقسیم کر دیئے جائیں کوئی ملیریا کی روک تھام کرے، کوئی ہیضہ اور دوسرے وبائی امراض کا انسداد اپنے ذمّے لے لے، کسی کو ذات الصدر اور ذات الجنب کے علاج کا پورٹ فولیو دیا جائے، لیکن پورٹ فولیو کی تقسیم کا کام اس طرح ہونا چاہئے، گویا وزارتیں تقسیم ہو رہی ہیں۔ ہم تو ہفتوں سے عرض کر رہے ہیں کہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کے پاس "عصائے موسوی" ہی نہیں، "دمِ عیسیٰ" بھی ہے، لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا، الحمدللہ کہ ڈاکٹر حمید اللہ بیگ صاحب نے ہمارے انکشاف کی تصدیق کر دی ؎

متفق گردید رائے بو علی با رائے من

۱۲ر دسمبر

مسلم لیگی لیڈروں میں سے جو اُٹھتا ہے، یہی کہتا ہے کہ "مسلمانو! اپنا بھلا چاہتے ہو تو لیگ کو مضبوط بناؤ" خان لیاقت علی خان، چودھری خلیق الزمان، یوسف خٹک صاحب، خان عبدالقیوم خان، کھوڑو صاحب، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، سب حضرات نے یہ بات ایک مرتبہ نہیں بیسیوں مرتبہ کہی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ تین برس سے یہ فقرہ بار بار دہرایا جا رہا ہے، لیکن لیگ ہے کہ مضبوط ہونے میں نہیں آتی۔ آخر یہ کوئی جادو کا کھیل تو نہیں کہ "لیگ کو مضبوط بناؤ، مضبوط بناؤ" کہا کہ لیگ سچ مچ لوہا لاٹ ہو گئی۔

جب خان لیاقت علی خاں نے لیگ کی صدارت سنبھالی تھی تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب لیگ ضرور مضبوط ہو کے رہے گی۔ لیکن خان لیاقت علی خاں کو لیگ کا صدر بنے ہوئے کئی مہینے ہو گئے اور ابھی لیگ کا وہی حال ہے۔ کڑیوں کو دیمک کھا گئی ہے، ستون گرنے کو ہیں، چھجہ سر بسجود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکان گرا کہ گرا۔ یہ ٹھیک ہے کہ خان لیاقت علی خاں نے اسے اڑواڑا دے کے سنبھال رکھا ہے، لیکن جس عمارت کو اڑواڑا دے کے سنبھالا جائے اسے مضبوط نہیں بنایا جا سکتا، اسے مضبوط کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اسے گرا کے از سر نو تعمیر کرایا جائے۔

افسوس ہے کہ لیگی رہنما اس بات پر ہرگز تیار نہیں، وہ اس اڑواڑ کو عمارت کی مضبوطی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ بار بار ان سے کہئے کہ حضرت یہ عمارت بوسیدہ ہو چکی، اب اس کو مضبوط بنانا ناممکن ہے تو خدّام بارگاہ کو حکم ہوگا، کہ اس اڑواڑ پر ایک دو تھونیوں کا اضافہ کر دو، فرش پر بجری بچھا کے سیمنٹ ڈال دو، دیواروں پر سپیدی کرا دو، تا کہ الکشن کا موسم تو گزر جائے۔ چنانچہ ملک لال خاں ان دنوں سرخی کوٹ رہے ہیں، دولتانہ صاحب سفیدی کی بوریاں کندھے پر لادے پھرتے ہیں اور صوفی عبدالحمید سیمنٹ کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں لیکن ہماری رائے میں ساری تدبیریں بیکار ہیں، آپ اینٹوں اور پتھروں کے جس ڈھیر کو لیگ کی عمارت سمجھے بیٹھے ہیں، وہ عمارت نہیں، نرا ملبہ ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ بچاری لیگ بالکل غفرلہا ہونے کو ہے، یا ایک روایت کے مطابق غفرلہا ہو چکی ہے اور لیگی لیڈر الکشن کے عرق بادیان اور ووٹ کے خمیرہ گاؤزبان کی فکر میں سرگرداں پھر رہے ہیں، حالانکہ اب نہ خمیرہ گاؤزبان کا موقع رہا نہ عرق بادیان کا، نہ نوشدارو کام آسکتا ہے نہ جواہر مہرہ اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ٹانک دواؤں سے مُردے جی اٹھتے تو ہر طبیب اور ہر ڈاکٹر جسے کسی مقوّی دوا کا نسخہ یاد ہے مسیحائی کا دعوےٰ

کر بیٹھتا۔ لیگی لیڈروں کو لوگوں سے صاف صاف یہ کہہ دینا چاہئے کہ لیگ بچاری تو چل بسی، لیکن ہم جو اس کے مزارِ پُر انوار کے مجاور ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے زندہ ہیں، اس لئے مرحومہ کی رُوح کو ثواب پہنچانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ہمیں ووٹ دیجئے اور سعادتِ دارین حاصل کیجئے۔

مسلم لیگ کے لیڈروں کو چاہئے کہ لیگ کی مضبوطی کا کام پی، ڈبلیو، ڈی کے محکمے کے سپرد کر دیں۔ وہ چاہے تو یہ کام اماتی طریقہ پر کرائے، یا ٹنڈر طلب کر کے کسی کو ٹھیکہ پر دے دے۔

۱۳ر دسمبر

سُنا ہے، حال میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پاگلوں کا تبادلہ ہُوا ہے، یعنی لاہور کے پاگل خانے میں جتنے ہندو اور سکھ پاگل تھے وہ ہندوستان بھیج دئے گئے ہیں، اور بریلی کے پاگل خانے میں جو مسلمان پاگل تھے، انہیں لاہور کے پاگل خانے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ گذشتہ فسادات کے دوران میں بریلی اور لاہور کے پاگل خانے ہی صرف دو ایسے مقامات تھے، جہاں ہندو مسلمانوں کی مخلوط آبادی ہونے کے باوجود فساد نہیں ہُوا۔

راقم الحروف کو منطق پر پوری طرح عبور حاصل نہیں، صغریٰ کبریٰ قائم کر کے نتائج نکالنا راقم کو نہیں آتا۔ لیکن اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنے کے لئے تو منطق پڑھنے کی ضرورت نہیں، کہ جس جگہ ہندو، مسلمان، سکھ مل جل کے رہتے ہوں اور ان میں کبھی ہنگامہ و فساد کی نوبت نہ آئے، وہ واقعی پاگلوں کی بستی ہے۔ ہوشمند لوگ میل ملاپ سے زندگی بسر نہیں کر سکتے اور آپس میں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ اگر صحیح ہے (اور کوئی وجہ نہیں کہ صحیح نہ ہو) تو دیوانگی پر ہوشمندی کے تفوّق کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور بہت سے لوگ ایسے بھی نکل آئیں گے۔

جو یہ بات سن کے پاگل ہو جانا چاہتے ہوں ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

فسادات کے زمانے میں جو لوگ لاہور کے شفاخانۂ امراضِ دماغی میں موجود تھے انہوں نے کبھی ایک دوسرے کے حالات سے تعرّض نہیں کیا۔ ان میں ایک صاحب اپنے آپ کو نبی کہتے تھے، لیکن دوسرے پاگل نہ تو کبھی ان کی نبوّت پر ایمان لائے، نہ انہوں نے اس سے انکار کرنے کی ضرورت ہی سمجھی۔ ایک اور صاحب بادشاہت کے مدّعی تھے لیکن کسی نے نہ تو اُن کی اطاعت کی، نہ اُن کے خلاف بغاوت کرنا ضروری سمجھا۔ انہی میں ایک اور بزرگوار بھی تھے، جو بظاہر بڑے ہوشمند معلوم ہوتے تھے، لیکن باتیں کرتے کرتے وہ یکبارگی "چل کبڈی، چل کبڈی" کے نعرے لگانا شروع کر دیتے تھے۔ تاہم پاگلوں نے اُن کے معاملے میں ہمیشہ رواداری کا ثبوت دیا ہے، کسی نے اُن سے اتنا بھی تو نہیں کہا کہ تم کبڈی کیوں کھیلتے ہو، آنکھ مچولی کیوں نہیں کھیلتے؟

پاگل خانے میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن کسی سکھ اور مسلمان پاگل میں مذہبی اختلاف کی وجہ سے لڑائی نہیں ہوتی۔ پاگلوں میں فساد بھی ہوا ہے، مگر ہندو مسلم فساد کبھی نہیں ہوا۔ عیسیٰ خاں اور نروتم سنگھ دونوں پاگل تھے، عیسیٰ خاں پٹھان تھا اور نروتم سنگھ سکھ۔ وہ پاس پاس رہتے تھے، صرف لوہے کے ایک جنگلے نے انہیں جدا کر رکھا تھا۔ لیکن وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے تو بے اختیار مسکرا پڑتے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں شفقت کا نور جھلکنے لگتا تھا۔ اُن میں صرف پاگل پن کا رشتہ تھا اور اس رشتے نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ نرنجن داس اور علیم الدین پاگل خانے سے باہر ہوتے تو فسادات کے زمانے میں ضرور لڑ پڑتے، اور نہ جانے اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوتا، لیکن پاگل خانے میں انہیں کبھی لڑنے کا خیال تک نہیں آیا۔

بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو بہت مدت کے بعد خیال آیا کہ پاگل خانے کی بھی تقسیم ہو جانی چاہیئے۔ ہندو اور سکھ پاگل بھارت میں رہیں اور مسلمان پاگل پاکستان میں تاکہ اُنہیں اکٹھا دیکھ کے بعض لوگ اہلِ خرد پر دیوانوں کی برتری کا کوئی پہلو نہ نکال لیں، اور بات صحیح بھی ہے۔ یہ پاگل کچھ دن اور اکٹھے رہتے تو ہوش و خرد کا اعتبار اُٹھ جاتا، اور بڑے بڑے اربابِ دانش پکار اُٹھتے کہ ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

۴ار دسمبر

معلوم ہوا ہے کہ کل لفٹنٹ جنرل ممتاز محمد خان دولتانہ نے ایک خونریز معرکے کے بعد موچی دروازہ لاہور کو جو پورٹ آرتھر کی طرح ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا، فتح کر لیا۔ اس لڑائی میں جسے کرسیوں کے معرکہ کے بعد سب سے بڑا محاربہ کہنا چاہیئے، لیگ کے اکثر مشہور افسر شریک تھے۔ بکتر بند دستے کی کمان لفٹیننٹ کرنل ظفر اللہ کر رہے تھے، لفٹیننٹ کرنل ابو سعید جنرل دولتانہ کے باڈی گارڈ کے افسر اعلیٰ تھے۔ بریگیڈیر لال خان ہراول کی افسری کر رہے تھے۔ میجر جنرل صوفی اگرچہ صرف نشان کے ہاتھی ہیں، لیکن اس معرکہ میں وہ بھی موجود تھے۔

لوگ کہتے ہیں، موچی دروازہ لاہور کا دل ہے، لاہور پنجاب کا دل ہے، اور پنجاب پاکستان کا دل ہے۔ اس لئے موچی دروازے پر جنرل دولتانہ کا قبضہ ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کا دل اُن کے قبضے میں آگیا، لہٰذا لوگوں کو چاہیئے کہ انہیں آئندہ "دلبرِ پنجاب" بلکہ "دلبرِ پاکستان" کہا کریں۔ گویا کل موچی دروازے میں جو کچھ ہوا وہ محض دلبری و دلستانی کا ایک معرکہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس معرکہ میں ناز و کرشمہ اور

عشوہ و غمزہ کی بجائے لاٹھیوں سے کام لیا گیا، سچ ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہم اور آپ تو موچی دروازہ کو لاہور کا دل کہتے ہیں، لیکن ہمارے ایک معاصر کی رائے میں موچی دروازہ "سومنات" ہے جسے بیسویں صدی کے محمود غزنوی یعنی جنرل ممتاز دولتانہ نے ایک ہی ہلّے میں سر کر لیا۔ اگر دولتانہ صاحب محمود غزنوی ہیں اور موچی دروازہ سومنات ہے تو ملک لال خان صاحب التونتاش ہوئے، چودھری عبدالکریم کو داؤد طائی کہنا چاہیئے اور ہمارا معاصر اس قصّے میں اچھا خاصا حسن میمندی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا، کہ ایاز کون ہے؟ اس منصب کے امیدواروں کو خود ہی قرعہ اندازی کے ذریعے فیصلہ کر لینا چاہیئے۔

موچی دروازے کے اس معرکے کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں، کہا جاتا ہے، کہ جنرل دولتانہ مدّت سے اس لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کمک، رسد اور رسل و رسائل کے متعلق ہفتوں سے انتظامات ہو رہے تھے، بڑی بڑی قلعہ شکن توپیں اور بکتر بند دستے جمع کئے جا رہے تھے۔ اتوار کو دن کے دو بجے دھاوا شروع ہوا، دولتانہ صاحب نے میمن و میسار ساقہ اور جناح پر قابل اعتماد افسر مقرر کئے۔ بریگیڈیر چیمہ سیالکوٹ کے ایک معرکے میں شکست کھانے کی وجہ سے بددل ہو رہے تھے، اس لئے داہنے بازو کی پیدل فوج کی سرداری سپرد کی گئی۔ صوفی عبدالحمید کو برکت کے لئے آگے رکھا، خود دولتانہ صاحب قلب فوج میں متمکن ہوئے اور دھاوا شروع کر دیا۔

یہ لڑائی اس قسم کی تھی جسے گذشتہ جنگِ عظیم کی اصطلاح میں لچکیلی لڑائی کہا جاتا رہا ہے، یعنی وہ ربڑ کی طرح پھیلتی اور سمٹتی تھی، ایک طرف سے حریف دباؤ ڈالتا تھا اور

جنرل دولتانہ کے بکتر بند دستے اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، وہ چندا دل کی لڑائی لڑتا ہوا پیچھے ہٹتا تھا اور یکبارگی دوسری طرف سے حملوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جنرل دولتانہ جو پانچ سو جان نثاروں کو حلقے میں لئے کھڑے تھے، اپنی فوج کا دل بڑھانے کے لئے برابر تقریر کئے جا رہے تھے۔ لیکن یہ تقریر کسی نے نہ سُنی، کیونکہ ان کی فوج یا تو لڑتی اور یا تقریر سنتی ایک وقت میں دو کام کرنا تو بہت مشکل ہے۔

کہتے ہیں، اچھرہ کے "میاں صاحب" نے جو جنرل دولتانہ کے خراج گزار سرداروں میں سے ہیں، عین لڑائی میں دو پلٹنیں ٹرکوں پر لاد کے بھیجیں۔ انہوں نے اگرچہ لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا، تاہم اس کمکی فوج کے آجانے سے لڑائی کی عام حالت پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل دولتانہ اپنے خراج گزار کی وفاداری دیکھ کے بہت خوش ہوئے ہیں اور عنقریب ایک دربار منعقد کر کے انہیں "فرزند لٹھ بند مولا بخش بہادر" کا خطاب مرحمت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۵ر دسمبر

کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی آب و ہوا ایسی ہے کہ مچھلیوں کی پرورش بآسانی ہو سکتی ہے، چنانچہ مشرقی پاکستان کی حکومت جگہ جگہ مچھلیوں کی افزائشِ نسل کا انتظام کر رہی ہے۔ غالباً یہ مشرقی پاکستان کے گورنر ملک فیروز خاں "نون" کے نام کی برکت ہے، کیونکہ عربی میں "نون" مچھلی کو کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ملک صاحب صرف بحرِ سیاست کی مچھلی ہیں، لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی پاکستان ان کی بدولت اچھا خاصا "ذوالنّون" بنتا جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں سلاطین و امرا کسی شخص سے خوش ہوتے تھے تو اسے خلعت و

انعام بخش دیتے تھے، لیکن پنڈت نہرو جب کسی ملک کے لوگوں سے خوش ہوتے ہیں تو اُنہیں ایک ہاتھی یا ہتھنی بھجوا دیتے ہیں۔ تُرکی اس بخشش عام سے محروم تھا، اسے حکومت پاکستان نے ایک ہتھنی بھجوا دی، جو گویا ایک حیثیت سے بھارت کی "الفیل مالفیل" کا جواب ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں بھارت اور پاکستان کے درمیان اس "فیل بخشی" کے سلسلے میں معاہدہ ہو جانا چاہئے تاکہ بعض ملکوں کو بھارت ہتھنیاں بھجوائے اور بعض کو پاکستان، ہر کیٹے ہندوستان سے جائیں اور مہاوت پاکستان سے، ورنہ مضمون لڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم کے سلسلے میں بیسیوں جھگڑے ہیں، کہیں بیرونی ممالک کے چڑیا گھروں کی تقسیم کا نیا جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔

اخباروں میں ان دنوں "چار بڑوں" کی کانفرنس کا ذکر بار بار آرہا ہے۔ "چار بڑوں" سے اگرچہ دُنیا کے چار بڑے ملکوں کے سربرآوردہ لیڈر مراد ہیں، لیکن یہ ترکیب پڑھ کے ذہن بے اختیار "دہی بڑوں" کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ راقم کو اندیشہ ہے کہ کہیں لوگ "بڑوں" کی رعایت سے "کانفرنس" کو دہی نہ کہنا شروع کر دیں، کیونکہ ان چار اکابر کو کانفرنس سے وہی تعلق ہے جو دہی کو "بڑوں" سے، "بڑے" دہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں اور لیڈر کی لیڈری کے جوہر کانفرنس میں کھلتے ہیں۔

یہ "چار بڑے" اصل میں آل انڈیا ریڈیو کے عجائبات تراجم میں سے ہیں، لیکن ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان نے بھی انہیں اس طرح اختیار کر لیا ہے، گویا یہ مفہوم ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہی موجود نہیں۔ بہرحال اگر آل انڈیا ریڈیو والے "آل بھارت کوی سمیلن" کو "آلو" کا بھرتا" اور پنجابی کوی دربار کو "پکوڑے" کہنا شروع کر دیں تو ہم کیا کر لیں گے، یہ تو ظاہر ہے کہ آلو کا بھرتا اور پکوڑے، دہی بڑوں سے کسی حیثیت میں کم نہیں۔

---

۸ اردسمبر

راقم الحروف نے پچھلے دنوں لکھا تھا کہ جب سے لیگ کے جلسوں کے لئے "حاضرین" کی فراہمی کا سوال پیش آیا ہے، اس لفظ کو واحد اور جمع دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما کے نزدیک واحد کے لئے "حاضرین" کا استعمال بہت بڑی بدمذاقی ہے اور وہ راقم کو اس بدمذاقی کا ذمّہ دار قرار دے رہے ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک شخص جو بعض جلسوں میں شریک ہو چکا ہے، اپنے آپ کو ان جلسوں کا "حاضرین" کہتا ہے اور اس بات پر مصر ہے کہ سب لوگ اسے "حاضرین" کہیں تو ہم اعتراض کرنے والے کون؟ ذرا گھر سے نکلئے تو آپ کو اس قسم کے فقرے بکثرت سننے میں آئیں گے کہ "میں بھی لیگ کے جلسے کا ایک "حاضرین" ہوں" پھر آپ ہی کہئے کہ ہم اور آپ اس "مجاورے" کی رواج پذیری میں کیونکر حائل ہو سکتے ہیں؟ جو لفظ عوام کی زبان پر چڑھ گیا، وہی درست ہے۔ آپ ہزار گرامر کی سند پیش کیجئے، کوئی نہیں سنتا۔

اولیاء ولی کی جمع ہے، لیکن اکثر لوگ اسے واحد کے معنوں میں بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ خواجہ نظام الدین بدایونی علیہ الرحمۃ کو بڑے بڑے پڑھے لکھے آدمی نظام الدین اولیاء ہی کہتے ہیں۔ "معذرت" ایک عام لفظ ہے اور "محضر" سے اسے کوئی تعلق نہیں، لیکن جب سے صوفی عبدالحمید صاحب نے معذرت کا استعمال کم ہوتا جاتا ہے اور "محضر" اس کی جگہ لے رہا ہے۔ "مہاجرین" مہاجر کی جمع ہے لیکن اب مہاجر کی جگہ بھی "مہاجرین" ہی بولا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر لوگ کہتے ہیں، "کل میں ایک "مہاجرین" سے ملا" اور اکثر مہاجرین خود بھی تو اپنے متعلق یہی کہتے ہیں کہ "میں ایک مہاجرین ہوں"۔

اور سنئے "مسلم" واحد ہے اور "مسلمین" اس کی جمع ہے لیکن بعض لوگ اپنے آپ کو مسلم یا مسلمان کے بجائے "مسلمین" کہتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ آپ کون ہیں تو جواب ملے گا کہ "اللہ کے فضل سے میں مسلمین ہوں، پچھلے تین برس سے مہاجرین ہوں اور اب تو لیگ کے جلسوں کا حاضرین بھی ہوں"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو مہاجرین اور حاضرین جیسے الفاظ پر کیا اعتراض ہے؛ اگر ایک سکھ اپنے آپ کو سوا لاکھ کہہ سکتا ہے تو ایک "مسلمین"، جو حسنِ اتفاق سے "مہاجرین" بھی ہے، اپنے آپ کو "حاضرین" کیوں نہیں کہہ سکتا۔

---

۲۱ دسمبر

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ چودھری نذیر احمد وزیرِ صنعت پاکستان صنعت و حرفت کے متعلق کچھ نہیں جانتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے عہدِ وزارت میں صنعت و حرفت نے کوئی ترقی نہیں کی، اگرچہ یہ شکایت درست نہیں، بہت سے کام بے خبری اور ناواقفیت کے باوجود انجام دیئے جا سکتے ہیں، اسی لئے تو حافظ نے کہا ہے کہ ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت

بہ غمزۂ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

تاہم اگر لوگوں کو ایسا ہی اصرار ہے تو ہم خان لیاقت علی خان سے درخواست کریں گے کہ چودھری نذیر احمد صاحب کو کچھ دنوں کوٹلی لوہاراں کے کسی لوہار کے ہاں دھونکنی دھونکنے کا موقع دیا جائے اور یہ نہ ہو سکے تو کوٹلی لوہاراں کے کسی لوہار ہی کو وزیرِ صنعت مقرر کر دیا جائے، آخر لوہار، وکیل سے زیادہ صنعت و حرفت کے رموز سے واقف ہے۔

قافیوں کے سلسلے میں یاد آ گیا کہ ہمارے ہاں   کی طرح قافیوں کی کمی نہیں۔ ممدوٹ بظاہر کتنا ثقیل اور نامانوس نام ہے لیکن قافیوں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ

کوٹ سے لے کے لنگوٹ تک کوئی نو دس شگفتہ قافیے موجود ہیں، جن میں اخروٹ اور اراروٹ بھی شامل ہیں اور دولتانہ کے قافیوں کا کہنا ہی کیا ہے، خزانہ، فسانہ، خانہ، زمانہ، نشانہ کتنے اچھے قافیے ہیں۔ لیکن شاعر نہیں ملتا، ایک زمانہ تھا، جب شاعر موجود تھے، شگفتہ قافیے ہاتھ نہیں آتے تھے، آج قافیے موجود ہیں، لیکن ایسا شاعر ہاتھ نہیں آتا جو ان قافیوں سے مناسب کام لے سکے۔

اردو شاعری میں اکبر اور ظفر علی خاں قافیے کے شاعر ہیں یعنی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے ہیں اور بڑی تلاش سے نادر نادر قافیے ڈھونڈ ھ لاتے ہیں۔ آج سے دس بیس برس پہلے جب مولانا ظفر علی خاں کی شاعری زور پر تھی، اُن کا یہ حال تھا کہ نئی نئی زمینیں طرح کرتے تھے۔ اچھوتے قافیے نکل سکتے ہوں۔ اُن کے قلم سے بچنے نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ آج سے دس پندرہ برس پہلے اگر کوریا کا مسلہ چھڑا ہوتا تو وہ ضرور قافیوں کی تلاش میں کنج کاوی کرتے، ممدوٹ کا ذکر آتا تو کوٹ سے لنگوٹ تک سارے قافیوں پر طبع آزمائی کرتے۔ افسوس جب یہ زمانہ آیا، مولانا قلم اور کاغذ سے عدم تعلون کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے، ان قافیوں کو شکایت ہے کہ ؎

قسمت ببیں فتادہ کہ ترکان مست او
در دورِ ما بطاق بنہادند جام را

متفرق

سنا ہے ، ریڈیو پر سیلاب کے متعلق تقریروں کا ایک سلسلہ "سبکساران ساحل سے" کے عنوان شروع ہو رہا ہے ، جس میں پہلی تقریر کا عنوان "تنکے کا سہارا ہے"۔ کہیں اس عنوان سے اس ایک کروڑ روپے کی رقم کی جانب تو اشارہ نہیں ، جو مرکز نے صوبہ پنجاب کو سیلاب کے سلسلہ میں مرحمت فرمائی ہے ؟ ایک کروڑ روپے کی رقم خاصی بڑی سہی ، لیکن اس سیلاب میں تو تنکے ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

پچھلے دنوں الٰہ آباد میں پولیس سب انسپکٹروں کی اسامی کے لئے عام معلومات کا جو امتحان ہوا ، اس میں بعض امیدواروں نے سوالات کے بڑے دلچسپ جواب دیئے ہیں۔ مثلاً ایک سوال تھا کہ ہماچل پردیش کہاں ہے ؟ ایک طالب علم نے جواب دیا شمالی کوریا میں ؟

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس غلط جواب کی بنا پر امیدوار کو فیل کر دینا صحیح نہیں، آخر "ہماچل پردیش" نام بھی تو ایسا ہے کہ وہ شمالی کوریا ہی کا کوئی شہر معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور سوال تھا کہ قطب مینار کس نے بنوایا ؟ امیدوار نے جواب دیا ، مہاراجہ

اشوک نے۔ ہمارے خیال میں امیدوار نے یہ جواب محض مصلحتاً دیا ہے، اس نے سوچا ہوگا، کہ اس موقع پر ایبک یا التمش کا نام لے دیا تو کہیں ممتحن فیل ہی نہ کر دے، اس لئے اس نے قطب مینار کی تعمیر کا سہرا بھی اشوک کے سر پر باندھ دیا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر پڑھے لکھے ہندو قطب مینار کو پرتھوی راج کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ پرتھوی راج کی بیٹی اس مینار پر چڑھ کے ہر صبح جمنا جی کے درشن کیا کرتی تھی۔ اگرچہ قطب مینار پر چڑھنے کی زحمت گوارا کرنے سے جمنا کے کنارے پہنچ کے اشنان کرنا زیادہ آسان ہے، لیکن تاریخ آخر تاریخ ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ پولیس کی سب انسپکٹری کے امیدواروں سے اس قسم کے سوالات ہی کیوں کیئے گئے؟ انہیں اس سے کیا واسطہ کہ قطب مینار کس نے بنایا تھا؟ اُن سے تو یہ سوال کرنا چاہیئے تھا کہ اگر کوئی شخص قطب مینار چرا لے جائے تو تم اس کا سُراغ کس طرح لگاؤ گے؟ اگر وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکتے تو یقیناً انہیں فیل کر دینا چاہیئے تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں سب انسپکٹری کے امیدواروں سے اس قسم کی اُلٹی سیدھی باتیں نہیں پوچھی جاتیں۔

ایک لیڈر سے کسی نے اثنائے گفتگو میں کہا "میرا مقصد تو فوت ہو گیا" لیڈر صاحب گھبرا گئے، کہنے لگے، انّا للہ وانا الیہ راجعون ؁ مرحوم کو کیا عارضہ تھا؟ صاحب مجھے بڑی ہمدردی ہے۔

آج سے دس بیس سال پہلے کے لیڈر خاصے خوش ذوق لوگ تھے اور ان میں سے بعض لوگ شعر کہتے تھے اور اچھے شعر کی داد دے سکتے تھے۔ سر سکندر حیات خاں کو بظاہر ادب اور شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک زمانہ تک فوج میں رہے، پھر سیاسیات کے بکھیڑوں میں پڑ گئے، لیکن وہ خوش مذاق شخص تھے۔ میاں

محمد ممتاز دولتانہ کے والد مرحوم احمد یار خاں دولتانہ شعر بھی کہہ لیتے تھے، پھر انہیں اچھے شعر کی پہچان بھی تھی۔

خان لیاقت علی خان نے اپنے ایک بیان میں عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ ہمارے خیال میں اب مسلم لیگ کو مضبوط کرنا ذرا مشکل کام ہے، خان لیاقت علی خان اور دوسرے وزراء یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قصرِ وزارت کی تعمیر سے جو چونا گارا بچ گیا ہے، اسے ذرا سلیقہ سے خرچ کیا جائے تو مسلم لیگ کی عمارت خود بخود مضبوط ہو جائے گی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، جو عمارت گر رہی ہو اسے مضبوط کرنا بڑا کام ہے، اُدھڑا اُدھڑا دے کے سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ تو ممکن ہے کہ خضر وزارت سے چونے کچھ تغاریں مل جائیں اور یار لوگ کوچی لے کے لیگ کی دیواروں پر سفیدی پھیر دیں، لیکن اس طرح زیادہ سے زیادہ داغ دھبے مٹ جائیں گے، اور دیکھنے والوں کو یہ پرانی عمارت بالکل نئی معلوم ہونے لگے گی، لیکن کوچی لے کے سفیدی پھیر دینے سے عمارت مضبوط تو نہیں ہو جایا کرتی۔

شیخ عبداللہ نے اچھا کیا کہ جشنِ آزادی منا لیا۔ اول تو زندگی ہی کا کوئی اعتبار نہیں، پھر دولت کی طرح وزارت بھی ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جشن، جلسے اور جلوس کے بغیر لیڈر کی زندگی بے کیف ہے، زندہ باد کا ایک نعرہ لگ گیا اور زندگی میں تھوڑی سی ہما ہمی پیدا ہو گئی، ورنہ لیڈر ہیچ اور لیڈری ہیچ۔ اور زندہ باد کے نعرے سن کے لیڈر ہی کو آسودگی نصیب نہیں ہوتی، نعرے لگانے والوں کا بھی تو فائدہ ہے، پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں، کشش اور حنجرہ کے بہت سے امراض کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شیخ صاحب نے آزادی حاصل کرنے سے پہلے آزادی کا جشن منا لیا، تھامیا۔

موجود، دیوان موجود، ہندوستانی فوجیں موجود اور ہندوستان کے قرض کا بارِ گراں سر پہ لیکن آزادی نہ ملے تو کیا، شیخ صاحب جشن بھی نہ منائیں، جشن منایا جا چکا، آزادی بھی مل جائے گی اور آزادی ملے نہ ملے، جیتے جی ایک دفعہ جشن کا ہنگامہ تو دیکھ لیا۔ مہاراجہ سر پہ مسلّط ہے تو ہوا کرے، دیوان کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے تو کوئی پروا نہیں، ملک میں لڑائی کی آگ بھڑک رہی ہے تو بھڑکتی رہے، ہندوستانی فوجیں اکسٹھ باسٹھ کرتی پھرتی ہیں تو اس سے ہمیں کیا؟ لوگ بھوکے مر رہے ہیں تو مرتے رہیں، شیخ صاحب نے جشن تو دیکھ لیا تقریر تو کر لی، زندہ باد کے نعرے تو لگوا لئے۔

پچھلے دنوں کچھ مزدور دلّی کے پُرانے قلعہ کے پاس کھدائی کا کام کر رہے تھے کہ انہیں پانچ مورتیاں ہاتھ آئیں جو خدا جانے کب سے زمین میں دبی پڑی تھیں۔ ہندو مہا سبھا والوں کو خبر ملی تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور مورتیوں کو ایک نظر دیکھ کے حکم لگایا کہ پرانے زمانے میں یہاں ضرور کوئی مندر ہوگا۔

لوگ پرکا کوا اور رائی کا پربت بنا لیتے ہیں، ہندو مہا سبھا والوں نے پانچ مورتیوں سے مندر بنا لیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن سُنا ہے کہ اس انکشاف کی بنا پر مہا سبھا نے حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا ہے کہ پرانا قلعہ ہمارے حوالے کر دیا جائے۔

یہ مورتیاں قلعہ میں سے ملتیں یا قلعہ مورتیوں کے اندر سے نکل آتا تو اور بات تھی۔ نہ قلعہ مورتیوں کے اندر نہ مورتیاں قلعہ کے اندر، پھر بھی ہندو مہا سبھا والے قلعہ پر برابر حق جمائے جا رہے ہیں۔ گویا جس مکان کے پاس کبھی کوئی مندر رہا ہے، وہ مندر ہندو مہا سبھا کا ہے، چاہے یہ مکان دلّی میں ہو یا آگرہ میں، کلکتہ میں ہو یا مدارس میں، اس کے پاس سے کہیں مورتی نکل آئی اور مندر بنا اور مندر کا وجود ثابت ہو گیا، تو مکان پر قبضہ مسلّم۔

ہمارے ہاں یار لوگوں کو الاٹ منٹ کی بڑی بڑی ترکیبیں یاد ہیں، لیکن ایسی نادر ترکیب کسی کو نہیں سوجھی۔ ہندو مہا سبھا والوں کو اسمبلی ہال، گورنر جنرل کے محل اور بڑے بڑے دفتر کے آس پاس کے علاقے میں بھی قسمت آزمائی کرنی چاہیئے، کیا عجب ہے، یہاں بھی ایک آدھ مورتی نکل آئے؟

ایک معاصر کا بیان ہے کہ پیرزادہ عبدالستار ستار بجاتے ہیں، اسی لئے ستار ان کے نام کا جزو ہے۔ لیکن پیرزادہ صاحب صرف ستار ہی نہیں بجاتے، خیال اور ٹھمری بھی گاتے ہیں۔ چنانچہ جن دنوں وہ سندھ کے وزیر تھے، آل انڈیا ریڈیو پہ گانے کے لئے ایک آدھ دفعہ دلی بھی تشریف لائے تھے، نہ جانے ریڈیو پاکستان پہ انہیں گانے میں کیوں تامل ہے؟ یہ مانا کہ وہ پاکستان کے وزیر خوراک ہیں، لیکن موسیقی بھی تو آخر "غذائے روح" ہے، چاول کا انتظام نہیں ہو سکتا تو نہ سہی، کم از کم ہمیں "بلاول" سے تو محروم نہ رکھئے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ اتنے میں معلوم ہؤا ہے کہ مسجد وزیر خاں میں جمعہ کو قائدِ اعظم کے جہلم کے سلسلے میں جو جلسہ ہؤا ہے، اس میں ایک قرار داد یہ منظور کی گئی ہے کہ ریڈیو پاکستان کے پروگرام میں ملکہ پکھراج اور ملکہ موتی وغیرہ ہا کا گانا نہ رکھا جائے۔ ہمارے خیال میں اگر ملکہ پکھراج کی جگہ وزرا گانا شروع کر دیں تو غالباً مسجد وزیر خاں کے پیش امام صاحب بھی اس درباری کے قائل ہو جائیں۔ پیرزادہ صاحب قوالی شریف سنائیں گے شیخ کرامت علی اور میاں محمد ممتاز دولتانہ دوگانہ گائیں گے۔ فرمایئے اس پروگرام پر علما کو کیا اعتراض ہے؟

آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال کا سکونتی مکان جاوید منزل جس سڑک پہ واقع ہے، وہ میو روڈ کہلاتی ہے۔ پچھلے دنوں جب سڑکوں کو "مشرف باسلام" کرنے کا معاملہ سامنے آیا تو کارپوریشن نے میو روڈ کا نام "اقبال روڈ" رکھ دیا، اس کے بعد کارپوریشن نے ارادہ

کیا کہ "منٹو پارک" کو مشرف باسلام" کر کے اس کا اسلامی نام "اقبال پارک" رکھا جائے، لیکن حکومت نے یہ تجویز منظور نہ کی، چنانچہ منٹو پارک بدستور منٹو پارک ہے اور اسے دائرۂ اسلام میں لانے کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

لارڈ میو اور لارڈ منٹو دونوں ہندوستان کے گورنر جنرل رہ چکے ہیں، حکومت نے سوچا ہو گا کہ ایک گورنر جنرل کی یادگار تو "نذرِ اقبال" ہو چکی، کم از کم لارڈ منٹو کی یادگار تو قائم رہے اور اگر قائم نہ رہے تو کسی وزیرِ اعظم کے پلّے پڑے، بات ٹھیک بھی ہے، لارنس باغ اسلام قبول کر کے جناح باغ بن گیا ہے تو منٹو پارک کو قبولِ اسلام کے بعد ناظم الدین پارک یا لیاقت علی پارک بننا چاہئے، شعرا اور اہلِ علم کا کیا ہے، انہیں تو چھوٹی چھوٹی سڑکوں بلکہ گلی کوچوں پر ٹالا جا سکتا ہے، لیکن بڑی بڑی سڑکوں اور پارکوں کے نام ان لوگوں کے ناموں پر رکھنے چاہئیں جو کم سے کم کسی صوبے کے وزیرِ اعظم تو رہے ہوں۔ گویا اس معاملہ میں بھی وہی طریقہ ملحوظ رکھا جائے گا جو کوٹھیوں کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔

سڑکوں اور گلی کوچوں کو مشرف باسلام کرنے اس تبلیغی کارنامہ کے ساتھ ساتھ مسلمان مشاہیر کی یادگاریں قائم کرنے کا معاملہ ہماری حکومت کے پیشِ نظر ہے، لیکن یہ معاملہ اس طریقے سے انجام پانا چاہئے کہ مشاہیر کی یادگاریں بھی قائم ہو جائیں اور وزیروں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کو شکایت کا موقع بھی نہ ملے۔ مثلاً گڑھی شاہو کا نام گڑھی سید جمال الدین رکھ دیا جائے یا خالصہ سٹریٹ کو عبید اللہ سندھی سٹریٹ کہا جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن مال روڈ، میکلوڈ روڈ، ڈیوس روڈ یا مشہور پارکوں کو ابھی سے سرکار محفوظ رکھنا چاہئے، نہ جانے کس وقت کیسی ضرورت پیش آ جائے۔

وزیروں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے بعد کارپوریشن کے ممبروں کا درجہ آتا ہے۔ خواجہ دل محمد تومیونسپلٹی مرحوم کے زمانے سے ایک خاصی بڑی سڑک بغل میں مارے بیٹھے ہیں۔ کارپوریشن کے دوسرے ممبروں کو بھی ایک آدھ سڑک، سڑک نہیں تو کوئی کوچہ اور کوچہ نہیں تو کوئی چھوٹی موٹی گلی ہی الاٹ ہو جانی چاہیئے۔ مثلاً فیروز سنز والے ڈاکٹر وحید "آبائے شہر" میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور ایک کارپوریشن ہی کیا یونیورسٹی میں بھی ان کی شہرت کے جھنڈے گڑے ہیں، اس کے باوجود لاہور بھر میں کوئی چھوٹی موٹی گلی بھی ایسی نہیں جسے ڈاکٹر صاحب بلا شرکت غیرے اپنا سکیں۔

کارپوریشن کا اجلاس ہو رہا تھا کہ چند خواتین جا پہنچیں اور کہنے لگیں، غضب خدا کا لاہور میں ڈھائی لاکھ روپے روزانہ سگرٹوں پر خرچ ہو جاتے ہیں، مردوں کو چاہیئے کہ سگریٹ پینا ترک کر دیں۔ اُدھر سے جواب ملا کہ عورتوں کی چوڑیوں پر بھی تو لاکھوں روپے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ سُن کے خاتون آگے بڑھیں، "کھن کھن" کی آواز آئی اور ساتھ ہی میز کے نیچے رنگین چوڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ڈھیر سا لگ گیا، افسوس ہے، مردوں سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیاں نکال نکال کے وہیں چوڑیوں کے ساتھ ڈھیر کر دیتے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ مرد چوڑیاں پہن کے گھروں میں بیٹھ جائیں، عورتیں سگریٹوں سے خود نبٹ لیں گی۔

بہرحال خواتین کو صرف سگریٹوں پر اعتراض ہے، حقہ پر کوئی اعتراض نہیں اور اعتراض بھی کیسے ہو سکتا ہے، اردو کی پہلی کتاب کا یہ فقرہ "ماں بچے کو گود میں لیئے بیٹھی ہے باپ حقہ پی رہا ہے" ہمارے ملک میں ماں کی ماتا کا ذکر جب آئے گا، حقہ کا نام ضرور لیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں تو یہ مردوں کی بدذوقی ہے کہ سگریٹ کو چوڑی کا مدِمقابل سمجھتے ہیں، سگریٹ کی سند نہ شاعری سے مل سکتی ہے، نہ اردو کی پہلی کتاب سے، اور حقہ اور چوڑی دونوں کی سند موجود ہے، مثلاً فارسی کا یہ

شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

سیہ چوڑی بدست آں نگارے
بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مارے

اور حقہ کے جواز میں بیسیوں شعر موجود ہیں ذرا میر حسن کا یہ شعر سنئے ؎

لبِ ناز پر اپنے مہنال دھر
نکالے نغمی پردے سے دردِ جگر

آپ کو وہ زمانہ یاد ہوگا، جب روپوں کی جانچ پرکھ میں بڑا اہتمام کیا جاتا تھا، اور دکاندار روپوں کو بجا بجا کے اُن کی آواز کا امتحان کرتے تھے، دندانے دیکھتے تھے، جب اچھی طرح اطمینان ہو جاتا تھا کہ روپیہ کھرا ہے اور تال سُر میں کہیں کوئی خرابی نہیں تو اسے شرفِ قبول حاصل ہوتا تھا، ورنہ لوٹا دیا جاتا تھا۔

اکثر لوگ تو ایسے کن رس تھے کہ تانت باجی اور راگ بوجھا۔ یعنی روپیہ بجا یا اور سمجھ میں آگیا کہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ بعض کا یہ حال تھا کہ پہروں روپے بجا بجا کے دیکھتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور سچ پوچھئے تو سُروں کی نبض پہچان کے کھوٹے کھرے کی جانچ کرنا خاص خاص لوگوں کا کام ہے، یہ کس بس ہمت ہے کہ پہروں رُپے بجا بجا کے یہ سوچتا رہے کہ یہ کون سُر ہے، دھیوت یا نکھاد، مدھم یا پنچم، پھر نکھاد تیور لگا ہے یا کومل، چنانچہ کبھی کبھی تو کھوٹے روپوں کی وجہ سے اکثر لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی تھی۔

شکر ہے، وہ زمانہ ختم ہوا، چاندی کے روپوں کی بجائے ٹکسال ہی اس قسم کے بے سُرے رُپے ڈھلنے لگے، جن کی آواز کا امتحان کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی، بس صورت دیکھی اور ان کی معقولیت کے قائل ہو گئے۔ دندانے دیکھ کے اطمینان کر لیا، گویا سُر تال اور گلنے بجانے کے قصے سے نجات ہو گئی اور جو لوگ بھینس کے ڈکرانے اور بلبل کے چہچہانے میں تمیز نہیں کر سکتے، وہ خدا کا شکر بجا لائے، لیکن ایک اور حادثہ

پیش آیا، یعنی ریزگاری پر ونسٹنٹ کے طور پر "واک آؤٹ" کر گئی۔ "واک آؤٹ" تو صرف چاندی کی دوّنیوں اور چوّنیوں کو کرنا چاہئے تھا، کیونکہ چاندی کے روپے سے اُن کی رشتہ داری تھی، لیکن اس موقع پر نکل کی دوّنیوں اور تانبے کے پیسوں نے بھی "ریزگاری برادری" کا ساتھ دیا اور یہ ساری برادری ہمیانیوں اور تجوریوں میں اس طرح جا چھپی کہ اس کا سُراغ لگانا دشوار ہو گیا۔

اب نہ جانے برسوں کی گوشہ نشینی کی وجہ سے جو قید سے کسی طرح کم نہیں تھی، نکل کی دوّنی کو یرقان ہو گیا، یا کوئی اور حادثہ پیش آیا۔ بہرحال کچھ عرصے سے دیکھ رہے ہیں، کہ بازار میں دو قسم کی دوّنیاں ملتی ہیں، ایک کے چہرے پر تو رُخ رُخ نور برستا ہے، دوسری قسم کی دوّنیوں کی رنگت پیلی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی برسوں کا بیمار رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ریزگاری برادری کو کچھ ایسا فروغ نصیب ہوا کہ سو روپے کا نوٹ بھی بھنا لیجیے، جب بھی ریزگاری ہی ملے گی اور اُسے اٹھانے کے لئے قُلی کو بلانا پڑے گا۔ بہرحال یہ تو کوئی ایسی پریشانی نہیں، مصیبت یہ ہے کہ بازار میں کوئی دکاندار پیلی دوّنی لیتا ہی نہیں۔ آپ نے جہاں پیلی دوّنی نکالی، اُس نے دور سے دیکھ کے کہہ دیا "دوّنی پیلی ہے"۔ اور آپ ہیں کہ بس اس خیال سے شرمائے جا رہے ہیں کہ میں جیب میں پیلی دوّنی ڈالے کیوں پھر تا رہا؟

اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن افسوس ہے کہ کہیں کہیں تو پیلی دوّنی کے لینے دینے پر معاملہ لپّا ڈگّی اور ہاتھا پائی سے گزر کر خون خرابے تک جا پہنچا ہے اور قتل کی کئی وارداتیں بھی ہو گئی ہیں۔ گویا "پیلی دوّنی" "زرد خطرہ" بنتی چلی جا رہی ہے، دکاندار پیلی دوّنی لیتے نہیں اور جن لوگوں کے پاس یہ دوّنیاں آ گئی ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ اس دور میں جہاں "بناسپتی" قسم کا وزیر چل جاتا ہے بلکہ سیاست کے ہاٹ بازار میں کھری اشرفی کے مول بکتا ہے۔ پرائم بڈھے، جن کے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں

آنت سر ہل رہا ہے، ہاتھ کانپ رہے ہیں، دو قدم چلتے ہیں اور ہانپنے لگتے ہیں، بڑی بڑی گدیاں سنبھالے بیٹھے ہیں۔ بیلی دوّنی کیوں نہ چلے؟ اسے چلنا چاہئے اور ضرور چلنا چاہئے۔

متعدّد اخبارات نے اس قضیے کا ذکر کر کے حکومت سے درخواست کی ہے کہ اس سلسلے میں ضرور کوئی اعلان ہو جانا چاہئے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بیلی دوّنی کھوٹی ہے یا کھری، لیکن ہمارے ان معاصرین کو معلوم نہیں کہ نئے اور پرانے وزیر اور وزارت کے امیدوار سب کے سب خود اسی قسم کے مخمصے میں اُلجھے ہوئے ہیں، یعنی وہ سب بھی اسی فکر میں ہیں کہ کسی طرح اُن کی "بیلی دوّنیاں" چل جائیں۔ بعض لوگوں نے تو جیب میں دوّنیاں ہی دوّنیاں بھر رکھی ہیں، ایک دفعہ نہ سہی، شاید ایک ایک دو دو کر کے چل جائیں۔ اصل میں دُنیا کا عجب ہنجار ہے، کتنے جھوٹ ہیں جو سیاست کی منڈی میں سچ کے بھاؤ بک رہے ہیں اور کتنے سچ ہیں جو بس "بیلی دوّنی" بن کے رہ گئے ہیں۔

ہم نے بڑے بڑے دیانتدار لوگوں کو دیکھا ہے کہ غلطی سے کوئی کھوٹا سکہ ان کے گلے پڑ جاتا ہے تو وہ بس اسی فکر میں رہتے ہیں کہ یہ کسی نہ کسی طرح چل جائے، پنواڑی نے لوٹا دیا تو تانگے والے کے حوالے کیا، اس نے دھوکا نہ کھایا تو کہیں اور چلانے کی کوشش کی۔ غرض بددیانتی کو پھیلانے اور ترقی دینے میں کھوٹے سکوں کا بڑا حصہ ہے، پھر سیاست کی منڈی کے اُن آڑھتیوں اور صرافوں کی دیانتداری کا کیا کہنا جن کی دکان پر کھوٹے سکوں کے انبار لگے ہیں اور بیلی دونیوں سے تجوری بھری پڑی ہے

پچھلے دنوں اطلاع ملی تھی کہ اردو کے ایم، اے کا نصاب تجویز کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب "تذکرہ" کو اس کی علمی اور ادبی خوبیوں کی بنا پر نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ "تذکرہ" کوئی سیاسی کتاب نہیں اور اس میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، پھر بھی کچھ لوگ

جن میں انجمن حمایت الاسلام کی مجلس منتظمہ کے ارکان بھی شامل ہیں، برابر کیے جا رہے ہیں، کہ ہم کسی کو یہ کتاب پڑھنے نہیں دیں گے، کیونکہ اس کے مصنف ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جو ہمیشہ کانگرس کی حمایت کرتے رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ہم ہندوستان کے وزیر تعلیم کی تصنیف کیوں پڑھیں؟ اپنے وزیر تعلیم شیخ کرامت علی صاحب سے یہ کیوں نہ عرض کریں کہ وہ فرصت کے اوقات میں اپنا "تذکرہ" لکھ ڈالیں۔ یہ "تذکرہ" مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ" سے زیادہ دلکش ہوگا، اور پھر یہ بھی تو ہے کہ شیخ صاحب ہمیشہ مسلم لیگ میں رہے ہیں، اور ان کے سیاسی عقائد سے انجمن حمایت اسلام کے ارکان کو قطعاً اختلاف نہیں۔

اگر لوگوں کا انداز یہی رہا تو اردو زبان بہت سی کتابوں سے محروم ہو جائے گی، مثلاً سر سید احمد خاں مرحوم کی کتابیں پڑھنا اس لیے جرم قرار دیا جائے گا کہ وہ دینی عقائد کے لحاظ سے نیچری اور سیاسیات میں انگریزوں سے تعاون کے حامی تھے۔ غالب کا کلام پڑھنے کی ممانعت کر دی جائے گی، کیونکہ مرحوم نے معمولی معمولی انگریزوں کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتابیں اس لیے ناقابلِ التفات ہیں کہ اُن کا رجحان بھی کانگریس کی جانب تھا اور سجاد حسین مرحوم تو پکے کانگریسی تھے۔ کوئی سچا مسلمان ان کی کسی کتاب کو کیسے ہاتھ لگا سکتا ہے، یہ حال رہا تو اردو میں زیادہ تر "کٹورہ بھر خون عرف دو دھاری تلوار"، "باوفا قاتل"، "وہ عورت جس نے کرو کھایا" اور اس قسم کی کچھ کتابیں رہ جائیں گی، جو راسخ العقیدہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی ہیں اور باقی کتابیں علامہ محمد اسد اور مولانا محمد بخش مسلم کو لکھنی پڑیں گی، مسلم نیشنل گارڈ کے ارکان میں سے کسی صاحب نے کوئی "سی حرفی" لکھی ہو تو انہیں چاہیے کہ انجمن حمایت اسلام کے دفتر بھیج دیں، کیا عجب کہ اُن کی تقدیر جاگ اُٹھے، یعنی ان کی کتاب ایم، اے کے نصاب میں شامل کر لی جائے۔

معلوم ہوا ہے کہ شاہ عبداللہ نے فلسطین کو شرق اردن میں شامل کرنے کے لئے برطانیہ سے ایک کروڑ پونڈ مانگے ہیں۔ شیخ عبداللہ کو بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کے ہندوستان کی حکومت سے کروڑ دو کروڑ روپے وصول کر لینے چاہئیں۔ شرق اردن میں الحاق کے نسخے پر ایک پونڈ خرچ ہوتے ہیں، کشمیر میں یہ نسخہ ایک کروڑ روپے میں تیار ہو جائے تو کیا بُرا ہے؟

ایران میں شیخ سعدی کے بہت سے ایسے لطیفے مشہور ہیں جو کسی کتاب میں تو نہیں ملتے، البتہ زبان زد عوام ضرور ہیں۔ اس قسم کا ایک لطیفہ سنئے، شیخ گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ نے لونڈی سے کہا "دیکھو کون ہے؟" وہ دیکھ کے آئی تو کہنے لگی "غبداللہ آیا ہے" شیخ نے کہا "غبداللہ کیا ہو گا، عبداللہ ہو گا"، لونڈی بولی "بر عینش نقطہ است" چونکہ یہ شخص جو شیخ سے ملنے آیا تھا اور جس کا نام عبداللہ تھا، ایک آنکھ سے کانا تھا اور عربی میں آنکھ کو عین کہتے ہیں، اس لئے یہ لطیفہ مزہ دے گیا۔

شرق اردن کے شاہ عبداللہ اور کشمیر کے شیخ عبداللہ دونوں کی ظاہری آنکھیں اگرچہ صحیح و سلامت ہیں لیکن باطنی آنکھیں ماؤف ہیں، اس لئے دونوں غبداللہ ہیں، ایک غبداللہ شرق اردن اور فلسطین دونوں پر انگریزوں کو مسلّط رکھنا چاہتا ہے، دوسرا غبداللہ پورے کشمیر کو ہندوستان کے حوالے کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ کشمیر کے غبداللہ کو بھی شرق اردن بھجوا دیا جائے، ایک غبداللہ بادشاہ، دوسرا وزیر، "وزیرے چنیں شہریارے چناں"۔

دو تین دن سے وزارت کے متعلق جو خبریں آ رہی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ وزراء نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ بدستور اختلاف کی آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے اور بیرونی مداخلت ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔ گویا ان لوگوں نے نفاق پر اتفاق کر لیا ہے، اور

اس راستے سے ذرہ بھر ادھر اُدھر ہونا نہیں چاہئے۔

ہمارے کھلنڈرے وزرا آنکھ مچولی کھیلنا چاہتے ہیں، تو شوق سے کھیلیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس حالت میں بچاری قوم کیا کرے؟ کیا ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم بھی دنیا بھر کے کام چھوڑ چھاڑ کے اختلاف کی آنکھ مچولی کا تماشا دیکھتے رہیں؟ مرحوم فیضی نے اپنے اس شعر میں اسی قسم کی کسی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے ؎

دلِ من در کفِ طفلیست کہ از بے خبری
بلبلش مُردہ بکنجِ قفسے افتادہ است

ایک مولوی صاحب سے پچھلے دنوں وزراء کے اختلاف کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ امت کا اختلاف باعثِ رحمت ہے، اس لئے ہمارے وزرا جنہوں نے اپنی زندگی میں اختلاف کے سوا اور کچھ نہیں کیا، رضوانِ الٰہی کے مستحق ہیں۔ محکمہ تعلقاتِ عامہ کو یہ نکتہ پلے باندھ لینا چاہئے، اس کی بنا پر ایسا اچھا پریس نوٹ مرتب ہو سکتا ہے، جس کے لفظ لفظ سے نیک نامی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔

کچھ اور سنا، مسٹر غضنفر علی خاں جو خان ممدوٹ کی چوٹ سمجھے جاتے تھے وزیر سے سفیر بنے اور اب ایران جا رہے ہیں، ان کی بدولت وزارتِ مہاجرین لشٹم پشٹم چلی جا رہی تھی، اب اس کا بھی کوئی سہارا نہ رہا۔ ادھر مغربی پنجاب کی وزارت میں اختلاف کی رحمت سایہ فگن ہے، اُدھر وزیر مہاجرین رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔ لاہور میں مکھیوں مچھروں اور وزارت کے جھگڑوں کے سوا کیا رکھا ہے، ایران میں طہران ہے، اصفہان ہے، مشہد ہے، شیراز ہے ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آب رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ را

پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ عید کے روز گلستان فاطمہ میں ایک پارٹی ہو گی جس میں سردار عبدالرب نشتر بھی شریک ہوں گے۔ آج معلوم ہوا ہے کہ پارٹی کا ارادہ ترک کر دیا گیا ہے، کیونکہ سردار عبدالرب نشتر راولپنڈی کے ملٹری ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں گویا یہ سارا قصہ "برات کی تیاری اور دولہا غائب" کا مضمون ہو کے رہ گیا ہے۔ شکر ہے کہ عید کی نماز کے متعلق اخباروں میں یہ اعلان ہو گیا، ورنہ بہت سے لوگ تو اس وہم میں پڑے رہتے کہ اب کے عید کی نماز بھی ہو گی یا نہیں۔

بہر حال سردار عبدالرب نشتر نہ تو شاہی مسجد کے خطیب ہیں، نہ پیش امام، نہ قاضی، نہ مفتی، نہ فقیہ، پھر بھی ان کی ناسازیٔ طبع کا یہ اثر ہے کہ عید کی پارٹی منسوخ کر دی گئی۔ اگر خدانخواستہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی بیمار ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عید ہی نہیں ہو سکتی۔

پچھلے دنوں سے مغربی پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کے پاس طلبہ کی جانب سے اس مضمون کے خط آ رہے ہیں کہ یا تو ہمیں پاس کر دیجئے، ورنہ آپ کی خیر نہیں بعض طلبہ کو اس بات پر اصرار ہے کہ جن مضامین میں ہم فیل ہوئے ہیں۔ ان کا دوبارہ امتحان لیا جائے۔ ہمارے خیال میں طلبہ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ جن مضامین میں ہم فیل ہوئے ہیں۔ ان کا امتحان دوبارہ لیا جائے اور کسی طالب علم کو فیل نہ کیا جائے۔

بعض طلبہ نے اپنے خطوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ وقت کی نزاکت پر غور کیجئے اور ہمیں پاس کر دیجئے تاکہ ہم پاکستان کی خاطر کٹ مریں ـــــ لیکن اگر یہ طلبہ پاکستان کی خاطر کٹ مرنا چاہتے ہیں تو امتحان پاس کرنے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟ بی اے یا ایم اے کی ڈگری نہ تلوار ہے نہ بندوق، نہ توپ ہے نہ ٹینک، اور شہیدوں کو تو عاقبت میں بھی امتحان پاس کرنے کی ایسی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مرزا غالب نے کہا ہے ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کوہ کن کی رسم پرستی تو صرف اس قدر تھی کہ تیشہ بغیر مر نہ سکا، لیکن آج کل کے رسم پرستوں کو مرنے کے لئے تیشہ کی نہیں بلکہ بی، اے یا ایم، اے کی ڈگری کی ضرورت ہے۔

طلبہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رجسٹرار صاحب کو دھمکیاں دینا بے سود ہے، وہ نہ کسی کو فیل کر سکتے ہیں، نہ پاس۔ اور اگر فیل پاس کا امتیاز ہی اٹھ جائے، جو شخص امتحان دے اسے پاس کر دیا جائے تو رجسٹرار اور ممتحنوں بلکہ خود یونیورسٹی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے بلکہ ایسی حالت میں تو پڑھنا پڑھانا ہی غیر ضروری ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ سکول اور کالج بند کر دیئے جائیں اور سال کے سال قرعہ اندازی کر کے لوگوں کو ڈگریاں اور سندیں الاٹ کر دی جایا کریں۔ اس طرح ہمارے ہاں، لکھنے پڑھنے کے بغیر کثرت سے لکھے پڑھے نظر آئیں گے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ دیکھئے صاحب انگریزوں کے عہدِ حکومت میں طلبہ کو فیل کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا اور پاکستان کی آزاد مملکت میں بھی لوگوں کو برابر فیل کیا جا رہا ہے۔

یوں تو لاہور میں کئی بزرگوار علّامہ کے لقب سے مشہور ہیں، لیکن مستند قسم کے علّامہ صرف دو تین ہیں۔ ایک تو یہی علّامہ اسدؔ جو خان ممدوٹ کی وزارت کے زمانے میں تعمیرِ ملّت کرتے تھے، اور اب ملّت کو "بے تعمیر" چھوڑ کے یونیورسٹی میں دندنا رہے ہیں۔ اور دوسرے علّامہ علاؤالدین صدیقی جو لیگ کے سکرٹری بھی رہے ہیں بلکہ صدارت کی "امیدواری" تک فرما چکے ہیں اور اب صرف مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں لیکن جب سے انہوں نے ہندوستانی فلموں پر ریویو لکھنے شروع کئے ہیں، لوگ انہیں "فلّامہ" کہتے ہیں گویا لاہور میں لے دے کے ایک ہی مستند قسم کا "علّامہ" رہ گیا ہے۔

"فلامہ" کی اصطلاح پر ہمیں خیال آیا کہ اگر فلم بروزن علم کو عربی کا لفظ تصور کر کے اس سے الفاظ مشتق کیے جائیں تو تمام فلمی اصطلاحات کا ترجمہ بآسانی ہو سکتا ہے مثلاً افلام، تفلیم، تفلّم، استفلام، انفلام، مفاطمہ وغیرہ سے سیکڑوں الفاظ گھڑے جا سکتے ہیں۔ علم کی جمع علوم ہو سکتی ہے تو فلم کی جمع فلوم ہونی چاہیے۔ اسی طرح فلموں کے مکالمہ کو فلمی مکالمہ کہنے کی بجائے "مفالمہ" کہنا چاہیے۔ علم سے عالم درست ہے اور اس کی جمع علماء ہے تو فلم سے فالم بھی صحیح ہوا اور اس کی جمع "فلما" بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی معمولی قسم کا عالم فلم سازی کے فن کی طرف توجہ کرے تو اسے فالم کہہ لیجیے لیکن علامہ صدیقی جیسے بزرگوار کو فلامہ ہی کہنا پڑے گا۔

اسی طرح کیمرہ، اسم آلہ کے عام وزن پر "مفلم" کہنا چاہیے اور سٹوڈیو کو "مفلَم"، فلم چھوٹا یعنی دو تین ریلوں کا ہو تو اسے "فلیم" کہنا چاہیے، کیونکہ عربی میں اسم تصغیر بنانے کا عام قاعدہ یہی ہے۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ افراط تفریط بری ہے۔ لیکن جب فلم کے لیے یہ فقرہ استعمال کرنا پڑے تو ہم کہیں گے کہ افلام تفلیم بری چیز ہے۔

کارپوریشن نے اعلان کیا کہ لاہور میں جو ٹوٹی پھوٹی اور جلی ہوئی عمارتیں ہیں انہیں گرانے کا کام عنقریب شروع کر دیا جائے گا اور اس کام میں پورا ایک برس صرف ہو گا۔ یہ ظاہر ہے کہ جن عمارتوں کے انہدام میں ایک سال کی مدت خرچ ہو سکتی ہے، ان کی تعمیر پہ پوری ایک صدی نہ سہی، پچاس برس تو ضرور صرف ہوں گے۔

اور کیا عجب ہے کہ تعمیر کی نوبت ہی نہ آئے اور ان عمارتوں کو گرانے ہی میں عمریں گزر جائیں، کیونکہ کارپوریشن کے اکثر تخمینے غلط ثابت ہوا کرتے ہیں۔ لاہور میونسپلٹی نے اندازہ لگایا تھا کہ پانچ برس کے اندر اندر لاہور بہشت بن جائے گا۔ میونسپلٹی صاحبہ لاہور کو کارپوریشن کے حوالے کر کے خود تو جنت نصیب ہو گئیں اور لاہور جہاں تھا وہیں ہے

کہتے ہیں، ایک شخص اپنے لڑکے کو کسی بزاز کے پاس لے گیا اور کہنے لگا، اسے بزازی کا کام سکھا دیجئے۔ چھ سات مہینے کے بعد اُس طرف سے گزر ہُوا تو پوچھا:۔

"لڑکے نے کتنا کام سیکھ لیا؟"

بزاز کہنے لگا "آپ کا لڑکا تھان کھول تو لیتا ہے لیکن لپیٹ نہیں سکتا"

کھولنے سے لپیٹنا اور گرانے سے بنانا زیادہ مشکل ہے، اس لئے ممکن ہے کہ کارپوریشن ان عمارتوں کے انہدام میں تو کامیاب ہو جائے لیکن ان کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر نہ کر سکے۔

اور ایک بچاری کارپوریشن پر کیا موقوف ہے، ہمارے، اکثر لیڈروں، وزیروں، امیروں کا یہی حال ہے۔ یعنی وہ تھان کھول تو لیتے ہیں لیکن لپیٹنا نہیں جانتے۔ انہوں نے تھان کھول کے یہ سمجھ لیا ہے کہ اصل کارنامہ یہی ہے، حالانکہ ابھی انہیں "لپیٹنے" کا مرحلہ بھی طے کرنا ہے۔

سُنا ہے کہ برطانیہ، ہندوستان، پاکستان مل کے برما کو ۲۶ کروڑ روپیہ نقد اور اسلحہ قرض دے رہے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پاکستان کو کتنا روپیہ دینا پڑے گا، لیکن یہ تو ہونے سے رہا کہ پاکستان دس بیس ہزار روپیہ خیرات کے طور پہ دے کے چپکا ہو رہے، قرض کی رقم بہت ہی کم بھی ہوئی تو پانچ سات کروڑ سے کیا کم ہو گی؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کہاں کا ساہوکار ہے کہ دوسرے ملکوں کو قرض دیتا پھرے اور قرض تو ہُوا، ہمارے پاس اتنا اسلحہ کہاں سے آ گیا کہ دوسرے ملکوں کی ضرورتیں پوری کرتے رہیں۔ اسلحہ کا کارخانہ ابھی قائم ہُوا نہیں کہ اُدھار مانگنے والے آ موجود ہوئے، شاعر نے اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ ؎

تجھے کیا فکر ہے اے دل! اِدھر صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

برما والے کہتے تھے کہ جو ہو سو ہو ہم کامن ویلتھ میں ہرگز شامل نہیں ہوں گے لیکن انہیں بھی کامن ویلتھ سے آخر رشتہ جوڑنا ہی پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ پھاٹک سے داخل نہ ہوئے چور دروازہ سے جا گھسے اور کھلم کھلا جا کے کرسی پر ڈٹ جانے کے بجائے چوکھٹ ہی پر بیٹھے رہے تاکہ کامن ویلتھ میں شامل بھی رہیں اور اس سے باہر بھی سمجھے جائیں۔ اسے "بیمے دروں بیمے بردں" قسم کی پالیسی کہتے ہیں، ہندوستان کی پالیسی بھی کچھ اسی قسم کی "داخل خارج" کی ہے "روپ چھپل" بھی اسی کو کہتے ہیں۔ وہ جو کل عرض کیا گیا تھا کہ "خارجی پالیسی" کو رنگوا لیا جائے، رنگ ذرا "میل خورے" قسم کا ہو تو داغ دھبے اور پیوند نظر نہیں آتے تو وہ ہندوستان ہی کی خارجہ پالیسی کے متعلق تھا لیکن اگر پاکستان کے لیڈروں نے بھی طے کر لیا ہے کہ خارجی پالیسی وہی پرانی رہے گی تو برما یا ہندوستان کی پیروی کی کیا ضرورت ہے، رنگوانا اور پیوند لگوانا الگ رہا دھلوانا بھی بے سود ہے۔

لاہور کی دکانوں اور چھوٹی بڑی فرموں پر ان دنوں جو سائن بورڈ نظر آرہے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو بڑی تیزی کے ساتھ انگریزی کی جگہ لے رہی ہے اور کہیں کہیں تو اردو کے ساتھ عربی بھی نظر آجاتی ہے۔ مثلاً پاپوش محل جوتوں کی دکان ہے دارالاسلحہ میں بندوقیں اور تلواریں بکتی ہیں، دارالملباس بزازی کی دکان کا نام ہے۔ انارکلی سے ذرا ادھر "دارالمقصرین" کا سائن بورڈ نظر آتا ہے، یہ حجام کی دکان ہے۔ خلیفہ جی نے اپنے اور اپنے شاگردوں کے لئے حجام یا نائی کے بجائے "مقصر" کا پرشکوہ نام تجویز فرمایا ہے۔

تعجب ہے کہ نائی تو حجام یا باربر کے بجائے "مقصر" کہلانا پسند کرتا ہے، ہیر کٹنگ سیلون جیسے پرطمطراق نام پر "دارالمقصرین" کو ترجیح دیتا ہے لیکن ہمارے محکموں کے افسر برابر اپنے عہدوں کے انگریزی نام استعمال کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ مثلاً مختلف صیغوں کے سکرٹری بدستور سکرٹری کہلاتے ہیں اور انہیں کوئی سکتر بھی کہہ دے

تو چڑ جاتے ہیں، حالانکہ سکرٹری کا صحیح ترجمہ منشی ہے۔ بہت تکلف کیجئے تو چیف سکرٹری کو میر منشی کہہ لیجئے۔ گویا مسٹر فدا حسین میر منشی ہیں۔ مختلف صیغوں کے سکرٹری منشی، اور ڈپٹی سکرٹری، نائب منشی۔ آخر ابوالفضل اور علامہ سعد اللہ خاں شاہجہانی منشی کہلاتے تھے تو ان لوگوں کو منشی کہنے میں کیا ہرج ہے؟

اگر لفظ "منشی" کو اپنے اصل معنوں میں استعمال کرنا ہے تو سکرٹری کو منشی کہنا پڑے گا، اور اگر اسے مروجہ معنوں میں استعمال کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تو نائی کو "خلیفہ" اور "ہیر کٹنگ سیلون" کو دارالخلافہ کہنا پڑے گا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ نائی کو "خلیفہ" خاکروب کو "مہتر" کہنے کی ممانعت کر دی جائے اور ادنیٰ قسم کے محرر بدستور "منشی" کہلاتے رہیں۔

بہر حال ہمیں سکرٹری اور چیف سکرٹری وغیرہ عہدوں کے نام بدلنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ سکرٹری کو منشی کہلانا ناپسند ہے تو یوں ہی سہی، اسے منشی کی بجائے "دبیر" اور چیف سکرٹری کو "سرِ دبیر" کہہ لیجئے۔ کم از کم سکرٹری اور چیف سکرٹری تو نہ کہئے، ورنہ ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں پاپوش محل اور دارالمقصرین بھی تہمد سے پتلون کی طرف ہجرت نہ کر جائیں۔ یعنی فینسی فٹ ویر اور فیلینسی ہیر کٹنگ سیلون کہلانا شروع نہ کر دیں۔

اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ بعض مشہور انجمنوں نے بھی ابھی اینگلو محمڈن قسم کے ناموں سے نجات حاصل نہیں کی مثلاً "خلافتِ پاکستان گروپ" ابھی تک بدستور "خلافت پاکستان گروپ" کہلا رہا ہے۔ گویا صرف لفظ "گروپ" نے اس اچھے خاصے اسلامی نام کو "اینگلو محمڈن" نام بنا رکھا ہے، اس جماعت کے ارکان کو "گروپ" کا کوئی ترجمہ نہیں سوجھا تھا تو اسے مشرف با سلام کر کے "غروف"، بنا لیتے۔ خلافت پاکستان غروف" ہر حال میں "خلافت پاکستان گروپ" سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور پھر "گروپ" کو دائرہ اسلام میں لانے کا ثواب الگ رہا۔

پچھلے دنوں ایک خبر آئی تھی کہ ایک مولوی صاحب رات بھر کسی مسجد میں ٹھہرے، صبح سویرے مصلّے بغل میں دبا کر چلتے بنے۔ مصلّی ڈیڑھ روپے میں فروخت ہُوا، لیکن ساتھ ہی مولوی صاحب چوری کے جرم میں دھر لئے گئے، اور اب بڑے گھر کی ہوا کھا رہے ہیں۔

یہ خبر بہت معمولی سی ہے، مسجدوں سے چٹائیاں اور جوتیاں وغیرہ اکثر چرائی جاتی ہیں اب اگر ایک شخص نے جس کی ڈاڑھی خاصی لمبی ہے، مسجد سے مصلّی چرا کے اسے ڈیڑھ روپے میں بیچ ڈالا تو کیا ہو گیا؟ اور پھر اس شخص کو "مولوی صاحب کیوں کہا جائے، ہر شخص جس کی داڑھی "یک مشت و چہار انگشت" ہو مولوی نہیں ہوتا اور یہ بچارا مولوی ہوتا تو کسی مسجد میں پیش امام ہوتا، یوں مصلّے نہ چراتا پھرتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ قریب قریب ہر اخبار نے اس خبر پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ایسی ایسی باتیں کہی ہیں، گویا مصلّے کی چوری کسی بہت بڑی سازش کا نتیجہ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان دنوں موضوع کا قحط ہے، اخبار والوں کو بڑی مشکل سے موضوع ہاتھ آتا ہے، یا تو وہ زمانہ تھا کہ وزارت اور وزارت کے ساتھ اسمبلی قائم تھی۔ ایک طرف شیعان ممدوٹ تھے، دوسری طرف شیعان دولتانہ، پھر وزرا کبھی لورینگ میں، کبھی میٹرو میں اور کبھی لاہور کی مسجدوں میں چہکتے پھرتے تھے اور روز اخبار نویسوں کو کوئی نہ کوئی موضوع ہاتھ آجاتا تھا۔ اب نہ وزارت ہے، نہ اسمبلی نہ دنگل ہیں، نہ پہلوان بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ شیعانِ ممدوٹ اور شیعانِ دولتانہ کچھ اس طرح اسمبلی سے نکالے گئے ہیں کہ بالکل "خارجی" ہو کے رہ گئے ہیں۔ اس حالت میں بچارے اخبار نویس کیا کریں، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص انہیں بغل میں مصلّی اور مُنہ پر داڑھی لئے نظر آتا ہے تو چیل کی طرح اس پر جھپٹا مارتے ہیں، یعنی اس کی ڈاڑھی اور مصلّے کو موضوعِ گفتگو بنا لیتے ہیں۔

علماء کرام کو اخبار نویسوں پر ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ انہوں نے موضوع کی کمیابی

بلکہ نایابی کی وجہ سے ڈاڑھی اور مصلّے کی اس داستان سے کام لیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" والا معاملہ ہے۔ دولتانہ اور ممدوٹ اگر یوں وقت پر دغا نہ دے جاتے یعنی سیاسیات سے بے تعلّق ہو کے نہ رہ جاتے تو اخبار نویسوں کو یہ کھکھیڑیں کیوں اٹھانی پڑتیں؟ وہ جس شخص کو ڈاڑھی میں چہرہ اور بغل میں مصلّیٰ چھپائے دیکھتے، اس کے پیچھے "شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پروبال" کہتے ہوئے دوڑ پڑتے۔ اصل میں یہ "نایسری" کی باتیں ہیں، کہ رسی کا قصّہ نہیں تو مصلّے کی داستان ہی سہی، مودی نہیں تو مودودی تو ہے۔

مولانا مودودی بلکہ یوں کہئے کہ جماعتِ اسلامی کے اخبار "تسنیم" نے گورنری راج کے ساتھ "سول" کی حمایت کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں اخبارات کو موضوع کی کمیابی نے کس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، گورنری راج کی حمایت کے معاملہ میں تو خیر یہ دلیل موجود ہے کہ مودی اور مودودی میں تجنیس خطی ہے، لیکن "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے معاملے میں، اس قسم کی کوئی دلیل تلاش کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ لے دے کے اکبر مرحوم کا یہ شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ

سیّد اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لے آئے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

اس شعر میں ہر چند "گزٹ" سے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" مراد نہیں، تاہم گزٹ کا ذکر تو ہے۔

بہرحال اگر موضوع کی کمیابی اس حد تک جا پہنچی ہے کہ کشمیر کا معاملہ معرضِ بحث میں آئے اور لوگوں کا ذہن خواہی نخواہی "جہادِ کشمیر" کی بحث کی جانب منتقل ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ فی الحال "آلو کے بھرتے" اور "شب برات کے حلوے" پر طبع آزمائی کی جائے اور یہ نہیں تو سرحد کی حکومت نے جو تنخواہ دار پیش امام مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے

ؔ سر فرانسس مودی

ان کے متعلق اظہارِ خیال کیا جائے۔

رسالہ "ادبی دنیا" میں جو سال بھر کے التوا کے بعد حال میں شائع ہوا ہے، ایک نئے شاعر کا کلام نظر آیا۔ اوّل تو اس دور میں نیا شاعر ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے ہاں نئے شاعر پیدا ہی نہیں ہوتے اور جو شاعر اپنے آپ کو نیا کہتے بھی ہیں، وہ گھس پس کے اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ انہیں "نیا" کہلاتے شرم آئے نہ آئے ہمیں "نیا" کہتے ضرور شرم آتی ہے تو یہ صاحب جن کا کلام "ادبی دنیا" میں چھپا ہے۔ اس اعتبار سے بالکل نئے ہیں، کہ ان کا کلام پہلے کسی رسالے میں نہیں چھپا، یا چھپا ہے تو کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزرا اور اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اُن کا تخلص بالکل نئے انداز کا ہے۔ یعنی وہ "گلزارِ نسیم" کہلاتے ہیں، یہ کتابی قسم کا تخلص ہے، یعنی کتاب کی کتاب ہے، اور تخلص کا تخلص۔

ایک زمانے میں شاہی قسم کے تخلصوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ یعنی نصیر الدین ہمایوں ظہیر الدین بابر۔ جلال الدین اکبر۔ نور الدین جہانگیر اور سراج الدین ظفر۔ خیر صاحب سراج الدین ظفر پر شاعروں کا یہ خاندان مغلیہ ختم ہو گیا۔ پھر تخلصوں کے اور سلسلے شروع ہوئے، جن میں کچھ خانقاہی تھے، کچھ کج کلاہی، کچھ گلابی، کچھ شہابی، کچھ حسابی۔ لیکن یہ کتابی سلسلہ بالکل نیا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل بکاؤلی کا قصہ نظم میں لکھا تو اس کا نام گلزارِ نسیم رکھا۔ ہمارے نوجوان شاعر نے اس کتاب کے نام کو اپنا تخلص قرار دے دیا۔ اب اگر شاعری نے ترقی کی اور شاعر جن کی پیداوار بالکل رُکی پڑی ہے، پھر پیدا ہونے لگے تو دیکھ لیجئے گا کہ ان میں کوئی دربارِ اکبری کہلائے گا، کوئی آبِ حیات کوئی شعر العجم، کوئی سخندانِ پارس، کوئی بانگِ درا، کوئی بالِ جبریل، کوئی چچا چھکن، اور کیا عجب کوئی صاحب ٹیڑھی لکیر یا احوال الآخرۃ، قصۂ شاہ بہرام با تصویر یا اصلی تے وڈّی ہیر وارث شاہ بھی کہلانا شروع کر دیں۔

ملتان میں ایک صاحب لالہ کلیان داس تھے جو آموں کی فصل میں اپنے دوستوں کو جن میں بعض اخبار نویس بھی تھے، آم بھیجا کرتے تھے۔ فسادات میں لالہ کلیان داس کا کلیان ہو گیا، یعنی ملتان چھوڑ کے بھارت کا رُخ کرنا پڑا، جب سے آموں کی فصل شروع ہوئی ہے، مولانا عبدالمجید سالک جو "عامی" تو نہیں، البتہ "آمی" ضرور ہیں اور اکثر حلقوں میں "فقہ آمی" کے امام سمجھے جاتے ہیں، بار بار پوچھ رہے ہیں کہ بھائیو کوئی یہ تو بتاؤ کہ کلیان داس کے آموں کے باغ کس کو الاٹ ہوئے تاکہ آموں کے لئے اس سے رجوع کیا جائے؟

مولانا سالک کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لالہ کلیان داس کے باغ پیر زین العابدین صاحب کو ملے ہیں۔ لیکن اطمینان رکھئے کہ ان سے آپ کو ایک آم بھی نہیں ملے گا، وہ پانی ملتان بہ گیا۔ پیر زین العابدین سے آم حاصل کرنا، ہاتھی سے گنے کھانا ہے۔ پیر صاحب آم خود کھاتے ہیں یا مریدوں کو کھلاتے ہیں جو بچ رہتے ہیں، انہیں فروخت کر دیتے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ آم عام تھے، سالک صاحب اچھے خاصے "نواب امب" بنے ہوئے تھے اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے "انبہ پرور" حضرات سے وہ بکی وصول کیا کرتے تھے اور ایک یہ زمانہ ہے کہ آم ہندوستان سے آ ہی نہیں سکتے۔ لے دے کے ملتان کے آموں کا سہارا رہ گیا تھا، لیکن ان پر بھی "پیر زین العابدین" مسلط ہیں جو "عشر" کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور سرے سے "وہ بکی" ادا کرنے کے قائل ہی نہیں

پچھلے کچھ دنوں سے اس قسم کی خبریں آ رہی ہیں کہ ایم، ایل، اے حضرات بڑے ہمت چھٹ ہو گئے ہیں، جہاں کسی نے ذرا چلیں چپڑکی۔ انہوں نے اٹھا کے پیٹ ڈالا اور کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ملتان میں جہاں سکھا شاہی میں مول راج کا راج تھا،

آج کل ایم، ایل، اے، راج ہے یعنی ایم، ایل، اے حضرات جو کچھ چاہتے ہیں، کرتے ہیں نہ پولیس ان کی حرکتوں پر معترض ہوتی ہے، نہ کسی وزیر کے کانوں پر جوں رینگتی ہے۔

ایم ایل اے حضرات میں پیر بھی ہیں، سید بھی جن کے آباؤ اجداد میں بڑے بڑے صاحبان کشف و کرامات بزرگ ہو گذرے ہیں۔ ان لوگوں کو کشف سے تو کیا واسطہ، البتہ ان میں "صاحبان کفش و کرامت" کی کثرت ضرور ہے۔ یعنی شیخ کرامت علی صاحب قبلہ سے اُن کی یاد اللہ بھی ہے اور ہاتھ میں جُوتا بھی، جہاں کرامت کا زور نہیں چلتا وہاں "بزورِ کفش" کام نکل آتا ہے۔

اور یہ کچھ انہی لوگوں پر موقوف نہیں۔ اس بے کاری کے زمانے میں ہر طرف کفش کاری کا دور دورہ ہے۔ ایم، ایل، اے کے ہاتھ میں بھی جوتا ہے، پولیس والے کے ہاتھ میں بھی، کراچی کے ایک ڈاکٹر نے جو خیر سے کارپوریشن کے ممبر بھی ہیں، سوچا، ہم کیوں پیچھے رہیں۔ چنانچہ سرِ محفل اپنے ایک ساتھی کی مرمت کر ڈالی اور جو لوگ ان تینوں گروہوں میں نہیں یعنی نہ ایم ایل اے ہیں نہ پولیس کے کانسٹبل، حوالدار یا تھانیدار، اور نہ کارپوریشن کے ممبر، وہ اس فکر میں ہیں کہ جوتے کا صحیح مقام متعین ہو جانا چاہئے۔ یعنی اس دور میں اسے پاؤں میں ہونا چاہئے یا ہاتھ میں۔

پچھلے دنوں سردار اورنگ زیب خاں نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ مسلم لیگ کسی کی جیب میں نہیں، حکومت نے جو دیکھا کہ یہ پٹھان جو وزارت اور لیڈری دونوں کا مزا چکھ چکا ہے، لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈال کے مسلم لیگ کو تلاش کرتا پھرتا ہے تو سردار اورنگ زیب کو برما بھیج دیا۔ بظاہر تو سردار اورنگ زیب اور برما کی سفارت بڑی ان مل اور بے جوڑ چیزیں معلوم ہوتی ہیں، ہر شخص یہی کہے گا کہ اگر ان دونوں بزرگوں کو سفیر بنا کے ہی بھیجنا تھا تو میاں بشیر احمد کو برما اور سردار اورنگ زیب خاں کو افغانستان

بھیج دیا ہوتا۔ لیکن ہماری حکومت غالب کی طرح ذرا مشکل پسند واقع ہوئی ہے۔ ایسے پامال اور پیش پا افتادہ مضامین کی جانب اس کی طبیعت نہیں آتی۔ افغانستان میں چندریگر اور رہبر ماہیں سردار اورنگ زیب، غالب کا شعر بلکہ استاد ناسخ کے اُن اشعار میں سے معلوم ہوتے ہیں، جن کا مطلب آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔ بس وہی کیفیت ہے کہ ؏

مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

اور چندریگر اور اسحٰق سیٹھ کا تو نام آتے ہی ہمیں استاد رفیق الشعراء یاد آجاتے ہیں، جن کا یہ مصرع بہت مشہور ہے ؏

کوّا اندھیری رات میں دن بھر اُڑا کیا

مغربی پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری نواب زادہ ولایت علی خاں نے فرمایا ہے کہ مسلم لیگ کو سیاسیات سے دستکش ہو کے صرف معاشرتی اور اقتصادی معاملات سے سروکار رکھنا چاہیئے، بات ٹھیک بھی ہے مسلم لیگ اگر محرّم کے دنوں میں جگہ جگہ سبیلیں لگوائے، رمضان کے مہینے میں افطاری اور سحری اور ربیع الاوّل میں جلسوں اور جلوسوں کا بندوبست کیا کرے اور اس سے قدم آگے بڑھائے تو افیونیوں سے افیون چھڑائے، طوائفوں کو نکاح پر آمادہ کرے بلکہ مرثیہ خوانوں، واعظوں اور مولود خوانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کو ملازم رکھ کے تیوہاروں پر دھاوا بول دے تو لیگ کے سارے کارکنوں کے لئے اچھا خاصا کام نکل سکتا ہے اور ہم قربانی کی کھالیں تو بھول ہی گئے، لیگ والے اگر قربانی کی کھالیں ہی جمع کرنے کا بیڑا اٹھائیں تو یہ بجائے خود بڑا خاصا کام ہے۔

اور ہم تو یہ بھی کہیں گے کہ مشاعروں، دنگلوں اور دوسرے کھیلوں کا انتظام بھی مسلم لیگ اپنے ہاتھ میں لے لے تو بچارے ڈپٹی کمشنروں کو اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے کچھ زیادہ وقت مل جایا کرے گا اور مسلم لیگ کے کارکن بھی بیکار نہیں بیٹھنے پائیں گے اور

چودھری خلیق الزّماں کی تو یہ کیفیت ہو گی کہ "مدح صحابہ" سے بمشکل فراغت پائی تھی کہ لوگوں نے "مجلس پڑھنے" کے لیے بلوالیا۔ وہاں سے آ کے کمر بھی نہ کھولنے پائے تھے کہ مشاعرے والے آ دھمکے۔ غرض لیگ سے ریاست کو خارج بھی کر دیا جائے، جب بھی لیگ کے صدر کی ریاست میں کوئی فرق نہیں آئے گا، کبھی دنگل، کبھی مشاعرہ، کبھی مجلس میلاد، کبھی مجلس عزا، کہیں مرثیہ، کہیں تقریر، کہیں نری صدارت اور یہ بھی نہیں تو اطمینان سے بیٹھے قربانی کی کھالیں گن رہے ہیں۔

پچھلے دنوں سرگودھا میں ایک مشاعرہ ہوا تھا، جس کے متعلق احمد ندیم قاسمی کا ایک مضمون "امروز" میں چھپ چکا ہے۔ پچھلے چند دنوں کے اندر اس مشاعرے کے سلسلے میں اتنے مضامین موصول ہوئے ہیں کہ اُن سب کو چھاپ دیا جائے تو لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ "امروز" سرگودھا سے نکلتا ہے اور صرف اس لئے جاری کیا گیا ہے، کہ مشاعرہ سرگودھا کے حالات دنیا کو معلوم ہو جائیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس مشاعرے کے متعلق جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں، اُن میں سخت تضاد پایا جاتا ہے حالانکہ یہ راوی سب کے سب مشاعرہ میں شریک تھے "اسماءالرجال شاعری" کی کتابوں میں اُن کے جو حالات ملتے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب "ثقہ" ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے "حاطب اللیل" کہا جا سکے، گویا ع

حدیث اگرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

اس سلسلے میں مشاعرہ سرگودھا کے مہتمم پروفیسر رازی صاحب کی بھی ایک طویل تحریر ملی ہے جسے مشاعرہ کی "تفسیر کبیر" کہنا چاہئے۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ شاعروں کو لینے کے لیے لاہور آئے تو انہیں "مال" کی تلاش میں کس طرح در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں، پھر بعض لوگوں نے "مال" کا نرخ کس قدر بڑھا چڑھا کے بتایا اور معمولی قسم کے شاعر کے لیے جو جنگ سے پہلے پانچ روپلی میں آجاتا تھا، کس طرح وہ

دو سو اور تین تین سو روپے طلب کئے گئے۔ غرض رازی صاحب کے اس طویل مضمون کو پڑھ کے "گاہک" اور "مال" دونوں کی حالت پر ترس آتا ہے۔

دعوت ناموں کے جواب میں شعرا نے جو خط لکھے ہیں۔ رازی صاحب نے ان کے اقتباسات بھی اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں جو بڑے دلچسپ ہیں بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ آپ میری شرکت ضروری سمجھتے ہیں تو تین سو روپے فوراً بھجوا دیجئے۔

۲۔ آپ کے خلوص کے سامنے میں نے سپر ڈال دی، محبت کا پرستار ہوں، بہرحال مشاعرہ میں حاضر ہو جاؤں گا مگر بھائی روپیہ فیس پہلے بھیجنا پڑے گا۔

۳۔ میں عام مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا، ہاں یہ آپ کی خاطر تیار ہوں، تین گنا فسٹ کلاس کا کرایہ پیشگی بھجوائیے، واپسی کے متعلق فیصلہ آپ پر۔

۴۔ معاملہ کے متعلق سودا بازی کی مجھے عادت نہیں تاہم میں مناسب سمجھتا ہوں کہ دو سو روپے عنایت فرمائیں، میرا کمرہ الگ ہوگا، بستر ہمراہ نہیں لاؤں گا، صبح گرم پانی سے نہانے کی عادت ہے۔

۵۔ جناب گرانی کا زمانہ ہے، ملتان سے مجھے دو سو روپے ملے تھے، آپ پچاس روپے کم دے دیجئے۔

۶۔ بھائی کشمیر سے تو میری حالت زیادہ قابلِ رحم ہے، اچھا کرایہ آگیا تو آجاؤں گا، ورنہ معذور جانئے۔

لیجئے، پیر الٰہی بخش کے ساتھ میر غلام علی تالپور بھی گئے۔ یعنی نہ پیر رہا نہ میر، یوں کہنا چاہئیے کہ بظاہر تو میر صاحب تالپور کہلاتے ہیں، لیکن یوسف عبداللہ ہارون صاحب اُن سے زیادہ تال کے پورے نکلے یعنی انھوں نے تین ووٹ سے تالپور صاحب کو ہرا دیا "تین تال" اسی کو کہتے ہیں۔

اگرچہ یقین تھا کہ اس مقابلہ میں میر صاحب کا پلّہ بھاری رہے گا لیکن عین وقت پر ان کی پارٹی کے چار ممبر ٹوٹ کے یوسف ہارون صاحب سے جا ملے۔ یوں کہئے کہ میر غلام علی تال پور کو اس "آڑے چوتالے" نے مارا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دولتانہ صاحب جو ہمیشہ سے قاعدہ قانون اور اصول کے حامی رہے ہیں، میر مجلس تھے۔ اس لئے خلیل خاں فاختہ اڑا گئے اور اس "اصول فاختہ" کے سامنے میر صاحب کی کوئی پیش نہ چلی۔

سُنا ہے، کچھ بزرگوار پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں ایک بڑے زور کا مشاعرہ کر رہے ہیں۔ مشاعرہ ہمارے ہاں بڑا چلتا ہوا نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر کا معاملہ ہو یا فلسطین کا، عقیقہ ہو یا ختنہ، سگائی ہو یا شادی، ہر موقع پہ یہ نسخہ بڑا نافع ثابت ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ "اجزائے نسخہ" میں کبھی فرق نہیں آتا۔ مشاعرہ چاہے سرگودھا میں ہو یا لاہور میں، "اجزائے نسخہ" یعنی شاعر حضرات وہی ہوتے ہیں، یہ نسخہ بس یوں چلتا ہے، کہ ھوالشافی۔ فیض ڈیڑھ تولہ، تاثیر ڈھائی تولہ، حفیظ ہوشیارپوری چھ ماشے، باقی اجزا کیا لکھوں، نسخہ اتنا عام ہے کہ "اجزائے نسخہ" اور ان کے اوزان سب کو معلوم ہیں۔

مشاعرہ کے "فوائدِ کثیرہ" سے تو کسی کو انکار نہیں اور ہمارا تو خیال ہے کہ اگر مشاعرہ کی گرم بازاری کا یہی عالم رہا تو ڈاکٹر اور طبیب حضرات مریضوں کو کڑوی کسیلی دوائیں پلانے کے بجائے یہ کہہ دیا کریں گے کہ، مشاعرہ میں باقاعدہ شریک ہوا کرو اور اگر اللہ نے مقدرت دی ہو تو خود ایک آدھ مشاعرہ کرا ڈالو، کیونکہ شعرا کے کلام میں دل اور جگر کا ذکر اس کثرت سے آتا ہے کہ ضعفِ قلب ہو یا ورمِ جگر مشاعرہ کی مداومت سے خود بخود دور ہو جاتے ہیں اور داد دینا یا شاعروں پہ آوازے کسنا تو پھیپھڑوں کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اسلامی نظامِ حکومت کے قیام میں مشاعرہ کیونکر ممد ثابت ہو سکتا ہے۔

پاکستان کی پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا ہے جس کے رو سے آئندہ کوئی فرم اپنے نام کے ساتھ "قائدِ اعظم" اور "جناح" کے الفاظ استعمال نہیں کر سکے گی۔ اس بل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے لوگوں نے قائداعظم کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا تھا "گاندھی بیڑی" پہلے ہی خوب چل رہی ہے "اقبال گھی سٹور" کو بھی خاصا فروغ ہوا ہے۔ اب قائدِ اعظم لانڈری اور جناح ریستوران بھی چل رہے ہیں۔ اس بل کے منظور ہونے کے بعد گاندھی بیڑی اور اقبال گھی سٹور تو بدستور چلتے رہیں گے، البتہ قائداعظم لانڈری اور جناح ریستوران ختم ہو جائیں گے۔

ہمارے خیال میں پاکستان کی مرکزی حکومت کو ان "سیاسی تاجروں" کی جانب بھی توجہ کرانی چاہئے جو اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے قائدِ اعظم کا نام استعمال کر رہے ہیں۔ الکشن کی منڈی میں جب ووٹوں کی تجارت شروع ہوئی تو دیکھ لیجئے گا کہ نئے اور پرانے کاروباری قائدِ اعظم کا نام ہی لے لے کے گاہکوں کو پھانسنے کی کوشش کریں گے۔ پاکستان کی مرکزی حکومت نے اس قسم کی حرکتوں کے سدباب کا بھی کوئی طریقہ سوچا ہے یا قائدِ اعظم کا نام لے کے سیاسی کاروبار چلانا ہمیشہ جائز سمجھا جائے گا۔

یہ نہ سمجھئے کہ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کیونکہ مشائخ اور علماء کے مرید اور عقیدتمند ہی ان کے ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے القاب نہیں لکھتے، یہ حضرات خود اپنا نام لکھیں گے، تو ازراہِ انکسار اپنے آپ کو دس پانچ گالیاں ایسی دے جائیں گے کہ کئی سطروں کا دیوالہ نکل جائے گا۔

مثلاً فقیر حقیر سراپا تقصیر ہیچ مداں اچنبہ دہان کج مج زبان ننگِ اسلاف و فخر اخلاف — حنفی قادری کان اللہ لہٗ۔

کچھ عرصے سے علماء کی طرح مشائخ میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہو چلی ہے: علماء کہتے

ہیں کہ حکومت کے تمام معاملات ہمارے سپرد کر دیئے جائیں تاکہ پاکستان کی حکومت کی بنیاد شریعتِ اسلامی پر رکھی جائے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی روحانی اصلاح کا کام ہمارے حوالے کر دینا چاہیئے، تاکہ ہم مسلمانوں کو بتائیں کہ تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کا طریقہ کیا ہے، قبض کسے کہتے ہیں۔ بسط کیا ہے، فلسفہ و لطیفہ کیا ہوتا ہے، ذکرِ جہر کیونکر کرنا چاہیئے، مراقبہ کے لئے کیا کیا شرطیں ہیں؟ عرفانِ الٰہی کی منزلیں کیونکر طے کی جاسکتی ہیں؟ جذب و سلوک کے راستہ میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور انہیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟ اندیشہ ہے کہ اگر ان حضرات نے اپنے اپنے مطالبات پر زور دیا، تو مسلمان قوم اربابِ شریعت اور اہلِ طریقت کیلئے "گل بازی" بن کے رہ جائے گی۔

مغربی پنجاب کی وزارت کی دوراندیشی کی داد دینی چاہیئے کہ اس نے ابھی تک علماء و مشائخ کو پاس نہیں آنے دیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدانخواستہ حکومت مسلمانوں کی روحانی اصلاح سے غافل ہے، یہ کام بھی ہو رہا ہے اور حضرت علامہ محمد اسد سابق لیوپولڈ ویس کی نگرانی میں بڑی خوبی سے ہو رہا ہے۔ وہ تو شکر کیجیئے کہ ہماری سرکار کو بڑی آسانی سے ایک یورپین نومسلم ہاتھ آگیا، ورنہ مسلمانوں کو اپنی "تعمیرِ نو" کرانے کے لئے یورپ کا سفر کرنا پڑتا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ویانا میں صرف دندان سازوں کی کثرت ہے، اب معلوم ہوا کہ ایمان کی مرمت اور روح کی اصلاح کا سامان بھی وہیں سے آتا ہے۔

سُنا ہے کہ اسلامی اکیڈیمی کا اہتمام بھی حضرت علامہ محمد اسد کے سپرد ہو گا اور اس کارگاہ میں جو مولوی ڈھل کے نکلیں گے، مسلمانوں کی باطنی اصلاح کا کام ان کے حوالے کر دیا جائے گا، کارخانہ چاہے کسی قسم کا ہو اسے چلانے کے لئے یورپین ماہرین کی خدمات سے فائدہ اُٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

ایک مقامی اخبار نے غنی کاشمیری اور مرزا صاحب کے متعلق ایک حکایت لکھی ہے جس کا

خلاصہ یہ ہے کہ صائب نے غنی کا ایک شعر سن کے اس کے معنی پوچھنے کے لئے کشمیر کا سفر اختیار کیا تھا۔ یہ حکایت بہت مشہور ہے اور میر حسین دوست سنبھلی نے "تذکرہ حسینی" میں اسے تفصیل سے لکھا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے صرف سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے یہ قصہ لکھ مارا ہے، اس لئے اس میں بعض ایسے لطائف آ گئے ہیں جن کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے — "غنی کاشمیری کو کون نہیں جانتا، جن کے لئے اقبال بھی رطب اللّسان رہا ہے، ایک بار غنی کاشمیری نے ایک شعر لکھا ؎

موئے میانت شدہ کرالہ پن
کرد جدا کاسۂ سرہا زتن

یہ شعر شیراز کے ملک الشعراء صائب نے سُنا، تمام لغت چھان ماری انہیں لفظ کرالہ پن کہیں نہ ملا۔"

اس مختصر سی عبارت میں تین لطیفے ہیں، ایک تو "جن کے لئے اقبال بھی رطب اللّسان رہا ہے" اچھا خاصا لطیفہ ہے، دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ شعر کا پہلا مصرعہ غلط ہے، اسے یوں ہونا چاہئے تھا ؎

موے میانِ تو شدہ کرال پن

کیونکہ کشمیری زبان میں "کرال" کمہار کو اور "پن" دھاگے کو کہتے ہیں، لیکن ایڈیٹر صاحب کا سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ مرزا صائب کو شیراز کا ملک الشعراء بنا دیا، اصل میں وہ بیچارے بھی معذور ہیں، انہوں نے سُن رکھا ہے کہ فارسی کے شاعر صرف شیراز میں پیدا ہوتے ہیں اور اردو کے شاعر صرف جالندھر میں۔

ایڈیٹر صاحب موصوف کے اضافۂ معلومات کے لئے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صائب شیرازی نہیں بلکہ اصفہانی تھے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ سیدھے گھر سے چلے اور بس کشمیر پہنچ کے دم لیا، وہ اصفہان سے آ کے کئی برس آگرہ اور لاہور میں رہے

دکن اور کابل کی سیر کی، آخر ۱۰۴۲ھ میں جب ان کا شاگرد ظفر خاں کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا تو وہ اس کے ساتھ کشمیر گئے اور وہیں غنیؔ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس واقعہ سے غالباً دو تین برس پہلے انہوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں وہ کہتے ہیں ؎

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند
افتادہ است توسنِ عزمم مرا گزار

ایڈیٹر صاحب نے اس داستان پاستان میں چھ مصرعے لکھے ہیں، جن میں سے تین صنعت بے بحری میں ہیں، ایک اور مصرع بھی غلط نقل ہوا ہے، لیکن اس کا وزن درست ہے۔ خیر نظم کے معاملے میں تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان کی نثر بھی اسی قسم کے عجائبات سے مملو ہے، مثلاً

"صائب بھاگ کر اس سے بغلگیر ہو گیا اور بتایا کہ وہ صائب ہے۔"
"کمہار ایک ناچتی ہوئی مٹی کے چاک کے اوپر مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔"
"صائب یہ مصرع سُن کر پھڑک ہی گیا اور غنیؔ کا منہ چوم کر کہنے لگا "بھائی تم نے ایرانیوں کے قلم کو توڑ دیا ہے۔"

یہ فقرہ لکھ کے تو آپ نے واقعی قلم ہی توڑ دیا۔
اس کہانی میں کمی اتنی رہ گئی کہ صائبؔ نے غنیؔ کو "ہیلو ڈارلنگ" نہیں کہا۔

ایک صاحب نے جن کا شمار اردو کے نئے ادیبوں میں ہوتا ہے، اپنی ایک تازہ تصنیف میں "بنفشہ کی جھاڑی" کا ذکر کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جس طرح اور غلط سلط ترکیبیں اور بے معنی الفاظ رواج پا گئے، اسی طرح "بنفشہ کی جھاڑی" کو بھی ایسا قبول حاصل ہوگا، کہ ادب و شاعری کے سبزہ زار میں بنفشہ کی جھاڑیاں ہی نظر آئیں گی، بہرحال ان بزرگوار کی اطلاع کے لیئے عرض ہے کہ بنفشہ کی جھاڑی نہیں ہوتی۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ "بنفشہ کی جھاڑی" چھوڑ کے "بنفشہ کا پیڑ" بلکہ "گیہوں کا درخت" بھی لکھ دیجئے تو نہ آپ پہ

مقدمہ چلے گا، نہ پولیس آپ سے باز پرس کرے گی۔

ایک مشہور افسانہ نگار نے لکھا "تو نے میرے دل کو خس و خاشاک کر ڈالا" لوگوں نے تعجب سے پوچھا "خس و خاشاک کر ڈالا" کیا ہوا؟ آپ کی مراد کہیں "خاک کر ڈالا" سے تو نہیں؟ انشا پرداز نے چلا کے کہا "میں تو اس موقع پر "خاک یا راکھ" کے بجائے خس و خاشاک ہی لکھوں گا، آپ میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہیں، بگاڑ لیجئے۔ جن صاحب نے "بنفشہ کی جھاڑی" لکھا ہے اور اس کی اوٹ میں کہانی کے ہیرو کو چھپا کے بٹھا دیا ہے، وہ بھی اگر اس قسم کے دلائل پر اتر آئیں یعنی صاف صاف کہہ دیں کہ "بنفشہ کی جھاڑی" ہو گی اور بیچ کھیت ہو گی تو بتائیے ہم اور آپ اُن کا کیا کر لیں گے؟

ایک اخبار میں کسی صاحب نے جو شاعر، مضمون نگار اور افسانہ نگار سب کچھ ہیں، ذیل کا اشتہار چھپوایا ہے:۔

"آپ خود نہیں لکھ سکتے تو ہم سے اجرت پر سہرا، غزل، مرثیہ، تقریر، کہانیاں وغیرہ لکھوا کر اپنے نام سے چھپوائیے، معاملہ خفیہ رکھا جائے گا"

بہتر ہوتا جو نرخ نامہ بھی چھاپ دیا جاتا کہ غزل کے کتنے دام ہوں گے؟ مضمون کے کتنے؟ مرثیہ کتنے روپوں میں لکھا جاتا ہے اور تقریر کی کیا اجرت لی جاتی ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ مشتہر کو بھی یہ بتا دینا چاہیئے کہ خوردہ کا کیا بھاؤ ہے اور تھوک مال کس نرخ پر بکتا ہے اس بات کی تصریح اس لئے ضروری ہے کہ لاہور میں افسانوں، غزلوں اور سہروں کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ تر تھوک مال ہی کے گاہک ملیں گے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مال کیسا ہے؟ پرانا ہے یا نیا، گھٹیا ہے یا بڑھیا اور شاعری اور مضمون نگاری کے اس کارخانہ دار کو گاہک بھی ملتے ہیں یا نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ بہت سے نئے شاعر اور مضمون نگار جو اس اشتہار کے بعد اخباروں اور رسالوں میں مضمون چھپوانا شروع

کریں گے اور مفت میں بدنام ہو کے رہ جائیں گے۔ یعنی اُدھر کسی اخبار یا رسالہ میں اُن کی غزل چھپی اور ادھر لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یہ تو کارخانہ کا مال ہے۔ اب چاہے ان بچاروں نے کتنی ہی محنت اور کاوش سے غزل کیوں نہ لکھی ہو، لوگوں کے دلوں میں جو یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ لاہور میں شعر و ادب کی فیکٹری کھُل گئی ہے اور اس کا مال منڈی میں برابر بِک رہا ہے وہ کیوں کر نکل سکتا ہے؟ اور اگر کارخانہ داروں نے صرف اپنے کارخانہ کی ساکھ بڑھانے کے لئے یہ کہہ دیا کہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر، ہمارے ہاں سے مال خرید رہے ہیں تو ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا خدا حافظ۔

کانگریس کی صدارت کے لئے ان دنوں پٹابھی سیتا رامیہ اور پرشوتم داس ٹنڈن میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ایک معاصر کا خیال ہے کہ اس مقابلہ میں ٹنڈن جی کامیاب ہوں گے۔ معاصر مذکور کو نجوم، جفر، رمل یا کسی اور خاص ذریعے سے یہ بات معلوم ہوئی ہو تو اور بات ہے، ورنہ اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیتا رامیہ جی کا پلّہ بھاری ہے۔

سیتا رامیہ سبھاش چندر بوس سے ہار گئے تو اور بات تھی، ان دنوں سبھاش بوس کی ہر دلعزیزی کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کا چراغ جلتا نظر نہیں آتا تھا، سیتا رامیہ کا کیا مقدور تھا کہ ان کا مقابلہ کرتے۔ لیکن ٹنڈن جی جنہیں سالک صاحب ٹھن ٹھن جی کہتے ہیں، صرف مسٹر پٹیل کے بل بوتے پر اچھل رہے ہیں، ورنہ وہ کانگریسی لیڈروں کی صفِ اوّل میں تو کبھی نہیں تھے۔

بہر حال یار لوگوں کے لئے بازی بدنے کا کوئی نہ کوئی موقع ضرور نکل آتا ہے۔ نون اور ممدوٹ، دولتانہ اور ممدوٹ، اعظم اور جیسا پہلوان، محمد خاں اور بھولو کا دنگل نہ سہی، سیتا رامیہ اور ٹنڈن جی کی کُشتی ہی سہی۔

اگلے زمانے میں جیسے دنگل ہوا کرتے تھے ویسے دنگل اب کہاں ؟ بٹیروں کی پالیاں مُرغ بازی کے مقابلے بھی خواب و خیال ہو گئے، اب لے دے کے بس یہی سیاسی دنگل رہ گئے ہیں۔ چاہے ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں، لیکن ان کی وجہ سے تھوڑی دیر کی تفریح کا موقع تو نکل آتا ہے۔

بعض لوگ اس بات پر بہت خوش ہیں کہ برٹش کامن ویلتھ اب نری "کامن ویلتھ" رہ گئی ہے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک لفظ کی کمی بیشی سے کیا فرق پڑ گیا ؟ کامن ویلتھ تو ہر حالت میں برٹش کامن ویلتھ ہی رہے گی، چاہے آپ اسے صرف کامن ویلتھ کہئے یا کوئی اور نام رکھ لیجئے۔

امتحانوں میں اکثر اوقات ایسے فقرے دیئے جاتے ہیں جن میں بعض لفظ چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ جو حصہ چھوٹا ہوا ہے اُسے پورا کرو۔ در اصل یہ کامن ویلتھ بھی اسی قسم کا امتحانی سوال ہے یعنی اس ترکیب کا جو حصہ چھوٹا ہوا ہے اسے ہمارا ذہن خود پورا کر لیتا ہے۔

مشہور نیشنلسٹ لیڈر منشی احمد دین جو ان دنوں ہندوستان ہی میں ہیں جگہ جگہ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ کشمیر کو ہندوستان ہی میں شامل ہونا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کشمیر کے پاکستان میں شامل ہونے کی حمایت بھی تو کرتے رہے ہیں تو صاف مکر گئے اور کہنے لگے، توبہ کیجئے، میں تو ہمیشہ ہندوستان میں کشمیر کی شرکت کا حامی رہا ہوں، نہ جانے آپ کو کس نے بہکا دیا ؟

منشی احمد دین ٹھیک کہتے ہیں، انہوں نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ جغرافیہ کہتا ہے کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ منشی احمد دین نہ تو جغرافیہ ہیں، نہ جغرافیہ

کے اقوال و افعال کی ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے۔ ہندوستان والوں کو چاہیئے کہ وہ منشی احمد دین پر غصہ نکالنے کے بجائے جغرافیہ کو پکڑیں اور کشمیر کے محل وقوع کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں۔ منشی صاحب پر ناراض ہونا بے سُود ہے۔

منشی احمد دین صاحب کو بھی چاہیئے کہ وہ اس مضمون کا ایک بیان شائع کر دیں کہ میں نے آج تک کبھی نہیں کہا کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیئے، البتہ جغرافیہ یہی کہتا ہے لیکن جغرافیہ جھک مارتا ہے اور میں ہمیشہ سے جغرافیہ محل وقوع، حدود اربعہ وغیرہ کا مخالف رہا ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جغرافیہ جو کچھ کہے اس پر میں آنکھ بند کر کے ایمان لے آؤں اور جغرافیہ تو جغرافیہ، میں تاریخ کو بھی نہیں مانتا۔ میں تو مسٹر جے پرکاش نرائن، پنڈت جواہر لال نہرو، اور شیخ محمد عبداللہ کو مانتا ہوں اور یہ تینوں یہی کہتے ہیں کہ کشمیر کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیئے۔ مجھے جغرافیہ سے شدید اختلاف ہے، میں اس کی پروا نہیں کرتا، میں تو بینگن کی بھی پروا نہیں کرتا، کیونکہ میں بینگن کا نوکر نہیں ہوں اور میں اس کی پروا کیوں کروں؟ میں تو خود بینگن ہوں اور دہلی کے میدان تھالی کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔"

اگر منشی صاحب نے اس قسم کا کوئی بیان چھپوا دیا تو اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور یہ جو لوگوں میں بدگمانی ہے کہ وہ جغرافیہ ہیں دُور ہو جائے گی۔ جغرافیہ جائے بھاڑ میں، منشی احمد دین اس کی خاطر کیوں آفت میں پڑیں۔ انہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے، یعنی گنگا گئے گنگا رام، جمنا گئے جمنا داس۔

دو دن ہوئے کراچی میں ایک کُل پاکستان قسم کا مشاعرہ ہوا، چونکہ پاکستان میں لاہور شاعری کی سب سے بڑی منڈی ہے اور یہاں ہر قسم کا شاعر آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہاں سے بھی شاعروں کی ایک کھیپ بھیجی گئی۔ اگرچہ کراچی اور پاکستان کے دوسرے حصوں کے شاعر بھی موجود تھے لیکن سُنا ہے کہ میدان لاہور ہی کے شاعروں کے ہاتھ رہا اور سب نے

متفق اللفظ ہو کے کہہ دیا کہ مشرقی پاکستان کے پٹ سن، مغربی پاکستان کی کپاس اور گندم کے بعد مغربی پنجاب کا شاعر ہی پاکستان کی سب سے بڑی پیداوار ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ترکی کی طرف سے جو صاحب سفیر کی حیثیت سے پاکستان میں مقیم ہیں، وہ ترکی زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ نجد و حجاز کی جانب سے جو صاحب سفیر بنا کے پاکستان بھیجے گئے ہیں، وہ بھی بہت بڑے شاعر ہیں اور فی البدیہہ شعر کہتے ہیں، چنانچہ اس مشاعرہ میں انہوں نے بھی اپنا کلام سُنایا جسے سُن کے یا یوں کہنا چاہئے کہ جس کا اردو ترجمہ سن کے اہلِ مشاعرہ نے بڑی تعریفیں کیں۔

معلوم ہوتا ہے، اسلامی ملکوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ صرف شعراء کو سفیر بنا کے پاکستان بھیجا جائے، ہمارے رائے میں پاکستان کی حکومت کو اس مصرع طرح پر ضرور گرہ لگانی چاہئے یعنی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آئندہ صرف حضرات شعرائے کرام کو سفیر بنا کے اسلامی ممالک میں بھیجا جائے اور اگر ہماری حکومت چاہے کہ ان سفارت خانوں کے عملہ میں ایک بھی غیر شاعر نہ ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے ہاں ہر قسم کا شاعر موجود ہے، ریشہ دار، بے ریشہ، لمبے ریشہ والا، چھوٹے ریشے والا، تلخ یعنی ہجو گو قسم کا شاعر، شیریں یعنی نرا غزل گو، ترش، پھیکا، کسیلا، سرد، گرم، معتدل، گلے باز مترنم، بے سُرا، ولایتی کھاد کا بھی، دیسی کھاد کا بھی، حکومت کو یہ فکر نہیں ہونی چاہئے کہ اگر شاعر سارے بھیج دیئے تو مشاعرہ کی گھریلو دستکاری کو کہیں نقصان نہ پہنچے۔ مشاعرہ کی مانگ پوری کرنے کے بعد الغاروں شاعر بچ رہیں گے، چاہے مشاعرہ کی ضرورت پوری کیجئے، چاہے ڈرائنگ روم کی زینت بنایئے۔

مملکتِ نجد و حجاز کے سفیر صاحب کا بڑا کمال تو یہی ہے کہ مشاعرہ میں اپنی نظم پڑھ کے سُنا دی۔ ہمارے ہاں ایسے ایسے شاعر موجود ہیں جو سفارت خانوں ہی کو نہیں بلکہ ساری وزارت

خارجہ کو منظوم کر ڈالیں۔ ایک ایک مصرع سے تاریخ نکالیں پھر اسی مضمون کو نظم معرا میں اس طرح بیان کریں کہ ساری دُنیا پاکستان اور پاکستان کے شاعروں کی تعریفیں کہنے پر مجبور ہو جائے، کیا اچھا ہو کہ سفیر کی اسناد نظم کرنے کے لئے بحر ہزج یا اس قسم کی کوئی بحر اختیار کی جائے، مراسلے متدارک یا متقارب میں ہوں، تقریر کے لئے بحر رجز اور گفتگو کے لئے بحر رمل سے کام لیا جائے۔

جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ دُنیا میں سات سمندر ہیں۔ ہمارے شاعروں کے پاس اس سے دگنی "بحریں" ہیں، پھر بھی بہت لوگ شاعری کے ان "سمندروں" سے ناواقف ہیں۔ اگر بیرونی ملکوں میں شاعر سفیر اور شاعر اتاشی بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دُنیا کو معلوم ہو گیا کہ پاکستانی شعرا کے قبضے میں اتنے سمندر ہیں تو لوگ برطانیہ کو سمندروں کی رانی کہنا چھوڑ دیں گے اور اللہ نے چاہا تو اس طرح ہمارے سارے دلدر دُور ہو جائیں گے۔ امریکہ والے اس وہم میں ہیں کہ وہ "بحرین" کو چھوڑ کے اسی طرف کا رُخ کریں گے اور شاعری کی مانگ اتنی بڑھے گی کہ ہمیں شاعروں کی گھریلو دستکاری کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی اور امریکہ کی اجارہ دار کمپنیوں کو شاعری اور اس کے بحور کا ٹھیکہ دینے کے بعد شاعروں کی گھریلو دستکاری کی ایسی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔

بہرحال سفرا کو سفیر بنا کے باہر بھیجنا تو شروع کیجئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے اور کسی خیال سے نہ سہی فی الحال ترکی اور مملکتِ نجد و حجاز کے جواب کے طور پر ہی سہی، ورنہ دنیا یہی کہے گی کہ پاکستان میں شاعر نہیں پیدا ہوتے یا پیدا ہوتے ہیں تو سفیر نہیں بن سکتے۔

پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ پاکستان کے سکّے کا نام روپیہ کے بجائے چاند یا ہلال رکھ دیا جائے گا، جو لوگ صرف تجویزیں پیش کرتے ہیں، انہیں ایسا موقعہ خدا دے، چنانچہ اس مصرع طرح پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی گئیں، جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب نے لکھا تھا کہ روپیہ کا نام جناح اور اٹھنی کا نام لیاقت ہونا چاہئے۔ اب ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ چونی کا نام رُباعی ہونا چاہئے۔

اصل میں شاعری سے مسلمانوں کا پنڈ چھوٹنا مشکل ہے، چونی کا نام رُباعی ہو گیا تو گاہک دکاندار سے کہے گا کہ ہم نے ایک رباعی عرض کی ہے، ملاحظہ فرمایئے اور آلوؤں کی صورت میں اس کی داد دیجئے۔ اس شاعرانہ خیال کا مطلب سیدھی سادی اردو میں یہ ہے کہ "میاں چونی کے آلو تول دو" لیکن اگر چونی رباعی ہے تو اکنی کو مصرع اور بیت یا شعر کہنا چاہئے، دونی اگر ٹکسال سے حال ہی ڈھل کے نکلی ہے تو مطلع ہے ورنہ فرد یا سیدھا سادا شعر۔

تین آنے کو مثلث کہنا چاہیے، پانچ آنے کو مخمس اور چھ آنے کو مسدس، اس حساب سے ڈیڑھ آنہ مستزاد ہوا یعنی مصرع پر آدھ مصرع بڑھایا گیا ہے۔ لیکن پانچ پیسے بھی مستزاد ہو سکتے ہیں، اس لئے پانچ پیسے کو مستزاد اصغر کہہ لیجئے اور چھ پیسے کو مستزاد اکبر، سات آنے کو مسبّع اور آٹھ آنے کو مثمن بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ روپیہ کے لئے ہمیں کوئی لفظ نہیں سوجھا، غزل کہہ لیجئے یا قطعہ، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دینا پڑے گا کہ غزل یا قطعہ ہمیشہ آٹھ اشعار کے ہوا کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روپیہ کے معاملہ میں اس "صنعت عددی" کا التزام نہ کیا جائے، یعنی روپے کو اس کی اہمیت کی وجہ سے بیت الغزل کہہ لیا جائے۔

اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ شاعری کی بہت سی اصطلاحیں سب لوگوں کو ازبر ہو جائیں گی، مثلاً اٹھنی اگر کھوٹی ہے تو دکاندار کہے گا کہ صاحب مجھے تو اس مثمن میں ایسا نظر آتا ہے یا اگر کسی نے پاکستانی چونی کے ساتھ غلطی سے ہندوستان کی دونی دے دی تو دکاندار یہ کہہ کے اسے لینے سے انکار کر دے گا کہ "میاں دیکھتے نہیں، اس مسدس میں شتر گربہ ہے"۔ بہرحال اگر ہماری حکومت شاعری کی سرپرستی کرنا چاہتی ہے تو سکوں کے نام تجویز کرتے وقت اسے

شاعری کی اصطلاحوں کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے۔

مدت ہوئی، لاہور سے زمزم نام ایک اخبار نکلا تھا جو سکڑ کے "ضمیمہ" بن گیا اور اب صرف "زمزم بکڈپو" رہ گیا ہے۔ پچھلے چند دنوں سے اخباروں میں "آبِ زمزم" ایک عرق کا اشتہار شائع ہو رہا ہے جس کے متعلق مشتہر نام کا دعویٰ ہے کہ وہ معدہ کے اکثر امراض کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جس ادارہ کی طرف سے یہ اشتہار شائع ہو رہا ہے، اس کا نام بطحا فارمیسی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بطحا مکہ معظمہ کا ایک نام ہے۔

ہمیں تو اب تک یہی معلوم تھا کہ زمزم مکہ معظمہ میں ہے جو لوگ حج کرنے جاتے ہیں، وہ بوتلوں میں بھر کے آبِ زمزم بھی لے آتے ہیں جو تبرک کے طور پر عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اگر "آبِ زمزم" کسی کیمیاوی ترکیب سے لاہور میں تیار ہونے لگا تو کسی دن کوئی صاحب "حجرِ اسود" بھی تیار کر کے پیش کر دیں گے اور کوئی عجب نہیں کہ حج بھی لاہور ہی میں ہونے لگے، سمجھ میں نہیں آتا کہ تاجر لوگ اس قسم کی حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ "آبِ زمزم" انہی صاحب کی ایجاد ہے جو "زمزم" اور "زمزم بک ڈپو" کے مالک ہیں یا کسی اور صاحب نے یہ حرکت کی ہے؟ ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں کوئی صاحب "حوضِ کوثر" کے نام سے کوئی دواخانہ کھول کے نہ بیٹھ جائیں اور "آبِ کوثر" کے نام سے عرق بادیان بیچنا نہ شروع کر دیں۔ واضح رہے، لاہور میں "کوثر" نام ایک اخبار موجود ہے، جس کے ایڈیٹر مولانا نصر اللہ خاں عزیز ہیں۔ اگرچہ مولینا سے اس قسم کی حرکت کی توقع تو نہیں لیکن زمزم "آبِ زمزم" بن گیا تو کوثر کو "حوضِ کوثر" اور "آبِ کوثر" بنتے کیا دیر لگتی ہے، مولینا نصر اللہ خاں عزیز نے آبِ کوثر کے نام سے عرق نہ بیچا تو کوئی اور بیچے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہز ہائی نس سر آغا خان اپنی جوبلی کے موقع پر ہیروں میں تلے تھے لیکن ان کے فرزند ارجمند پرنس علی خاں باپ سے بھی آگے نکل گئے، یعنی خبر آئی ہے کہ ان کے بیاہ کی تقریب میں جو ضیافت ہونے والی ہے، اس میں یوں تو بیسیوں ایسی چیزیں ہوں گی جنہیں دیکھ کے حسن بن صباح کی جنّت یاد آجائے، لیکن ان سب سے زیادہ دلکش چیز ایک حوض ہے، جس میں پانی کی جگہ عطر بھرا گیا ہے۔ سُنا ہے اس حوض کو بھرنے میں کوئی دو سو گیلن یعنی بیس بائیس من عطر خرچ ہوا ہے۔

پرنس علی خاں حوض بنوا چکے تو خیال آیا کہ اس تقریب پر شراب کا دور بھی چلے گا، اگر کوئی مہمان بدمستی کے عالم میں حوض میں جا گرا تو کیا ہوگا۔ چنانچہ حوض کے گرد ایک چھوٹا سا جنگلہ لگوا دیا گیا لیکن اس جنگلے سے کیا ہوتا ہے جنہیں بدمستی کے عالم میں پھسلنے کی عادت ہے، وہ ضرور پھسلیں گے اور حوض میں ڈبکیاں کھائیں گے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی صاحب اس حوض کے معطّر راستے سے اگلی دُنیا میں جا پہنچیں۔

پرنس علی خاں کے اس "حوضِ عروسی" کے تذکرہ میں ہمیں خیال آیا کہ اگر ممکن ہو تو پنجاب کی سیاسیات کو بھی اس حوض میں دو غوطے دیئے جائیں، ان دو غوطوں میں اگر وہ بے چاری غفر لہا بھی ہو جائے جب بھی ہمیں افسوس نہیں ہوگا، کیونکہ اس طرح کم از کم لوگوں کو اس تعفّن سے تو نجات ہو جائے گی جس کے لئے وہ ہمیشہ انگشت نما رہی ہے۔ سباری صاحب بیگ کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں کب تک بیٹھے لوگوں سے جھگڑتے رہیں گے، ابھی انتخابات ہوئے بھی تو نہ جانے ٹکٹ گھر کی یہ کھڑکی کسی کام آئے یا نہ آئے اور کیا عجب ہے کہ لوگ ٹکٹ خریدے بغیر ہی اسمبلی میں جا گھسیں، اس سے تو اچھا ہے کہ جنوبی فرانس تشریف لے جائیں، پرنس علی خاں کے ہاں بن بلائے مہمان بن کے جا دھمکیں اور عطر کے اس حوض میں ایک آدھ غوطہ ہی کھا آئیں۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو چندہ جمع کر کے لاہور میں اس قسم کا ایک حوض بنوایا جائے جس میں یو۔ڈی کلون نہ سہی، خس یا حنا کا عطر بھرا جائے اور پنجاب کی سیاست کو اس میں اس طرح غوطے دیئے جائیں کہ یا تو وہ "غفرلہا" ہو جائے ورنہ کم از کم اس سڑاند سے تو نجات نصیب ہو۔

ایک زمانے میں لوگ سمجھتے تھے کہ پنجاب کو اللہ نے سیاست ہی عطا نہیں فرمائی۔ کانگرس نے مدتوں یہاں ہنگامہ برپا کئے رکھا، لیکن سیاست اسے بھی نصیب نہیں ہوئی۔ حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ پنجاب کو سیاست تو عطا ہوئی ہے، لیکن ایسی سڑی بسی کہ زمانہ قبل از تاریخ کا کوئی حادثہ معلوم ہوتی ہے۔ میاں عبدالباری صاحب خواہی نخواہی اس مریض جاں بلب کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں، ہماری سنئے تو اب اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیجئے اور میاں صاحب کو بھی اس قصے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، چودھری خلیق الزماں یہ کام بھی خود ہی کر لیں گے، انہوں نے ایسے ایسے کئی مُردے دفن کئے ہیں اور یو۔پی کا گورکن یوں بھی ذرا متعلق ہوتا ہے، کہاں لائل پور کہاں لکھنؤ۔

انڈونیشیا کے نمائندے مسٹر ادھم نے کل لاہور کے ایک عام اجتماع میں تقریر کی۔ خیال تھا کہ چودھری ظفر اللہ بھی اس موقع پر موجود ہوں گے، لیکن انہیں کوئی کام آپڑا اور وہ لاہور نہ پہنچ سکے، اس لئے سول مسلم لیگ کے صدر سردار ظفر اللہ نے ان کی جگہ جلسے کی صدارت کی۔

اگرچہ سردار ظفر اللہ کو صرف نام کی رعایت سے جلسے کا صدر بنایا گیا تھا، لوگوں کو اس "رعایت لفظی" کا احترام کرنا چاہیئے تھا، لیکن کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے ان کی تقریر توجہ سے نہ سنی، یہ ٹھیک ہے کہ لفظی رعائتوں کا زمانہ گزر چکا، لیکن لوگوں کو آداب محفل کا تو خیال رکھنا چاہیئے اور خاص طور پر جب مسٹر ادھم جیسا معزز مہمان موجود ہو تو آداب محفل کی پاسداری اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔

کچھ عرصہ سے اخباروں میں مسلم لیگ فنڈ کے متعلق مضامین چھپ رہے ہیں، جن میں کہا جا رہا ہے کہ لیگ فنڈ میں جو لاکھوں روپے جمع ہوئے تھے، ان کا کوئی حساب موجود نہیں، نہ جانے یہ روپے کہاں گئے؟ کس کے صرف میں آئے؟ چندہ کھانے میں کون کون شریک تھا، کس کے حصے میں کتنا آیا؟ اور لیگ کے خزانے میں کتنی رقم باقی رہ گئی ہے؟

ہمارے خیال میں یہ بحث ہی بے سود ہے، چندہ دیکھنے کی چیز نہیں، کھانے کی چیز ہے۔ اس لئے اگر کچھ لوگ چندہ کھاتے ہیں تو کھانے دیجئے اور چپکے ایک گوشے میں بیٹھے تماشا دیکھتے رہئے۔ لیگ فنڈ تو مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے، اس لئے حلال وطیب ٹھہرا، یار لوگ سوراج فنڈ کھا گئے جس میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں وغیرہ سب کا حصہ تھا۔

اس زمانے میں چندے کا ذکر کرنا گڑے مردے اکھیڑنا ہے، کیونکہ چندے کا دھندا پرانا ہو چکا اور چندہ خوری کا بازار ان دنوں مندا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کئی ایسی غذائیں نکل آئی ہیں جو چندہ سے زیادہ زود ہضم اور مقوی ہیں مثلاً الاٹمنٹ ہی کو لیجئے جو سرکاری درباری قسم کی غذا ہے اور پھر غذا کی غذا ہے اور دوا کی دوا۔ یعنی اس کا تعلق گورنمنٹ سے بھی ہے اور ریفیوجی منٹ سے بھی اس کا رشتہ نکالا جا سکتا ہے، الاٹ منٹ میسر ہو تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ چندہ کھائے۔

چندے کے تذکرے میں ایک صاحب یاد آ گئے جنہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور کمیٹی کمیٹی کا چندہ کھایا تھا یعنی کانگرس میں بھی رہے تھے، خلافت کمیٹی میں بھی، اور بھی کئی کمیٹیوں اور مجلسوں سے ان کا تعلق رہ چکا تھا، لیکن جہاں گئے، چندے کا دھندا چلتا رہا، چنانچہ انہیں دیکھ دیکھ کے اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ اور چندہ خورے کو چندہ۔ ایک دفعہ ان کی چندہ خوری کی حکایت عام ہوئی اور لوگوں

نے حساب مانگنا شروع کیا تو انہوں نے بھرے جلسے میں کہہ دیا کہ "مسلمانو! چندہ کھاتا رہا ہوں اور کھاتا رہوں گا، تمہاری جیبوں میں جو کچھ ہے، میرے حوالے کر دو، لیکن یہ یاد رہے کہ کہ میں حساب نہیں دوں گا" اللہ دوسرے قومی کارکنوں کو بھی اُن کی سی ہمت اور بے باکی عطا فرمائے۔"

چندے کے سلسلے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ ایک زمانے تک چندے کی حیثیت غیر سرکاری دربار میں حاصل ہے یعنی ڈپٹی کمشنروں نے چندہ اُگاہنا شروع کر دیا ہے اور ایک چندے ہی پر کیا موقوف ہے "مشاعرے" پر بھی سرکار نے اپنا ٹھپہ لگا کے اسے سرکاری بنا لیا ہے، یعنی شاعر بیگار میں پکڑے جاتے ہیں، ان پر ٹکٹ لگتا ہے اور ٹکٹ سے جو آمدنی ہوتی ہے، اسے چندہ کہا جاتا ہے، غزلیں اور نظمیں جبراً بھرتی کی جاتی ہیں اور بھرتی کے شعروں سے مشاعرے رونق پاتے ہیں۔

ایک صاحب جو اکثر سرکاری مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں، کہتے ہیں کہ ان تقریبوں میں پولیس والوں کی کثرت دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سرکار کو مشاعرے پر اعتبار نہیں، یعنی یہ ڈر ہے کہ اگر اس پر پہرہ نہ بٹھایا گیا تو موقع پا کے بھاگ نکلے گا دوسری طرف شاعر بھی پولیس سے ابھی مانوس نہیں ہوئے، یعنی شعر پڑھتے وقت برابر یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب کوئی غیر سرکاری قسم کی حرکت ہو جائے اور دھر لئے جائیں۔ داد کے معاملہ میں بھی یہ حال ہے کہ جس شاعر کو ڈپٹی کمشنر بہادر سے داد مل گئی، وہ سمجھا کہ محنت وصول ہو گئی، ورنہ لوگ ہزار داد دیں، شاعر کو اطمینان نہیں ہوتا۔

ایک موقع پر عجب تماشا نظر آیا۔ شاعر آ چکے تھے، سامعین بھی موجود تھے اور پولیس والے بھی جگہ جگہ کھڑے تھے، لیکن ڈپٹی کمشنر بہادر تشریف نہیں لائے تھے یعنی برات تیار اور دولہا غائب۔ قاعدے کے رو سے مشاعرہ شروع ہو جانا چاہئے تھا، لیکن اتنی ہمت کس

میں تھی کہ مشاعرہ شروع کرادیتا آخر گھنٹہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں ڈپٹی کمشنر صاحب تشریف لائے اور مشاعرہ شروع ہوا۔ رات کے کھانے پر بھی یہی ہوا، کھانا ٹھنڈا ہو گیا اور ڈپٹی کمشنر صاحب نہ آئے، سب کو زور کی بھوک لگی ہوئی تھی، لیکن جب تک ڈپٹی کمشنر صاحب تشریف نہ لائے، کھانا دسترخوان پر نہ آیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ ان مشاعروں میں ہمیشہ ڈپٹی کمشنر بہادر ہی کو "بیت الغزل" اور حاصل مشاعرہ سمجھا جاتا ہے۔

پرسوں خبر آئی تھی کہ خان ممدوٹ جو نئی وزارت مرتب کر رہے ہیں، اس میں میاں نوراللہ کو ضرور شامل کیا جائے گا۔ ہم سمجھے تھے کہ میر نور احمد تو پہلے ہی موجود ہیں، میاں نوراللہ وزیر بن گئے تو مغربی پنجاب کی حکومت "نورٌ علیٰ نور" ہو جائے گی۔

آج جو خبریں آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے دفتر میں تو میر نور احمد شمع روشن کئے بیٹھے ہیں، لیکن وزارت کے ایوان میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور میاں نوراللہ کچھ بجھے بجھے معلوم ہوتے ہیں۔

آج مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا جلسہ اور وزارتی معرکہ کا آخری دنگل تھا، ہم نے دیکھا کہ اکھاڑے کے گرد اگرد لوگوں کے ٹھٹ لگے ہیں، شرطیں بدی جارہی ہیں، ایک کہتا ہے ہمارا پہلوان جیتے گا۔ دوسرا کہتا ہے، نہیں میدان ہمارے پہلوان کے ہاتھ رہے گا۔ اتنے میں دونوں پہلوان لنگوٹ کسے اکھاڑے میں اترے، کیا سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم ہیں، کیسا کلہ ٹھلہ ہے، رستم زندہ ہوتا تو ان کے قدم لیتا، لندھور بن سعدان مر نہ جاتا تو بڑے پہلوان کا کیا ذکر ہے، کرامت پہلوان شیخوپوریہ پٹھا ممدوٹ پہلوان کے شاگردوں میں نام لکھواتا۔

اب کشتی شروع ہوئی، کبھی یہ اس کو دھکیلتا، اکھاڑے کے کنارے تک لے جاتا ہے کبھی وہ اس کو ریلتا تماشائیوں کے ہجوم تک پہنچا دیتا۔ قیامت کے داؤ پیچ اور جوڑ توڑ ہو رہے ہیں، کبھی یہ زور شور ہے، گویا پہاڑ ٹکرا رہے ہیں، ہاتھیوں میں ٹکریں ہو رہی ہیں کبھی داؤ پیچ

ہیں ایسی خوبصورتی ہے، گویا بلبلیں گتھی ہوئی ہیں۔ ملک پہلوان نون والا جس کی کشتی گیری کی دھوم سان فرانسسکو تک ہے اور کئی دوسرے بڑے بڑے پہلوان کھڑے دیکھ رہے ہیں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کشتی کا انجام کیا ہوگا؟

کشتی گیری کا فن آسان نہیں، اس کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان پہلوانوں نے برسوں محنتیں کی ہیں، پلاؤ، قورمے، تنجن، بریانی پر ہتھے مارے ہیں، نرم نرم ریشمی گدیلوں پر ڈنڑ پیلے ہیں، مدتوں راتوں کو جاگے اور دوپہر کو سو کر اٹھے ہیں اور برسوں وجاہت خاندانی اور شرافت آبائی کے سلسلے میں اچھل کود کرتے رہے ہیں جبھی تو یہ رنگ روپ، یہ کلہ ٹھلہ اور یہ سلیقے میں ڈھلا ہوا جسم پایا ہے۔ میاں رمضانی تم خاک پہلوانی کروگے، مارے فاقوں کے جسم نڈھال ہوگیا ہے، گال پچکے ہوئے ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں، دو قدم چلتے ہو اور ہانپنے لگتے ہو، اس پر کشتی دیکھنے کا شوق کہ گرتے پڑتے یہاں تک چلے آئے، دھکے کھائے، لیکن گھس بیٹھ کر اکھاڑے تک پہنچ گئے۔

اے لو، دونوں پہلوان ہانپنے لگے، سانس پھولا ہوا ہے، جسم پسینہ پسینہ ہو رہا ہے ہاتھ کہیں ڈالتے ہیں اور پڑتا کہیں ہے، اب فتح و شکست کا فیصلہ کرنا مشکل ہے دونوں برابر کے جوڑ ہیں، دفعتاً خان ممدوٹ کوئی ایسا پیچ کھیل گئے کہ حریف کا کندھا زمین سے لگ گیا اور ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں، اب اس میں چاہے ملت کی رسوائی ہو، قوم رہے یا مٹ جائے، وزرا نے کشتی گیری کا شوق تو پورا کر لیا ہے ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

محمد علی نام، مجاہدِ اعظم لقب، پیشہ زراعت، عمر پچاس سال، قد چھ فٹ ایک انچ، گٹھا ہوا جسم، ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، پچیس برس سرکار کی ملازمت کی، اب ریٹائر

ہو چکے ہیں، لیکن بیکار نہیں بیٹھنا چاہتے۔ پچھلے دنوں ان سے کسی نے کہہ دیا۔۔۔ . . . . کہ قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا اور آپ سے زیادہ کوئی شخص قیادتِ عظمیٰ کا اہل نظر نہیں آتا، بس پھر کیا تھا، فوراً عرضی لکھ کے پبلک سروس کمیشن کے پاس بھیج دی، ساتھ ہی ساڑھے سات روپے فیس کے طور پر داخل کر دیئے، اب بیٹھے گھڑیاں گن رہے ہیں کہ کب کراچی سے بلاوا آتا ہے اور کب مجاہدِ اعظم کو پاکستان کا قائدِ اعظم مقرر کیا جاتا ہے۔

محمد علی مہاجر عرف مجاہدِ اعظم کو یقین ہے کہ قیادتِ عظمیٰ کے لئے مقابلہ ہوا تو قرعۂ فال انہی کے نام پڑے گا کیونکہ وہ "ریڈی میڈ" قسم کے لیڈر ہیں، قطع و برید کی کوئی ضرورت ہی نہیں بس کراچی بلوا کے قیادتِ عظمیٰ کا تاج اُن کے سر پر رکھ دیجئے اور قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھئے۔ یہ نہ سمجھئے کہ انہوں نے روپے پیسے کے لالچ میں یہ سارا بکھیڑا کیا ہے، توبہ کیجئے۔ اُن کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے، سات ہزار روپیہ مختلف قومی انجمنوں میں چندہ دے چکے ہیں، تیرہ بچوں کے باپ ہیں، جن میں پانچ کالج میں پڑھتے ہیں۔ روپیہ پیسہ نہیں چاہتے، لیڈری چاہتے ہیں اور لیڈری بھی ایسی ویسی نہیں یعنی اگر ہم یا آپ انہیں صوبائی لیگ کی صدارت یا اس قسم کا کوئی چھوٹا موٹا عہدہ دے کے ٹرخانا چاہیں تو ہمیں سخت ناکامی ہو گی، وہ تو حضرت قائدِ اعظم کے جانشین بننے کی فکر میں ہیں یعنی انہوں نے بہت ہی انکسار فرمایا تو شاید چودھری خلیق الزماں پر ہاتھ صاف کرنے پر آمادہ ہو جائیں، دولتانہ، نون اور ممدوٹ وغیرہ کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔

حضرت مجاہدِ اعظم محمد علی مہاجر کا دعوےٰ ہے کہ وہ سولہ سیر بوجھ اٹھا کے چوبیس گھنٹے میں چونسٹھ میل مسافت طے کر سکتے ہیں، دو گھنٹے میں ننگے پاؤں بارہ میل دوڑ سکتے ہیں، ضرورت پڑے تو چار من تک بوجھ اٹھا سکتے ہیں ہفتہ بھر تک بھوکے پیاسے رہ

سکتے ہیں۔ نہ ان پہ گرمی اثر کرتی ہے نہ سردی، اٹھارہ ہزار فٹ اونچے پہاڑوں پہ پیدل سفر کر چکے ہیں۔ کوئی حربہ اُن پر کارگر نہیں ہوتا اور اُن کا دعوےٰ ہے کہ ایٹم بم بھی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا، گویا شیخ محمد علی مہاجر آٹھوں گانٹھ کمیت قسم کے لیڈر ہیں اور لیڈروں میں ان کی وہی حیثیت ہے جو دواؤں میں امرت دھارا کو حاصل ہے، مناسب بدرقہ کے ساتھ جس موقع پر استعمال کیجئے، انشاء اللہ تیر بہدف پائیے گا۔

مجاہدِ اعظم ان دنوں نیلی بار میں تشریف فرما ہیں اور وہاں بھی بیکار نہیں بلکہ ذبیح اللہ جماعت کے کمانڈر بھی ہیں اور مہاجر کمیٹی کے آنریری سکرٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں، لیکن ان کاموں میں ان کا جی نہیں لگتا اور جی کیسے لگے، کہاں سارے پاکستان کی قیادتِ عظمیٰ، کہاں نیلی بار کی مہاجر کمیٹی کے سکرٹری کا عہدہ، بہر حال انہوں نے پبلک سروس کمیشن کو عرضی بھجوادی ہے، ساڑھے سات روپے فیس بھی داخل کردی ہے، اب نیلی بار میں بیٹھے پبلک سروس کمیشن کے دعوت نامے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اگر خدانخواستہ ان کی آرزو پوری نہ ہوئی یعنی پبلک سروس کمیشن نے انہیں پاکستان کا قائدِ اعظم منتخب نہ کیا تو وہ نیلی بار ہی میں پڑے رہیں گے اور جس طرح انہوں نے مجاہدِ اعظم کا لقب اختیار کیا ہے، اسی طرح جانشین قائدِ اعظم کا لقب بھی اختیار کرلیں گے، پبلک سروس کمیشن انہیں قائدِ اعظم بنائے نہ بنائے، اللہ تو انہیں جانشین قائدِ اعظم بنا چکا ہے۔

ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض بزرگواروں نے جو اپنے نام کے ساتھ بالالتزام "علامہ" لکھا کرتے تھے "علامگی" سے توبہ کرلی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو اپنے ماتحتوں کو حکم دے دیا ہے کہ آئندہ ان کے نام کے ساتھ ہرگز "علامہ" نہ

لکھا جائے۔ اصل میں ان بزرگواروں کا کوئی قصور نہیں، انہیں "علامہ" کے معنی ہی معلوم نہیں تھے، معنی معلوم ہو گئے اور انہوں نے اپنے نام کے ساتھ علامہ لکھنا چھوڑ دیا،
بہرحال ؎

اُسے بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

اپنے ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے القاب لکھنا، کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے بعض اوقات لوگوں کو عجیب و غریب غلط فہمیاں ہوتی ہیں، مثلاً ایک علامہ قسم کے بزرگوار ایک مرتبہ آدھی رات کو ایک قصبے میں اترے جہاں ایک ہی ہوٹل تھا، ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا تو چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

حضرت علامہ نے جواب دیا "ہم ہیں علامہ فہامہ سرکار شریعت مدار حافظ قاری صوفی ——— چشتی صابری دہلوی ثم لاہوری"

چوکیدار گھبرا کے بولا "معاف کیجئے صاحبان ہوٹل میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ نہیں۔"

اکثر مشائخ اور علما کے نام جو قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین محی الملۃ والدین سے شروع ہو کے مدظلہ العالی یا متع المسلمین بطول حیاتہ پر ختم ہوتے ہیں، کئی کئی سطروں میں آتے ہیں۔ ان حضرات کو چاہیئے کہ اپنے ناموں کو مختصر کریں، کیونکہ آج کل کاغذ کمیاب ہے اور اس قسم کے دس نام لکھنے میں اخبار کا پورا کالم صرف ہوتا ہے۔

قائداعظم نے ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ اسلامی سوشلزم کو مملکت پاکستان کے دستورِ حکومت کی اساس قرار دیا جائے گا، حال میں میاں افتخار الدین نے ڈھاکہ میں جو تقریر کی ہے اس میں بھی انہوں نے "اسلامی سوشلزم" کا ذکر ہے، بعض حضرات نے جنہیں قائداعظم کی یہ تقریر یاد نہیں رہی "اسلامی سوشلزم"

کی ترکیب، کو سرے سے مہمل قرار دیا ہے، ان کا ارشاد ہے کہ اسلام کو سوشلزم سے کیا تعلق؟

بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہم آئے دن اس قسم کی مہمل ترکیبیں استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً جن ملکوں میں مسلمان آباد ہیں، انہیں عام طور پر "اسلامی ممالک" اور "عالمِ اسلام" لکھا جاتا ہے۔ جس حکومت کی باگ ڈور کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہے اسے بے تامل "اسلامی حکومت" کہہ دیا جاتا ہے اور ہم نے بعض لوگوں کو "اسلامی سلطنت" اور "اسلامی بادشاہت" بھی لکھتے دیکھا ہے۔ حالانکہ بادشاہت اور سلطنت سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں، گستاخی معاف ہماری رائے میں تو "اسلامی بادشاہت" کہنا ہی ویسا ہے جیسا کسی شراب خانے کو محض اس لئے "اسلامی شراب خانہ" کہہ دیا جائے کہ اس کا مالک مسلمان ہے۔

ایک اخبار نے "نُورَاللہ مرقدہٗ" لکھ کے بزعمِ خود بچارے میاں نور اللہ پر چوٹ کی ہے، حالانکہ "نُورَاللہ مرقدہٗ" کے کوئی معنی ہی نہیں البتہ عربی میں "نَوَّرَ اللہُ مَرْقَدَہٗ" ضرور کہتے ہیں جس کے معنی ہیں، اللہ اس کے مرقد کو نورانی کرے۔ البتہ وزیرِ خزانہ کو لوگ میاں نور اللہ کی جگہ میاں نورّاللہ کہنا شروع کردیں تو اور بات ہے۔

لیکن اگر بچارے نئے وزرا کو "تشدید" کا نشانہ بنانا ہے تو دوسرے وزرا کیوں بچ رہیں، شیخ کرامت علی صاحب کو کرّامتؔ علّی کہئے، میجر مبارک علی شاہ کو مبّارکؔ علّی اور میاں عبدالحمید دستی کو عبدالحمّید دستّی۔ سہارن پور اور اس پاس کے اضلاع پرانے زمانے میں اس لئے مشدد آباد کہلاتے تھے کہ وہاں کے لوگ تشدید کا استعمال حد سے زیادہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس علاقے میں بیٹا بیٹّا ہے، بیٹی بیٹّی ہے عقل عقّل اور علم علّم۔

تشدید کے سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آگیا، خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک دفعہ تشدید کے بعض عجائبات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا، وِلّی اصل میں "دل لی" ہے کیونکہ

جو شخص دِلّی آتا ہے، دل کھو بیٹھتا ہے۔ راقم الحروف نے اس مصرع طرح پر گرہ لگائی، کہ بلّی اصل میں بل لی ہے، کیونکہ یہ ظالم بِل کے بِل صاف کر ڈالتی ہے۔ اگرچہ اس طرحی مشاعرہ کا حاصل صرف دو مصرعے تھے ع

دِلّی
بلّی

لیکن غور کیجئے تو یہ دو مصرعے بڑی بڑی غزلوں پر بھاری نظر آتے ہیں۔

ہمارے صوبے میں ان دنوں دو کانفرنسیں ہو رہی ہیں، لاہور میں یونیورسٹی کی اردو کانفرنس اور سرگودھا میں طبّی کانفرنس۔ ہمارے وزیر تعلیم وصحت شیخ کرامت علی صاحب کا دونوں کانفرنسوں سے گہرا تعلّق ہے لیکن چونکہ طبّی کانفرنس میں وہ "برات کے دُلھا" یعنی صدر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے سرگودھا تشریف لے گئے اور اردو کانفرنس اردو کے سب سے بڑے زباندان کے قدوم میمنت لزوم سے محروم رہ گئی، گویا تعلیم پر صحت اور اردو پر طب یعنی "زبان" پر "گاؤزبان" نے فتح پائی۔

جہاں تک اُردو کا تعلّق ہے، شیخ صاحب بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں؛ البتہ طب سے اُنہیں بجز اس کے اور کوئی تعلّق نہیں کہ وہ اپنی نرم گفتاری اور خوش اخلاقی کے باعث کبھی کبھی ریشہ خطمی باضافہ لعاب بہی دانہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن طب سے اس قسم کا تعلق سردار شوکت حیات کو بھی ہے جو اپنے اکل کھرے پن کی وجہ سے جراتہ اور شاہترہ کا خیساندہ بلکہ جوشاندہ معلوم ہوتے ہیں۔

بہر حال ہماری دُعا ہے کہ طبّ قدیم کے زرِ کامل عیار کے لئے جو "کشتہ" ہو چکا ہے شیخ کرامت علی صاحب کی صدارت "مادالحیات" ثابت ہو۔ بحمداللہ کہ شیخ صاحب کو اطبائے کرام سے نہ کوئی سیاسی اختلاف ہے اور نہ طبّی، اور طبّی اختلاف ہو بھی کیسے سکتا

ہے، شیخ صاحب اخلاط اربعہ کے قائل ہیں بلکہ خود مغربی پنجاب کی وزارت کے جسم میں ایک "خلط" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا اطبا کا کام ہے کہ وہ "صفرا ہیں یا سودا" کم از کم "خون" تو ہرگز نہیں۔

دو دن ہوئے راقم الحروف نے لکھا تھا کہ وزیر کے لغوی معنی بوجھ اٹھانے والے کے ہیں، اس لئے اگر صوبائی وزیروں کو "صوبہ قلی" کہہ دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ اس پر ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس حساب سے وزیر زراعت "زراعت قلی" ہوئے، وزیر تعلیم، تعلیم قلی اور وزیر اعظم "بڑے قلی"۔ لیکن سب سے دلچسپ نام تو ریلوے کے وزیر صاحب کا ہے، کیونکہ انہیں "ریلوے قلی" کہا جا سکتا ہے مگر اس قسم کی نکتہ نوازیاں کرتے وقت ذرا احتیاط کیا کیجئے، کیونکہ ان سے توہین کا پہلو نکلتا ہے

حضرت سلامت! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی حیثیت محض سخن گسترانہ ہے۔ وزراء کی توہین مقصود نہیں، قلی، ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اور ترکوں میں شاہ قلی، حسین قلی، محرم قلی، علی قلی کی قسم کے نام رکھنے کا رواج اب تک ہے۔

تفنن برطرف عربوں میں تو زیادہ بوجھ اٹھانا طاقت اور ہمت کی نشانی سمجھی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خاندان بنو امیہ کا آخری فرمانروا مروان الحمار کہلاتا تھا۔ ہمارے ہاں کسی شخص کو حمار یعنی گدھا کہہ دیا جائے تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا لیکن مروان کو یہ لقب اس کی مستقل مزاجی اور حیرت انگیز ہمت کی وجہ سے ملا تھا۔

مرزا باقر نے میر گھسیٹا سے پوچھا "آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟"

"غریب خانہ بدایوں میں ہے"

"لاحول ولا قوۃ، بدایوں بھی کوئی بستی ہے، آب و ہوا ناقص، باشندے حماقت

میں مشہور، بدایوں میرا وطن مالوف ہوتا تو میں خودکشی کر لیتا۔"

میر گھسیٹا جل گئے، پوچھا "اور آپ کا وطن؟"

"مکہ معظمہ جسے ام القریٰ بھی کہتے ہیں، اب فرمائیے۔"

اور میر گھسیٹا مرزا صاحب کے وطنِ مالوف کے متعلق جو فقرے سوچ رکھے تھے وہ زبان تک آ کے رہ گئے۔

خان ممدوٹ کی وزارت میں ایک پیر صاحب تو پہلے ہی شامل ہیں اب انہوں نے ایک اور پیر یعنی سر مہر شاہ کو وزارت میں شامل کرنے کا ارادہ کر کے اسے اتنا مقدس بنا لیا ہے کہ ہم اور آپ وزارت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وزارت جلال پور شریف نہیں تو نہ سہی، زندہ پیروں کا مزار شریف تو ضرور ہے۔ ہمت ہے تو اس کے خلاف کچھ کہہ کے دیکھئے، کفر کا فتویٰ نہ لگ جائے تو ہمارا ذمہ۔

اردو میں عام طور پر بلیک مارکیٹ کا ترجمہ "چور بازار" کیا جاتا ہے لیکن "کالا بازار" کہنے میں کیا ہرج ہے۔ کالا پانی اور کالا ازار تو پہلے ہی مستعمل ہیں "کالا بازار" کہہ دینے ہیں کیا ہرج ہے۔ یوں تو کالا شاہ کاکو اور کالا باغ بھی پنجاب کے دو مشہور مقامات ہیں اور کالا باغ میں ایک بہت بڑے جاگیردار بھی ہیں جو نواب صاحب کالا باغ کہلاتے ہیں لیکن کالا پانی اور کالا آزار کی طرح اگر "کالا بازار" کو بھی اردو کی ٹکسال کا چالو سکہ سمجھ لیا جائے تو اس سے "کالا باغ" اور "کالا شاہ کاکو" کی عزت اور شہرت پر حرف نہیں آتا اور پھر بلیک مارکٹ یعنی "کالا بازار" کوئی ایسی گری پڑی چیز نہیں، ان کوٹلوں کی دلالی میں تو بڑے بڑوں کے ہاتھ منہ کالے نظر آتے ہیں۔

سُنا ہے ماسٹر تارا سنگھ ان دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں میں "فسا د کراؤ" کی صدا ئیں لگاتے پھرتے ہیں، پچھلے دنوں وہ سردار موہن سنگھ کوسے کے دلّی بھی پہنچے تھے لیکن وہاں

ان کی دال نہ گلی، کیونکہ سردار پٹیل پہلے ہی دلّی میں موجود ہیں۔

ہم پیشہ لوگوں کا باہمی عناد مشہور ہے۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" جس گلی میں ایک کھٹ بُنا موجود ہے وہاں دوسرے کھٹ بُنے کا قدم جمانا مشکل ہے، دلّی میں ایک آل انڈیا قسم کا "کھٹ پٹیا" بیٹھا ہے پھر وہاں دوسرے "کھٹ پٹیے" اور وہ بھی صوبائی قسم کے کھٹ پٹیے کا گزارہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ماسٹر تارا سنگھ "فساد کرالو" کی صدا لگاتے دِلّی پہنچے تو سردار پٹیل نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم ماسٹر جی کو دلّی میں فساد کرانے نہیں دیں گے۔ یہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دلّی میں فساد کرانا ہو تو ہم خود کرالیں گے، ماسٹر تارا سنگھ اور سردار موہن سنگھ فساد کرانے والے کون؟ سردار پٹیل اور ماسٹر تارا سنگھ دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ ماسٹر جی "پٹڑی دکان دار" بھی نہیں بلکہ صرف "پھیری والے" ہیں اور سردار پٹیل نے اچھا خاصا کاروبار کھول رکھا ہے۔

ہندوستان کے اخبارات میں آج کل جنگ کا بڑا چرچا ہے جس اخبار کو اٹھا کے دیکھیے بس یہی کہہ رہا ہے کہ بھارت سرکار کو فوراً پاکستان پر حملہ کر دینا چاہیئے، دراصل ان بھدر پرشوں نے جو آج جنگ، جنگ پکار رہے ہیں، جنگ کا نام ہی سنا ہے، دیکھی کبھی نہیں اس لئے جو منہ میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔

پچھلی جنگ کے دوران میں لکھنؤ کی ایک بھٹیاری سے کسی نے کہا کہ تین سال سے لڑائی ہو رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا، بڑی بی یہ سن کے حیران رہ گئیں اور کہنے لگیں:

"اے ہے یہ کیسی لڑائی ہے کہ تین سال سے ہو رہی ہے اور ختم ہونے میں نہیں ہوتی ذرا مجھے لڑنے کے لئے بھیج دیجئے، موا دشمن تین پہر کے اندر بھاگ نہ کھڑا ہو تو میرا نام

شباب جاں نہیں۔

ہندوستان کے اخبارات بھی سمجھتے ہیں کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہم مہاشہ نانک چند ناز کو لڑنے بھیج دیں گے، وہ اپنا کلام سنانا شروع کر دیں گے اور سارے اہلِ پاکستان کو غش آ جائے گا۔ اگرچہ خدا کے فضل سے ہمارے ہاں بھی ایسے شاعر موجود ہیں، جن کا کلام سن کے بیساختہ مہاشہ نانک چند ناز کو بھی غش آ جائے، لیکن جنگ آخر جنگ ہے، گالیاں دینے یا بے تکے شعر پڑھنے کا مقابلہ نہیں۔

سنا ہے جنرل موہن سنگھ نے کہا ہے کہ حیدر آباد کو فتح کرنے میں تو چار دن خرچ ہوئے تھے، لیکن لاہور چار گھنٹوں میں فتح ہو جائے گا، یعنی ۱۲ بجے حملہ شروع ہوگا اور چار بجے لاہور پر پوری طرح جنرل موہن سنگھ کا قبضہ ہو جائے گا۔ جنرل صاحب نے آج تک شہر تو کوئی فتح نہیں کیا، البتہ کئی شہروں میں قید ضرور رہے ہیں، اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ چار گھنٹوں میں لاہور کیونکر فتح کر لیں گے۔

اور جنرل صاحب جرنیل بھی تو نہیں بلکہ نرے کپتان ہیں۔ جاپانیوں نے جنگ کے زمانے میں انہیں کپتان سے جرنیل بنا دیا اور آپ جانتے ہیں کہ جاپان کی بنی ہوئی چیزیں کتنی سستی اور ناپائدار ہوتی ہیں۔ جنگ سے پہلے جاپان سے سستا کپڑا کھلونے وغیرہ چیزیں آتی تھیں، جنگ کے بعد "میڈ ان جاپان" جرنیل اور کرنیل آنے شروع ہو گئے۔ آج کل ہندوستان میں اس جاپانی مال کی اگلی سی کھپت تو نہیں رہی، پھر بھی شکر ہے کہ اس قسم کے کرنیل اور جرنیل خاصے اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جنرل موہن سنگھ نے ایک زمانے میں دلّی کو فتح کرنے کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن جاپانیوں نے کچھ عرصے کے بعد ہی انہیں قید کر لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو وہ قید ہو کے دلّی پہنچے اور کچھ عرصے

کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ آج وہ چار گھنٹوں میں لاہور فتح کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، دیکھئے اب کے ان پر کیا گزرتی ہے، اس قسم کے دعوے انہیں راس نہیں آیا کرتے۔

لندن میں ان دنوں اولمپک کے جو کھیل ہو رہے ہیں، ان میں پاکستان کے پہلوان وزن کرانے کے لئے ذرا دیر میں پہنچے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں دنگل میں شریک ہونے کی اجازت ہی نہ ملی۔

ہمارا خیال تھا کہ پاکستان کے پہلوان رات کو دیر تک جاگتے رہے ہوں گے، اس لئے صبح وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ لیکن پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر کا بیان ہے کہ پہلوانوں کا وزن کرنے کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا تھا، اولمپک کمیٹی نے پاکستان کی ٹیم کو اطلاع دیئے بغیر اس میں تبدیلی کر دی، پاکستانی پہلوان وزن کرانے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وزن چھوڑ قلفئے بھی طے ہو چکے یعنی جوڑ بھی مقرر ہو گئے۔

جب انگریز پہلے پہل ہندوستان آئے اور لوگوں نے انہیں ہاتھوں کے بجائے چھری کانٹے سے کھانا کھاتے دیکھا تو ان کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت یہ تھی کہ انگریز کے ناخنوں میں زہر ہوتا ہے، ہاتھ سے کھانا کھائیں، تو مر جائیں۔ بعض لوگ تو انگریزوں سے ہاتھ ملاتے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں زہر سرایت نہ کر جائے۔

اس قسم کے توہمات ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں، یورپ میں بھی ہیں۔ مثلاً وسطی یورپ کے دیہات کے اکثر لوگوں میں یہ خیال عام ہے کہ بعض لوگوں کو یہ قدرت حاصل ہے کہ خاص خاص موقعوں پر بھیڑیئے کا قالب اختیار کر لیں۔ ملایا کے اکثر حصوں میں یہ خیال عام ہے کہ بعض لوگ شیر کا روپ دھار کے مار دھاڑ کرتے پھرتے ہیں ۔۔۔ شکر ہے کہ ہمارے

ملک میں اس قسم کی روایات مشہور نہیں ہمارے ہاں انسان کے لباس میں بھیڑئیے ضرور موجود ہیں، لیکن یہ واہمہ کی کرشمہ آرائی نہیں، بلکہ واقعہ ہے۔

وزرا کے اکھاڑے کے سب سے نامور پہلوان میاں نوراللہ ہیں وہ نماز کمیٹی کی صدارت بھی کرتے ہیں، بنکنگ اور سُود کی تعریف میں بھی قصیدہ ارشاد فرما دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی تقریریں سُنی ہیں، اُن کا خیال ہے کہ میاں صاحب کی رائے میں مسلمانوں کی نجات کا انحصار یا تو نماز پر ہے یا پھر سُود پر۔ اب فرمائیے اس موقع پر کیا کہنا چاہئیے؟

ڈان (اردو) کراچی نے سوئٹزرلینڈ کو تو سوئستان لکھا ہی تھا، اب اس نے ہالینڈ کو "ہالستان" کہنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہا، تو کہیں نیو فونڈلینڈ "فنڈستان" اور سکاٹ لینڈ "اسقاطستان" نہ بن جائے۔ ڈان میں اس قسم کے نام پڑھ کے ہمیں خیال گزرتا ہے کہ سپستان جسے آج تک ایک عام دوا سمجھتے رہے ہیں، کسی ملک ہی کا نام نہ ہو۔

ہمارے ایک معاصر نے میاں محمد ممتاز دولتانہ کی تصویر چھاپی ہے جس کے نیچے لکھا ہے "چودھری عبداللہ خاں بھٹی وزیر آزاد کشمیر گورنمنٹ" ہمیں یہ تصویر دیکھ کے خیال ہوا، کہ میاں محمد ممتاز دولتانہ کی تصویر کے نیچے غلطی سے چودھری عبداللہ خاں بھٹی لکھ دیا گیا ہے تو چودھری عبداللہ خاں بھٹی کی تصویر کے نیچے میاں محمد ممتاز دولتانہ لکھ دیا گیا ہو گا، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ جس تصویر کے نیچے دولتانہ صاحب کا نام لکھا گیا ہے وہ چودھری عبداللہ خاں بھٹی کی نہیں، بلکہ سید نذیر حسین شاہ کی تصویر ہے۔ "احمد کی پگڑی محمود کے سر" ہو تو کوئی ہرج نہیں کیونکہ اس کی تائید میں کہاوت موجود ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ احمد کی پگڑی محمود کے سر پر رکھنے کی بجائے اسے مسعود کے سر پر رکھ دیا گیا اور بچارا محمود مُنہ تکتا رہ گیا۔

دو تین دن ہوئے "امروز" میں شاہ نعمت اللہ ولی کے قصیدے کا ذکر آیا تھا، بعض اصحاب کو شبہ ہوا ہے کہ ہم نے جن شاہ نعمت اللہ کا ذکر کیا ہے وہ کوئی اور بزرگ ہیں اور ان شاہ نعمت اللہ سے جن کی پیش گوئیاں مشہور ہیں اُن کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ شبہ قطعاً بے بنیاد ہے، ہم نے جن شاہ نعمت اللہ کا ذکر کیا ہے وہ اصل میں وہی بزرگ ہیں جن کی پیش گوئیاں مشہور ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اخباروں نے انہیں شاہ نعمت اللہ بخاری لکھا ہے، حالانکہ ان کا وطن کرمان ہے اور وہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کہلاتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں کوہستانی بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مدت تک پہاڑوں میں عبادت کرتے رہے ہیں۔ کرمان کے پاس ماہون کی ایک چھوٹی سی بستی ہے، یہاں ان کا مقبرہ ہے جو ایران کی مشہور عمارتوں میں سمجھا جاتا ہے۔ مقبرے کے ساتھ ایک خوبصورت باغ بھی ہے، جسے دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

اخباروں میں اس بات پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ پولیس اور عوام میں پہلے سے زیادہ تعلقات ہونے چاہئیں، ہمارے عندیہ میں دونوں کے تعلقات پہلے سے بہت زیادہ ہیں، جرائم زیادہ، گرفتاریاں زیادہ، مقدمات زیادہ، یہ بڑھتے ہوئے تعلقات کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں؟ نہ جانے لوگ پھر کیوں شور مچاتے جا رہے ہیں؟

ہندوستان کی ریاستوں سے طوائفیں نکالی گئیں، گویّے نکالے گئے، بھانڈوں کو جواب مل گیا، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھیوں کا کیا کریں؟ کمبخت ہاتھیوں کے گاہک بہت کم ہیں۔ لے دے کے سرکس میں ان کی کھپت ہو سکتی ہے لیکن اتنے سرکس کہاں سے آئیں جن میں ہندوستان بھر کے ہاتھیوں کے لئے جگہ نکل سکے، پھر مصیبت یہ ہے، سرکس والے بھی ہاتھی کی قیمت زیادہ سے زیادہ تین سو روپے لگاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ہندوستان کی حکومت کو چاہئے کہ خرید و فروخت کے قضیئے ہی میں نہ پڑے بلکہ جس طرح اکثر لوگ سانڈ چھوڑ دیتے ہیں، اس طرح ہاتھی چھوڑ دے، بھانڈوں اور گویوں کی طرح یہ بچارے بھی مانگ کھائیں گے اور "ہند سرکار" کو دعا دیں گے، سرکس کی زندگی سے تو بھیک مانگنا ہی اچھا ہے۔

اور ہندوستان کی حکومت میں تو ہاتھیوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں، یوں تو کہنے کو انڈین یونین کے گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ راجاجی کہلاتے ہیں اور راجاجی کا ہاتھی بہت مشہور ہے لیکن وہ ہاتھی کے بغیر راجاجی ہیں۔ مولوی صاحب کا گھوڑا اور پنڈت جی کی بہلی تو پہلے ہی غائب ہو چکی ہے اب راجاجی کا ہاتھی بھی گیا۔ مولوی صاحب کا گھوڑا تو خیر تانگے میں جت گیا لیکن راجاجی کے ہاتھی کے لئے تانگے والوں کے ہاں بھی تو کوئی گنجائش نہیں۔

نادر شاہ افشار کو پہلی بار ہاتھی پر سوار ہونے کا اتفاق ہوا تو مہاوت سے کہنے لگا، "عنانش بدستِ من بدہ"۔ مہاوت نے جواب دیا "صاحب فیل عنان ندارد"۔ نادر شاہ یہ کہتا ہوا ہاتھی سے اتر آیا "مرکبے کہ عنانش بدستِ غیر باشد سواری را نشاید"۔

مسٹر شیخ عبداللہ کشمیر کے وزیر اعظم بن کے بہت خوش تھے لیکن انہیں اب معلوم ہوا ہے کہ کشمیر کی وزارت اصل میں ہاتھی کی سواری ہے یعنی ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مہاراجہ مہاوت ہے، آنکس بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، پنڈت نہرو داروغہ فیل خانہ ہیں، راتب کا انتظام بھی وہی کرتے ہیں اور بچارے شیخ صاحب کو چرکٹے کی حیثیت بھی حاصل نہیں۔

سُنا ہے، پاکستان کی حکومت عنقریب ایک آرڈی نَنس نافذ کرنا چاہتی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اخبار والے جو آئے دن وزرا پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں، ان کی زبان بندی کا انتظام کر دیا جائے، یوں کہنا چاہیئے ؎

شہر میں اپنے یہ لیلےٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

عصمتِ انبیا کے تو تمام مسلمان قائل ہیں لیکن لوگ ابھی تک عصمتِ وزرا پر ایمان نہیں لائے اور اخبار نویسوں کو اگر آرڈی نَنس کے زور سے اس بات کا قائل بھی کر لیا جائے کہ وزرا معصوم ہیں تو عام لوگوں کا کیا علاج؟ گستاخی معاف چائے خانوں، ریستورانوں، شہروں کے گلی کوچوں میں جو باتیں کہی جا رہی ہیں ان کا عشرِ عشیر بھی اخباروں میں نہیں چھپتا، آرڈی نَنس سے اخباروں کی تو زبان بندی ہو جائے گی، لیکن زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے؟

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے سکرٹری صاحب نے اخباروں میں جو بیان چھپنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ اسمبلی پارٹی کا اجلاس تو ہوا لیکن حریفوں کو بھی طاقت آزمائی کا موقع نہیں ملا، یعنی یہ اجلاس نرا اجلاس تھا دنگل نہیں تھا، شکر ہے کہ لیگ کونسل کے اجلاس میں اس کمی کی تلافی کر دی گئی۔ یعنی حریفانِ بزم نے کرسیاں اٹھا اٹھا کے پھینکنی شروع کر دیں اور یہ سماں نظر آنے لگا کہ ؎

درید و برید و شکست و بہ بست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

سنا ہے کہ جب کرسیاں پھینکی جانے لگیں تو دولتانہ صاحب اور مولانا علاؤالدین صدیقی دونوں نے آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ نون صاحب نے اس موقع پر دوسروں ہی سے

آیۃ الکرسی پڑھوائی خود نہیں پڑھی اور آپ جانتے ہیں کہ وہ درود بھی خود نہیں پڑھا کرتے، بلکہ دوسروں ہی سے پڑھواتے ہیں اور اس طرح ثواب میں شریک ہو جاتے ہیں۔

معلوم نہیں لیگ کونسل کے اجلاس میں جو ہنگامہ ہوا وہ جہاد تھا یا فساد، بہرحال اگر یہ جہاد تھا تو خان ممدوٹ اس ثواب سے محروم رہ گئے، کیونکہ وہ اس موقع پر موجود نہیں تھے، اور فساد تھا تو جب بھی ان کی محرومی اس اعتبار سے افسوسناک ہے کہ آیۃ الکرسی پڑھنے کا ثواب ان کے حصے میں نہیں آیا۔

لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن پر جس کھڑکی سے ٹکٹ فروخت کئے جاتے ہیں، اس پر اردو حروف میں "ٹکٹ باری" لکھا ہوا ہے، کیونکہ "باری" پنجابی زبان میں کھڑکی کو کہتے ہیں اور جس کھڑکی میں ٹکٹ بابو ٹکٹ بیچے اسے قاعدہ کے مطابق "ٹکٹ باری" ہی کہنا چاہئے۔ افسوس ہے، لالہ موسیٰ کے ٹکٹ بابوؤں کو یہ معلوم نہیں کہ "باری" صرف کھڑکی ہی کو نہیں کہتے، بلکہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر کو بھی باری ہی کہتے ہیں۔

ہمیں تو اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں لوگ مولانا عبدالباری کو بھی "ٹکٹ باری" نہ کہنا شروع کر دیں اور ہمارا یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں۔ مولانا عبدالباری کو ٹکٹ سے بڑی نسبت ہے جسے انہوں نے ٹکٹ کاٹ دیا، اس کا مشیر بننا یقینی ہے اور اگلے الیکشن میں بھی تو لیگ کے "ٹکٹ بابو" وہی ہوں گے یعنی جسے وہ ٹکٹ کاٹ دیں گے وہی الیکشن کی گاڑی میں بیٹھ سکے گا۔ کوئی عجب نہیں کہ کچھ عرصے کے بعد مولانا عبدالباری کو تو لوگ بھول جائیں لیکن "ٹکٹ باری" زندہ جاوید ہو جائے۔

بعض اخباروں نے لکھا ہے کہ کراچی میں "ٹڈی کانفرنس" ہو رہی ہے، یہ ٹڈیوں کی کانفرنس ہے تو اسے "ٹڈی دل" کہئے، کیونکہ ٹڈیوں اور اکالیوں کا "دل" ہوتا ہے،

کانفرنس نہیں ہوتی اور اگر یہ کانفرنس ٹڈیوں کے انسداد کے لئے کی جارہی ہے تو ٹڈیوں کے انسداد کی کانفرنس کہنا چاہئے "ٹڈی کانفرنس" سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس میں صرف ٹڈیاں اور ٹڈیوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔

ہمیں تو ڈر ہے کہ "ٹڈی کانفرنس" کی قسم کی ترکیبیں چل نکلیں تو ملیریا کے انسداد کے لئے جو کانفرنس ہو رہی ہے اُسے لوگ "مچھر کانفرنس" کہنا شروع کر دیں گے ہم تو اصل میں لفظ "کانفرنس" ہی کے استعمال کے مخالف ہیں کیونکہ ہم نے اپنے کانوں سے بعض لوگوں کو "احرار کانفرنس" کے بجائے "احرار کانفرنس" کہتے سُنا ہے، اب یہ نہ پوچھئے کہ ان بزرگوں میں کیسے کیسے مقدسین شامل تھے؟

"ٹڈی دل کے انسداد کی کانفرنس" آپ کو ذرا بھاری بھرکم سی ترکیب معلوم ہوتی ہے تو "ٹڈی کانفرنس" کے بجائے "ٹڈی مار کانفرنس" کہئے اور پھر اسی سانچے میں لفظ ڈھالتے چلے جائیے، مچھر مار کانفرنس، مکھی مار کانفرنس، وقس علیٰ ہذا۔ لیکن خدا کے لئے اس کانفرنس کو جس میں بڑے بڑے سرکاری افسر شامل تھے اور ٹڈیوں کا ایک بھی نمائندہ موجود نہیں تھا، ٹڈی کانفرنس تو نہ کہئے۔

"ڈان" میں ایک خط شائع ہوا ہے جس میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ روپیہ کا نام "قائد" اور اٹھنی کا نام "لیاقت" ہونا چاہئے۔ ہمارے خیال میں اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو چونی دونی، اکنی، ادھنی، پیسہ، دھیلے اور پائی اور دمڑی کے لئے بھی اسی قسم کے نام تجویز کرنے پڑیں گے۔ مثلاً چونی کا نام "خلیق" دونی کا "شہاب" اکنی کا "باری" دولتانہ کی قیمت اگرچہ کم ہو گئی ہے، پھر بھی ادھنی کا نام تو "دولتانہ" ضرور ہونا چاہئے۔

اگر سکوں کے یہ نام سرکاری طور پر منظور کر لئے گئے تو شروع شروع میں لوگوں کی

سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ کتنے 'باری' کا ایک 'شہاب' اور کتنے 'شہاب' کا ایک "لیاقت" ہوتا ہے۔ بازاروں میں خرید و فروخت کے موقع پر عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں گی، مثلاً آپ دکاندار سے کہیں گے، ایک دولتانہ کی ٹکیہ دے دو، جواب ملے گا ایک دولتانہ کی ٹکیہ کیا آئے گی، کم از کم ایک خلیق کی تو خریدئیے۔ آپ جلدی سے کہیں گے، ہاں ہاں ایک خلیق ہی کی دے دو، اصل میں میں خلیق کی جگہ دولتانہ کہہ گیا اور ہاں لکس کے صابن کی قیمت کیا ہے، آٹھ باری یعنی ایک، لیاقت کل دام کتنے ہوئے بارہ باری ؟ ٹھیک ہے نا ؟

جزائر شرق الہند کے مسلمانوں کے بارے میں ہم لوگوں کی بے خبری بیحد افسوسناک ہے، ہم میں اکثر کو یہ معلوم نہیں کہ مشرق اقصیٰ کے ان جزیروں میں سات کروڑ مسلمان بستے ہیں جو ہم سے بالکل کٹ کے رہ گئے ہیں یعنی ہم ان کے متعلق اور وہ ہمارے متعلق کچھ نہیں جانتے، پنڈت نہرو کی ہوشمندی کا کیا ٹھکانا ہے، ملایا گئے، ہندیشیائیوں سے تعلقات پیدا کئے، ایشیا کانفرنس کی اور ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے ہی ایشیا میں اس کی قیادت کے لئے زمین تیار کرنی شروع کر دی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا، سیّد ابراہیم السکاف جو ملایا اور جاوا کے مشہور تاجر ہیں اور نہ صرف ملایا اور جاوا بلکہ اکثر عرب ممالک میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں، اور وہ ہندوستان کے اکثر معاملات مثلاً ہندوستان کے مسلم عوام کی تحریکوں سے قطعاً ناواقف تھے۔ ان سے اور چند مسلمان فوجی افسروں سے گفتگوئیں ہوئیں تو انہیں حالات معلوم کرنے کا شوق ہوا، چند کتابیں پڑھیں اور اتنے متاثر ہوئے کہ کراچی آئے لیکن کسی نے زیادہ توجہ نہ کی، کئی دروازوں پر دستک دی، لیکن سب بند پائے۔ آخر وہ بددل ہو کے "ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم" کہتے ہوئے چلے گئے۔ نہیں معلوم کمندِ شوق کوتاہ تھی یا گوشۂ بام بلند تھا، بہرحال وہ ہم سے پھر اتنی ہی دُور ہو گئے ہیں جتنے پہلے تھے۔

"نیا ادب" بمبئی میں کرشن چندر کا ایک افسانہ چھپا ہے جو کوٹلی کے ایک مہاجن دیس راج کی داستانِ مصیبت ہے۔ دیس راج کوٹلی پر آزاد کشمیر فوج کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اب وہ کوٹلی نہیں۔ پندرہ بیس ہزار ہندوؤں میں مشکل سے دو چار پانچ ہزار بچے ہوں گے اور وہ بھی جو لوگ بھاگ سکے، ورنہ سب ختم ہو گئے۔ اب وہاں کوئی ہندو نہیں"

واضح رہے کہ کوٹلی ایک قصبہ ہے جو میرپور سے ۲۶ میل شمال کی جانب اور پونچھ سے چالیس میل جنوب کی جانب ہے، اس قصبے کی ساری آبادی تین چار ہزار سے زیادہ نہیں، لیکن مسٹر کرشن چندر کے بیان کے مطابق یہاں پندرہ بیس ہزار صرف ہندو ہی بستے تھے، گویا مسلمانوں کی آبادی بھی شامل کر لی جائے تو قصبے کی آبادی چالیس ہزار تو ضرور ہوگی۔

مسٹر کرشن چندر نے فسادات کے متعلق بعض اچھے افسانے لکھے ہیں جو فن کے معیار پر پورے اُتریں نہ اُتریں، اُن سے کم از کم شدتِ احساس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اُنھیں یہ حق نہیں کہ واقعات کو افسانے کے قالب میں ڈھال کے اُن کی صورت بالکل مسخ ہی کر دیں۔ مسٹر کرشن چندر کو غالباً معلوم نہیں کہ کوٹلی میں کرنل بلدیو سنگھ پٹھانیہ گھر گئے تھے، ہندوستانی فوج نے انہیں نکالا تو ہندو بھی نکل گئے اور اسے بھی جلنے دیجئے۔ تین چار ہزار آبادی کے قصبہ میں پندرہ بیس ہزار ہندو کہاں سے آ گئے؟

پچھلے دنوں "امروز" میں ایک مقالۂ افتتاحیہ چھپا تھا کہ اگر گورنر جنرل اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کے "بعض نا اہل" اور "بے ایمان" ممبروں کو علیحدہ کر دیں تو عوام کو یہ بتایا جائے کہ ان لوگوں کو کس جرم میں یہ سزا دی گئی ہے؟ اگرچہ اس مقالہ میں مغربی پنجاب کی اسمبلی کا ذکر تک نہیں تھا تاہم ہمارے صوبے کی اسمبلی کے بعض ممبروں نے فرض کر لیا ہے کہ رُوئے سخن اُنہیں کی جانب ہے۔

دوسرے دن ہمیں اسمبلی کے ایک ممبر جناب ولی محمد گوہیر صاحب کا خط ملا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ دیکھئے، آپ نے ہمیں "بے ایمان" کہہ دیا۔ ہم انہیں جواب نہیں دینے پائے تھے، اتنے میں خبر آئی کہ چند ایم، ایل، اے حضرات وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں جا پہنچے اور ان سے عرض کی کہ "امروز" نے ہماری شان میں سخت گستاخی کی ہے اس لئے اس کے ایڈیٹر اور پرنٹر و پبلشر پر مقدمہ چلایا جائے۔

معلوم نہیں خان ممدوٹ نے انہیں کیا جواب دیا؟ غالباً یہی کہا ہوگا کہ پاکستان بھر کی کسی اسمبلی کے کسی ممبر کو اگر نا اہلی یا بد دیانتی کی وجہ سے الگ کر دیا جائے اور لوگوں کو اس کا جرم بتا دیا جائے تو آپ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ بہر حال یہ ایم، ایل، اے حضرات بے نیل مرام واپس آ گئے۔

ہمارے لئے یہ تو ناممکن ہے کہ جو لوگ "امروز" پڑھتے ہیں، اُنہیں مقالہ افتتاحیہ یا حرف و حکایت کا مطلب سمجھانے کے لئے صبح سویرے ان کے گھر پہنچ جایا کریں۔ بہر حال یہ ہو سکتا ہے کہ جو ایم، ایل، اے حضرات "امروز" کے باقاعدہ خریدار ہیں، اُن کے ہاں "امروز" کے عملۂ ادارت کے کسی رکن کو بھیج دیا جایا کرے۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ خدانخواستہ مغربی پنجاب کی اسمبلی کے ممبر اُردو نہیں سمجھتے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات لمبے لمبے فقروں کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے اگر پھر اسمبلی کے کسی ممبر کو اسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی تو ہم ان کا کیا کریں گے؟

اصل بات تو یہ ہے کہ اس انتظام سے ایم، ایل، اے حضرات کی "سہولت" سے زیادہ اپنی "حفاظت" مقصود ہے لیکن ہم انہی ایم، ایل، اے حضرات کے لئے اس قسم کا انتظام کر سکتے ہیں جو لاہور میں موجود ہیں۔

علامہ مشرقی کی انڈو پاکستان اسلام لیگ اب تک دو تین پریس کانفرنسیں کر چکی ہے، لیکن ان کانفرنسوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کیونکہ اخبار نویس کانفرنسوں میں شریک

ہوتے ہیں، چائے بسکٹ پر ہاتھ مارتے ہیں، علامہ مشرقی کی لمبی لمبی تقریریں سنتے ہیں اور اسلام لیگ کی حمایت کرنا درکنار پریس کانفرنس کی روئداد تک نہیں چھاپتے۔

پریس کانفرنسیں بیکار ثابت ہوئیں تو جناب علامہ نے اخبار نویسوں کو پھانسنے کا ایک اور طریقہ نکالا یعنی اعلان کر دیا کہ جو اخبار نویس انڈو پاکستان اسلام لیگ کی حمایت کریں گے، انھیں معاوضہ دیا جائے گا اور اخباروں کے نامہ نگاروں کو دو روپے فی کالم کے حساب سے معاوضہ ملے گا اور انگریزی اخباروں کے نامہ نگار تین روپے فی کالم کے حساب سے معاوضہ پائیں گے، ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹروں کو ساٹھ روپے ماہانہ ملیں گے، روزانہ اخباروں کے ایڈیٹروں کو ڈیڑھ سو روپے ماہانہ، اور اگر کوئی شخص اسلام لیگ کی حمایت میں کتاب لکھ ڈالے تو اسے کتاب کی حیثیت کے مطابق ایک سو روپے سے پانچ ہزار روپے تک دیئے جائیں گے۔

جب سے اخباروں میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ترکی جا رہے ہیں بعض رسالوں کے ایڈیٹر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کا حق سفارت مسلّم ہو گیا۔ رسالہ کی ایڈیٹری نہیں تو نہ سہی سفارت تو کہیں گئی نہیں اور اگر انھوں نے کسی طرح ثابت کر دیا کہ ان کا رسالہ "ہمایوں" سے زیادہ مقبول ہے تو کیا عجب حکومت پاکستان اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائے یعنی میاں بشیر احمد کی جگہ انہیں سفیر بنا کے بھیج دے۔

ان حضرات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میاں بشیر احمد نرے ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں اور ہمارے خیال میں تو ان کے تقرر کا فیصلہ کرنے میں اتنا وقت صرف اس لئے خرچ ہو گیا کہ وہ ہمایوں کے ایڈیٹر ہیں اور آپ "ہمایوں" جیسے ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر ہی کیوں نہ ہو ذرا مشتبہ قسم کا انسان سمجھا جاتا ہے اور خفیہ پولیس تو مدت تک

اخبار نویسوں کو "اقوام جرائم پیشہ" میں سمجھتی رہی ہے، نہ جانے اب کیا حال ہے؟

ایک صاحب جو کراچی میں سال بھر قیام کرنے کے بعد حال میں لاہور آئے ہیں، فرماتے ہیں کہ ترکی کے سفیر صاحب نے جو شاعر بھی ہیں کراچی کی ایک صحبت میں اپنا کلام پڑھ کے سنایا تھا۔ لوگ سمجھے تو نہیں تاہم داد ضرور دیتے رہے، راقم نے عرض کیا کہ خدا نے چاہا تو میاں بشیر احمد صاحب بہت جلد ترکوں سے ہمارا انتقام لیں گے یعنی ہر محفل میں اپنا کلام سنائیں گے، لوگ سمجھیں گے تو نہیں تاہم داد ضرور دیں گے۔

جناب ارشد تھانوی نے جو بھوپال میں وکالت بھی کرتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں، اپنے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ بھوپال کی حکومت کو اردو کی بجائے سنسکرت کو دفتری زبان قرار دینا چاہیئے، واضح رہے، ارشد تھانوی صاحب ہندی کو نہیں بلکہ سنسکرت کو بھوپال کی دفتری زبان بنانا چاہتے ہیں گویا زبان کے معاملہ میں وہ پٹیل جی اور سمپورنانند جی دونو سے بڑھ گئے ہیں۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ہمارے خیال میں ارشد تھانوی صاحب کو خود اس معاملے میں پہل کرنی چاہیئے، یعنی آئندہ جب وہ کسی مشاعرے میں شریک ہوں تو اردو کے بجائے سنسکرت میں شعر پڑھیں۔ ابھی خود سنسکرت نہیں آتی، اگر وہ سنسکرت سیکھ لیں اور اس میں شعر کہنا شروع کر دیں تو ہمیں یقین ہے کہ جس مشاعرے میں وہ اپنا کلام سنائیں گے وہ دم بھر میں خالی ہو جائے گا۔ ارشد تھانوی صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ سنسکرت کبھی پوری طرح ہندوستان کی دفتری زبان نہیں بنی، پرانے زمانے میں بھی جب سنسکرت جاننے والے کثرت سے تھے، دفتروں میں پراکرت کا رواج تھا اور سنسکرت صرف عالموں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جبکہ سنسکرت کا رواج مٹ چکا ہے اسے دفتری زبان بنانا بڑے دل گردے

کا کام ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ کشمیر کے لوگوں کو میٹھی چیزوں سے بہت کم رغبت ہے، وہ چائے بھی پیتے ہیں تو اس میں چینی کے بجائے نمک ڈال لیتے ہیں اور پھر اس نمکین چائے کا دور دِن بھر چلتا رہتا ہے۔ لیکن جب سے پاکستان سے کشمیر کا تعلق منقطع ہوا ہے، کھیوڑہ کا نمک عنقا ہو گیا ہے، شیخ عبداللہ نے بڑی تگ و دو کی تو ہندوستان سے سانبھر نمک کی ایک کھیپ آگئی، . . . . لیکن سانبھر نمک میں کڑواہٹ ہے، اس لئے کشمیری اس نمک کی کڑوی چائے پیتے ہیں تو اس زمانے کو یاد کر کے روتے ہیں جب پاکستان سے ہزاروں من نمک آتا تھا اور ہر جگہ بآسانی مل سکتا تھا۔

شیخ محمد عبداللہ جو کشمیر کے لوگوں کو ہندوستان کا "نمک خوار" بنانے پر تلے ہوئے ہیں، سانبھر نمک کے بہت حامی ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ کشمیر کے لوگ اسے نمک نہیں قلمی شورہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیخ صاحب کی شوراشوری کے باوجود ان کی "ذرات" بالکل "بے نمک" بن کے رہ گئی ہے۔

ویر بھارت، ملاپ، پرتاپ، جے ہند اور پربھات وغیرہ اخبار جن دنوں لاہور سے نکلتے تھے، اپنی "سپیشلوں" کی وجہ سے بہت بدنام تھے۔ آج کل ان اخباروں میں سے ایک دو دلّی میں ہیں، باقی مشرقی پنجاب کے مختلف شہروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ گاڑیاں بنا ہیں جو تھوڑی بہت ریل گاڑیاں چل رہی ہیں، ان کا بھی یہ حال ہے کہ جس شہر کے مسافر زیادہ ہوتے ہیں اُسی کی طرف چل پڑتی ہیں، پھر بھی ان اخباروں کی "سپیشلیں" جن میں جھوٹ ہی جھوٹ لدا ہوتا ہے، بھک بھک کرتی دھواں اڑاتی پورب سے پچھم اور اُتر سے دکن تک دوڑتی پھرتی ہیں۔

پچھلے دنوں ایک اخبار نے لکھا تھا کہ کیرن کے "عظیم الشّان شہر" پر ہندوستانی فوجوں نے قبضہ کر لیا، دوسرا اخبار اس سے بھی بازی لے گیا اور بڑے فخر سے اعلان کر دیا، کہ ترارکھل کا خوبصورت شہر اور اس کی عظیم الشّان عمارتیں بالکل تباہ ہو گئی ہیں اور آزاد کشمیر کی حکومت اپنے دارالحکومت کو چھوڑ کے بھاگنے پر مجبور ہو گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ترارکھل اور کیرن دونوں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ کیرن میں سو ڈیڑھ سو کچے مکان ہوں گے، اور ترارکھل کی آبادی آج سے سال بھر پہلے پچاس ساٹھ نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے، لیکن ہندو اخباروں نے ان بستیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے، گویا ان کی آبادی دہلی جتنی نہ سہی، امرتسر اور جالندھر سے ضرور زیادہ ہو گی۔

ان اخباروں میں جھنگڑ کے "عظیم الشّان شہر" کا ذکر بھی آیا ہے، یہ مقام اس لحاظ سے ضرور اہم ہے کہ یہاں سے تین سڑکیں نکلتی ہیں لیکن جہاں تک آبادی کا تعلّق ہے، یہاں زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھر ہوں گے، اس کے پاس ہی سریاہ کا "مشہور شہر" ہے، جس میں کُل تین گھر ہیں۔ ان بستیوں کا حال ہندو اخباروں میں اس طرح آیا ہے کہ ان کی آبادی تین تین لاکھ نہ سہی بیس تیس ہزار تو ضرور ہو گی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جموّں اور سری نگر کے سوا ریاست کے کسی شہر کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ نہیں۔

مشرقی بنگال کے ایک وزیر سے لوگوں نے شکایت کی کہ اکثر اہل کار خائن اور بددیانت ہیں، رشوت خواری کا بازار گرم ہے۔ وزیر مذکور نے ٹھنڈی سانس بھر کے فرمایا "یہ ٹھیک ہے، لیکن اب فرشتے کہاں سے آئیں؟"

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مشرقی بنگال کے اہل کاروں میں جو رشوت نہیں لیتا، وہ فرشتہ ہے — وزیر موصوف کو شاید خود بھی نہیں معلوم کہ اس ایک فقرے میں وہ کیا کہہ گئے؟

اخباروں میں اس قسم کے خطوط برابر چھپ رہے ہیں کہ کارپوریشن نے صفائی کا جو انتظام

کر رکھا ہے، وہ بہت ناقص ہے۔ شکر کیجئے، کارپوریشن نے صفائی کا انتظام تو کر رکھا ہے اگر سرے سے انتظام ہی نہ کرے تو کوئی اس کا کیا کرلے گا؟

اور سچ پوچھئے تو لاہور کا صفائی کا انتظام کب اچھا تھا، بیس پچیس برس سے تو ہم لاہور کا یہ حال دیکھ رہے ہیں جو لوگ اس سے بھی زیادہ عرصے سے اس شہر میں مقیم ہیں، ان کا بیان ہے کہ ہم نے ہمیشہ یہی حال دیکھا ہے، البتہ پچھلے سال سے ذرا انتظام زیادہ خراب ہو گیا ہے، سو وہ کچھ ایسی بات نہیں، آخر اور کون سا محکمہ ہے جس کا انتظام اچھا ہے۔

اگلے وقتوں میں یعنی ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کے زمانے میں جسے ہم میں سے اکثر لوگ زمانہ قبل تاریخ کہتے ہیں، کبھی کبھی کہیں سڑک کوٹنے کا انجن نظر آ جاتا تھا اور بعض سڑکوں پر کنکریٹ کی ایک پتلی سی تہہ بچھ جاتی تھی۔ لیکن اب وہ بھی مدت سے نظر نہیں آتا۔ اصل میں سڑک کوٹنے کا انجن بھی زمانہ قبل تاریخ کا کوئی جانور تھا جو مر کھپ گیا، اس لئے کارپوریشن سے اس سلسلے میں کچھ کہنا بے سود ہے۔

ان دنوں صرف گرمی کے دنوں میں مکھیوں کی کثرت نظر آتی تھی، اب جاڑے میں بھی ان سے نجات نہیں ہوتی۔ دراصل یہ مکھیاں پالتو ہیں، لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں، کارپوریشن عام مکھیاں پالتی ہے اور اس طریقے سے پالتی ہے کہ ان پر موسم کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ سارا سارا سال موجود رہتی ہیں، اس پر کارپوریشن کو مبارکباد دینی چاہئے تھی، لوگ الٹے اعتراض کر رہے ہیں۔

پالتو کتوں کے گلے میں لوگ پٹہ ڈال دیتے ہیں تاکہ ان میں اور آوارہ کتوں میں تمیز کی جاسکے، ان پالتو مکھیوں کے گلے میں پٹہ تو نہیں ڈالا جاسکتا اور پٹہ ڈالنے کی ضرورت بھی کیا ہے، لاہور میں جتنی مکھیاں ہیں، سب کی سب پالتو ہیں۔

ہمارے ایک معاصر نے ایک صاحب کا ذکر کیا ہے جو تنخواہ لئے بغیر وزیر بننے پر آمادہ ہیں۔ ہم نے ایسے پٹواری تو دیکھے ہیں جو بلا تنخواہ کام کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں لیکن اس قسم کے وزیر نظر سے نہیں گزرے۔ کہیں یہ صاحب جو وزارت کے خواب دیکھ رہے ہیں، اسمبلی کا ممبر بننے سے پہلے پٹواری تو نہیں تھے؟

سُنا ہے، آج کل خان ممدوٹ کے ہاں وزارت کے امیدواروں کا تانتا بندھا ہُوا ہے۔ خان موصوف کلّے میں گلوری دبائے مسکرا مسکرا کے سب کی باتیں سنتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے، بہت ہُوا تو سر ہلا دیا جس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ "حلوا خوردن را روئے باید" اور یہ بھی کہ مطمئن رہئے، آپ کی وزارت کا معاملہ تو طے ہو چکا۔

خان ممدوٹ کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کم سخنی اگر پان کھانے کی وجہ سے ہے تو پان کھانا چھوڑ دیجئے، آخر پان ہی تو ہے شراب یا افیون تو نہیں اور اگر پان کھانا چھوڑ نہیں سکتے تو سر ہلانے کا انداز بدلئے ورنہ وزارت کے یہ امیدوار جن میں سے ہر ایک کو وزیر بننے کا یقین ہو چکا ہے لوگوں کو جینے نہ دیں گے۔

حلقۂ اربابِ ذوق کا سالانہ اجلاس اس مہینے کے خاتمے پر ہو رہا ہے جس کی صدارت کے لئے خواجہ شہاب الدین کا نام تجویز کیا گیا ہے، خواجہ صاحب اچھی خاصی اردو بول لیتے ہیں، اس لئے بہتر ہوتا کہ اس منصب کے لئے مسٹر فضل الرحمن کا نام تجویز کیا جاتا اور کچھ نہیں تو زندگی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی افادیت کا دائرہ تو وسیع ہو جاتا، پھر خواجہ شہاب الدین وزیر مہاجرین ہیں اور حلقۂ اربابِ ذوق "مہاجرین" نہیں۔

پچھلے دنوں پہلے خبر آئی کہ امریکہ نے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کر لیا، پھر معلوم ہُوا کہ رُوس نے بھی اس معاملے میں امریکہ کی پیروی کی، اب خبر آئی ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ نے بھی یہودیوں کی

ریاست کو تسلیم کر لیا ہے۔

سکھوں کو یہودیوں سے جو محبت ہے، اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ عرب جن سے یہودیوں کی لڑائی ہو رہی ہے مسلمان ہیں بلکہ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تو ہے کہ سکھ اور یہودی فلسطین اور مشرقی پنجاب میں بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں، مثلاً جس طرح سکھ مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب میں جا بسے ہیں، اسی طرح یہودی یورپ کے مختلف ملکوں سے آ کے فلسطین میں آباد ہو رہے ہیں۔ فلسطین میں یہودی اقلیت میں ہیں، لیکن انہوں نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ مشرقی پنجاب میں سکھ اقلیت میں ہیں تاہم وہ اس سرزمین میں اپنی حکومت قائم کر لینا چاہتے ہیں۔

مولانا فضل الٰہی کی نظر بندی پر بڑا شور مچا ہوا ہے جو اُٹھتا ہے پوچھنا شروع کر دیتا ہے کہ آخر انہیں کس قصور کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کسی شخص سے کوئی قصور ہی سرزد نہ ہو تو حکومت اسے گرفتار ہی نہ کرے؟

کہا جاتا ہے کہ جس وارنٹ کی بنا پر مولانا فضل الٰہی کو گرفتار کیا گیا ہے، وہ ۱۹۲۰ء میں جاری کیا گیا تھا، لیکن وارنٹ ۲۸ سال پرانا ہو، جب بھی وارنٹ ہی رہتا ہے بلکہ پرانی شراب کی طرح پرانے وارنٹ میں بھی زیادہ "تیزی و تندی" آجاتی ہے اور اسے بھی جانے دیجئے، حکومت مولانا فضل الٰہی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی، گرفتار کر لیا، ہمارا اور آپ کا کیا مُنہ ہے کہ نکتہ چینی کریں۔

ڈسٹرکٹ مسلم لیگ، ہزارہ کے پروپگنڈا سکریٹری حکیم فیروز الدین چغتائی نے بعض دلچسپ واقعات لکھ کے بھیجے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب امب کی شریعت بھی "خانہ ساز" قسم کی شریعت ہے، جسے شریعتِ اسلامی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ ریاست امب میں اگر مرد اور عورت بدکاری کرتے پکڑے جائیں تو دونوں پر سو سو روپیہ جرمانہ کیا جاتا ہے، مرد اپنا جرمانہ خود ادا کرتا ہے، عورت کا جرمانہ خاوند کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا خاوند جرمانہ ادا نہ کر سکے تو جو شخص سو روپیہ سرکاری خزانہ میں داخل کر دے، عورت اُس کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

حکیم صاحب نے اس سلسلہ میں ایک تازہ واقعہ لکھا ہے کہ مسمی رحمت اللہ ساکن کھنیاں ریاست امب اور مسماۃ صاحب جان بدکاری کے جُرم میں گرفتار ہوئے، رحمت اللہ نے جُرمانہ ادا کر دیا، لیکن صاحب جان کے خاوند میں اتنی استطاعت نہ تھی، اس لیے صاحب جان کو جیل بھیج دیا گیا، کچھ عرصہ بعد ایک اور شخص نے سرکاری خزانہ میں ایک سو روپیہ داخل کر کے عورت پر قبضہ کر لیا۔ صاحب جان اس شخص سے خوش نہ تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ رہنا چاہتی تھی، لیکن امب کا قانون اس میں مزاحم تھا، اس لیے وہ بھاگ کے ضلع ہزارہ کی ایک بستی کھلابٹ میں پہنچی اور خان فیض محمد خان نائب صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ ہزارہ کے ہاں ملازم ہو گئی، نیا خاوند اُس کے پیچھے کھلابٹ پہنچا لیکن وہ اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں اور اصلی خاوند اسے لے جانے کا مجاز نہیں، بہر حال نواب صاحب امب گھاٹے میں نہیں رہے، یعنی ان کے خزانے میں دو سو روپے داخل ہو چکے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، امب میں جس چیز کو "اسلامی شریعت" کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کی حیثیت محض کاروبار کی ہے، جہاں مرد اور عورت پر بدکاری کا الزام ثابت ہوا، ریاست نے اپنے دو سو روپے کھرے کر لیے۔ خاوند جرمانہ ادا نہیں کر سکتا تو نہ سہی، جس نے سو روپے داخل خزانہ کیے عورت پر قبضہ کر لیا۔ گویا ریاست امب اسم بامسمّیٰ ہے، آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

ڈاکیوں کے ایک جلوس نے کل لاہور میں "بند کرو" کے نعرے اس زور سے لگائے کہ اکثر لوگوں کا ذہن بے اختیار سعادت حسن منٹو کے افسانہ "کھول دو" کی جانب منتقل ہو گیا۔ اس "کھول دو اور بند کرو" کے تضاد سے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہیئے کہ افسانہ نگاروں اور ڈاکیوں میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے، ایک کھول دو کہتا ہے دوسرا بند کرو کے نعرے لگاتا ہے، بچارے ڈاکیئے تو "چور بازاری بند کرو"، "اقربا پروری بند کرو" کے نعرے لگا رہے تھے، اس لئے افسانہ نگاروں سے نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس جلوس میں صرف "بند کرو" کے نعرے ہی نہیں لگے، بھوک، پیٹ اور گیہوں کا ذکر بھی آیا، چنانچہ سارے ڈاکیوں نے اپنے کندھوں پر بلّے لگا رکھے تھے، جن پہ "بھوکا" لکھا ہُوا تھا۔

ڈاکیوں سے ہمیں ہمدردی ہے، ان کے مطالبات کے صحیح ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ جلوس نکالنے کے لئے یہ موقع کچھ ایسا موزوں نہیں تھا، ہمارے ہاں وزارت کی جنگ چھڑی ہوئی ہے، توپیں دھائیں دھائیں گولے برسا رہی ہیں، پھر الاٹمنٹ کا معاملہ بھی ابھی تک یک سو نہیں ہونے پایا۔ بعض حضرات ایسے ہیں جنہیں الاٹمنٹ کی لوٹ میں صرف ایک کوٹھی یا ایک کارخانہ ہاتھ آیا ہے حالانکہ اُنہیں دو کوٹھیاں اور تین کارخانے ملنے چاہئیں تھے وہ تو ان لوگوں کی ہمّت اور حوصلے کی داد دینا چاہیئے کہ انہوں نے وقت کی نزاکت کا لحاظ کر کے جلوس نہیں نکالا، ورنہ اگر ڈاکیوں کی طرح یہ حضرات یعنی "الاٹمنٹ کے ڈاکو" بھی جلوس نکال بیٹھتے تو کوئی اُن کا کیا کر لیتا؟ ڈاکیوں کے حقوق سے ہمیں انکار نہیں لیکن آخر ڈاکوؤں کے بھی تو کچھ نہ کچھ حقوق ہیں، ہمیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور تصنیف "تذکرہ" کو ایم، اے اُردو کے نصاب میں شامل کرنے کے خلاف جو اعلان ہُوا ہے، وہ دراصل انجمن اسلامیہ کی طرف سے ہے

راقم الحروف نے کل کے "حرف وحکایت" میں اس کا ذکر کیا تو انجمن حمایت اسلام کو بھی اس ثواب میں شامل کر لیا، بہرحال انجمن حمایت اسلام سے معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ہم نے اسے گناہ میں نہیں بلکہ ثواب میں شریک کیا ہے، البتہ انجمن اسلامیہ کی حق تلفی ضرور ہوئی، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بہرحال جو صاحب اس علمی کارنامے کی داد دینا چاہیں، انہیں انجمن حمایت اسلام کے بجائے انجمن اسلامیہ کی جانب رُخ کر لینا چاہیئے۔

پچھلے دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب تذکرہ کو ایم اے کے نصاب تعلیم میں شامل کرنے پر جن لوگوں نے اعتراض کیا تھا، ان میں اردو کے ایک مشہور انشاپرداز بھی تھے۔ ایک دوست کا بیان ہے کہ آج سے چند سال پہلے جب سید جمال الدین افغانی کی نعش ترکی سے افغانستان لائی گئی تو یہ صاحب بے حد متعجب تھے کہ یہ سید جمال الدین افغانی کون ہیں؟ جن سے لوگوں کو اس قدر عقیدت ہے۔

تذکرہ پر ان کے اعتراضات کا ذکر سن کے راقم الحروف کی طبیعت میں جو تکدر پیدا ہوا تھا، بحمداللہ کہ یہ واقعہ سن کے وہ بالکل دور ہو گیا۔ جس شخص کو ادعائے علم وفضل کے باوجود یہ معلوم نہیں کہ سید جمال الدین مرحوم کون تھے؟ اسے یہ حق حاصل ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ" پر جتنے اعتراضات چاہے کرے اور مولانا کی علمی قابلیت کے متعلق جو چاہے کہے۔

۸ر اپریل

راقم الحروف نے کئی انتخابی معرکے دیکھے ہیں، جن میں سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور شیخ حسام الدین کا مقابلہ ہماری تاریخ کے اہم واقعات میں سے ہے۔ یہ دونوں بزرگ امرتسر کے شہری حلقے سے اسمبلی کے اُمیدوار تھے۔ ڈاکٹر کچلو کی پشت پناہی کا فرض کانگرس انجام دے رہی تھی اور شیخ صاحب کی حمایت پر جماعتِ احرار مستعد تھی، چونکہ عربی میں حسام اور سیف دونوں تلوار کے نام ہیں، اس لئے ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو دین کی تلوار دین کی تلوار سے ٹکرا رہی تھی۔ چنانچہ جس دن ووٹ ڈالے گئے اُسے "دین" کی مناسبت سے "یوم الدین" کہا گیا، یہ اور بات ہے کہ لڑائی تو دینداروں کے درمیان تھی اور ووٹ دینے والوں میں "بے دین" بھی شامل تھے۔

یہ واقعہ اس لئے یاد آ گیا کہ یمن میں ان دنوں اس سے ملتے جلتے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ سیف الاسلام امام احمد یمن کے فرماں روا تھے، اُن کے چھوٹے بھائی سیف الاسلام عبداللہ نے اُنہیں ایسا زچ کیا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو گئے اور سیف الاسلام عبداللہ نے یمن کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ امام احمد کے بیٹے سیف الاسلام بدر کو معلوم ہوا تو انہوں نے کچھ فوج جمع کر کے اپنے چچا پر ہلّہ بول دیا۔ . . . .

. . . . اور سیف الاسلام

عبداللہ کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے، گویا اُدھر بھی سیف الاسلام اِدھر بھی سیف الاسلام وہ بھی اسلام کی تلوار یہ بھی اسلام کی تلوار، اسے کامیابی ہوئی جب بھی اسلام کی فتح اور اس نے میدان مار لیا جب بھی اسلام کی فتح۔

نہ جانے سر ونسٹن چرچل کو کیا ہو گیا کہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا، اور پھر نہ جلوس نکلوایا، نہ کوئی بیان دیا اور نہ نعرے لگوائے بلکہ چپ چاپ گھر کو سدھارے گستاخی معاف یا تو سر ونسٹن سیاسیات کی داؤں پیچ سے واقف نہیں یا بڑھاپے کے باعث اُن سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے ؎

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

مسٹر چرچل کو معلوم ہونا چاہئے کہ وزرا خود مستعفی نہیں ہُوا کرتے بلکہ برخاست کر دیئے جاتے ہیں اور برخاست ہونے کے بعد بھی ہمیشہ وزارت کی آرزو میں رہتے ہیں، داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ حضرت میاں میر صاحبؒ اور شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر باقاعدگی سے حاضری دیتے ہیں، نجومیوں اور عاملوں سے ملتے ہیں، فال نکلواتے ہیں غرض ساری عمر وزارت کی طلب ہی میں گزار دیتے ہیں۔ مسٹر چرچل اسّی برس کے ہو گئے مدتوں وزارت کی، لیکن وزارت سے چمٹے رہنے کا ڈھب نہ آیا، یا تو برطانیہ میں وزارت کی کرسیاں خاص وضع کی ہیں یا اُس ملک میں سریش کا قحط ہے۔

یار لوگوں نے جاتے جاتے قزلباش صاحب کی وزارت پر ہاتھ ڈالا تھا کہ چلو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، لیکن گورنر نے اڈا ہی اڑا دیا، اب عدم اعتماد کی مکھی بیٹھے بھی تو کہاں بیٹھے۔ وزارت تو خیر وزارت تھی، اس قصّے میں بے چاری اسمبلی ہی غت ربود ہو گئی گویا ہاتھی مع ہودہ غائب کا مضمون ہے لیکن فرض کیجئے کہ اسمبلی غت ربود نہ ہوتی، ہاتھی بھی رہتا ہودہ بھی، مہاوت بھی چڑھے بھی اور عدمِ اعتماد کی تحریک پیش ہو کر منظور ہو جاتی

جب بھی نتیجہ کے اعتبار سے معاملات وہی ہوتے جو آج کل ہیں، البتہ ان کی نوعیت میں کسی قدر فرق آجاتا یعنی ہم یہ کہہ سکتے کہ "موئے کو ماریں شاہ مدار"، بہرحال ہمیں افسوس ہے کہ شاہ مدار کا وار خالی گیا۔

---

۱۰ اپریل

مدت سے یہ غلغلہ برپا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے "خطرہ" سے بچنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی بعض تدبیروں پر عمل کرنا چاہتی ہے۔ اب سنا ہے کہ بی، اے اور ایم۔ اے کی فیسیں ڈیوڑھی بلکہ قریب قریب دگنی کر دی جائیں گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ داخلہ کی فیسوں میں بھی اضافہ ہوگا۔

ہماری رائے میں یہ تدبیر اپنی جگہ خوب ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کے "خطرہ" کو روکنے کے لئے کافی نہیں، حکومت نے مے نوشی اور مے فروشی کے سدباب کے لئے جہاں شراب پر ڈیوٹی بڑھائی ہے وہاں پرمٹ کا قاعدہ بھی جاری کر رکھا ہے، پھر بھی پینے والے پیتے ہیں اور پرمٹ کے بغیر پیتے ہیں کہ ع

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است

پنجاب یونیورسٹی کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں فیسیں بڑھیں، وہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے پرمٹ کا قاعدہ بھی جاری ہوجائے یعنی بی، اے اور ایم، اے وغیرہ میں جس قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ نہ تو پرمٹ کے بغیر کسی کتاب فروش کی دکان سے مل سکیں، نہ پرمٹ کے بغیر انہیں کوئی پڑھ سکے بلکہ محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحب کے مشورہ سے صرف خاص خاص کتاب فروشوں کو یہ کتابیں فروخت کرنے کا لائسنس دیا جائے ع

ہر کوہ نہ تابد ایں صدا را

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہندوؤں نے اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ کشتری اور دیش تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے تھے، لیکن اعلیٰ تعلیم صرف برہمن حاصل کر سکتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی شودر وید منتر سن لیتا تھا تو اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ اگر پنجاب یونیورسٹی کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی یعنی اعلیٰ تعلیم صرف ایک چھوٹی سی جماعت تک محدود ہو کر رہ گئی تو ہندو تہذیب کو زندہ کرنے کا سہرا پنجاب یونیورسٹی کے سر بندھے گا اور بنارس یونیورسٹی یونہی تاپتی رہ جائے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اگر کوئی شخص پرمٹ کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اُسے توپ دم کر دیا جائے یا اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے، البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ اُسے سخت سزا دی جائے۔ اس سلسلے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے، کہ شراب کی بُو شرابی کا راز فاش کر دیتی ہے اور بُو راز فاش نہ کرے تو ڈاکٹر پتہ لگا لیتا ہے لیکن علم کا معاملہ ہی جداگانہ ہے، نہ ڈاکٹر پتہ لگا سکتا ہے کہ کس شخص نے کتنا علم حاصل کیا اور کس ذریعے سے حاصل کیا، نہ اور کسی ذریعے سے یہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے یہ معاملہ سی، آئی، ڈی کے سپرد کرنا پڑے گا۔

اگر پنجاب یونیورسٹی کی کوششوں سے سچ مچ اس قسم کا کوئی قانون منظور ہو گیا تو مزے ہی آجائیں گے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ہارڈی گالزوردی کے ناول پڑھنا ممنوع ہی ٹھہرا، ہم اور آپ فردوسی، خیام، سعدی، حافظ، میر، غالب وغیرہ کا کلام بھی نہیں پڑھ سکیں گے، کیونکہ اُسے بھی بی، اے اور ایم، اے کے نصاب میں شامل کر دیا جائے گا۔ اس لئے یا تو چھپ چھپ کے ان بزرگوں کا کلام پڑھیں گے یا پھر فلمی گیتوں پر قناعت کر کے بیٹھ رہیں گے کہ "پتیم آؤ بسو مورے من بن" بھی ایک کیفیت رکھتا ہے اور اگر پرمٹ کے بغیر آدمی چُنتے وقت اس معیار کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، صلاحیتِ کار میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کوئی شخص محنت کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں، بیماروں کی جگہ

ہسپتال میں ہے، وزارت میں نہیں۔ نئی حکومت ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہیئے جو قابل بھی ہوں اور محنت بھی کر سکیں تاکہ اُن کی محنت دوسروں کے لئے نمونہ ثابت ہو۔

---

۱۴ رمئی

کچھ لوگ شکار کھیلنے جا رہے تھے کہ اُن کے ایک دوست جنہیں شکار سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا، ساتھ ہو لئے۔ دوستوں نے سمجھا دیا تھا کہ میاں جنگل میں نہ تو بات ہی کیجیو، نہ آہٹ ہی ہونے پائے ورنہ شکار ہاتھ نہیں آئے گا۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ تالاب کے کنارے تیتر نظر آئے، نئے شکاری نے انگریزی میں کہا "وہ رہے تیتر" اور سارے تیتر اڑ گئے۔ دوستوں نے کہا "بھئی تم نے یہ کیا کیا؟" کہنے لگے "مجھے یہ کب معلوم تھا کہ تیتر انگریزی بھی سمجھتے ہیں"

اسی قسم کا ماجرا مولوی فضل الحق اور مسٹر سہروردی کے درمیان بھی پیش آیا، مولوی فضل الحق نے اپنے بیان میں اتنی گنجائش رکھ لی تھی کہ ضرورت پڑے تو دستوری کنونشن میں شامل ہو جائیں بلکہ کنونشن میں شامل ہونے کے لئے کندھے ہی تول رہے تھے، اتنے میں مسٹر سہروردی کا بیان چھپا کہ مولوی فضل الحق اور اُن کی جماعت کنونشن میں شامل ہو جائے گی، اور یار لوگ بدک گئے اور یا یوں کہئے کہ سارے تیتر اُڑ گئے۔

اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مسٹر سہروردی نے ساری عمر شکار ہی نہیں کیا، یُونہی وقت گذارنے کے لئے شکاریوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اُن کا شکاری ہونا مسلم لیکن اُنہیں بیان چھپوانے میں اتنی عجلت سے کام نہیں لینا چاہیئے تھا کیونکہ یہ تیتر ذرا نازک مزاج ہیں، ادھر آپ نے بات کی اور اُدھر وہ پھر سے اُڑ گئے اور مولوی فضل الحق تو تیتر بھی ہیں اور بٹیر بھی۔ وزارت کی بہاریں بھی دیکھی ہیں، لیڈری کی کبڈی بھی کھیلی ہے، ہر گلہ بھی جانتے ہیں انگریزی بھی سمجھتے ہیں۔

دراصل مسٹر سہروردی کو ایسی مجبوریاں درپیش ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ وزیر کی حیثیت سے اُن کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کی متابعت کریں اور لیڈر کی حیثیت سے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی جماعت کے لوگوں کو سنبھالے رکھیں۔ اس کے علاوہ اُن کی لیڈری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً بیان دیتے رہیں، اب اگر اُن کے بیان کی بدولت تیتر بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ کبوتر بھی اُڑ جائیں تو سہروردی صاحب کو معذور سمجھنا چاہیئے، راقم الحروف ان کا (تیتروں، بٹیروں اور کبوتروں کا نہیں بلکہ سہروردی صاحب کا) پُرانا نیاز مند ہے، اس لئے اُن کی خدمت میں جو باتیں عرض کی گئیں وہ بطور طنز نہیں بلکہ ازراہ دل سوزی و خیر خواہی عرض کی گئی ہیں۔

---

۶ رمئی

راقم نے آج سے کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ پنجاب کے وائس چانسلر میاں افضل حسین صاحب اردو کے موجودہ رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط کو رواج دینا چاہتے ہیں، تو ہمارے بعض کرم فرما بہت بگڑے تھے اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میاں صاحب نے رومن رسم الخط کا تو کبھی نام نہیں لیا، البتہ وہ خطِ نسخ کے پُرزور حامی ہیں لیکن اسے کیا کہئے گا کہ میاں صاحب نے پچھلے دنوں بہاولپور میں جو تقریر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومن رسم الخط کو رواج دینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے چین بلکہ یوں کہئے کہ ماؤزے تنگ کا حوالہ بھی دیا ہے، یوں تو اس نام نے موزے خواہ مخواہ تنگ کر رکھے ہیں لیکن اب کے قافیہ بھی تنگ ہو گیا۔

میاں افضل حسین صاحب اعلیٰ تعلیم کے خطرے سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے اب انہوں نے اُردو کے موجودہ رسم الخط کا تیا پانچا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اس کے بعد کیا عجب ہے کہ اردو کے بجائے پاکستان میں چینی زبان جو بہت میٹھی ہے۔

رائج کر دی جائے اور ہمیں چینی کے لئے کارخانے کھولنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑے بلکہ جو کارخانے کھل چکے ہیں انہیں بھی بند کر دیا جائے اور چینی زبان رائج ہی نہ ہو، جب بھی ہمارے بچے آکسفورڈ اور کیمبرج کے لہجے میں اُردو ضرور بولا کریں گے، کہئے تو رومن اُردو میں ایک آدھ نظم عرض کروں۔

اعلےٰ تعلیم کے خطرے سے پاکستان کو نجات دینے کے لئے ان دنوں مختلف تدبیروں پر عمل کیا جا رہا ہے، مثلاً پہلے ہم نے سنا تھا کہ یونیورسٹی داخلہ کی فیسیں بڑھا رہی ہے۔ اب سُنا ہے کہ ایک دن میں دو دو مضامین کے امتحان ہُوا کریں گے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ایک دن میں دو امتحان دینا مشکل ہے، جواب ملا کہ کیمبرج میں یونہی ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں سے کسی کو اس سے پہلے کیمبرج پہنچنے کی توفیق نہیں ہوئی، یہ مقام یا تو افریقہ کے اُن جنگلوں میں ہے جہاں بہت کم لوگ پہنچ سکے ہیں، یا قطب جنوبی کے آس پاس واقع ہے۔ بہرحال اگر کسی دن "کیمبرج میں یونہی ہوتا ہے"، کی لپیٹ میں زبان اردو بھی آگئی تو کوئی ان یونیورسٹی والوں کا کیا کرے گا۔

راقم نے دو دن ہوئے بعض ایسے واقعات نقل کئے تھے جو مشہور تو بہت ہیں لیکن کوئی اصلیت نہیں رکھتے۔ مثلاً اس افسانے نے بڑی شہرت پائی ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے خاندان کے لوگوں کے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے تھے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے سوانح حیات میں اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن مسز ہتی سنگھ نے اس افسانہ کی تصدیق کی ہے، خدا جانے مسز ہتی سنگھ نے کیا کہا اور ہمارے یہ دوست کیا سمجھے کیونکہ اب وہ ذرا اونچا سننے لگے ہیں، دراصل مسز ہتی سنگھ کا جو مضمون ہندوستان کے اخباروں میں

شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے کہیں بھی اپنے بیان کی تردید نہیں کی۔

ہم نے اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی کا ایک شعر بھی نقل کیا تھا جس کے متعلق اکبر مرحوم سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "یہ شعر میرا نہیں"۔ ہمارے یہ دوست فرماتے ہیں کہ کلیاتِ اکبر الہ آبادی کے پہلے ایڈیشن میں یہ شعر موجود ہے، راقم کے پیش نظر نہ کلیاتِ اکبر کا پہلا ایڈیشن ہے۔ نہ یہ بات یاد ہے کہ اس میں یہ شعر ہے یا نہیں، کلیاتِ اکبر کے پہلے ایڈیشن میں یہ اشعار بھی موجود ہیں جو دیوان اکبر داناپوری میں بھی چھپ چکے ہیں ؎

تری زلفوں میں دم اُلجھا ہوا ہے
بلا کے پیچ میں آیا ہوا ہے
چلے دُنیا سے جس کی یاد میں ہم
غضب ہے وہ ہمیں بھولا ہوا ہے

میں نے صرف دو شعر نقل کئے ہیں لیکن پروفیسر عطا الرحمٰن لکھتے ہیں کہ اس غزل کے پانچ شعر دونوں دیوانوں میں موجود ہیں۔ اکبر داناپوری اور اکبر آبادی کا زمانہ ایک ہے، اکبر داناپوری کا دیوان تجلیاتِ عشق اُن کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ اکبر الہ آبادی کے کلیات کا پہلا حصہ بھی جس میں اُن کا پرانا کلام ہے، اُن کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ اکبر کا سوانح حیات ملاحظہ فرمایئے تو اُن کی زندگی اور شاعری کے متعلق بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں، اور بہت سے طلسم ٹوٹتے ہیں۔

---

۷ رمئی

پچھلے دنوں مسٹر عبدالوحید خاں سابق رکن دستور ساز اسمبلی نے جو اِن دنوں سیاسیاتِ عالیہ کے قطب مینار پر بیٹھے ہیں، اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ یوں تو ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے، تاہم صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کے دفتر میں روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے، یہ اِن

دنوں کا ذکر ہے کہ سرحد مسلم لیگ نے کنونشن کے ممبروں کی نامزدگی کے جملہ حقوق اپنے وزیرِ اعلیٰ کے سپرد نہیں کئے تھے، اس لئے مسٹر عبدالوحید خاں کو ذرا پھر دُوربین لگا کے دیکھنا چاہیئے کہ ابھی تک سرحد مسلم لیگ کے صدر دفتر میں روشنی کی ایک ہی کرن ہے یا ع

عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

ہو سکے تو ایک آدھ کرن مانگ بھیجئے کہ اور کسی کے کام آئے نہ آئے کم از کم دو چار بزرگوں کو جگنو بنانے کے لئے تو کافی ہے۔

---

۹ رمئی

لاہور کے ایک اخبار نے موسم کی دلآویزی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ کسانوں کو ابر بہار کی چیرہ دستیاں ناگوار ہیں، کیونکہ بعض علاقوں میں فصل ابھی تک اٹھائی نہیں جا سکی۔ دُرست ہے فصل کو نقصان پہنچے تو صرف کسانوں کو پریشان ہونا چاہئے، ہمیں اور آپ کو اس قصے سے کیا سروکار، ہمارے نان و نفقے کی ذمہ واری تو امریکہ پر عاید ہوتی ہے تھی آ گیا، ضرورت پڑی تو گندم بھی آ جائے گا، چپڑی اور دو دو کھائیں گے۔ اور ٹل مچائیں گے کہ میاں مٹھو چوری کھاؤ گے؟

اس موقع پر داغ کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک صاحب اُن سے ملنے آئے، سر سے پاؤں تک اُن کا لباس سبز تھا، گویا بالکل ہریل بنے ہوئے تھے۔ داغ بڑے تپاک سے ملے، حقہ پیش کیا، پان کھلایا، پھر کہنے لگے پہلے تو تم ہریل تھے، پان کی برکت سے چونچ سُرخ ہو گئی اور پُورے میاں مٹھو بن گئے، اب کہو "نبی جی روزی بھیجو"۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، ذاکر صاحب نوجوان تھے لیکن کربلائے معلےٰ اور نجفِ اشرف کی زیارت سے فارغ ہو کے انہی دنوں لکھنؤ آئے تھے، انہوں

نے سر سے پاؤں تک سپید لباس پہن رکھا تھا، کسی نے کہا، ہائیں یہ فرات کا بگلا کہاں سے آگیا! اس پر واہ وا، سبحان اللہ کا شور جو مچا تو میاں نوا کہ گھبرا گئے۔

۱۰ر مئی

مس ہیلن کیلر نے فرمایا ہے کہ پاکستان میں نابیناؤں کی تعداد پونے دو لاکھ کے قریب ہے لیکن اُن میں سے صرف ۳۴۳ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ مس کیلر کو غالباً یہ معلوم نہیں، کہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے نابیناؤں اور بیناؤں میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہے گا، اس قسم کی تدبیریں ہو رہی ہیں کہ دو چار سو اشخاص جنہیں افسری کرنا ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں جن کی قسمت میں کلرکی کرنا لکھا ہے وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں اور باقی لوگوں کو انگوٹھا لگانا آجائے۔

مس کیلر نے اس تذکرہ میں عقل کے اندھوں کا ذکر نہیں کیا، ورنہ معاملہ کہیں سے کہیں جا پہنچتا اور بڑا غضب تو یہ ہوا کہ انہوں نے گونگوں اور بہروں کی تعداد بھی نہیں بتائی ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں گونگوں اور بہروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اب یہ گونگے چاہے گنگ محل کے ہوں چاہے کنگال محل کے آخر گونگے ہی تو ہیں، انگوٹھا لگانا بھی جانتے ہیں اور سر ہلانا بھی اور سر تو اس طرح ہلاتے ہیں گویا ان کی گردنیں ربڑ کی بنی ہوئی ہیں۔

۱۲ر مئی

قاآنی ایران کا مشہور شاعر تھا، ایک مرتبہ کسی نے اس سے پوچھا کہ فلاں شاعر جب کسی امیر کا قصیدہ کہتا ہے تو قصیدہ کے ساتھ ساتھ کچھ شیرینی بھی لے جاتا ہے۔ خدا

جانے اس میں کیا مصلحت ہے، قاآنی نے جواب دیا "تا شعرش شیریں نماید" یعنی تاکہ اس کا کلام شیریں معلوم ہو۔ سنا ہے کہ پنڈت نہرو بھی اپنی گفتگو کو زیادہ شیریں بنانے کے لئے اسی قسم کی تدبیروں پر عمل کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں مصر کے وزیر اعظم کرنل ناصر دلّی کے ہوائی اڈّے پر اُترے تو پنڈت نہرو نے ان کی خدمت میں مصری اور الائچیاں پیش کیں، کرنل ناصر نے کبھی مصری نہ دیکھی تھی اُس کی ڈلی اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پنڈت نہرو نے پوچھا "آپ نہیں جانتے یہ کیا ہے؟" اُنہوں نے کہا "نہیں تو" پنڈت جی نے کہا "یہ مصری ہے ہمارے ملک میں میٹھی چیز کو مصری کہتے ہیں، کیونکہ پرانے زمانے میں مصری مصر سے آیا کرتی تھی" یہ سن کر کرنل ناصر بہت خوش ہوئے، لیکن یہ بات غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہو گی کہ پنڈت جی شہد کی مکھی نہیں بلکہ مصری کی مکھی ہیں۔

ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی سے بھی کرنل ناصر کی ملاقات ہو چکی ہے لیکن انہوں نے وزیر اعظم مصر سے ہرگز یہ نہیں کہا ہو گا کہ مصری شاہ لاہور کا ایک مشہور محلّہ ہے کیونکہ اوّل تو وہ لاہور کے محلّوں کے نام نہیں جانتے، دوسرے اُنہیں اس قسم کے داؤں پیچ بھی نہیں آتے۔ پنڈت جی کی اُستادی میں کیا کلام ہے کہ آٹھ آنے خرچ کر کے مصریوں سے خاصا شیریں رشتہ قائم کر لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ چو این لائی سے ملاقات کے موقع پر پنڈت جی نے طشتری میں تھوڑی سی چینی اور الائچیاں رکھ کے اُن کی خدمت میں پیش کر دی ہوں گی اور جب انہوں نے پوچھا ہو گا کہ یہ کیا؟ تو پنڈت جی نے فرمایا ہو گا کہ ہمارے ملک میں شکر کو چینی کہتے ہیں کیونکہ پرانے زمانے میں شکر چین سے آیا کرتی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ افغانوں پر بھی اسی قسم کا کوئی داؤں چل گیا ہو یعنی ان سے پنڈت جی نے کہہ دیا ہو کہ آپ سے بھی ہمارا تعلق "شکریں" بلکہ "گلقندِ آفتابی" کی قسم کا ہے، آپ جس چیز کو قند کہتے ہیں، اسے ہم کھنڈ یا کھانڈ کہتے ہیں، اس لحاظ سے دیکھئے تو قندھار سے ہمارا تعلق پرانا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ افغانوں سے بھارت کا تعلق "شکریں" ہی نہیں "نمکیں" بھی ہے یعنی بھارت نے انہیں خلا قند ہی کی چاٹ ہی نہیں لگائی نمک پارے بھی کھلائیں گے۔

راقم الحروف پنڈت نہرو کی خوبیوں کا بڑا قائل ہے، لیکن سیاست کے کھیڑے میں پڑ کے ان جیسے لوگوں کو بھی اس قسم کی حرکتیں کرنی ہی پڑتی ہیں۔ پنڈت جی اگر اس موقع پر یہ بھی کہہ دیتے کہ وہ نہر سویز کی رعایت سے نہرو کہلاتے ہیں جب بھی کوئی حرج نہیں تھا، ہاں ہمیں اُن سے یہ شکایت ضرور ہے کہ انہوں نے شیرینی تقسیم کرتے وقت پاکستان کا خیال نہیں رکھا، حالانکہ وہ چین کی چینی، مصر کی مصری اور قندھار کی قند کا ذکر کرتے وقت کہہ سکتے تھے کہ شکر سکّر میں بنتی تھی جو اب سکھر کہلاتا ہے اور پاکستان کہا جائے تو اچھا خاصا "قندنامہ نہرو" مرتب ہو جائے لیکن ہم اس قصّے کو یہیں ختم کئے دیتے ہیں، اس زمانہ میں لوگ پندنامہ عطار نہیں پڑھتے، قندنامہ نہرو کون پڑھے گا؟

---

۱۳ رمئی

قارئینِ "نوائے وقت" میں سے ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ خیر سگالی کیا ہے، پہلے کیا تھی اور اب کہاں سے ٹپک پڑی، ٹھیک ٹھیک بات تو ہمیں بھی معلوم نہیں، البتہ سُنا ہے کہ خیر سگالی اصل میں کبڈی کی ایک قسم ہے کبھی ہندو اور سکھ کبڈی کبڈی کہتے لاہور تک آجاتے ہیں اور کبھی ہم کبڈی کی دُھن میں امرتسر تک چلے جاتے ہیں۔ پہلے اس لئے کہیں نظر نہیں آتی تھی کہ رابعہ غضنفر علی خاں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا اور اب چونکہ ایجاد ہو چکی ہے اس لئے

ہمیں استعمال بھی کرنی پڑے گی۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ خیر سگالی نری کبڈی ہے، یوں تو یہ کبڈی بھی ہے اور آنکھ مچولی بھی لیکن بعض لوگ خیر سگالی کو بٹیر بازی کا بدل سمجھتے ہیں اور شرطیں باندھ کے گڈول لڑاتے ہیں اور جو اس لائق بھی نہیں وہ خیر سگالی کو ایک قسم کی جگالی سمجھتے ہیں اور دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر آدھی رات تک جگالی کرتے رہتے ہیں۔

راجہ غضنفر علی کے لئے خیر سگالی کی جگالی بہت مفید ثابت ہوئی، لوگ انہیں آہستہ آہستہ بھولتے جاتے تھے "زندہ باد غضنفر علی" کے نعرے سُنے مدتیں ہو گئی تھیں، اخباروں میں ان کا نام بہت کم چھپتا تھا، خیر سگالی کی وجہ سے اتنا تو ہوا کہ مدّتوں پاکستان اور بھارت میں اُن کی تعریفیں ہوتی رہیں۔ دوسرے لوگوں کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا ان میں بعض ایسے خوش قسمت نکلے کہ خیر سگالی کی برکت سے ان کی تصویریں اخباروں میں چھپ گئیں۔ بعض کا صرف نام شائع ہوا اور بعض کا نام بھی چھپ نہ سکا۔

ایک صاحب نے جو درجہ اوّل کے خیر سگالی سمجھے جاتے تھے، اخباروں میں بیان چھپوایا ہے کہ گڈول یعنی خیر سگالی کو محدود کر دیا جائے . . . .
کیونکہ غیر محدود خیر سگالی بے حد مضر ہے ہماری رائے میں خیر سگالی کو محدود کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کے لئے لائسنس کا طریقہ جاری کیا جائے یعنی جس شخص کے پاس لائسنس نہ ہو وہ معمولی سے معمولی خیر سگالی بھی نہ کر سکے۔ یہ طریقہ پسندیدہ نہ ہو تو گڈول لمیٹڈ کے نام سے ایک کمپنی قائم کر کے خیر سگالی کے جملہ حقوق اس کے حق میں محفوظ کر دیئے جائیں۔

خیر سگالی کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعض لوگ ماسٹر تارا سنگھ کو خیر سگالِ اعظم سمجھ کے اُن سے گڈول "لڑانے" کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان لوگوں کی سمجھ میں

یہ بات نہیں آتی کہ بچارے ماسٹر تارا سنگھ بھی "کنوئیں کی تہ کے تارے" ہیں اس لئے اُستاد کا یہ شعر اُن کی زبان پر چڑھا ہوا ہے ؎

یوں تنِ خاکی میں روشن دل ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

خیر سگالی کے جذبہ کو تقویت دینے میں سمگلنگ یعنی بقول مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش قاچاقی کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے خیر سگالی کے ماہرین یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کی ناچاقی کو دُور کرنے کے لئے قاچاقی بڑی ضروری ہے اور قاچاقی میں سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے جو کچھ کیا جائے وہ خیر سگالی ہے جو کبڈی بھی ہے آنکھ مچولی بھی گالی بھی اور رجگالی بھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دافعِ قاچاقی ہے اور ممدِ ناچاقی۔

---

۱۵ مئی

لاہور کے ایک اخبار میں جاپان کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا ایک حصّہ ملاحظہ ہو:۔

"عصمت و عفت کا احساس یہاں نام کو نظر نہیں آتا، اگرچہ شائستگی اور عفت جاپانی کردار کا خاص پہلو ہے، ٹانگ یاران کی برہنگی کو یہاں اسی طرح عیب نہیں سمجھا جاتا جس طرح ایشیا کے دوسرے ملکوں میں سڑک پر تھوکنا عیب نہیں سمجھا جاتا۔ آج سے پچاس سال پہلے تک مرد عورت ساتھ ساتھ غسل کرتے تھے اور لوگ اُسے عیب نہیں سمجھتے تھے، ہوٹلوں اور سراؤں میں خادمائیں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتیں کہ کوئی شخص ان کے سامنے لباس تبدیل کرے۔"

جاپان میں کپڑے کے کارخانے کثرت سے ہیں، اس لئے اگر کارخانہ قسم کے لوگ

بالکل ننگے ہو جائیں جب بھی کوئی ایسی بات نہیں، آخر یہ لوگ خود کپڑا پہننا شروع کر دیں، تو دوسرے ملکوں کو کیا بھیجیں؟ ہمارے ملک میں ابھی کپڑے کے کارخانوں نے اتنی ترقی نہیں کی پھر بھی بہت سے لوگوں کو کپڑا میسّر نہیں، جب اتنا کپڑا تیار رہنے لگا کہ دوسرے ملکوں کو بھی بھیجا جا سکے تو نہ عاشق کے گریبان کے لیے چار گرہ کپڑا میسّر ہوگا نہ لنگوٹی کے لیے۔

اس پر ہمیں یاد آگیا کہ نوابانِ اودھ کے زمانے میں ناگے سادھوؤں کی ایک فوج بھی تھی جو اکثر معرکوں میں حصّہ لیتی تھی، ان ناگوں کے سردار ہمّت گر اور امراؤ گر تھے جو شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کے مقربین میں سے سمجھے جاتے تھے۔ پانی پت کے معرکہ میں شجاع الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا تھا، اس کے ساتھ جو فوج تھی، اس میں ناگے بھی تھے جو ننگ دھڑنگ لوگوں کے سامنے پھرتے تھے۔ شاہ ابدالی کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوا، شجاع الدولہ کے پاسِ خاطر سے انہیں اور کوئی سزا تو نہ دی لیکن دفتر سے نکلوا دیا۔

اس مضمون کے آخیر میں کہا گیا ہے :-

جنس کے معاملہ میں جاپانی بہت آزاد خیال ہیں، اخباروں میں اس موضوع پر کھل کر بحث ہوتی ہے، جنس جاپانیوں کی نظر میں ایک فطری عمل ہے اس حیاتیاتی فعل کے بارے میں وہ کسی ریاکارانہ روّیہ کو جائز نہیں سمجھتے، پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے لوگ بس اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، کہ جاپانیوں نے پرانے رسوم و رواج اور بیجا تعصّبات سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور اس لیے اتنی ترقی کی ہے، اگر دوسرے ملک یہ روش اختیار کریں تو ان کے لیے بھی ترقی کی راہیں کھلی ہیں۔

اگر عریانی کو معیوب نہ سمجھنے بلکہ ننگے پھرنے سے ترقی ہو سکتی ہے تو ننگے ہو جانے میں کیا ہرج ہے؛ چلیے اب کے عید کے موقع پر اس "ریاکارانہ روّیہ" سے نجات حاصل کر لی

جائے۔ ہم میں کوئی اورنگ زیب عالمگیر یا کوئی شاہ ابدالی تو ہے نہیں کہ بس اتنی سی بات پہ تلوار کھینچ لے گا۔ اگلے وقتوں کے چند بڈھے رہ گئے ہیں، انہوں نے چین چپڑ کی تو اُن سے نپٹ لیا جائے۔ اگر عصمت و عفت کا احساس جاپان میں نہیں ہوتا تو ہمارے ہاں بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ جاپانی جنس کے معاملے میں کسی "ریاکارانہ رویّہ" کو روا نہیں رکھتے، تو ہمیں بھی روا نہیں رکھنا چاہیئے۔ اگر "عصمت و عفت کے احساس" اور اس قسم کے دوسرے "بے جا تعصبات" سے نجات حاصل کرکے آپ جاپان کی طرح ترقی کر سکتے ہیں تو ذرا جلدی کیجیے تاکہ "ترقی" کی جو "راہیں" کھلی ہیں وہ کہیں بند نہ ہو جائیں۔

پچھلے دنوں اس کالم میں یہ ذکر آیا تھا کہ بے اصل باتیں کبھی کبھی سچ کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور اس سلسلے میں چند مثالیں بھی دی گئی تھیں۔ اس پر راقم کے بعض کرم فرماؤں نے اچھی خاصی بحث چھیڑ دی، جناح عوامی مسلم لیگ لائل پور کے سیکرٹری صاحب نے اس بحث کے متعلق راقم کے نام خط لکھا ہے جس میں انہوں نے بعض حوالے دیئے ہیں، تیج دہلی کا ایک کٹنگ بھی بھیجا ہے جس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بھانجی نین تارا سہگل کی ایک کتاب کے بعض حصّوں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ راقم کے پاس مرحوم اکبر الہ آبادی کے سوانح حیات کے متعلق دو کتابیں اور اُن کا کلام بھی موجود ہے، پنڈت نہرو کے خود نوشت سوانح حیات بھی ہیں، اس کے علاوہ تیج میں نین تارا کا مضمون بھی میری نظر سے گذر چکا ہے لیکن اس عالم میں کہ چراغِ سحری ہو رہا ہوں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ آخر ان بحثوں کا حاصل دلآزاری کے سوا کیا ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "آزردنِ دلِ دوستاں جہل است" بہت بحثیں کر چکا، اب زندگی کے چند لمحے جو باقی ہیں وہ کسی اور مشغلہ میں گزر جائیں تو اچھا ہے۔

---

۱۲ مئی

ایک سے زیادہ شادی کرنے کے سوال پر بیگمات نے جو شور مچایا ہے اُس کی بدولت

آپس کے میل ملاپ کی کچھ راہیں بھی نکل آئی ہیں، یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ دو شادیاں کرنے کے معاملے میں صرف محمد علی ہی قصور وار نہیں بلکہ ہمارے بعض دوسرے اکابر بھی یہی حرکت کر چکے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان دنوں بڑی بیگمیں بڑی بیگموں سے پینگیں بڑھا رہی ہیں، اور چھوٹی بیگمیں چھوٹی بیگموں سے۔ ادھر چھوٹی بیگم نے کسی چھوٹی بیگم کو چائے پر بلایا۔ اُدھر بڑی بیگم نے دو تین بڑی بیگموں کو کھانے پر مدعو کر لیا اور کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کہیں تو کئی بڑی بیگمیں آپس میں سکوٹ کر رہی ہیں اور کہیں کئی چھوٹی بیگموں میں کانفرنس ہو رہی ہے۔

اسلام نے چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے لیکن اس کے ساتھ شرط ایسی لگا دی ہے کہ دوسری شادی کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یوں بھی دوسری شادی کرنا غربا اور متوسط طبقے کے لوگوں میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بھانڈوں کی یہ نقل اکثر لوگوں نے دیکھی ہو گی کہ ایک بھانڈ نے میدان میں لمبا سا بانس گاڑ دیا، دوسرا بھانڈ اُس پر جا چڑھا۔ ساتھیوں نے پوچھا کیوں بھئی کس حال میں ہو؟ جواب ملا "دو بیویوں والے سے اچھا ہوں"۔

عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خاوند ظالم ہیں اور بیویاں مظلوم، لیکن بعض بیویاں بھی بڑی ظالم ہوتی ہیں، وہ جو "زن مرید" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ آخر وہ ایسے ہی خاوندوں کے لئے ہے جو ہر قسم کے دکھ سہتے ہیں اور اُف نہیں کرتے، اب اگر ایسے لوگوں کو اللہ اتنی ہمت دے کہ وہ "انجمن تحفظ حقوق شوہران" کے نام سے ایک انجمن قائم کر کے بیٹھ جائیں تو ہمیں اُن سے ضرور اظہارِ ہمدردی کرنا پڑے گا۔

مردوں کے حقوق کے سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا، شیخ سعدی کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا اگلا سا زور و شور تو نہیں رہا تھا، تاہم یہ لڑائیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں، ایک دفعہ شیخ کو فلسطین کے عیسائیوں نے پکڑ کر خندق بنانے کے کام پر لگا دیا، اتفاق سے حلب کے ایک دولت مند شخص کا گذر اُس طرف سے ہوا، وہ سعدی کو جانتا تھا۔ دس دینار دے کر

انہیں قید سے چھڑایا اور اپنے ساتھ حلب لے آیا یہاں اُس نے شیخ کی بڑی خاطر مدارات کی اور سو دینار مہر پر اپنی لڑکی سے اُن کی شادی کردی۔

شیخ کی بیوی بڑی بدمزاج اور زبان دراز تھی، بات بات پہ طعنے دیتی تھی، ایک دن کہنے لگی، کیوں جی! تم وہی ہونا جنہیں میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا تھا، شیخ نے جواب دیا، ہاں میں وہی ہوں جسے تمہارے باپ نے دس دینار دے کر خریدا اور سو دینار پر تمہارے ہاتھ بیچ ڈالا۔

---

۲۲ مئی

اخبار "پاسبان" ڈھاکہ کی روایت ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر جن کامیاب طلبہ کے ناموں کا اعلان کیا گیا، ان میں ایک صاحب مسٹر خدا حافظ بھی تھے۔ ابھی لوگ اس نام کی داد دینے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مس اللہ بیلی کا نام سنائی دیا اور محفل کشتِ زعفران بن کر رہ گئی۔ ایک تو یہ دونوں نام اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اس پر طرّہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

پہلے تو ڈاکٹر قدرتِ خدا جنہیں بعض لوگ یورپ کے عام قاعدہ کے مطابق ڈاکٹر خدا بھی کہتے ہیں، اپنے نام کی وجہ سے سارے پاکستان میں شہرت رکھتے تھے لیکن اب عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ مسٹر خدا حافظ اور مس اللہ بیلی کے دریافت ہونے کے بعد ڈاکٹر خدا کے نام کی عظمت میں کسی قدر فرق آگیا ہے لیکن ہماری رائے میں یہ بات صحیح نہیں، ڈاکٹر قدرت خدا کے ماں باپ نے اُن کا نام ہی ایسا رکھا ہے کہ نہ کوئی مس اللہ بیلی ان کا مقابلہ کر سکتی ہے نہ کوئی مسٹر خدا حافظ۔ ہاں اگر کوئی عرفان اللہ، رضوان اللہ یا شوکت اللہ یورپ کے عام قاعدے کے مطابق مسٹر اللہ کہلانا شروع کر دیں تو اور بات ہے۔

دیکھئے ڈاکٹر قدرت خدا کا ذکر آیا اور راقم کیا کیا مزخرفات لکھ گیا۔

ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر محمد علی نے فرمایا ہے کہ وہ دلّی سے مطمئن ہو کر تشریف لائے ہیں لیکن ہمیں یاد ہے آج سے دو برس پہلے وہ دلّی سے آئے تھے تو اس سے بھی زیادہ مطمئن معلوم ہوتے تھے اور ہم نے اور لوگ بھی دیکھے ہیں، جو دلّی گئے اور انہی کی طرح مطمئن ہو کر واپس آئے ؎

چو می بینم کسے از کوئے او دل شاد می آید
فریبے کز وے اوّل خوردہ بودم شاد می آید

ہماری رائے میں مسٹر محمد علی کو چاہئے کہ ہمیں بھی اس "اطمینان" میں شریک کر لیں۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں کہ بے اطمینانی میں ساری قوم حصہ دار ٹھہرے اور "اطمینان" کے مزے تنہا وزیرِ اعظم ہی لوٹیں۔

---

۲۳ مئی

رویتِ ہلال کے سلسلے میں مسٹر اے آر شبلی کا ایک بیان قریب قریب سارے اخباروں میں چھپا ہے۔ ہمارے ایک معاصر نے جو ترجمہ کیا ہے، ذرا وہ ملاحظہ ہو:۔

انہوں نے (مسٹر شبلی نے) رویتِ ہلال کمیٹی کو پیغمبرِ اسلام کا مقولہ یاد دلایا کہ رویتِ ہلال کے سلسلے میں مشرق کے مقابلہ میں مغرب کی رویت کی بنیاد پر فیصلہ کو ترجیح دی جائے۔

گستاخی معاف، مسلمان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر یوں نہیں کیا کرتے ان کے ارشادات کو مقولہ نہیں بلکہ حدیث کہتے ہیں اور حدیث کا ترجمہ کرنے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ راقم کسی شخص کے عقاید سے بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ نے یہ اخبار مسلمانوں کے لئے نکالا ہے تو مسلمانوں کا اندازِ تحریر تو اختیار کیجیے۔

علامہ اقبال کے ایک نیاز مند ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ علامہ سخت کبیدہ خاطر

معلوم ہوتے ہیں۔ پوچھا خیر تو ہے۔ علاّمہ اقبال کہنے لگے۔ آج ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا نام ادب سے نہیں لیتا، بلکہ آپ کو حضرت محمدؐ یا صرف محمد کہتا ہے۔ مسلمانوں کا آج یہ حال ہے تو خدا جانے آگے چل کر کیا ہوگا! یہ کہہ کے علاّمہ مرحوم نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

یہ رویت ہلال کا معاملہ بھی بڑا بے ڈھب ہے۔ جن دنوں رویت ہلال کمیٹی نہیں تھی، ایک عید ہُوا کرتی تھی۔ جب سے رویت ہلال کا معاملہ ایک کمیٹی کے سُپرد ہُوا ہے، ہر شہر میں دو عیدیں ہو رہی ہیں۔ اس کمیٹی کے کارناموں کا حال سُن کے ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر نماز جمعہ کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے تو جمعہ کی نمازیں بھی دو ہُوا کریں۔ ایک جمعہ کے روز دوسری جمعرات کو یعنی ہفتہ کے سات دنوں ہی میں گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مولوی صاحب جمعرات ہی کو نماز جمعہ پڑھا دیں اور جب کوئی اُن پر اعتراض کرے تو تائید میں دو عاقل و بالغ اور "متدین" اشخاص کی شہادت پیش کر دیں۔

اگر رویت ہلال کمیٹی قائم رکھنا ہے تو جو لوگ شہر کی مختلف مسجدوں میں نماز پڑھاتے ہیں، اُن سب کو اس کمیٹی میں شامل کر لینا چاہئے۔ اُن کے ساتھ ساتھ بعض بڑے بڑے افسروں کا ہونا بھی ضروری ہے جو ہلال عید کے سلسلے میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کر سکیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ تمام مشہور علماء جن کا فتویٰ شہر کے کسی حصّے میں چلتا ہے، اس مجلس میں شامل کر لئے جائیں، ورنہ دو عیدیں ہو کر رہیں گی۔

۲۵ر مئی

ملک فیروز خاں نُون ذاتی طور پر بڑے شریف بزرگوار ہیں لیکن ذرا کانوں کے کچے، ساتھیوں نے جو کچھ کہا اسے سچ مان لیا۔ جس راستے پر چلایا چل نکلے لیکن انہوں نے معروفی

کے بعد جس انداز سے جمہوریّت کا نام لینا شروع کیا ہے، اس پر تعجب ہوتا ہے، وہ بچاری نہ پہلے ان قصوں میں شریک تھی، نہ اب شریک ہے ـــ اس لئے اپنی لڑائی لڑیئے، جمہوریّت کا نام نہ لیجئے۔

ملک صاحب کو یہ جو گمان ہے کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے بیشتر ارکان ان کا ساتھ دیں گے یہ بھی تری خوش فہمی ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ جو لوگ کل تک ان کے ساتھ تھے وہ آج ان سے فرنٹ ہو چکے ہیں، ہاں معزول وزیر کچھ مدّت تک ان کا ساتھ دیتے رہیں تو اور بات ہے لیکن آخر اس ٹھائیں ٹھائیں سے کیا فائدہ؟ تریسٹھ برس کی عمر ہونے کو آئی، سارے حوصلے نکل چکے، اب کسی گوشے میں بیٹھ کے اللہ اللہ کیجئے ـــ

ملک صاحب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جب سے اُن کی وزارت ٹوٹی ہے لیگ اسمبلی پارٹی کے بعض ارکان نے گریبان پھاڑ کے صحرا کی راہ لی ہے، بعض کو روتے روتے غش آ گیا ہے اور بعض خودکشی کرنے کی فکر میں ہیں، حالانکہ یہ سب لوگ بخیر و عافیت ہیں اور جس طرح ملک صاحب کی وزارت قائم ہونے پر وہ سر ہلاتے رہے تھے۔ اب بھی اُسی طرح سر ہلا رہے ہیں۔

---

۱۲ رجُون

موچی دروازے کے باہر جلسہ ہو رہا تھا، اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے، اتفاقاً مقرّر کی زبان سے چند فقرے ایسے نکل گئے جو عام مسلمانوں کے مذاق پر گراں گزرے۔ اس پر لوگ بگڑ گئے، قریب تھا کہ کوئی منچلا بڑھ کے بچارے مقرّر کی مرمّت کر ڈالتا لیکن وہ بھی بڑا گرگِ باراں دیدہ تھا، محفل کی کیفیت دگرگوں دیکھ کے دفعتہً رنگ بدلا، چنانچہ چند لمحوں میں ہر طرف واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں، اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے

لگنے لگے، کچھ نوجوان آگے بڑھے اور لیڈر کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے۔

جلسہ کے خاتمہ پر مقرر نے کہا "یہ مسلمان بھی عجیب لوگ ہیں کبھی جوتیاں مارتے ہیں، کبھی گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے ہیں۔"

ان صاحب نے مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ عوام پر ہی نہیں، خواص پر بھی صادق آتا ہے، مثلاً پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی ہی کو لیجئے مولوی فضل الحق سے ناراض ہوئے تو ایک سانس میں انہیں پانچ مرتبہ غدار کہا اور خوش ہوئے تو "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ کے مشرقی پاکستان کے سیاہ و سپید کا انہیں مالک بنا دیا۔ مسٹر محمد علی کہنے کو تو وزیر اعظم ہیں، لیکن ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے طبیعت شاہانہ پائی ہے وہ جو سعدی نے بادشاہوں کے متعلق کہا ہے کہ گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت بدہند تو وہ ان پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

تیمور اور خواجہ حافظ کی ملاقات اگرچہ تاریخی اعتبار سے مشتبہ ہے لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ تیمور سے حافظ کی ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کہہ دیا ؎

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

میں نے سمرقند و بخارا کو اتنی محنت سے فتح کیا اور آپ ہیں کہ ایک خال کے عوض انہیں دے ڈالنے پر آمادہ ہیں، خواجہ حافظ نے جواب دیا "انہی غلط بخشیوں کی بدولت تو اس حال کو پہنچا ہوں۔"

معلوم نہیں مسٹر محمد علی کو مولوی فضل الحق کی کون سی ادا پسند آگئی کہ پورا مشرقی پاکستان اُن کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اس قسم کی غلط بخشیاں خود اُن کے لئے مضر ثابت نہ ہوں۔ یعنی خواجہ حافظ کی طرح اُنہیں بھی یہ نہ کہنا پڑے کہ انہی غلط بخشیوں کی بدولت تو اس حال کو پہنچا ہوں۔

اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ میجر جنرل سکندر مرزا نے مولوی فضل الحق کو پیغام تہنیت نہیں بھیجا، لیکن انہوں نے اس قسم کا کوئی پیغام نہیں بھیجا تو دوسرے لوگوں نے ضرور بھیجا ہوگا، اکثر بزرگ تو ایسے ہیں جنہوں نے ہر قسم کے پیغام ہائے تہنیت پہلے ہی سے لکھوا رکھے ہیں، بس نام بھرا اور چلتا کیا اور جنرل سکندر مرزا بھی مبارک باد کا پیغام بھیج دیتے۔ یہ مولوی فضل الحق وہ نہیں جو کل تک غدار کہلاتے تھے بلکہ اُن کے نام کے ساتھ لفظ غدار تخلص کی طرح چپکا ہوا تھا، اب وہ "سرکار" یا یوں کہئے کہ سرکار کی سرکار ہیں۔ مسٹر سرکار مشرقی پاکستان کے وزیر اعلےٰ ٹھہرے اور مولوی فضل الحق مسٹر سرکار کی "سرکار" ہوئے، شیخ صادق حسن صاحب قبلہ بس اتنی سی بات میں خوش ہیں کہ وہ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ تخلص کرتے رہے ہیں لیکن مولوی فضل الحق اُن سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

۱۳ر جون

راجہ غضنفر علی خاں نے امیر خسرو کے عرس کے موقع پر فرمایا:۔

افسوس ہے کہ ثقافتی احیاء کے اس دور میں بھی انسانیت کے ایک سچے خادم حضرت امیر خسرو کے کارناموں پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا، اہل علم کو چاہیئے کہ امیر خسرو کا وہ غیر مطبوعہ کلام جمع کریں جو اکثر و بیشتر اردو کی ابتدائی شکل میں ہے۔

راجہ صاحب کے اضافہ معلومات کے لئے عرض ہے کہ "ثقافتی احیا" کے اس دور میں نہ سہی تاہم آج سے پینتیس چھتیس برس پہلے امیر خسرو کے متعلق خاصی ریسرچ ہو چکی ہے اور ان کا جتنا کلام مل سکا قریب قریب سب چھاپ دیا گیا ہے۔

خسرو کا کلام یوں تو مطبع نول کشور سے پہلے بھی چھپ چکا تھا لیکن خسرو کے متعلق ریسرچ کرنے اور ان کے پورے کلام کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے نواب عماد الملک بلگرامی کو آیا، غالباً انہی کی تحریک پر نواب اسحاق خاں رئیس جہانگیر آباد نے

اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ خسرو کے کلام کے قلمی نسخے فراہم کر کے ان کا مقابلہ کیا گیا۔ مشہور اہلِ علم نے ان کتابوں کی ترتیب میں حصہ لیا، ہر کتاب پر مبسوط دیباچہ لکھا گیا، جا بجا حواشی کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک جلد میں خسرو کا غیر مطبوعہ ہندی کلام تھا، جس میں ان کی کہہ مکرنیاں، دو سخنے گیت سب آ گئے تھے۔ بعض کتابیں چھپنے سے رہ بھی گئیں لیکن وہ اس سے پہلے بڑے اہتمام سے چھپ چکی تھیں ان میں اعجازِ خسروی بھی تھی جو نثر کی کتاب ہے اور محض تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

خسرو کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ راجہ غضنفر علی خاں کی نظر سے نہیں گزرا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، سیاست دانوں کو ان چیزوں کا مذاق ہی کب ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ندوۃ العلما کا ایک وفد لاہور میں چندہ جمع کرنے آیا اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ سے ملا تو اسے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ملک صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ندوہ کا نام سُنا ہے، بڑی حیص بیص کے بعد ایک روپیہ چندہ ملا جو عطائے شما بہ لقائے شما کہہ کر واپس کر دیا گیا۔

سچ پوچھئے تو راجہ غضنفر علی کو امیر خسرو کا کلام جمع کرنے یا ان کے متعلق ریسرچ فرمانے کی ایسی کیا فکر ہے ؎

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

خود راجہ صاحب کا کلام ابھی تک جمع نہیں ہو سکا یعنی انہوں نے جو تقریریں ارشاد فرمائی ہیں وہ کتابی صورت میں مرتب نہیں ہوئیں بلکہ راجہ صاحب کے متعلق پوری طرح ریسرچ بھی تو نہیں ہوئی اور ایک راجہ صاحب پر کیا موقوف ہے، دوسرے لیڈروں کے متعلق ابھی تک جو ریسرچ ہوئی ہے وہ بھی نامکمل ہے۔

سچ پوچھئے تو کہہ مکرنیاں، انمل، دو سخنے وغیرہ امیر خسرو نے ہی نہیں کہے، ہمارے بعض لیڈر بھی کہہ مکرنیاں کہنے یعنی بات کہہ کے مکر جانے میں جواب نہیں رکھتے۔ پھر ان کے ہاں

اُنمل اور دو سخنے بھی موجود ہیں۔ امیر خسرو کا ہندی کلام جمع ہو چکا جو باقی رہا ہے وہ جمع ہوتا رہے گا۔ پہلے ہمارے لیڈروں کی کہہ مکرنیاں، انمل، دو سخنے، الم غلم کتابی صورت میں جمع ہو جانا چاہئیے کیونکہ اس طرح اپنے سیاستدانوں کے متعلق ریسرچ کرنا ہمارے لئے بہت آسان ہو جائے گا۔

۱۸ر جون

ہم سمجھتے تھے کہ ملک فیروز خاں نون جو بڑے وضعدار لوگوں میں سے ہیں، ٹکٹ سے محروم ہونے کے بعد کسی گوشے میں جا بیٹھیں گے یا کاروبار کی طرف جھک پڑیں گے۔ کیونکہ انہیں ہنولے کی تجارت کا خاصا تجربہ ہے لیکن آج اخباروں میں اُن کا جو بیان چھپا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لیگ سے مستعفی بھی نہیں ہوں گے اور دستور ساز اسمبلی کا انتخاب بھی لڑیں گے۔

ملک صاحب نے خان عبدالقیوم خان کا طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ٹکٹ نہ ملا تو لیگ کو چند صلواتیں سُنا کے اُس سے قطع تعلق کر لیا بلکہ اس کے ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ

کوئے جاناں سے خاک لائیں گے
اپنا کعبہ الگ بنائیں گے

یا تو ملک صاحب یہ چاہیں گے کہ پنجاب مسلم لیگ جائداد منقولہ کی طرح ان میں اور دستی صاحب میں تقسیم ہو جائے۔ یا پھر وہ غرّائیں گے بھی انتخاب بھی لڑیں گے اور لیگ ہی میں دندناتے رہیں گے۔

ملک صاحب نے اپنے بیان میں فرمایا ہے کہ اللہ نے انہیں ایک روشنی عطا فرمائی ہے۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ ملک فیروز خاں نون جس مقام پر ہیں وہاں سے ایک راستہ یونینسٹ پارٹی کے کھنڈروں کو جا نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ انوار جنہوں نے انہیں راستہ دکھایا

ہے۔ اُدھر ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا قیاس اگر صحیح ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

کسی جماعت کا دو حصوں میں منقسم ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن سے تعاون و عدم تعاون کے سوال پر لیگ کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شفیع لیگ کہلاتی تھی دوسری جناح لیگ۔ اب اگر ملک فیروز خاں نون صوبائی لیگ چھوڑ کر مرکزی لیگ قائم کر کے بیٹھ جائیں اور اعلان کر دیں کہ "اصلی اور وڈی" لیگ یہی ہے جو نون مارکہ لیگ کہلاتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے تو کوئی ان کا کیا کرلے گا۔

سردار سنت سنگھ نے جو کچھ عرصہ تک حبشہ میں حکومتِ ہند کی طرف سے سفیر رہ چکے ہیں، ایک پریس کانفرنس میں فرمایا ہے کہ اکالیوں نے اصل میں پاکستان کی شہ پر حکومت کے خلاف تحریک شروع کر رکھی ہے۔ لیجئے کرے داڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا۔

سردار سنت سنگھ کا خیال ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ پاکستان میں سکھوں کا ایک علاقہ قائم کرنے کے لئے خط و کتابت کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ماسٹر تارا سنگھ سے صرف ایک صاحب مسٹر ایم۔ کے میر کی خط و کتابت رہی ہے۔ اب اگر میر صاحب نے ماسٹر جی کو "مورچہ" لگانے کی پٹی پڑھائی ہو اور لاہور کے تاجروں کی ایک فوج کمک کے طور پر بھیجنے کا وعدہ کیا ہو تو اور بات ہے۔ میر صاحب تاجروں کے حلقے میں واقعی چلتی تلوار سمجھے جاتے ہیں اور صورت شکل سے وہ خاصے لندھور معلوم ہوتے ہیں۔

غالباً سردار سنت سنگھ کا خیال ہے کہ سکھ اپنی عقل سے کام لے کر کوئی کام نہیں کرتا پہلے ہندوؤں نے اُسے اکسا کر مسلمانوں سے لڑوا دیا اب مسلمان اُسے اُکسا کر ہندوؤں سے لڑوا رہے ہیں۔ خود سردار سنت سنگھ کا یہ حال ہو تو ہو سارے سکھ اتنے گئے گزرے نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ سردار صاحب عقل کا یہ جو پشتارہ اٹھائے پھرتے ہیں یہ اصل میں حبشہ سے لوٹ لائے ہیں۔ سردار صاحب ایک تو سنت سنگھ ٹھہرے۔ پھر جبشہ جیسے گرم ملک کی سفارت! گویا ایک کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا۔ اس عالم میں عقل کا ڈھیر نہ لگ جائے تو اور کیا ہو۔

---

۲۵ جون

ان دنوں لاہور کارپوریشن خصوصاً لاہور کے میئر سید ہادی علی شاہ پر پانی کی قلت کے سلسلے میں بڑی لے دے ہو رہی ہے کیونکہ بقول شخصے یہیں پانی مرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شاہ صاحب نہ ٹونٹی ہیں نہ ٹینک، نہ تالاب نہ حوض نہ دریا نہ سقائے ابر کہ دم بھر میں جل تھل ایک کر دے۔ پھر بھی جب کبھی پانی کی کمی کی شکایت ہوتی ہے، لوگوں کے اعتراضات کا رخ انہیں کی جانب ہوتا ہے۔ غالباً ان پر سب سے زیادہ نکتہ چینی اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ خود سید ہیں۔ تعزیہ داری بھی کرتے ہیں۔ محرم کی مجلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو ابھی تک یہ حسن ظن ہے کہ تشنگی کی داد ملی تو انہیں سے ملے گی۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب پر پانی کی قلت کے سلسلے میں ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے اور کوئی جواب نہ دے سکیں گے بلکہ ممکن ہے کہ فرہاد کی طرح تیشہ لے کے جوئے شیر نہ سہی صرف پانی مہیا کرنے کی فکر میں گھر سے نکل کھڑے ہوں اور آئندہ سید ہادی علی شاہ کوہکن کہلائیں لیکن لوگوں کی یہ توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ بلدیۂ لاہور کی صدارت بڑی چیز سہی لیکن کوئی شیریں تو نہیں جس کی خاطر وہ اتنی مصیبتیں اٹھائیں اور صدارت شیریں ہی سہی، شاہ صاحب فرہاد کی طرح مزدور نہیں بلکہ اچھے خاصے خسرو پرویز ہیں۔

سید ہادی علی شاہ صاحب کی باتیں سن کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوئے پڑے تھے شور سن کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے اور فرمایا:۔

"میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں کہ ایک رات میں سب کچھ ہو جائے۔"
گویا شاہ صاحب کو اپنی صدارت کا زمانہ صرف جوانی کی ایک سہانی رات معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ خاصی مدت سے کارپوریشن کے ممبر چلے آتے ہیں اور اہلِ لاہور کو پانی کی قلت کی شکایت تو کئی برس سے ہے۔

اور یہ جو میر صاحب نے فرمایا ہے کہ "میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں" تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات انہوں نے محض ازراہِ انکسار فرمائی ہے۔ ورنہ الہ دین کا چراغ ضرور اُن کے پاس موجود ہے۔ یوں تو لاہور میں ہر قسم کے نئے اور پُرانے چراغ موجود ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ الہ دین کا کراماتی چراغ شاہ صاحب ہی کے پاس ہے۔

آگے چل کر شاہ صاحب نے فرمایا "پیاس کا مقابلہ صبر سے کرنا چاہیئے" اگر شاہ صاحب بھی لاہور کے اُن لوگوں کی طرح جنہیں قطعاً پانی میسّر نہیں پیاسے ہوتے تو صبر کی یہ تلقین بجا تھی۔ لیکن اللہ کے فضل سے اُنہیں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں پینے کے لیے اعلیٰ قسم کے مشروبات موجُود ہیں۔ اس لیے اُن کا جُون کے مہینے میں لوگوں سے کہنا کہ پیاس کا مقابلہ صبر سے کرنا چاہیئے، کوئی معقول بات نہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب لوگوں کے مصائب سُن کر شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے لیکن اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو آنکھوں کا پانی ہی ڈھل چکا ہے۔

انتہا

چوہدری عبدالحمید ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر نے اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور میں چھپوا کر مکتبہ کاروان ایبک روڈ۔ انارکلی لاہور سے شائع کیا۔

(کتبہ: محمد اقبال عباسی خوشنویس لاہور)

انڈکس

الف

ب

پ

ل

م

ن

و

ھ

ی